

کاج

A contact loved ones.

ایک رابطہ اپنوں سے
Aik Rabta Apno Se.

پاکستانی پوائنٹ

www.PakistaniPoint.Com

ذوالفقار ارشد گیلانی

راج

ذُو الْفَقَارِ ارْشَدْ كَلَانِي

اسٹاکٹ : مکتبہ القریش ، اردو بازار، لاہور

پاکستانی ادبیات کا
حکامی ادارہ

جملہ حقوق محفوظ ہیں

2000ء

ناشر محمد علی قریشی نے نیر اسد پریس لاہور سے چھپوا کر
القریش پبلی کیشنز لاہور سے شائع کی۔

قیمت ۱۰ روپے

”اب بچوں پر سے اپنے پیار کا آئچل ہٹالیں مہارانی۔“ مہاراجہ نے اپنی پات وار آواز میں کہا۔ ”آپ نے لڑکا کو بھی اس وقت تک گود سے نہیں اتارا جب تک وہ گھوڑے پر سوار ہو نہ لے لے قابل نہیں ہو گیا۔ اب آپ اس لڑکی کے ساتھ بھی یہی کر رہی ہیں۔ کیا آپ چاہتی ہیں کہ رانہت اپنے جگر گوشوں پر فخر کرنا چھوڑ دیں، یا آپ انہیں بزدل بنا کر طاؤس و لالہ کی محفلوں میں غرق کر دینا چاہتی ہیں، لیکن بھگوان کی سوگند ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔“

وہ مہاراجہ سے ملے لانا چاہتی تھیں لیکن اتنی امت بھی تو نہیں تھی ان میں کہ شوہر نے سامنے اپنی درازی کرتیں سو وہ سر جھکائے خاموش کھڑی رہیں۔

نکا نے اپنی والدہ کی سرخ و سپید رنگت اور والد کی گہری سیاہ آنکھیں ورثے میں پائی تھیں۔ ذرا دیر پہلے وہ اس بات پر والدہ کی ڈانٹ کھا رہا تھا کہ اس کے نشانہ بازی کے شوق کے نتیجے میں قلعے کی فصیلوں کے کنٹرے مرہہ کبوتروں سے اٹ گئے تھے۔ لیکن نکا ایک ڈانٹ کے بعد پھر بدوق اٹھا لیتا اور فصیل پر بیٹھنے والے کبوتروں کی شامت آ جاتی۔

اس کے برعکس نکا کی چھوٹی بہن ایک نہایت نرم و نازک اور شریف النفس بچی تھی۔ اس نے ماں کی سبز آنکھیں اور باپ کی سانولی رنگت چرائی تھی۔ مہارانی عموماً اس کے

ماں لے پن سے پریشان رہتیں۔ ان کے ذہن میں یہ خدشات تھے کہ ان کی بیٹی کا رشتہ مشکل سے ملے گا۔ وہ جیہ کے موڈ سے بھی خوفزدہ تھیں۔

شام کے وقت جب مہارانی قدیم روغنی تصاویر کے بکس کھولتیں تاکہ اپنے بچوں کو ان کے آباؤ اجداد کے کارناموں سے آگاہ کر سکیں تو ٹکا ہمیشہ میدان جنگ کی روغنی تصاویر دیکھنے پر اصرار کرتا۔ وہ راجپوتوں کے قدیم ہتھیاروں سے عشق کرتا تھا اسے بڑی بڑی کمائیں، تیر اور برچھیاں بے حد پسند تھیں۔ جو کسی شخص کا بدن کانڈ کے ٹکڑے کی مانند چیر سکتی تھیں۔ لیکن جیہ ایسی روغنی تصاویر کو دیکھنا بھی پسند نہ کرتی تھی وہ درختوں سے نکلنے ہوئے کسی گھوڑے، پہاڑوں یا راجاؤں مہاراجاؤں کی روغنی تصاویر کے سامنے گھنٹوں گم صم بیٹھی رہتی اور مہارانی کو شش کے باوجود یہ سراغ نہ لگا پائی تھیں کہ ان کی بیٹی کی سبز آنکھوں کے پیچھے کیا اسرار پوشیدہ ہیں۔

سائیں اصطبل کے بہترین گھوڑوں پر کانھیاں کس چکے تھے۔ ہاؤس ہولڈ کیولری آفیسرز رائفلیں کندھوں سے لٹکائے راجہ کی آمد کے منتظر تھے۔ شکار کا قافلہ تیار تھا، بس راجہ کا انتظار تھا۔

اور پھر راجہ جے سنگھ محل سے نمودار ہوئے۔ ان کی دائیں جانب راجکمار ٹکا اور بائیں جانب راجکمار جیہ سنگھ تھی۔ ٹکا نے اپنے لئے علیحدہ گھوڑے کا انتخاب کیا جبکہ راجکمار کی کو راجہ نے اپنی گود میں بٹھالیا۔ قافلہ جس وقت محل کے دروازے سے روانہ ہوا تو سورج طلوع ہونے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔

جیہ اپنے والد کے بازوؤں میں دبی بیٹھی تھی۔ اس کی کمر میں گولیوں کے پٹے کی ایک اجنبی سی چیم تھی۔ کسی نے اس کی کمر کے گرد کپڑا باندھ دیا تھا تاکہ اس کی کمر چھل نہ جائے گھوڑا دکی چال پر آیا تو جیہ کی پازیب، رکاب سے مل کر بجنے لگی۔ گھوڑے کی ٹاپوں کے ساتھ یہ تازک سا سارینہ ایک عجیب سا پیدا کر رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں شکار کا قافلہ قلعہ بالمیر کے صدر دروازے سے نکل کر اس شاہراہ پر آگیا جو جنگل کی سمت جاتی تھی۔

قلعہ کے باہر شہر میں سناٹا تھا۔ جھیل کے کنارے بنے ہوئے بعض مندروں میں ٹٹماتے دیئے کسی پجاری کے رت جگمگے کی گواہی دے رہے تھے۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے گلیوں کے کتے جاگ اٹھے اور انہوں نے چوکیداری کے فرائض انجام دہی کے طور پر بھونکنا شروع کر دیا۔ کئی تاریک کھڑکیوں سے ان کتوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر چپ کرانے کی صدا میں بلند ہوئیں۔

نصرتی اور مزید گزری اور وہ شہر کی گنجانی سے کھلے کی ویرانی میں نکل آئے۔ بائیں
 ہاتھ تار لول فاسمندر لگ رہی تھی۔

لالہ ہراول دستہ لائینس اٹھائے ہوئے تھا تاکہ تاریکی میں سفر بلا روک ٹوک جاری
 رہے۔ کھولے کی متناسب رفتار سے پہلے جیہ پر غنودگی طاری ہوئی اور پھر وہ نیند کی
 آغوش میں ہا پٹی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو تاریک زمین کے سینے پر اجالا اگنے لگا تھا۔
 آسمان نے سمیٹوں کی جانب اپنے سفر کا آغاز کر دیا تھا۔ ان کے آگے سیاہ رنگ کے بھینسے
 اور ادا صوں ہمارے ال تھے۔ شاہراہ کے آس پاس واقع دیہات کے کچے گھروں کی دیواروں
 نے مقابلے سے ادا صوں اٹھنا شروع ہو گیا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے رفتہ رفتہ ساری
 فضا ادا صوں کی رہی ہو۔

انہوں نے ادا صوں کی ایک قطار نمودار ہوئی۔ کیا عجیب جانور تھے۔ تیزی سے بھاگنے
 کی بجائے لولی آواز نکالی نہیں دے رہی تھی۔ بھگوان نے ان کے پیروں میں گدیے باندھ
 رکھے تھے۔

اداسوں کی قطار 'تم ہوئی تو دو گھڑ سوار راجہ کی جانب بڑھتے دکھائی دیئے۔ یہ شاہی
 فوج تھی۔

"اما نہیں اس" راجہ نے دریافت کیا۔

"انہوں میں پہلا مہاراجہ اور ایک شیر دل لکائی دیا ہے، حکم!" ایک شکاری نے نہایت
 ادا صوں سے جواب دیا۔

"شیر خاصا بڑا ہے، حکم! دوسرے نے ڈرتے ڈرتے گزارش کی "بہتر ہو گا کہ
 راہلاری کو ساتھ نہ لے جایا جائے۔"

راجہ کے چہرے پر جلال سا آگیا۔ شکاری اور قافلے کے دوسرے افراد چپ ہو گئے۔
 'پان راجہ نے کچھ کہنے کے بجائے گھوڑا آگے بڑھا دیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے
 قافلے کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا تھا۔

قافلہ جنگل کے دہانے پر ایک گاؤں میں پہنچ کر رک گیا۔ مہاراجہ بے سنگھ گھوڑے
 سے اترا تو چروں پر نقاب اوڑھے ہوئے متعدد عورتوں نے اپنے راجہ کا خیر مقدم کیا۔

"ہم اپنی جان، آپ لوگوں کے حوالے کئے جا رہے ہیں، بیٹیو!" راجہ نے اپنی رعایا کو
 نہایت احترام سے مخاطب کیا تھا۔ "اس کا خیال رکھنا، ہم بعد میں اسے بلوالیں گے۔"

مورتوں نے فوراً ہی جیہ کو گھیر لیا۔ ریاست کی راجکاری پہلی بار وہاں آئی تھی۔ مورتوں نے اس سے پہلے کسی حاکم کو اتنے قریب سے نہ دیکھا تھا۔ وہ جیہ کے گل چھو چھو کر اس کی یہاں موجودگی کا یقین کر رہی تھیں اور اس کی سبز آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔

جیہ کو پتا ہی نہ چلا کہ کب اس کے والد شکار کے لئے وہاں موجود ہاتھیوں پر بیٹھ کر جنگل کے لئے روانہ ہو گئے۔

عورتیں روزمرہ کے کام کاج میں مصروف ہوئیں تو بچوں نے جیہ کو گھیر لیا۔ ان کی آنکھوں میں یہی سوال تھا کہ قلعہ بالمیر سے آنے والی ان کی یہ ”بائی سا“ یا شاہی بہن کیسی ہے؟

ایک دس سالہ بچہ جیہ کے قریب آگیا ”بائی سا! کیا تم نے کبھی گائے کا دودھ پیا ہے؟“ ”کیوں نہیں۔“ جیہ کے لہجے میں راجکاریوں کی سی تمکنت تھی۔ ”تمام بچے گائے کا دودھ ہی پیتے ہیں۔“

”لیکن تم تو کسی بڑے سے سنہرے گلاس میں دودھ پیتی ہو گی، بائی سا!“ ”نہیں، ایسا نہیں ہے۔“ ”نہی جیہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہمارے پاس انگلینڈ سے آیا ہوا ایک گلاس ہے جس پر سرخ سپاہی کی تصویر بنی ہوئی ہے۔“ ”لیکن گلاس تو ہے نا؟“ بچہ کوئی فلسفی دکھائی دے رہا تھا۔ ”کیا تم ہمارے انداز میں دودھ پینا پسند کرو گی؟“

”نہی جیہ کچھ نہ سمجھی، اس کی آنکھوں میں کئی سوال ابھر آئے۔ لڑکے نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک گائے قریبی درخت کے نیچے کھڑی چارہ کھا رہی تھی۔ اس نے جیہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے گائے کے قریب لے گیا۔ جیہ نے نہایت سعادت مندی کے ساتھ لڑکے کی تقلید کی اور گائے کے پیٹ کے نیچے سر دے کر بیٹھ گئی۔ لڑکے نے گائے کے دودھ سے بھرے ہوئے ایک تھن کو پکڑ کر دبایا اور گرم گرم تازہ دودھ کی ایک دھار جیہ کے چہرے اور بالوں کو بھگوتی چلی گئی۔

دوسرے بچوں نے مارے خوشی کے اچھلنا کودنا شروع کر دیا۔ اچانک چند عورتوں کی نظریں ادھر اٹھیں تو وہ مارے خوف کے کانپ اٹھیں۔ جیہ کا چہرہ دودھ اور گوہر سے اٹا ہوا تھا۔ وہ فوراً بچوں کی طرف بھاگیں۔

”مہاراج نے دیکھ لیا تو وہ تم لوگوں کی کھال میں بھس بھروا دیں گے۔“ کئی ایک نے

ہانا شروع کر دیا۔

”اے اہل میل تھا، ایک تفریح۔“ لڑکے نے اپنی صفائی پیش کی۔ ”اس نے خود ایسا لہا، اندکی ظاہری تھی۔“

مردوں نے بہت دقت بچوں کو پیشنا شروع کر دیا۔ ان کے ہاتھی دانت کے نگلن بچنے لگے۔

”اور ہاں! لیس کے؟“

”م والدی، اگلی ہ۔“ عورتیں بدستور اپنے بچوں کو کونے دے رہی تھیں۔ ان وقت جیلر پھنسی تو سامنے سے راجکمار نکا آتا دکھائی دیا۔ بدحواس عورتوں نے جیہ کو اچھا بچھا ہسٹا لیا لی ایک نے اپنی اول منیوں سے جیہ کا چہرہ اور بال صاف کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ یہ اس اہل سے گھبرا کر منہ بسورنے لگی تھی۔ اہل نے اہل نظر اس لڑکے کو دیکھا جس نے یہ حرکت کی تھی، پھر اس کی نگاہیں اپنی اس لڑکے پر پڑیں، مراد ہو گئیں۔

”راہیہ! راجکمار! رو! ہمیں کرتیں بزدل۔“ اس کا لہجہ سخت اور الفاظ انگاروں جیسے تھے۔ ”اے رو! بند نہ کیا تو ہم اپنی تلوار سے تمہیں خاموش کر دیں گے۔“ نفخہ اٹھا۔ ”اے اہل! تلوار، ہاتھ ال دیا۔ راجکمار جیہ فوراً چپ ہو گئی۔ ”چلو ہاتھی پر بیٹھ جاؤ۔“ اہل نے کہا، اور جیہ فوراً ہالیا ہے۔“

اولیٰ کھڑا ہوا۔ ”یہ لے دھالنے کی آوازیں انہیں دور سے ہی سنائی دینے لگی تھیں۔ ہاتھی میں ہا لین مہلات نے اہلی کڈے کی مدد سے اسے بے بس کئے رکھا تھا۔

شیر: جب سامنے آیا تو جیہ کو اندازہ ہوا کہ خوف کے کتے ہیں۔ وہ بے اختیار اپنے بھائی لی ٹانگوں سے لپٹ گئی لیکن نکا نے انتہائی نفرت سے اسے پرے دھکیل دیا۔

جیہ سمجھ رہی تھی کہ کھیل ختم ہو گیا ہے لیکن اس وقت تو اس کے دل کی دھڑکن طمطم کی گئی جب اس کے والد نے اسے بانہوں میں بھرا اور چیختے دھاڑتے شیر کے عین سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ جیہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ بری طرح چیخی لیکن چیخ شیر کی دھاڑ میں دب کر رہ گئی۔

ذرا دیر بعد جیہ نے ہمت کر کے آنکھیں کھولیں تو اس کی روح فنا ہو گئی۔ شیر اس سے مصل ایک فٹ کے فاصلے پر تھا۔ وہ زخمی تھا اور بری طرح ترپ رہا تھا۔ اسے رسوں سے

جکڑ دیا گیا تھا لیکن یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ابھی رس توڑ دے گا اور سامنے موجود تمام افراد کو چیر بھاڑ کر رکھ دے گا۔ شیر کے تڑپنے کے باعث خون کے کئی چھینٹے جیہ کے اسکرٹ پر آگرے تھے۔ اس نے رحم طلب نگاہوں سے اپنے والد کی طرف دیکھا لیکن وہاں اسے اپنے لئے ہمدردی کی کوئی جھلک دکھائی نہ دی تھی۔

جیہ اپنے والد اور بھائی کے ساتھ دیر تک زخمی شیر کے سامنے کھڑی رہی۔ زخمی شیر اگر تھوڑا سا زور لگاتا تو وہ تینوں اس کے پنجوں کی زد میں آ جاتے لیکن مہاراجہ اور راجکمار اس خطرے سے بے پروا نظر آتے تھے۔

رفتہ رفتہ جب جیہ کا خوف بھی دور ہونے لگا اور وہ دلچسپی سے آزادی کی جدوجہد میں مصروف شیر کو گھورنے لگی حتیٰ کہ مہاراجہ اپنے دونوں بچوں کو شیر سے دور لے گیا۔ مہاراجہ نے اپنا ایک ہاتھ جیہ اور دوسرا ٹکا کے کندھوں پر رکھ دیا۔

”حکمران آدمی ہوتے ہیں اور آدمی ہمیشہ خوفزدہ رہتا ہے۔“ مہاراجہ کا انداز ناصحانہ تھا۔

”لیکن آدمی اپنا خوف ختم کئے بغیر حکومت نہیں کر سکتا۔“

جیہ اتنی چھوٹی تھی کہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ مہاراجہ اپنے بچوں کو راج نیقی سمجھا رہا ہے۔ یہی حکمرانوں کا فلسفہ تھا جو نسل در نسل قلعہ بالمیر کے راجکماروں کو پڑھایا جاتا تھا۔

۱۸۵۷ء

جیہ جس علاقے میں پیدا ہوئی تھی وہ اس صحرا کے پار واقع تھا جسے دشت مرگ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

حتیٰ کہ نئی صدی کے آغاز سے تین سال قبل بھاٹوں کے چھوٹے قبائل جب بالمیر کی بادشاہت کا رخ کر رہے تھے تو انہوں نے موت کی بہت سی کہانیاں دیکھی تھیں۔ تلاب اور دیہات کے کنویں خشک ہو چکے تھے۔ جودھ پور، بیکانیر اور جیسلمیر کی ریاستوں کو سیراب کرنے والی مصنوعی جھیلوں پر کالی کی سبزیت جم چکی تھی۔ پانی اتنا کم رہ گیا تھا کہ اس میں سے سرخاند اٹھنے لگی تھی اور ایسے جانور پیدا ہو گئے تھے جن کا وجود ہی موت کا پیغام تھا۔

دیہات کی چوپالوں اور کاروان سرائوں میں غذا کی مقدار بہت کم رہ گئی تھی۔ بھٹ اور گویئے گروہ در گروہ یہاں پہنچ رہے تھے اور اپنی چکنی چپڑی باتوں کے عوض خوراک کی انتہائی قلیل مقدار حاصل کر رہے تھے۔

پورے راجپوتانہ کو علم تھا کہ بالمیر کا مہاراجہ اس وقت اپنی سلطنت کے دلی عہد کی

”درباری جو شیوں کی بھی تو سنو!“ ان میں سے ایک بوڑھا یاد دلاتا۔ ”ان کی پیش گوئی ہے کہ انگریزوں کی حکومت کے عروج کے ہر بیس سال بعد قحط آیا کرے گا۔“

”اور پچھلے قحط سے اب تک بیس سال پورے ہو چکے ہیں۔“

سب کے چہرے اتر جاتے۔ واقعی انہوں نے دیہاتیوں کو بارش کے لئے پراتھنا کرتے دیکھا تھا۔ کاشتکار پہلے ہی سمجھ گئے تھے کہ ایک اور قحط شروع ہو چکا ہے۔

زمانہ قدیم میں چند یورپی باشندوں نے بالمیر کا سفر اختیار کیا تھا۔ ان میں سے جو چند ایک اس پر خطر سفر سے بچ کر بالمیر پہنچے تھے انہوں نے صحرا کو دشت مرگ کا نام دیا تھا، لیکن نصف صدی پہلے جب سے بالمیر نے برطانوی حکومت سے ایک معاہدے پر دستخط کئے تھے یورپی باشندے اکثر و بیشتر یہاں آیا کرتے تھے۔

محض دس سال پہلے زار روس نے روسی دربار کے دو گرانڈ ڈیوکس کے ہمراہ چندہ دن مہاراجہ بالمیر کے پاس گزارے تھے۔ اس سے پہلے قیصر جرمن کے صاحبزادے نے چند دن یہاں قیام کیا تھا۔ ان حالیہ سیاحوں نے بالمیر کو موت کی سرزمین نہیں بلکہ کاشتکاروں کی کھیتی قرار دیا تھا۔

اب بھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ خشک سالی جس نے بیرونی دنیا کو گہری تشویش میں مبتلا کر دیا ہے بالمیر کی سرحدوں پر آکر رک گئی ہے۔ بالمیر کے اردگرد واقع دیہات کے چاروں طرف اب بھی کپاس کی فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ دارالحکومت کو آنے والی شاہراہ دو رویہ سرسبز و شاداب درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔

بھائوں کا قافلہ جب دارالحکومت پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ بالمیر کے مہاراجاؤں کے محلوں کے سنگ مرمر کے گنبد رات کی تاریکی میں دیو قامت بھوت دکھائی دے رہے تھے۔ کاروان موت کی یادگاروں کے قریب سے گزر کر بازاروں میں داخل ہوا جو لاشیوں کے روشنیوں سے جگمگا رہے تھے۔

گیندے کے پھولوں سے بنے ہوئے ہاروں کے پہاڑوں کی عقب میں براہمن ہا کر مندروں میں جانے والی عورتوں کو پھول بیچ رہے تھے۔ لکڑی کے بنے ہوئے کلبوں میں بیٹھے دکاندار سونے اور چاندی کے زیورات، زری، صندل کی لکڑی کی مصنوعات، خوشبوئیات، آئینے اور ایسی ہی دوسری اشیاء اپنے گاہکوں کو منہ بولے داموں پر فراہم کر رہے تھے۔

بہت سے بچے بھاگ کر کارواں کے راستے میں حائل ہو گئے تھے۔

”مہاراجہ جے سنگھ نے تم لوگوں کے لئے خیموں کا ایک شہر آباد کیا ہے۔“

اگائے گئے تھے۔ سنگ مرمر کے پتھروں کو تراش کر پانی کی خوبصورت گزرگاہیں بنائی گئی تھیں۔ ان پائنت کی تزئین و آرائش کے لئے ماہرین کو بہ طور خاص دہلی سے بلوایا گیا تھا۔ جھلسا جھیل سے قلعے کے اندرونی حصے تک پانی کی ایک زیر زمین سرنگ تعمیر کی گئی تھی تاکہ محاصرے کے دنوں میں قلعے کے اندر پانی کی قلت پیدا نہ ہونے پائے۔ سرنگ پتھروں سے بنائی گئی تھی اور اس کی چھت اتنی نیچی تھی کہ کوئی بھی شخص تلوار اپنے سر سے بلند کر کے کسی پر حملہ آور نہ ہو سکتا تھا۔

اس وقت اسی قلعہ کے عظیم دربار ہال میں بالمر کے مہاراجہ جی سنگھ کا انتظار ہو رہا تھا۔ تمام درباری اور معزز مہمان اپنی اپنی نشستیں سنبھال چکے تھے۔ ذرا سی دیر گزری تھی کہ قلعہ بالمر کے در و دیوار چوہداروں کی آوازوں سے گونج اٹھے۔

”بادب‘ بلا لحظہ‘ ہوشیار۔ شاہ با فرو فرہنگ‘ مالک دولت اورنگ‘ حکمت نگاہ‘ روشن نگاہ‘ صائب تدبیر‘ دیدہ تقدیر‘ ستارہ بالمر مہاراجہ جے سنگھ جلوہ افروز ہوتے ہیں۔“

مہاراجہ نے تخت سنبھالا تو ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے بادشاہوں کی جانب سے نذر گزاری گئی۔ تمام ریاستوں کے معززین مہاراجہ کے لئے گراں بہا اور بیش قیمت تحائف لائے تھے۔

مہاراجہ روزانہ اپنی اسی گدی پر بیٹھتا تھا۔ راجپوت حکمرانوں کا روایتی تخت یہی تھا۔ اس کے عقب میں چھتر بردار ہوتا تھا جو اپنے آقا کے سر پر شاہی چھتر کا سایہ کئے رہتا تھا۔ مہاراجہ کے سامنے سب سے اگلی قطار میں بالمر کے امرا تھے جن کی تلواریں اطاعت کی نشانی کے طور پر ان کے گھٹنوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ ان کی نیاموں پر سنہری زنجیریں تھیں جو اس بات کا اظہار تھا کہ وہ امن و آشتی کے لئے اس دربار میں آئے ہیں۔

نذرانوں اور تحائف کا دور ختم ہوا تو رقص لڑکیاں دربار میں آگئیں۔ بالمر کی سانولی سلونی رقصاؤں نے کچھ دیر اپنے مہمانوں کا جی بہلایا لیکن پھر مہاراجہ نے انہیں واپس بھیج دیا۔ وہ آج اپنے درباریوں اور مشیروں سے مشاورت کے موڈ میں تھا۔

”آپ کو لندن ضرور جانا چاہئے، یور ہائی نیس۔“ اودے پور سے آئے ہوئے ایک معزز مہمان نے سرگوشی کے انداز میں تجویز پیش کی۔ ”چار سو سال پہلے ہمارے آباؤ اجداد کو پابند کر دیا گیا تھا کہ ہم کسی غیر شہنشاہ کو تعظیم نہیں دیں گے لیکن آپ اس پابندی کی زد میں نہیں آتے۔“

ایک اور مصائب مہاراجہ کی طرف جھک آیا۔ ”آپ کی عزت سب پر مسلم ہے، ملکہ
 اور ہمارے اندھی اور طوفان کی طرح، ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ وکٹوریہ کو بتائیں کہ
 طاقتور ہمارے لیے جیسے ہیں لیکن ٹیکس مغلوں کی حکومتوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔“
 اس نے کہا۔ بھوئی تو ایک اور ریاست سے آئے ہوئے پیغامبر نے اس کی جگہ سنبھال
 لی۔ ”ہمارے ہاں آپ پر قربان مہاراج، ہوشیار رہئے گا۔ برطانیہ ہمیں اپنے لالچ کی
 باتیں دہرا رہا ہے۔ ہند کی نصف سے زیادہ آمدنی اس گوری کے خزانے میں چلی جاتی ہے
 اور مال نصف اس فوج پر خرچ کر دی جاتی ہے جس میں کسی ہندوستانی کو بطور افسر بھرتی
 نہیں کیا جاتا۔ گاڑیاں برطانوی سلمان اور برطانوی پولیس سے بھری ہوئی آتی ہیں۔ انگریز ہمارے
 ہمارے گروہ طرزی کا ایک ایسا جلا بن رہا ہے جس سے ہم کبھی باہر نہیں نکل سکیں گے۔“
 پھر ایک ایک مہاراجہ بنے سکھ ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے راج کماروں اور
 اہلکاروں نے مہیلاں بنتا رہا لیکن آخری فیصلہ اس کی مہارانی کو کرنا تھا جو اپنی بانہوں میں
 اپنے راج کمار کو اٹھائے اس کی منتظر تھی۔

”آپ لندن ضرور جائیں، دربار! مہارانی نے اپنی سریلی آواز میں فیصلہ سنایا۔ ”آپ
 لندن کی آواز بن کر جائیں حکم۔ وکٹوریہ آپ کی بات پر دھیان ضرور دے گی۔
 لندن کی طاقتور ہندوستان کے مسائل سے پہلو تھی نہیں کر سکے گی۔“

”ہی ہاں والی ریلوے لائن کی دونوں اطراف کسانوں کی طویل قطاریں مہاراجہ جے
 گھڑا کے لیے لے لئے موجود تھیں۔ مہاراجہ نے انگلیٹنڈ جانے کے لئے بمبئی سے بحری
 ہمارے سار ہوتا تھا۔

مہاراجہ نے دوران سفر وہ اجڑے ہوئے دیہات دیکھے تھے جنہیں انگریزوں نے طاعون
 پھیلنے کی وجہ سے جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ مہاراجہ کا دل اپنے ہندوستان کی چٹائی دیکھ کر خون
 لے آنسو رو رہا تھا لیکن وہ ان لوگوں کے لئے کچھ بھی کرنے کا اہل نہ تھا۔

راستے کے ریلوے اسٹیشن انسانوں سے اٹے ہوئے تھے یہ سب لوگ قحط اور خشک
 مٹی سے تنگ آ کر بمبئی جا رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ برطانوی شہریوں اور برطانوی
 حکومت کے لئے کام کرنے والے ہندوستانی سوداگروں کے گھروں کے ارد گرد پرے بٹھادیے
 گئے ہیں تاکہ کوئی غریب روٹی مانگنے کے لئے ان کے دروازوں پر نہ جاسکے۔

”ہر شخص خوراک کے لئے تڑپ رہا ہے۔“ متاثرہ افراد اپنی چٹا بنا رہے تھے۔ ”قحط
 سے بچ جانے والے پیسے سے مر رہے ہیں۔“

”ہیرونی مارکیٹوں میں بھیجی جانے والی ہندوستانی گندم برآمدی بحری جہازوں سے چرا کر گراں قیمتوں پر مقامی بازاروں میں بیچی جا رہی ہے لیکن برطانوی آقاؤں سے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا“

جب وہ بمبئی پہنچا تو بے سنگھ فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ ایک بھیانک خواب سے جاگا ہے یا ایک سپنا دیکھنے جا رہا ہے۔ بڑی بڑی کوٹھیوں اور بنگلوں میں ہندوستانی اور انگریز باشندے بحث کر رہے تھے کہ ہندوستانی حکمران جوہلی تقریبات کے دوران ملکہ برطانیہ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کیسے لگیں گے۔ ان میں سے کوئی بھی قطع اور خشک سالی کے بارے میں بات نہ کرتا تھا۔

ڈاکس پر شاہی خواتین خواجہ سراؤں کے کھڑی کئے ہوئے پردوں کی آڑ میں اپنے راجاؤں اور مہاراجاؤں کو الوداع کہہ رہی تھیں۔ اوپری ڈیک پر کھڑا بے سنگھ بڑے غباروں کی صورت میں چلتے پھرتے عارضی زنان خانے دیکھ رہا تھا۔ بھارتی ریاستوں کا ایک منتخب گھڑ سوار دستہ بھی اسی جہاز سے برطانیہ جا رہا تھا جس نے جوہلی تقریبات کے دوران ملکہ کو ہندوستان کی طرف سے گارڈ آف آنر پیش کرنا تھا۔

ذرا دیر بعد جہاز کے لنگر اٹھائے گئے۔ بمبئی ہاربر رفتہ رفتہ افق کی لکیر کی طرح نگاہوں سے اوجھل ہوتی چلی گئی اور بے سنگھ یہ سوچنے کے لئے تیار رہ گیا کہ بھارت کی دولت ملکہ وکٹوریہ کے قدموں کی دھول بن رہی تھی لیکن خود ہندوستان کو بے رحم دھوپ کی تپش سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔

لندن پہنچ کر بے سنگھ کو اجنبی ماحول ملا تو وہ کچھ دیر کے لئے ہندوستان کے قطع اور خشک سالی کو بھول گیا۔ مے فیز کے علاقے میں اس کے لئے حاصل کی گئی پر تعیش آرام کی کرسیوں پر بیٹھ بیٹھ کر وہ اکر گیا۔ رات کو وہ جب نرم گدیوں پر لیٹا تو اسے یوں لگا جیسے وہ سمندری جھاگ میں ڈوبتا چلا جا رہا ہو۔ یہ بیڈ راجپوتوں کی ان سخت اور چھوٹی چارپائیاں سے بدرجما بہتر تھا جو سونے والے کی پنڈلیوں پر ختم ہو جاتی تھیں۔

دن بھر مہاراجہ بے سنگھ لندن کے گلی کوچوں میں غیر ملکی دولت کے نظارے دیکھتا رہا۔ وہ جہاں بھی گیا اسے وکٹوریہ کی پریڈ کی تیاریاں نظر آئیں۔ جلوس کے راستے کے ساتھ چوہلی اسٹینڈ بنائے جا رہے تھے۔ عمارتوں کی چھتوں پر یونین جیک لہرا رہے تھے جبکہ کھڑکی پر ملکہ کی تصویر آویزاں دکھائی دے رہی تھی۔

پھر اسے لندن اسٹاک ایکس چینج لے جایا گیا۔ اس نے وہاں جب ہندوستان

ہندوستانی مسلمان اور مزدور، دنیا بھر میں لے جانے والی کمپنیوں کے نام سے تو اس کا حلق خشک ہونے لگا۔ یہ سب برطانوی کمپنیاں تھیں۔ وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ شاید بھگوان نے دنیا بھر کی تمام نعمتیں صرف اور صرف انگریزوں کے لئے زمین پر اتاری ہیں۔

آخر کار جے سنگھ کو انڈیا آفس طلب کیا گیا جہاں سے ہندوستانی ریاستوں کے معاملات کنٹرول ہوتے تھے۔ مہاراجہ اپنے دو نوجوان مصاحبوں اور تجارت اور امور خارجہ کے وزراء کے ہمراہ جب سنگ مرمر کی سیڑھیاں چڑھ کر لابی میں پہنچا تو اسے ایک بہت بڑی آئل پینٹنگ دکھائی دی جس میں ایک ہندوستانی راجہ کو انگریز فوج کے ہاتھوں مغلوب ہوتا دکھایا گیا تھا۔ جو تین انگریز افسر اس شاندار عمارت میں اس کی رہنمائی کے لئے متعین کئے گئے تھے ان کے لباس اس کے وزراء اور مصاحبین سے کہیں زیادہ بہتر تھے۔

جے سنگھ کو ایک صوفے پر جگہ دی گئی۔ ایک نروس ہندوستانی مترجم کو اس کے برابر بٹھایا گیا جبکہ اس کے وزراء کرسیوں پر اس کے پیچھے بیٹھے تھے۔

”انگریز کو بتاؤ کہ برطانوی ہندوستان ان دنوں قحط اور فاقوں کا شکار ہے۔“ جے سنگھ نے نوجوان مترجم کو مخاطب کیا۔ ”ہمارے تجارتی راستے برطانوی ہند سے ہو کر گزرتے ہیں۔ ہم چاروں طرف سے محصور ریاستیں ہیں۔ کوئی بھی چیز ہماری سرحدوں میں داخل ہوتی ہے یا باہر جاتی ہے اس پر ہمیں برطانوی ہند کو دہرا ٹیکس دینا پڑتا ہے۔ اور اب برطانوی ہند کا قحط ہمیں بھی اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔“

مترجم نے مہاراجہ کے الفاظ انگریزی میں دہرا دیئے۔ جے سنگھ نے انگریزوں کے چروں پر بے نیازی کے آثار دیکھے تو اسے اپنے دوسرے حقیقتوں میں ڈھلتے نظر آئے۔

”برطانیہ کو صورت حال پر تشویش ہے۔ اس کے علاوہ لندن کے لارڈ میئر نے قحط کا امدادی فنڈ قائم کر دیا ہے۔“

جے سنگھ نے اپنا ہاتھ مترجم کے بازو پر رکھ دیا۔ ”انگریز کو بتاؤ کہ لارڈ میئر کے امدادی فنڈ کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ شاہی ٹیکس قحط کو آگ دکھانے کے مترادف ہیں۔ انہیں بتاؤ کہ اگر برطانوی ہند تباہ ہوا تو ہندوستانی ریاستیں بھی ڈوب جائیں گی۔“

تھکے نقوش والا ایک موٹا تازہ انگریز بالمر کی فائل کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر شرارت غالب تھی۔

”ہز ہائی نیس سے دریافت کرو کہ وہ اپنے حرم پر کس قدر دولت خرچ کرتے ہیں۔“ انگریز نے مترجم سے کہا۔ ”کیا وہ یہ محسوس نہیں کرتے کہ ریلوے سے ان کے ملک کی

ات میں مزید اضافہ ہو گا اور وہ اپنے حرم پر اب سے کہیں زیادہ پیسہ خرچ کر سکیں گے۔“
انگریز کا چہرہ تھمرا رہا تھا لیکن اس نے کوشش کی تھی کہ اس کے لہجے کا طنز نہ ہائی نہیں
کو ناگوار نہ گزرے۔

”حقیقت یہ ہے کہ بالمر کے پاس وافر فنڈز موجود ہیں۔ بالمر اپنی فوج پر کچھ خرچ
نہیں کر رہا۔ جب سے بالمر اپنے دفاع کے قابل نہیں رہا برطانیہ اس مد میں خاصی رقم ادا کر
رہا ہے۔

یہ ایک کھلی دھمکی تھی، کم از کم بے سنگھ یہی محسوس کرتا تھا خاص طور پر ایسی صورت
میں کہ برطانیہ مہاراجہ منی پور کو پھانسی دینے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اس نے برطانوی حکومت
کو لٹکا رہا تھا جس کے جواب میں اسے مجرم قرار دے دیا گیا تھا۔ بے سنگھ کو اپنے دند کی تیز
دھار نگاہیں اپنی پشت پر چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔

”بالمر اپنے تحفظ کے لئے برطانوی بادشاہت کا احسان مند ہے۔“ اس نے زہر خند سے
کہا۔ ”ہمارے رویوں کا احتساب کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ہم نے کبھی اپنی فوجوں پر اتنی
رقم خرچ نہیں کی، جتنی ہم برطانیہ کو بطور خراج ادا کرتے ہیں۔“

بے سنگھ کو یقین ہو گیا کہ انڈیا آفس سے ہندوستان پر حکومت کرنے والے افراد سے
ہمدردی کے دو بول بھی نہیں مل سکیں گے، چنانچہ وہ بے تابی سے جوبلی تقریبات کے اختتام
کا انتظار کرنے لگا تاکہ اسے ملکہ سے علیحدگی میں ملاقات کا موقع مل سکے۔

دن بھر وہ بے قراری سے مے فیہ ہاؤس میں ٹھٹھا رہتا جبکہ رات کو مختلف تقریبات
میں شرکت کرتا جو جوبلی پریڈ کا حصہ تھیں۔ یہاں اسے اداکاراؤں اور دوسرے لوگوں کی
بیویوں سے پرنس آف ویلز کے معاشقے سننے کو ملے۔ اسے کئی اور اسکینڈلز کا پتا بھی چلا جن
میں ملکہ وکٹوریہ کے ایک پوتے سمیت شاہی خاندان کے متعدد افراد ملوث تھے۔

جوبلی سے دو دن پہلے بے سنگھ کو خبر ملی کہ اس کے والد کا ایک پرانا دوست مہاراجہ
ڈنگرا، انگلینڈ پہنچا ہے اور اس سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔

ڈنگرا ایک ہجوم کے ساتھ بیل گریو اسکوائر پر اپنے مکان کے باہر بے سنگھ کو اپنا منتظر
ملا۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کا لبادہ پہن رکھا تھا جس پر گردن سے ناف تک ہیرے جڑے
ہوئے تھے۔

بے سنگھ بگھی سے اترا تو ڈنگرا نے گرم جوشی سے گلے لگا کر اس کا خیر مقدم کیا اور
فوراً ہی اپنے کمرہ خاص میں لے گیا جہاں سے سارا مغرب فرنیچر ہٹا لیا گیا تھا اور اس کی جگہ

ماہس مشرقی انداز کا فرنیچر سجایا گیا تھا۔

”اب بتاؤ، جے!“ بھاری بھر کم مہاراج نے نرم گدیلوں سے بنی ہوئی ایک گدی پر بیٹھتے ہوئے کلمہ ”اب جبکہ تم ہمارے شاہی آقاؤں سے مل چکے ہو، ان کے بارے میں تم نے کیا اندازے لگائے ہیں؟“

”میرے اندازوں یا سوچ سے کیا فرق پڑتا ہے حکم؟“ جے سنگھ کے لہجے میں مایوسی تھی۔ ”میرے پاس کوئی فوج نہیں کہ میں اپنے خیالات میں وزن پیدا کر سکوں۔“
 ڈگرا کی آنکھیں پھٹنے کو آگئیں۔ ”احتیاط سے جے!“ اس نے مہاراجہ جے سنگھ کو رالٹ کی۔ ”یہ انتہائی باغیانہ تبصرہ ہے۔ تم انگلینڈ میں ہو اور اس بغاوت کے جرم میں قلع سے محروم کئے جاسکتے ہو۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں، حکم!“ جے سنگھ اپنی بات پر قائم تھا۔ ”دنیا کے بہادر ترین فوجیوں کو برطانیہ کی پریڈوں کو سجانے کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ ہمارے پاس گنتیں ہیں لیکن ہم ان سے فائر نہیں کر سکتے کیونکہ ان کی فائرنگ مینس اور ایمونیشن برطانوی ہندوستان کے پاس ہے۔ بد قسمتی سے ہم ایک ایسی ملکہ کے دغلدار ہیں جس کے محافظ گوشت خور ہیں لیکن ہم راجپوت، گائے کو بھگوان کا پرتو سمجھتے ہیں۔ ہزاروں راجپوت سپاہی صرف اس وجہ سے محاصروں کے دوران پیاسے مر گئے کیونکہ انہیں ان نہروں کا پانی پینا گوارا نہ تھا جن میں ہمارے دشمنوں نے فنج کی ہوئی گنوماتا کا خون ملا دیا تھا۔“

ڈگرا نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لئے۔ وہ کچھ دیر غور سے جے سنگھ کو دیکھتا رہا پھر گویا ہوا۔ ”میں اکثر سوچتا ہوں کہ ہم ہندوستانی راجے زمانہ قدیم کے داستان گو ہیں جنہوں نے نود کو ہیرے جواہرات اور اپنے شاندار ماضی میں دفن کر لیا ہے کیونکہ ہم حل سے خوفزدہ ہیں۔ ہم اپنے بہادر خون کا ذکر کرتے ہیں لیکن گزشتہ تین نسلوں سے ہندوستان میں کوئی جنگ نہیں لڑی گئی۔ ہاتھیوں اور گھوڑوں کی لڑائی کے بجائے ہم نے محض ایک دوسرے پر لفاظی کے حملے کئے ہیں۔“

ڈگرا نے سترے پتے میں لپٹا ہوا پان منہ میں رکھا اور آگے کو جھک آیا۔

”ہمارے پاس اتنے خزانے موجود ہیں کہ ہم بہ آسانی اپنی فوجیں ترتیب دے سکتے ہیں لیکن اس کے برعکس ہمارے پاس کوئی فوج نہیں ہے بلکہ ہم اپنی دولت عیش و عشرت پر لٹا رہے ہیں۔ تمہارے جیسے کئی اور بھی برطانوی بلاشاہت کے خلاف آواز اٹھانے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔“ اس نے درمیانی انگلی جے سنگھ کی طرف اٹھا دی۔ ”ہاں تم یہ سب کر

سکتے ہو۔ تم نوجوان ہو اور تمام نوجوان ناممکن خواب دیکھتے ہیں۔ مجھے دیکھو۔ میں نے اپنے خزانے سے رقم لے کر اسے مغرب کی دولت میں لگا دیا ہے۔ بیس سال سے میں نے کوئی ٹیکس نہیں دیا میں نے ہمیشہ برطانوی بادشاہت کے اقدامت کی حمایت کی ہے اسی لئے غیر ملکی میری حکومت کے اخراجات ادا کرتے ہیں۔“

جے سنگھ نے بوڑھے حکمران کی بات کاٹنی ”کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے سونے بننے اور ساہوکار بن جائیں؟ یہ ہمارے دھرم کے خلاف بات ہے۔ قدیم کتابوں میں ہمارے دھرم کی بنیاد تو نہیں ہے؟“

”تم ایک بچے کی طرح بول رہے ہو، جے!“ بوڑھے حکمران کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ ”قدیم دھرم دیوتوں نے ہمیں صرف سلت فیصد رقم خود پر اور حکومت پر خرچ کرنے کی اجازت دی ہے۔ باقی رقم ہمیں اپنے لوگوں کی بھلائی پر خرچ کرنی ہے۔“ ڈوگرہ۔ چاندی کے پیک دان میں پان کی پیک تھوکی ”خیر اس خشک موضوع کو چھوڑو، یہ بتاؤ تمہیں لندن کی زندگی کیسی لگی؟“

جے سنگھ شش و پنج میں پڑ گیا کہ وہ اپنی زبان سے کیسے بتائے کہ لندن کے نوجوان دوستوں کی بیویوں، بہنوں اور بیٹیوں کے ساتھ گلچہرے اڑاتے پھرتے ہیں۔

”میرے خیال میں یہاں عزت و وقار کا پیمانہ ہمارے ہاں سے خلاصا مختلف ہے،“ ڈوگرہ نے بڑے محتاط الفاظ کا چناؤ کیا تھا۔

”نہیں۔“ جے سنگھ نے ہونٹ پان کی پیک سے سرخ ہو رہے تھے۔ وہ مسکرایا تو اس کی یہ سر باچھوں سے ہمہ نکل۔

”عزت و وقار؟ دھرم؟ تم ماضی میں زندہ ہو جے! یہ الفاظ اپنی قدر و قیمت کھو گئے ہیں۔ اب دنیا دولت کے بل بوتے پر چلتی ہے، دھرم اور عزت کے بل پر نہیں۔“ اس تلی بھائی اور ایک ملازم طشتری میں ایک بکس رکھے حاضر ہو گیا۔ ”بھگوان نے تمہیں وار عطا کیا ہے۔ یہ تحفہ اس پرارتھنا کے ساتھ قبول کرو کہ ہم اپنی اولادوں کے لئے ریاست چھوڑیں، پتھروں کے ڈھیر نہیں۔“

جوبلی پریڈ کے موقع پر بکنگھم پیلس میں ہندوستانی حکمرانوں کے اعزاز میں استقبال ترتیب دیا گیا۔ جے سنگھ ایک گوشت خور محافظ کی معیت میں وکٹوریہ کے ڈرائنگ روم پہنچا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وکٹوریہ نے جے پور کے مہاراجہ کی طرف سے بھیجا جانے انمول ہیروں کا کنگن پہنا ہو گا یا نہیں اور کیا مہاراجہ جے پور اپنی ایسی ملکہ کے ساتھ ایک

پر بیٹھ کر کھانا گوارا کر لے گا جسے اس کا دھرم چھوٹنے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ ننگن نے وکٹوریہ کو مہاراجہ کی بہن بنا دیا تھا اور ہندو دھرم میں بہن کے گھر سے کچھ لیا نہیں جاسکتا تھا، حتیٰ کہ پانی کا ایک گھونٹ بھی حرام تھا۔

اس روایت کے بارے میں سن کر ملکہ نے بھارتی حکمرانوں سے شاہی ضیافت میں شرکت سے معذرت کر لی تھی جو اس استقبالیہ کے بعد ہونے والی تھی۔

جے سنگھ نے اپنا نام اور القاب سننے تو اسے ایک لمحے کے لئے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی حملہ آور ہے جو شاہی توشے خانہ میں آگھسا ہے۔

استقبالیہ میں برطانوی قوت کے سارے نشان موجود تھے۔ پوری برطانوی کابینہ۔ غیر ملکی سفارت کار۔ یورپی ملکوں کے تاجدار اور دلی عہد۔ ڈائس پر اس ساری قوت و طاقت کا مرکز بیٹھا تھا۔ سیاہ لبادے میں ملبوس ایک دہلی پتلی بوڑھی عورت جس کے لباس پر سنہرے سورج اور نقرئی ستارے چمک رہے تھے۔

جے سنگھ نے دیکھا کہ وکٹوریہ نے مہاراجہ جے پور کا دیا ہوا ننگن پہن رکھا تھا۔ وہ ملکہ سے ملنے کے بعد آگے بڑھا اس نے پرنس آف نیپلز سے چند باتیں کیں اور پھر اپنی ماں کے پہلو میں کھڑے برطانوی شہزادوں اور شہزادیوں سے بات چیت کرنے لگا۔

وکٹوریہ کے دوسرے بچے کمرے میں موجود تھے۔ پروسیا کی ملکہ اور اس کے دو بیٹے۔ پرنس آف نیپلز، ڈچز آف ٹیک، زار نکولس سینڈ کی نمائندگی کرنے والے گرائنڈ ڈیوکس نے جے سنگھ کو دیکھا تو آرج ڈیوک فرڈی نڈ آف آسٹریا اور ہنگری سے بات چیت ادا ہو رہی تھی۔ چھوڑ کر اس کی طرف لپکا اور بالیر میں اپنے قیام کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ ان کے برابر میں شہنشاہ جاپان اور شہنشاہ سیام کے ولی عہد کھڑے تھے۔

بات چیت میں اک ذرا سا وقفہ ہوا تو جے سنگھ نے پلٹ کر دیکھا تو ایک پستہ قامت شخص جس نے ایک عام سا کوٹ اور پاجامہ پہن رکھا تھا کمرے میں داخل ہوا۔ جودھ پور کا قائم مقام بادشاہ سر پرتاپ سنگھ ملکہ سے ملاقات کے لئے ڈائس کی طرف بڑھا تو کمرے میں سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔

سرگوشیوں کو نظر انداز کرتا ہوا سر پرتاپ ڈائس پر چڑھا اور اپنی تلوار وکٹوریہ پر تان لی۔ ہال میں موجود لوگوں کے حلق سے سسکاریاں نکل گئیں۔ پرنس آف ویلز اپنی ماں کو بچانے کے لئے آگے بڑھا لیکن پریشان ہو کر رک گیا۔ سر پرتاپ نے تلوار وکٹوریہ کے قدموں میں ڈال دی تھی۔

اس شب اس نے ڈگمگا کے دیئے ہوئے تحائف کا جائزہ لیا۔ دوسری چیزوں کے علاوہ بعض دستاویزات بھی اس بکس میں موجود تھیں۔ ان دستاویزات سے اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ یعنی حاکم بالمیر اب کنیڈین پیسیفک ریلوے، برازیل ریلوے، ایک امریکن فروٹ کمپنی، نیل ٹیلی فون، آسٹریلیا کی سونے کی ایک کھن، تین بینکوں اور درجن بھر دیگر غیر ملکی اداروں کا شیئر ہولڈر ہو گیا ہے۔ اس نے اپنی اس فکست کی فائل کو دور پھینک دیا۔ اب اسے اس دن کا شدت سے انتظار تھا جب اس کا بیٹا بالمیر کے تخت پر حکمران کی حیثیت سے راجہاں ہوتا۔

جوبلی پریڈ کی صبح شدید بارش ہو رہی تھی۔ اپنے سر پر اسی فٹ طویل پگڑی بندھواتے ہوئے وہ کھڑکی میں سے ان بے وقوفوں کو دیکھ رہا تھا جو اس شدید بارش کے باوجود پریڈ دیکھنے آئے تھے۔

مہاراجہ بالمیر، سیاہ گھوڑوں پر سوار اپنی ریاست کے شہسواروں کے ساتھ بکنگھم پیلس روانہ ہوا تھا۔ اسے ارد گرد کی شاہراہوں پر موجود بیس لاکھ سے زائد افراد کی آنکھوں میں اپنے لئے عجیب و غریب تاثرات دکھائی دیئے تھے۔

وائٹ ہال کے نزدیک برطانوی نوآبادیوں کے شہسوار دستوں کی موجودگی کے باعث رنگوں کا طوفان سا آگیا تھا۔ آسٹریلوی دستے زرد کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ نیوزی لینڈ کے دستے اپنے کیولر ہیٹ پہنے ہوئے تھے جن پر رنگین پر لگے ہوئے تھے۔ سکھ سرخ پگڑیوں میں تھے۔ جے سکھ کو پیدل دستے بھی دکھائی دیئے۔ چینی فوج نکلنے ہیٹ پہنے ہوئے تھی۔ ٹینی ڈاڈ والے سفید اور مارش کے دستے سیاہ ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے۔

پیلس کے باہر چوک میں ایک چوتھائی دنیا کے حکمران جن کی فوجوں کو برطانوی طاقت کے عظیم سمندر میں غرق کر دیا گیا تھا، گھوڑوں پر سوار پریڈ کے آغاز کے منظر تھے۔ چوک کے آس پاس کے درخت لوگوں سے اٹے ہوئے تھے جو برطانوی قوت کے ایسے مظاہرے کو دیکھنے کے لئے آئے تھے، جیسا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

بالمیر کے لانسز بکنگھم پیلس کے دروازوں سے اندر داخل ہو گئے تاکہ وکٹوریہ کے گارڈ آف آرمز میں اپنی ریاست کی نمائندگی کر سکیں۔ جے سکھ کا دل انہیں دیکھ کر جل رہا تھا کیونکہ وہ کبھی اپنے دھرم کے مطابق بہادروں کا کردار ادا نہ کر پائیں گے۔

پریڈ شروع ہوئی۔ آغاز میں وہ برطانوی ہیرو تھے جنہوں نے غیر ملکی حکومتوں کو ان کے گھمنٹوں پر گرا دیا تھا۔ جے سکھ نے بکنگھم پیلس کی بالکونی میں وکٹوریہ کو دیکھا۔ وہ چھوٹی سی عورت پریڈ کی سلامی لے رہی تھی۔ برطانوی ہیروز کے ناموں کے ساتھ ان حکمرانوں کے نام

بھی پکارے جا رہے تھے جنہیں شکست فاش ہوئی تھی۔ جے سنگھ جانتا تھا کہ محض چند کاغذوں پر دستخط کر کے وکٹوریہ کا بھائی بن جانے کی اس عظیم قوت کے سامنے کوئی حیثیت نہیں۔

بحری فوج کی چھ گنتیں، گن گیرج پر وکٹوریہ کی بالکونی کے نیچے سے گزریں۔ یہ گنتیں مقامی دستوں کو نوآبادیاتی فوجی دستوں سے علیحدہ کر رہی تھیں۔ گنوں کے بعد نوآبادیاتی دستوں کا مارچ پاسٹ شروع ہوا۔ حصار اور لائبرز کے دستے ایک ایک کر کے مل پر نکلتے رہے۔

انڈین امپیریل کیولری کے دستے وکٹوریہ کے سامنے سے گزرے تو سورج بھی بادلوں کی چادر سے باہر نکل آیا۔ جھوم کی طرف سے داد و تحسین کے نعرے بلند ہوئے۔ جے سنگھ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ کیا واقعی سچ ہے کہ برطانیہ کی عمل داری میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا۔ لوگ نعرے لگا رہے تھے کہ سورج ہمیشہ وکٹوریہ کے لئے چمکتا رہے گا اور آج بھی سورج نے یہ ثابت کر دیا تھا۔۔۔ ملکہ کا موسم، ملکوں کی ملکہ کے لئے۔

چالیس بھارتی حکمرانوں نے اپنی ملکہ کی سواری کے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ جے سنگھ نے دیکھا کہ ان میں سے صرف ایک یعنی ملکہ کا نوجوان منہ بولا بیٹا سیرپور کا مہاراجہ وکٹرباھتھ ہلا کر جھوم کے نعروں کا جواب دے رہا تھا۔

دن پردن گزرتے رہے لیکن جے سنگھ کو ملکہ وکٹوریہ سے تنہا ملاقات کا موقع نہ مل سکا۔ برطانیہ اپنی خوشی اور سرشاری میں جھوم رہا تھا اور ایسے میں وہ موت کی کہانیوں سے کوئی دلچسپی نہ رکھتا تھا۔

بمبئی سے بالیر کے طویل سفر کے دوران جے سنگھ نے قحط اور خشک سالی کے کچھ اور بھیاں مناظر دیکھے تھے۔ برطانوی ہند میں لینڈ ٹیکسوں میں کوئی کمی نہ کی گئی تھی جس کی وجہ سے کاشتکاروں میں بے حد اشتعل پالا جاتا تھا۔ تقریباً ہر ریلوے جنکشن پر اس نے برٹش ریلوے آفیسرز کی موت کے بارے میں سنا جنہیں اتنا مارا گیا تھا کہ وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ اب برطانیہ عقلی کے خلاف بغاوت کی باتیں کھلے عام ہونے لگی تھیں۔

بالیر کی سرحدوں پر پریشان حال دیہاتیوں کے ایک وفد نے اپنے حکمران کو گھیر لیا۔

”کاشتکار بالیر کی سرحدوں میں مسلسل داخل ہو رہے ہیں، حکم!“

”ہو کار بھی جاگ اٹھے ہیں، حکم! وہ ہماری زمینیں قحط کا بہانہ بنا کر کوڑیوں کے مول

خریدنا چاہتے ہیں تاکہ بعد میں منہ مانگے داموں بیچ سکیں۔“

تب ہی ایک بوڑھے آدمی نے جس کی کمر بھر کی زیادتی کے باعث خم کھا گئی تھی، اپنے مکران سے ایسا سوال پوچھا جس کا جواب بے شکمہ کے پاس نہیں تھا۔
 ”ہم ابھی تک اپنی زمین کے مالک ہیں حکم! لیکن اگر اس بار بھی بارش نہ ہوئی تو ہم کیا کریں گے؟“

قحط سالی کے آغاز میں مہارانی کو علم نہ تھا کہ ایک دن اسے قریب المرگ سپاہی کی اپنی تلوار پر گرفت قائم رکھنے کی ناکام کوششوں کی طرح، اپنے نقاب اور پردے کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان تھی کہ کیا اس طرح وہ اپنی پیش رو بہادر راجپوت مہارانیوں کی آتماؤں کے لئے دھبا تو نہیں بن جائے گی۔

اس کے باوجود کہ مہارانی ان دنوں قحط سے متاثر ہونے والوں کی حالت سے اذیت کا رہ تھی، وہ صبح سویرے بیدار ہوتی اور بالمیر کی مہارانیوں کے مندر میں جا کر اپنے پیش روؤں کی آتماؤں سے پراگھنا کرتی کہ اس کی ریاست پر رحم کریں۔ وہ اپنی دیوی دیوتاؤں کے سامنے گڑگڑاتی اور انہیں اپنی رعایا کی حالت زار سے آگاہ کرتی جس کا وہ روزانہ نظارہ لیتی تھی۔

پوجا کے بعد وہ زنان خانے کی منقش دیواروں کے عقب میں آ بیٹھتی اور اپنے شوہر کو گھوڑے پر سوار ہو کر محل سے نکلتے ہوئے دیکھتی۔ مہاراجہ کے ارد گرد ان لوگوں کا ہجوم ہوتا تھا جو ریاست کے مختلف حصوں سے بدترین قحط کی بھیانک خبریں لے کر آیا کرتے تھے۔ بعض اوقات مہاراجہ چھکڑوں کے ایک طویل جلوس کے ہمراہ سفر کرتا جو مٹی کے تیل کے بڑے بڑے ڈرموں میں پانی لے کر ریاست کے گرد آلود راستوں پر دن رات محو سفر رہتا تھا۔ بعض دنوں میں وہ قلعہ بالمیر میں اناج کے ذخائر سے ہاتھیوں اور اونٹوں پر غلہ لاد کر لے جانے والوں کے ساتھ مختلف علاقوں میں جاتا۔

مہاراجہ مسلسل اپنی ریاست کے دوروں پر تھا اور مہارانی قلعہ کے اندرونی حصہ میں عورتوں کے امدادی کیپوں کی نگرانی کرتی۔ بعض اوقات وہ متاثرہ عورتوں کے لئے دربار منعقد کرتی۔ اس کے باوجود کہ یہ دربار سورج ڈھلنے کے بعد منعقد کئے جاتے پھر بھی محل کی دیواروں سے گرمی کے باعث لو اور تپش کے تھپیڑے ٹکا کرتے تھے۔

گرمی کی شدت اتنی زیادہ ہوتی تھی کہ لالینیں اور شمعیں بھی فاصلے پر روشن کی جاتی تھیں تاکہ ان کی حدت دربار میں شریک لوگوں تک نہ پہنچ سکے۔

مہارانی دربار میں آنے والی عورتوں کے دکھ سکھ پہنچنے کے لئے ان میں کھل مل جاتی۔

ان سے ان کی دلچسپی کی باتیں پوچھتی۔ وہ اکثر ان سے دریافت کرتی کہ ان کے بچے پڑھ سکتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں، کیوں؟

”بالمیر کے لڑکے چھ سال پڑتوں کی زیر نگرانی تعلیم حاصل کرتے ہیں جبکہ تین سال کے لئے لڑکیاں بھی اسکول جاتی ہیں، پھر بھی برطانوی ہند کے بچے پڑھائی لکھائی میں شملی ہند کے بچوں سے آگے کیوں ہیں؟“

نوجوان عورتیں مارے شرم کے ساری کے پلو میں منہ چھپا لیتیں۔ ایسے میں کوئی بوڑھی عورت جواب دیتی۔

”ہمارے ستارے گردش میں ہیں، حکم! کبھی ہم بھی اپنی زمینوں کے مالک تھے اور ہمارے بچے بھی تعلیم حاصل کیا کرتے تھے لیکن انگریز نے ایک قانون منظور کیا جس کی رو سے مالیانہ لینے والے ہماری زمینوں کے مالک ہو گئے اور راتوں رات انگریز نے ہمیں بھکاری بنا دیا۔“

عورت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اپنی ساری کا پلو کھینچا اور اسے جھولی کی طرح مہارانی کے سامنے پھیلا دیا۔ ”ساہوکار ہمیں قرضے دینے کو تیار نہ تھے چنانچہ زمینداروں نے ہمیں ان زمینوں سے بے دخل کر دیا، جن کے کبھی ہم مالک تھے اور ہم بھکاریوں کی طرح بھیک مانگنے پر مجبور ہیں، کیونکہ ہم جینا چاہتے ہیں۔“

اسی شب اپنے شوہر کے پہلو میں لیٹی ہوئی مہارانی نے دریافت کیا۔ ”کیا برطانویوں نے واقعی ایسا کیا ہے؟ کیا انہوں نے غریبوں سے زمینیں لے کر واقعی ٹیکس جمع کرنے والوں کے حوالے کر دی ہیں؟“

جے سنگھ نے ایک طویل سانس لی۔ ”ہاں، کارنوالس نے یہ قانون پاس کیا ہے۔ وہ اسے انصاف کہتا ہے۔ بقول اس کے وہ جانتا ہے کہ ہندوستان کے لئے کیا بہتر ہے، لیکن تم دیکھنا کہ انگریز کو ایک نہ ایک دن اس انصاف کی قیمت چکانی پڑے گی۔“

قحط کے تیسرے سال مہارانی سے یہ بات چھپی نہ رہ سکی کہ بالمیر کی حکومت ڈانواں ڈول ہے۔ گرمی اور تپش میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ دیہات کے کنوؤں میں بچ جانے والے آخری پانی کی آخری بوندیں بھی خشک ہو گئی تھیں۔ ندی نالے یوں خشک تھے جیسے کبھی ان میں پانی تھا ہی نہیں۔

اب مہاراجہ کئی کئی دنوں کی غیر حاضری کے بعد اس کی خواب گاہ میں آتا۔ اس کے شیر جیسے چہرے پر اب جھریاں نمودار ہونے لگی تھیں، داڑھی کے بال سفید ہونے شروع ہو

گئے تھے۔ وہ ہر وقت کھویا کھویا رہتا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے اندر اندر ہی کوئی روگ چاٹ رہا ہو۔

مہاراجہ کی وزارت کی کونسل میں شامل وزیروں کی بیگمات بھی اکثر اس سے ملنے آتیں اور وہ ہمیشہ غیر شادی شدہ لڑکیوں کے لئے جینز کی کیمالی اور عام گھروں کی غربت کا رونا روٹیں۔ ایسے میں مہارانی اپنے شوہر کے بارے میں مزید فکرمند ہو جاتی۔

مہاراجہ کی مایوس کن گفتگو سے اس کے خوف اور اندیشوں میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ ”لاج، طع اور ہوس“ وہ اپنی مٹھی بالکونی کی دیوار پر مار کر غرایا۔ ”مرنے والے مویشیوں سے زمینیں پٹی پڑی ہیں اور میرے وزیر چاہتے ہیں کہ ریلوے لائن اور فیکٹریاں تعمیر کرنے کی لئے اراضی برطانوی کمپنیوں کو ٹھیکے پر دے دی جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ بالمر کی ترقی کے لئے ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ بالمر کے یہی غنوار انگریزوں کے پارٹنر بن جائیں گے اور غریب کسانوں کا حق ماریں گے۔“

باہر سے اڑ کر آنے والی دھول آنکھوں میں پڑی تو بے سنگھ نے آنکھیں مسلتی شروع کر دیں۔ وہ بالکل سرخ ہو گئی تھیں۔ ”اور یہ دیکھو“ دہلی میں ہونے والے آخری برطانوی دربار میں میرے اپنے چچیرے بھائی راجہ مان سنگھ نے برطانویوں کو بتایا کہ میں بالمر میں انگریزوں کے کارخانے نہیں چاہتا کیونکہ میں بادشاہت کا دشمن ہوں لیکن اب میں ان افواہوں کا گلا گھونٹ دوں گا۔ میں اپنے گھڑ سوار دستے پیکنگ بھیجوں گا تاکہ وہ انگریزوں کی طرف سے چین کی ڈاؤگر ملکہ کے خلاف لڑائی میں حصہ لے سکیں۔“

وہ بے قراری سے بالکونی کی منقش دیوار پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ تو وہ باہر سے اڑ کر آنے والی دھول سے اٹ گئے۔ مہارانی نے بڑھ کر ہاتھ تھامے اور انہیں اپنی اوڑھنی سے صاف کرنے لگی۔ وہ آہستگی سے اسے اپنی خواب گاہ میں لے آئی۔ بے سنگھ نے کسی خوابیدہ معمول کی طرح اس کی تقلید کی تھی۔

”ڈنگرا صحیح کہتا تھا۔“ مہاراجہ جیسے نیند میں بول رہا تھا۔ ”آنے والی صدی میں خون سے لکھی ہوئی روایتوں کی نہیں، دولت سے بنائی ہوئی رسموں کی اہمیت ہو گی۔“

مہارانی کی خواب گاہ سے متصل ایک چھوٹا سا سوسنگ پول تھا جو چاروں طرف سے بند تھا۔ پول کی دیواروں پر صندل کے چراغ روشن تھے، جبکہ شفاف پانی میں سنگ مرمر کی تہ صاف دکھائی دے رہی تھی۔

مہاراجہ کے حلق سے اب غراہیں خارج ہو رہی تھیں۔ مہارانی نے جب اپنے تھکے

ماندے شوہر کا مٹی اور دھول میں اٹا ہوا لباس اتارنے کی کوشش کی تو اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔

جب مہارانی نے صندل کی لکڑی کے تیل سے مہاراجہ کے جسم کی مالش شروع کی تو وہ مہارانی کو بتا رہا تھا کہ اس نے جھلسا جھیل کے مشرقی کنارے پر حکومت کے نئے دفاتر معتدی بنانے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ بے زمین کسانوں کو روزگار فراہم ہو سکے۔

مہاراجہ نے کچھ اور کہنے کی کوشش کی لیکن مہارانی نے اپنے ہونٹوں سے اس کے لبوں پر خاموشی کی مر لگا دی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے شوہر کو اس وقت سکون کی ضرورت ہے اور یہ سکون صرف اور صرف ایک بیوی ہی دے سکتی تھی۔

نئے سال کے شروع میں بالیر کے گھڑ سوار دستے چین روانہ ہو گئے۔ عیسائی کیلنڈر کے مطابق یہ نئی صدی کی ابتدا تھی لیکن بارش اب بھی نہ ہوئی تھی۔ کسانوں کے ریلے کے ریلے جھلسا جھیل سے پانی لینے کے لئے دارالحکومت میں داخل ہوتے رہے جبکہ ان کے مویشی خوراک کے بجائے نمک چاٹ چاٹ کر اپنی زندگی کے دن پورے کرتے رہے۔

مہاراجہ نے خوراک کی کمیابی سے ستائے ہوئے لوگوں کے لئے بالیر کی سرحدیں بند نہیں کیں لیکن وہ اپنی ریاست کی حدود میں انگریزوں کی موجودگی کے بدستور خلاف رہا۔ بعض اوقات وہ لندن سے شائع ہونے والے اخبارات لا کر مہارانی کی بالکنی میں بیٹھ کر پڑھتا رہتا۔ یہ اخبارات ایک ماہ بعد بالیر پہنچتے تھے۔ بوسیدہ کانڈ کھول کر وہ چین کی جنگ کے بارے میں خبریں پڑھتا تھا۔

ایک بار وائسرائے کی جانب سے اسے ایک موٹا سیاہ لفافہ موصول ہوا۔ سیاہ رنگوں میں لپٹے ہوئے خط میں اسے آگاہ کیا گیا تھا کہ برطانوی بادشاہت اپنی روح سے محروم ہو گئی..... ملکوں کی ملکہ وکٹوریہ کا انتقال ہو گیا تھا۔

موسم گرم آیا تو امرا اور معززین کی بیویاں باقاعدہ باغیانہ باتیں کرنے لگیں۔ ان کی سربراہ وزیر اعظم کی بیوی تھی جو ہفتے میں تین دن باقاعدگی سے برت رکھا کرتی تھی۔ وہ ایک وفد کی صورت میں مہارانی کے پاس آئی تھیں۔

وزیر اعظم کی بیوی نے ہی اپنی ساتھیوں کی ترجمانی کی تھی۔ اس کا لہجہ بھی اپنے شوہر کی طرح خشک اور زندگی کی کسی رمت سے محروم تھا۔

”مہاراجہ کے اقدامات بلا جواز ہیں حکم!“ وہ مہارانی کو بتا رہی تھی۔ ”انہوں نے پچھلے چار سال میں ہمیں کسانوں سے ایک پیسہ بھی لینے کی اجازت نہیں دی لیکن ہم اپنے ٹیکس

اللہ کی سے ادا کر رہے ہیں۔ ہمیں آپاشی اور بیجوں کی قیمت بھی نہیں لینے دی گئی بلکہ حکم دیا گیا ہے کہ اپنے گوداموں کے دروازے قحط سے متاثر ہونے والوں کے لئے کھول دیئے جائیں۔“

اس نے منہ پر ہتھیلی رکھی اور کھانسنے لگا صاف کیا۔ دوسری بیگمات نے سر ہلا کر اس کی باتوں سے اتفاق کیا تھا۔

”ایسے کب تک ہم زندہ رہیں گے، حکم؟ آپ جانتی ہیں کہ کھانے کو نہ ملے تو اچھی بات نہیں ہے۔“

مہارانی نے اپنا فرض نبھانے کی کوشش کی تھی۔ ”اگر آپ ہفتے میں تین دن برت رکھتی ہیں تو آپ کو عام آدمی کے لئے قربانی دینے کی اہمیت کا اندازہ بھی ہو گا؟“

مہاراجہ جے سنگھ کے چچیرے بھائی کی بیوی نے کھانسنے لگا صاف کیا۔ مہارانی اسے دیکھ کر مسکرا دی۔ نوجوان عورت کا ڈھیلا ڈھالا لباس چٹلی کھا رہا تھا کہ وہ جلد ہی ماں بننے والی ہے۔

”لیکن حکم!“ نوجوان رانی نے شرمیلے لہجے میں کہا۔ ”میرے شوہر کہتے ہیں کہ انگریزوں نے کسانوں پر لگائے جانے والے ٹیکس معاف نہیں کئے۔ انگریزوں نے تو ان کپڑوں پر بھی ٹیکس لگا دیئے ہیں جو وہ اپنا تن ڈھانکنے کے لئے پہنتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ قحط سالی کے بعد انگریز حکومت پہلے سے دگنی مضبوط ہو گئی ہے لیکن ہالمیر دیوالیہ ہو جائے گا۔“

وزیر اعظم کی بیگم نے نوجوان رانی کا کندھا تھپتھپایا تو مہارانی کو محسوس ہوا کہ حکومت ہالمیر کے محل کی بنیادیں ہلنی شروع ہو گئی ہیں۔

جس روز مہارانی کو یقین ہو گیا کہ وہ ایک بار پھر ماں بننے والی ہے وہ بالکونی میں بیٹھی اپنے شوہر کی واپسی کی منتظر تھی۔

اور پھر خواب گاہ کے اندرونی پردے ہٹے اور مہاراجہ جے سنگھ بالکونی میں داخل ہوا۔ اس نے اپنی مہارانی کا طبع چہرہ اپنے ہاتھوں کے کٹورے میں تھام لیا جو مسلسل گھڑسواری سے سیاہ پڑ گئے تھے۔

”آپ کو اپنے پردے کو خیر ہوا کہتا پڑے گا۔“ اس نے دھماکہ کیا۔

مہاراجہ نے اور بھی بہت کچھ کہا لیکن مہارانی نے اس کے سوا کچھ نہیں سنا۔ وہ ساکت رہ گئی۔ دل ہی دل میں وہ پراگتھا کر رہی تھی کہ کاش اس کا شوہر وہ الفاظ واپس لے لے جنہوں نے ایک ہزار سالہ رسم کا چند لمحوں میں خاتمہ کر دیا تھا۔

لیکن جب جے سنگھ نے اپنا حکم واپس نہیں لیا تو مہارانی نے اپنی چڑی سر سے اتار کر اسے فقیروں کی جھولی کی طرح اپنے سامنے پھیلا لیا۔

”حکم! کچھ اور کہیں لیکن بھگوان کے لئے اپنا یہ حکم واپس لے لیں۔“

جے سنگھ نے چڑی اس کے ہاتھوں سے لے کر دور پھینک دی۔ ”سے اپنے حساب سے قربانی مانگتا ہے مہارانی۔ آپ کی یہی قربانی وقت کو درکار ہے جو ہر حال منفرد نہیں۔ بیوہ کی شیر دل ملکہ نے بھی اپنے پردے کو خیر باد کہہ دیا ہے اور قلعے سے متاثرین کی مدد کے لئے پوری ریاست کا دورہ کرتی پھر رہی ہے۔ جودھ پور کے بادشاہ کی بیوی بھی قلعے سے نکل آئی ہے۔ وہ مٹی سے بنے ہوئے ایک مکان میں رہتی ہے اور اپنے ہاتھوں سے قلعے زد گھن کے لئے کھانا پکا رہی ہے، ہم بھی چاہتے ہیں کہ آپ ان امدادی کیمپوں میں موجود رہیں۔ اپنے آپ سے پوچھیں، مہارانی، آپ کو اپنا پردہ عزیز ہے یا انسانی زندگیاں؟“

مہارانی نے فرش پر پڑی چڑی اٹھالی لیکن اسے دوبارہ سر پر نہیں اوڑھل۔ وہ خاموش تھی اور حیران تھی کہ آخر کپڑے کے اس چوڑے سے کٹڑے میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ اس سے جدائی اختیار کرتے ہوئے وہ اداس ہے اسے بیک وقت دو قربانیاں دینی تھیں۔ ایک پردے کی اور دوسری اس بچے کی دیکھ بھال جو اس کی کوکھ میں پرورش پا رہا تھا۔ مہارانی چند ثانیے کانپتی رہی لیکن رفتہ رفتہ اس نے خود پر قابو پا لیا اور بیرن کو بلوا بھیجا۔ بیرن اس کی قابل اعتماد ملازمہ تھی جو اس کی پوجا کا انتظام بھی کرتی تھی۔

زنان خانے کی راہداری میں سونے کی بھاری پازیب بجنے کی آواز بلند ہوئی۔ یہ بیرن کی آمد کا اشارہ تھا۔ چڑ ہی ثانیوں بعد پردہ ہٹا اور مضبوط جسم کی ایک طویل قامت عورت مہارانی کی خوابگاہ میں داخل ہوئی۔

”مہاراجہ نے ہمیں پردہ ختم کرنے کا حکم دیا ہے۔“ مہارانی نے اپنی خلومہ کو آگاہ کیا۔ ”قلعے سے ہماری غیر حاضری کے دوران تم اس بات کو یقینی بناؤ گی کہ متاثرہ خواتین کی اچھی طرح دیکھ بھال ہو رہی ہے....“

بیرن نے ایک طویل سانس لی جس پر اداسی غالب تھی۔ ”آپ ایسا نہ کریں مہارانی۔ راجپوت رانیوں کو اس سے بے حد نقصان پہنچے گا، حکم!“

”ہمارے مالک کی یہی خواہش ہے بیرن۔“ مہارانی نے پر عزم انداز میں کہا۔ ”تم جانتی ہو کہ ہم راجپوت عورتیں جان دے دیتی ہیں لیکن شوہر کے حکم سے سرتابی نہیں کرتیں.... تم کو کی بائی سے کہو کہ ہم ان سے ملنے آ رہے ہیں، جلدی!“

ہرن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن اس نے نمستے کے انداز میں ہاتھ باندھ دیے۔ ”
 آپ پر قرین، حکم!“

مہارانی اپنی قیام گاہ سے نکل تو اس کی چال میں کوئی لڑکھاٹ نہ تھی ایک راجپوت
 ملکہ بڑی شان سے مہاراجہ جے سنگھ کے دادا کی محبوب ترین داشتہ کوکی بائی کی رہائش گاہ کی
 طرف بڑھ رہی تھی۔ راستے میں محل کی کئی عورتوں نے ملکہ کا راستہ روکا۔ وہ خواجہ سراؤں
 کی شکایت کر رہی تھیں۔ مہارانی نے بڑے حوصلے سے ان کی شکایات سنیں اور انہیں
 لٹلایا۔

لیکن جب مہارانی نے اپنی آمد پر کوکی بائی کو نقری بستر کے نرم گدیلوں سے اٹھتے ہوئے
 دیکھا تو اس کے ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے کوکی بائی وہ واحد عورت تھی جس نے مہارانی
 کو ایک تیرہ سالہ دلہن کے روپ میں محل میں نہ صرف خوش آمدید کہا تھا بلکہ اجنبی زنان
 ملنے اور دربار کے آداب اور رسم و رواج سکھائے تھے۔

مہارانی اس سے پہلے بھی کئی بار کوکی بائی کی گود میں سر رکھ کر آنسو بہا چکی تھی اور
 آج پھر اس کے اشک کوکی بائی کی پوشاک بھگو رہے تھے۔

کوکی بائی نے اپنے نرم اور جھریوں بھرے ہاتھوں سے مہارانی کے لمبے بالوں کو سہلایا۔
 پریشان ہونے کی ضرورت نہیں میری بچی!“ وہ مہارانی کو دلاسہ دے رہی تھی۔ ”تمہیں
 تن کے ساتھ ساتھ خود کو بھی بدلنا ہو گا۔“

”وہ چاہتے ہیں کہ ہم پردہ ختم کر دیں۔“ مہارانی نے گلوگیر آواز میں کوکی بائی کو بتایا۔
 اگر ہم یہ حکم مانتے ہیں تو زبان خانے کے خواجہ سرا بن جائیں گے جو عورتوں میں رہ کر
 عورتوں کا تحفظ حاصل نہیں کر پاتے اور مردوں کی دنیا انہیں مرد تسلیم نہیں کرتی۔“

”ممکن ہے کہ تمہارے شوہر پر نئے شہنشاہ کے جشن تاجپوشی میں شرکت کے لئے
 جان جلنے پر زور دیا جائے اور تم جانتی ہو کہ وہ راجہ مان سنگھ پر کچھ زیادہ بھروسہ نہیں
 کرتا۔ نہ ہی اسے وزارت کی کونسل پر اعتماد ہے۔ اس لئے وہ چاہتا ہے کہ اس کی غیر موجودگی
 ماتم ریاستی امور کی دیکھ بھال کرو اور ظاہر ہے کہ یہ کام تم زنان خانے میں رہ کر نہیں کر
 سکتی۔“

”یہ آپ درست کہتی ہیں کوکی بائی!“ مہارانی نے کہا۔ ”لیکن ہمارے پیشروؤں نے اس
 بے عزتی کی بجائے موت کو گلے لگانے کو ترجیح دی ہے۔“

کوکی بائی کو جیسے جلال آ گیا۔

”کیا بچوں کی سی باتیں کرتی ہو، مہارانی۔“ وہ تیز آواز میں بولی۔ ”تمہارے شوہر کے دادا، شیر بالیر نے بالیر کی عورتوں پر اپنے شوہروں کی چتا میں جل مرنے پر پابندی عائد کر دی تھی اور تم نوجوان عورتیں آج بھی شوہر کی ارتھی کے ساتھ سستی ہو جانے والی بالیر کے ملکؤں کی داستانوں میں الجھی ہوئی ہو۔ اپنے آپ کو سنبھالو ایسا نہ ہو کہ تمہیں حاکم بالیر کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔“

اسی شام جب سورج کی ظلمت حدت کو شام کی ٹھنڈی گود میں سر چھپائے نصف گھنٹہ ہوا تھا مہاراجہ جے سنگھ، مہارانی سے ملنے آیا۔ مہارانی جب اپنے شوہر کے ساتھ زنانہ خانہ کو مردانے سے ملانے والی راہداری میں نکلی تو غیر متوقع طور پر مہاراجہ نے اس کا بازو تھم لیا۔ ورنہ وہ ہمیشہ اپنی بیوی سے فاصلے پر چلتا تھا۔

اپنے نقاب کی اوٹ سے مہارانی، صحن میں جمع کئی چہرے دیکھ رہی تھی۔ اپنے شوہر کے چچیرے بھائی راجہ مان سنگھ کا لالچی چہرہ اور وزیر اعظم کا چپٹا منہ۔ ان کے برابر وزارت کی کونسل کے دیگر اراکین کھڑے تھے۔ ان کے عقب میں دیگر امراء اور سر سے آخر میں بالیر کے سینکڑوں عام لوگ تھے۔

مہارانی دروازے میں ہی کھڑی رہ گئی اس کا ایک ایک پاؤں من من بھر کا ہو رہا تھا اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ آج اس کے چہرے سے نقاب نہیں بلکہ جسم سے لباس ہٹا دیا گیا ہے۔ وہ اب بھی خود کو اتنی باہمت نہیں پا رہی تھی کہ اپنے چہرے کو ان لوگوں کے سامنے عیاں کر دے جن میں سے کوئی بھی اس کا باپ بھائی شوہر یا بیٹا نہیں ہے۔

مہاراجہ جے سنگھ اس کے گلن کے پاس بول رہا تھا لیکن مہارانی اپنے بھیانک خیال میں الجھی کچھ بھی نہیں سن پاتی تھی۔

”مہارانی! کیا یہ لوگ مجھے بابا کہہ کر نہیں پکارتے یعنی باپ!“ وہ دوبارہ کہہ رہا تھا۔ چہرے سے پردہ ہٹاؤ اور اپنے بیٹے کے بھائیوں کو آشیر باد دو۔“

مہارانی نے کوشش کی کہ اس کی انگلیاں نقاب اٹھائیں۔ ایک لمحے کے لئے ریشمی نقاب نے اسے اور جے سنگھ کو وہاں موجود لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔ اسے یہ سوچ ہی بے حد شرم آ رہی تھی کہ اس کا چہرہ غیر مردوں کے سامنے بے نقاب ہو گا۔ اور پھر بدلیاں چاند کے سامنے سے ہٹ گئیں۔

نگاہیں سجدہ ریز ہوں، مہ رخشاں، در داستان روئے لالہ رنگ، دیدہ سیماب انگ، سک خرام، ماہ نازک اندام، ستارہ شیریں، تفسیر عروس تخت بالیر مہارانی شارداسنگھ جلوہ

ہوتی ہیں۔

مہارانی نے اپنے جسم و جان کے آقا کو مسکرا کر دیکھا اور اپنا بے نقاب چہرہ صحن کی طرف کر لیا۔

دلوں نے خاموش داد دی۔ آنکھیں جھپکنا بھول گئیں۔ بالمیر کی حور اور اب تک کی خوبصورت ترین مہارانی ان کے سامنے تھی۔

بالمیر کے لوگوں نے ادب سے گردنیں جھکا لیں۔ نگاہوں کو پابند کر دیا گیا کہ وہ گستاخی نہ کریں۔ ہاں البتہ وزارت کی کونسل کے ارکان اپنی مہارانی کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے۔ اگلے روز مہارانی نے بالمیر کا قلعہ چھوڑ دیا۔ اس نے قلعے کی دیواروں کے باہر جھلسا جھیل کے کنارے مٹی کے بنے ہوئے مکانوں میں رہائش اختیار کر لی۔ قلعہ زدگان کے خیموں اور گارے سے بنے ہوئے مکانوں کا یہ شہر آبادی کے لحاظ سے دارالحکومت سے بڑا ہو گیا تھا۔

گاؤں کے اجڑے ہوئے لوگوں کی بیٹیوں کی مدد سے مہارانی بہت جلد اپنی نئی زندگی میں مگن ہو گئی۔ اس کی زندگی کا انداز بدل گیا تھا۔ لیکن وہ نئے بچے کی آمد کے لئے ضروری انتظامات سے لے کر قلعہ سے مرجانے والے لوگوں کے کریا کرم تک، میں سورج طلوع ہونے سے پہلے اپنی پوجا کو نہیں بھولی تھی۔ وہ روزانہ تین گھنٹے تک اپنے کچے مکان کے ایک کونے میں بیٹھ کر دیوی دیوتاؤں کی پرارتھنا کرتی اور اس عہد کا اعادہ کرتی کہ بارشیں شروع ہوتے ہی وہ پردے میں لوٹ جائے گی۔

موسم بہار شروع ہو چکا تھا۔

اچھے وقتوں میں کسان ان دنوں پیلے رنگ کے کپڑے پہن کر بیساکھی مناتے اور فصل کاٹتے تھے لیکن اس بار پیلے کپڑے تھے اور نہ بیساکھی کا تہوار، بلکہ قلعہ کا پانچواں سال شروع ہو گیا تھا۔

مہاراجہ نے مہارانی کو قلعہ بالمیر بلا بھیجا۔

اونٹ کے اوپر آرام دہ ہودج میں بیٹھی ہوئی مہارانی اپنی دھن میں مہارانیوں کے مندر کی جزیات یاد کرنے میں مصروف تھی۔ اسے محل اور مندر سے دور رہتے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ اونٹ جب محل کے سامنے اپنے اگلے گھٹنوں پر بیٹھا تو وہ چونک گئی۔ اسے محل کے زنان خانے کی دیواروں کے عقب سے کئی آنکھیں جھانکتی ہوئی دکھائی دیں۔ جانے کیوں ملکہ کے جسم میں خوف کی ایک لہر سرایت کر گئی۔

مہاراجہ جے سنگھ کے بازوؤں نے اسے ہودج سے اٹھایا۔ ”جائیں مہارانی، آپ کی خدامیں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ آج رات ہم ایک ساتھ جھروکے میں عشاءِیہ تناول کریں گے۔“

مہارانی حرم میں داخل ہو گئی۔ زنان خانے کی بلند دبالا چھتیں اور قدموں کے نیچے ٹھنڈا سنگ مرمر محسوس کر کے اسے بے انتہا خوشی ہوئی تھی۔ مہارانی نے یہ بات بطور خاص محسوس کی تھی کہ خدامیں دور دور سے اسے جھک کر سلام کر رہی تھیں۔ ان کی پشت سنگی دیواروں میں پیوست تھی۔

مہارانی کی رہائش گاہ کے باہر چار خواجہ سرا پہرے پر تھے۔ ان کے ساتھ بیرن اور کچھ پجاری تھے۔ مہارانی نے عجیب سی نگاہوں سے استقبال کے اس اجنبی انداز کو دیکھا، یا ممکن ہے خود اسے ہی واپسی کے طور طریقے یاد نہ رہے ہوں۔ وہ آگے بڑھی تو خواجہ سرا اس کے سامنے سے دور ہٹ گئے۔ جو سنگ مرمر کے فرش پر پڑ رہا تھا مہارانی نے اپنی خواب گاہ کے دروازے پر ایک بھاری آہنی قفل دیکھا تو اس کی سوالیہ نگاہیں بیرن کی طرف اٹھ گئیں۔

بیرن نے ہاتھ باندھ دیئے۔ ”آپ پر قربان، حکم! آپ چونکہ جمعداروں اور اچھوتوں کے ساتھ رہتی رہی ہیں اس لئے پجاریوں کے خیال میں آپ ٹپاک ہو گئی ہیں۔“

مہارانی نے بے یقینی سے بیرن کو دیکھا۔ ”تم نہیں جانتیں کہ حکمران ذات پات سے آزاد ہوتے ہیں ہم بالمر کے ہر فرد کی ماں اور باپ کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہم ہر گھر میں داخل ہو سکتے ہیں اور ہر دسترخوان پر کھا سکتے ہیں۔ مہاراجہ کو دیوی دیوتا خود ہتسمہ دیتے ہیں، وہ ٹپاک نہیں ہو سکتے حکم!“

”لیکن آپ تو صرف ان کی دھرم پتی ہیں۔ پجاریوں کا کہنا ہے کہ آپ اپنے بدن پر ٹپاکی لے کر آئی ہیں۔“

”پجاری یہ بھی جانتے ہوں گے کہ دھرم کے اعتبار سے ہم اپنے شوہر کا نصف بہتر ہیں۔ لہذا ہم پر ٹپاکی کے اس جواز کا نفاذ نہیں ہوتا۔“ مہارانی نے دلیل دی۔

بڑا پجاری اپنا موٹا پیٹ ہلاتا آگے بڑھا۔ اس نے اپنے جسم پر محض ایک ریٹھی دھوتی باندھ رکھی تھی۔

”یہ ہمارے پر م پر ا کا سوال ہے حکم!“ اس نے سر جھکا کر نہایت ادب سے کہا۔ ”ہماری گیارہ سو سالہ تاریخ میں آج تک کسی مہارانی نے پردہ نہیں توڑا۔ ہم صرف آپ کو مذہبی غسل دینا چاہتے ہیں کہ آپ زنان خانے میں کوئی ٹپاکی یا نجاست نہ لے جائیں۔“

ہمارانی غصے سے پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔ وہ اپنی بے حد تک محسوس کر رہی تھی۔ بیرن نے پھر ہاتھ باندھ دیئے۔ ”آپ پر قربان، حکم! لیکن میں آپ سے بنتی کرتی ہوں کہ ہتسمہ کے بغیر زنان خانے میں داخل نہ ہوں ورنہ پجاری ہم سب کو نپاک قرار دے دیں گے۔“

سنگی راہداریاں اچانک ہی سونے کے بھاری زیورات کی کھنک سے گونج اٹھیں۔ کوکی بائی تیزی سے ہمارانی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ خداماؤں نے فوراً دیواروں سے لگ کر اسے ہلاتے دیا تھا۔ اس کا منہ غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ کوکی بائی آتے ہی پجاریوں پر چڑھ دوڑی۔ خواجہ سرا اور خدامائیں مسکرائے بغیر نہ رہ سکی تھیں۔

”پورا بالمیر قلعہ سے متاثر ہے“ کوکی بائی نے کہنا شروع کیا۔ ”اگر یہ پجاری اتنے موٹے نہ ہوتے تو ہم کہہ سکتے تھے کہ یہ بالمیر کے لوگوں کی ہمدردی میں برت رکھ رہے ہیں، لیکن یہ تو بکاؤ مال ہیں۔ انہوں نے اپنی آتما وزیروں کے پاس رہن رکھ دی ہے۔ دولت کے لئے یہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ یہ اسی دولت کی ریل پیل ہے کہ آج یہ لوگ زنان خانے کے معصوم اور بے ضرر بایسوں کو نپاک اور نجاست کی کہانی سنانے آئے ہیں۔“

بوڑھی کوکی بائی نے بیرن سے چابیاں لیں اور قفل کھول ڈالا ”اندر چلو“ اس نے ہمارانی کو اشارہ کیا اور وہ کسی فرمانبردار بیٹی کی طرح سر جھکا کر اپنی خواب گاہ میں داخل ہو گئی۔

پجاری واپس چلے گئے لیکن خدامائیں اور خواجہ سرا اس وقت تک خواب گاہ کے دروازے سے نہیں ہلے تھے جب تک کہ ہمارانی غسل کر کے شاہی جھروکے میں جانے کے لئے تیار ہو کر حرم میں نہیں نکل آئی۔

شاہی جھروکا دراصل ایک بلند و بالا مینار پر بنی ہوئی وہ سنہری بالکونی تھی جس سے بالمیر کے حکمران نہ صرف ارد گرد کے دیہات کا نظارہ کرتے تھے بلکہ ضرورت پڑنے پر دشمن کی نقل و حرکت پر بھی نگاہ رکھتے تھے۔

محل کے محافظوں نے اپنی دندگی میں پہلی بار شاہی جھروکے میں ہمارانی کے داخلے پر اسے فوجی سلام پیش کیا تھا۔ جے سنگھ پہلے بے جھروکے میں موجود تھا۔ وہ قیمتی پتھر سے تراشے ہوئے ایک بچ پر بیٹھا تھا۔ اس کے عقب میں شرکی روشنیاں آسمان کے ستاروں میں گنڈھ ہو رہی تھیں۔

کئی ماہ علیحدہ رہنے کے بعد مہارانی نے اپنے شوہر کو بتایا کہ وہ ایک اور بچے کی ماں بننے والی ہے۔

مہاراجہ کے بازوؤں کی گرفت مہارانی کی کمر پر سخت ہو گئی۔ اس نے اپنی بیوی کے دودھیا رخساروں کو کئی بار فرط مسرت سے چوم لیا تھا۔

”لیکن ہم پیدائش کے وقت یہاں موجود نہ ہوں گے مہارانی۔“ مہاراجہ نے آہستگی سے اپنی بیوی کو آگاہ کیا۔ ”وائسرائے نے ہمیں لندن میں نئے بادشاہ کے جشن تاجپوشی میں شرکت کی اجازت دے دی ہے۔“

”آپ نے سفر کے لئے وائسرائے سے اجازت کیوں لی؟“

مہارانی نے اپنی شرنگیں پلکیں اٹھائیں۔

”یہ ہمارے علاقوں پر عائد کی جانے والی نئی پابندیاں ہیں۔“ مہاراجہ نے اپنی پتی کو سمجھایا، ”نیا وائسرائے کرزن برا آدمی نہیں لیکن وہ اصولوں کا بے حد سخت ہے اس نے برطانوی ہند پر سے بہت سے ٹیکس اٹھائے ہیں۔ اس نے برطانوی پارلیمنٹ سے بھی کہا ہے کہ وہ نمک پر سے شاہی ٹیکس اٹھالے۔۔۔۔ تاکہ لوگوں کو کچھ رعایت ملے۔ ہر نئی تاج پوشی پر ایسی رعایتیں دی جاتی ہیں، لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ نے یہ رعایتیں دینے سے انکار کر دیا ہے۔“

”اگر وہ اچھا آدمی ہے تو ہماری روایات اور رسوم میں کیوں مداخلت کر رہا ہے؟“

مہاراجہ نے ایک طویل سانس لی۔ ”اس لئے کہ کرزن یہ سمجھتا ہے کہ اسے ہمارا باپ بنا کر ہندوستان بھیجا گیا ہے۔ پہلے انگریز یہ سمجھتے تھے کہ مہاراجہ اور راجہ بہت محدود ہو گئے ہیں۔ اس لئے انہوں نے ہمارے سمندر پار سفر کی حوصلہ افزائی کی لیکن اب ان کا خیال ہے کہ ہم نے انگریزوں کو ورغلانے میں خاصا وقت صرف کیا ہے۔ اس لئے ہمیں اپنے گھر میں ہی رہنا چاہئے۔۔۔۔“

”کیا آپ کا جشن تاجپوشی میں جانا بے حد ضروری ہے؟“ مہارانی نے اپنے شوہر کا جملہ کاٹا شاید وہ چاہتی تھی کہ اتنے ماہ ایک دوسرے سے الگ رہنے کے بعد اب مہاراجہ دوبارہ اسے چھوڑ کر نہ جائے۔

مہاراجہ بھی شاید اپنی پتی کی بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر مہارانی کے نرم و نازک گل تھپتھپائے۔

”ہمیں آپ کی تمنا کا احساس ہے، پرینما! مہاراجہ نے کہا۔ ”لیکن جس مقصد“

کے لئے ہم جارہے ہیں وہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے تاجپوشی میں شرکت تو محض بہانہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ انگریزوں کو شک میں مبتلا کئے بغیر زار روس سے فنڈز کی فراہمی کے لئے بات کریں کیونکہ خزانہ تقریباً خالی ہے۔ ہمیں کیس نہ کیس سے فنڈز حاصل کرنے ہیں اور یورپ میں زار ہمارا واحد دوست ہے۔“

خوف کا ایک سایہ مہارانی کے گورے رنگ کو زردی مائل کرتا چلا گیا۔ ”آپ ایسا نہیں کر سکتے، حکم!“ مہاراجہ کی سوالیہ نگاہیں انھیں تو مہارانی نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”اگر انگریزوں کو پتا چل گیا کہ آپ نے بادشاہت کے ساتھ کیا جانے والا معاہدہ توڑا ہے اور ایک غیر ملکی طاقت خصوصاً روس سے آزادانہ طور پر معاملات طے کئے ہیں تو۔“

مہاراجہ نے اپنی پتی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا لیکن مہارانی اس کے باوجود بولتی رہی۔
 ”..... برطانوی آپ کو بالمر سے جلا وطن کر دیں گے۔ وہ آپ کے تخت پر قابض ہو جائیں گے۔ وہ نکا کو آپ کا ولی عہد ماننے سے انکار کر دیں گے یا اسے ایک حکمران کے لئے مخصوص اختیارات نہیں دیں گے۔ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“ مہارانی چپ ہو گئی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ انگریز کسی مہاراجہ کو بے دخل کرنے کے علاوہ کسی بھی ہندوستانی ریاست کو برطانوی بادشاہت کے سرخ سمندر میں غرق کر سکتے ہیں لیکن اسے اتنے ظالمانہ الفاظ بولنے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔

مہاراجہ نے مہارانی کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے کٹورے میں تھام لیا۔ وہ اسے سیاسی داؤ بیچ اور اتار چڑھاؤ سمجھا رہا تھا۔ اس نے کوشش کی تھی، قائل ہونا یا نہ ہونا بہر حال مہارانی کے اپنے اختیار میں تھا۔

”اگر اس بار بھی بارش نہ ہوئی تو ہم بالمر میں ریلوے لائن تعمیر کریں گے اور غیر ملکی کمپنیوں کو یہاں فیکٹریاں لگانے کی اجازت دے دیں گے۔ ہمیں ہر حال میں کسانوں کو قرضے فراہم کرنے ہوں گے تاکہ وہ انگریز کمپنیوں کو برائے نام قیمتوں پر اپنی زمینیں فروخت نہ کریں۔ ان سب کے لئے رقم کی ضرورت ہے۔ جب زار نے ہمارے ساتھ زاروچ میں قیام کیا تھا تو اس نے بالمر نورتن کو بے حد سراہا تھا۔ ہم نے یہ اسے فروخت کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ اس سودے کو انگریزوں پر آشکار نہیں کرے گا۔“

”بالمر نورتن تو انمول ہے۔“ مہارانی نے اپنے پتی دیو کو یاد دلایا۔ ”آپ برطانوی بادشاہت سے اس کے فروخت کے لئے بات کیوں نہیں کرتے کم از کم برطانویوں کو اس طرح یہ یقین تو رہے گا کہ نیکلس محفوظ ہے۔“

”راج پہلے ہی ہمیں برطانیہ دشمن کہتا ہے۔“
 مہاراجہ نے مہارانی کو بتایا۔ ”اگر ہم برطانوی راج پر اعتماد کر کے سودا کرتے ہیں اور نورتن گم ہو جاتا ہے تو ہماری شنوائی کہاں ہوگی؟“
 مہارانی نے اپنے شوہر کو دیکھا ”یہ ناممکن ہے، حکم!“
 جے سنگھ نے قہقہہ لگایا۔ ”ممکن ہے اور بڑی آسانی سے ممکن ہے۔ کیا کوہ نور ایک ایسے بچے سے نہیں چرایا گیا تھا جو برطانیہ کی حفاظت میں تھا پھر یہی انمول ہیرا سرعام و کنوریہ کو تنھے میں دے دیا گیا؟ انگریزی دربار سے منسلک افسران کی بیویوں کی گردنیں ہندوستانی زر و جواہر سے کیوں اور کیسے جگمگا رہی ہیں؟ ملکہ و کنوریہ کی گردن بھی ان میں سے ایک تھی۔“

انتہائی خفیہ انداز میں مہارانی شاروا، مہاراجہ کی لندن روانگی کے انتظامات میں اس کی مدد کر رہی تھی۔ اس کے باوجود کہ خزانہ کلی طور پر مہاراجہ کے اختیار میں تھا۔ اس کی پائی پائی کے اخراجات کا باقاعدہ حساب رکھا جاتا تھا۔ جس فائل میں بالمیر نورتن کی موجودگی ظاہر کی گئی تھی اس فائل کو نہایت ہوشیاری سے ہٹا کر اس میں ترمیم کر دی گئی۔
 مہارانی نے اس سلسلے میں کئی راتیں جاگ کر گزاریں وہ اپنے شوہر کے ہمراہ شاہی جھروکے میں بیٹھ جاتی اور اپنی تحریر میں فائل کے مندرجات از سر نو لکھتی۔ ان مندرجات کو ہٹا دیا جاتا جن میں نورتن کا ذکر تھا۔

جے سنگھ کی روانگی سے ایک دن پہلے وہ ہندوستان کے نو قیمتی اور نایاب ترین پتھروں اور زر و جواہر سے آراستہ نیکلس مہارانی کی خواب گاہ میں لے کر آیا۔ سفار، یاقوت، ہیرے زمرد اور دوسرے پتھروں کی چمک سے مہارانی کی خواب گاہ جگمگا اٹھی۔ مہارانی دیر تک پر اشتیاق نگاہوں سے ان قیمتی زر و جواہر کو دیکھتی رہی جنہیں جمع کرنے میں صدیاں بیت گئی تھیں۔ ان میں سے ہر پتھر کئی قیراط وزن کا تھا اور ان کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔

جڑاؤ ہار کو زر و نشت کے کپڑے میں لپیٹ دیا گیا تھا۔ مہارانی نے ایک کمر بند کے ذریعے ہار مہاراجہ کی کمر سے باندھ دیا تھا تاکہ پیرس تک کے طویل سفر میں یہ بالکل مامون و محفوظ رہے اور آخر کار زار روس تک جا پہنچے۔

قسط اور خشک سالی کے پانچویں سال کے آخر میں، جب بادل آتے تھے لیکن بر سے بغیر گزر جاتے تھے، مہارانی نے ایک بیٹی کو جنم دیا۔ اس بار اندرونی قلعے کے دروازے پر بھاٹوں

کا کوئی ٹولہ موجود تھا۔ نہ کسی قسم کی کوئی خوش منائی گئی۔ لیکن دنیا میں آنے والی نے لوگوں کو تباہی و بربادی کی داستانوں سے ہٹ کر ایک نیا موضوع ضرور دے دیا تھا۔ عوام نے باقاعدہ شکر ادا کیا تھا کہ اس بار لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ بیٹے کی صورت میں ریاست کسی جشن کی متحمل نہ تھی۔ یوں بھی اب وقت ویسا نہیں تھا جیسا نکا کی پیدائش کے وقت تھا۔

مہاراجہ برطانوی شہنشاہ کے جشن تاجپوشی میں شرکت کے لئے دوبارہ انگلینڈ میں تھا لیکن اس بار انگلینڈ کے تخت پر کوئی بوڑھی بیوہ نہیں ایک مرد بیٹھا تھا۔ کون جانتا تھا کہ تخت کے مالک کی طرح ہندوستان کی قسمت بھی بدل جاتی۔

انگلینڈ سے واپسی پر مہاراجہ کے حوصلے کچھ اور بلند ہو گئے تھے۔ جب وہ دارالحکومت کی شاہراہوں پر گشت کے لئے نکلا تو لوگوں نے اس کے چہرے کی تازگی کو بطور خاص محسوس کیا۔ مہاراجہ نے نئے بچے کی پیدائش پر مبارکباد کے طور پر عوام سے پھولوں کے ہار بھی قبول کئے تھے۔

بچی کی پیدائش کے بعد بسترِ علالت پر لیٹی مہارانی نے بھی اپنی خواب گاہ میں آمد پر مہاراجہ میں ایک نمایاں تبدیلی محسوس کی تھی۔

نکا مور کے ایک پر سے نومولود کے پاؤں پر گدگدی کر رہا تھا۔ بچی نے صدائے احتجاج بلند کی تو بے سنگھ قہقہہ لگا کر اس کے جھولے پر جھک گیا۔

”یہ رونے والی بچی کی چیخ نہیں، جنگ کا نفاذ ہے۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا تھا۔ ”اگر ناموں سے کوئی فرق پڑتا ہے تو ہم اس کا نام جیہ رکھیں گے، یعنی فتح!“

مہارانی اپنے شوہر کے زندہ لہجے پر مسکرا دی۔ وہ بن کے سمجھ گئی تھی کہ روسیوں کے ساتھ اس کے شوہر کی بات چیت کامیاب رہی ہے۔

جیہ نے تین سال کی عمر سے پہلے بارش نہیں دیکھی تھی، البتہ اس نے خادماؤں سے اس بارے میں سنا ضرور تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے لوگ موت کے بارے میں سنتے ہیں۔

سات طویل سالوں تک آسمان چیتل کی بہت بڑی تھالی کی طرح صرف تپش برساتا رہا تھا لیکن اب اس نے موت کے بجائے زندگی برسانی شروع کی تھی۔

مہاراجہ اس عرصے میں دوبار اپنے ہاتھیوں اور کیولری کے ہمراہ دہلی گیا تھا تا کہ ہندوستان کو برطانوی بادشاہت کی یاد دلانے کے لئے منعقد کئے جانے والے وائسرائے کے دربار میں شرکت کر سکے۔ ہر بار وہ دیوالیہ ہو جانے والے خزانے کا رونا روتا اور ہر بار

مہارانی اسے ایک نئی ہمت دیتی اور ہمدردی کا اظہار کرتی۔

اور جس شب بارش ہوئی وہ بالیر کے لوگوں کے لئے گویا دیوالی کی رات تھی۔ انہوں نے ایک عرصے بعد موسموں کی گلی بندھی تبدیلی کا مزا چکھا تھا۔ قلعہ بالیر کے اندرونی دروازے کھول دیئے گئے۔ میلہ موسیقی شروع ہو گیا۔ پورا بالیر خوشیوں سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ فضا میں آتش بازی سے رنگیں ہو رہی تھیں۔ بھیگا ہوا بالیر شادمانیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ لوگ باگ جھلسا جھیل کے کنارے ایک بہت بڑے میدان میں جمع ہو کر اپنی خوشیوں کا اظہار کر رہے تھے۔ یہ وہ میدان تھا جہاں بالیر کے مہاراجہ کسی جنگ پر روانہ ہونے سے قبل اپنی فوجوں کا معائنہ کیا کرتے تھے اور مہارانیوں اپنے شوہروں کے جنگ سے واپس نہ آنے کی صورت میں جل مرا کرتی تھیں۔

محل کے سامنے وسیع و عریض برآمدے میں نرم گدیوں سے خصوصی تخت تیار کیا گیا تھا۔ جس پر بالیر کا مہاراجہ بچے سنگھ براجمان تھا۔ اس کی تلوار سات سالہ بیٹے نکا کی رانوں کو چھو رہی تھی۔

سرا تخت نسبتاً بلندی پر تھا۔ اس کے عقب میں مہین پردے پڑے ہوئے تھے۔ پردوں کے پیچھے زنان خانے اور مہاراجہ کے حرم کی عورتیں بیٹھی تھیں۔ مہارانی شاردا اور راجکمار جیہ پردوں سے ہٹ کر تخت پر بیٹھی تھیں۔ ان کے چہرے بے نقاب تھے۔ بالیر کا راگ گورو استاد ذرا فاصلے پر ایک اونچے پلیٹ فارم پر بیٹھا موسیقی کے آلات سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ موسیقی کی محفل ذرا ہی دیر بعد شروع ہونے والی تھی۔

بوڑھا استاد ذرا سا آگے جھکا تو گنگو تھم گئی۔ برآمدے میں موجود امرا اور دیگر معززین استاد کی طرف متوجہ ہو گئے۔ رات کی خاموشی میں بوڑھے استاد نے آگ کی دھن چھیڑ دی۔ دپک راگ فضا میں بکھرا تو یوں لگا جیسے وہاں موجود ہر شے نے آگ پکڑ لی ہو۔

دپک راگ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب موسیقار اعظم تان سین، اکبر اعظم کے دربار میں دپک راگ گایا کرتا تھا تو ہوا میں ہزار شمعوں کے شعلے کے برابر شعلہ پیدا ہو جاتا تھا اور درختوں کے پتے جل کر گر جایا کرتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تان سین کے وطن سے آگ نکلا کرتی تھی اور اس کی بیٹی برسات کی دھن یعنی راگ ملہار نہ گائی تو تان سین خود ہی جل کر بھسم ہو جاتا۔

استاد گاتا رہا اور محفل جھومتی رہی۔ اس کی آواز میں کچھ ایسا سم تھا کہ جو جہاں تھا وہیں ساکت تھا۔ لوگ راگ کی تپش میں اس تپش کو بھول گئے تھے جو سات سال کی خشک

ملا سے پیدا ہو گئی تھی۔

جیہ کچھ دیر دلچسپی سے راگ سنتی رہی، پھر اس نے کسما کر اپنے رخساروں کو کھجانا شروع کر دیا۔ گرم ہوا اسے پریشان کر رہی تھی۔ وہ اپنے آپ میں اس قدر الجھی ہوئی تھی کہ اسے احساس ہی نہ ہوا تھا کہ اس کے برابر بیٹھی مہارانی نے بھی گانا شروع کر دیا ہے۔ راگ میں تیزی آئی تو جیہ کو احساس ہوا کہ یہ سب اس نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ رات کی جھڑی۔ مور کا رقص۔ ہواؤں میں درختوں کا ناچنا اور کوئل کی کوک، سب کچھ اس کے لئے نیا تھا۔ راگ ختم ہوا تو سب لوگوں کے حلق سے نعرہ ہائے تحسین بلند ہونے لگے۔

استاد نے جھک کر لوگوں کے نعروں کا جواب دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ چند ثانیے وہ بائنی بیٹھا رہا اور پھر اس کی انگلیاں دوبارہ تاروں سے کھیلنے لگیں۔ ایک اور مدھر دھن اداؤں میں بکھرنے لگی۔

محل میں موجود ہر شے گویا محو رقص ہو گئی تھی۔ لم از کم جیہ کو یہی محسوس ہو رہا تھا۔ راگ ملہار نے فضاؤں میں ٹھنڈ بھیر دی تھی۔

اور پھر اچانک ہی مہارانی نے سونے کے کام والی چڑی اپنے سر پر اوڑھ لی۔ بارش کا ایک قطرہ جیہ کے سر پر بھی گرا تھا۔ جیہ نے کوئی خیال نہ کیا اور نہ ہی وہ سمجھ سکی کہ اس کی ماں کا چاند سا چہرہ نقاب کی اوٹ میں کیوں چلا گیا ہے۔

مہارانی نے جیہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے اٹھا کر پردے کے پیچھے لے گئی۔ جیہ کی آنکھوں میں حیرت کے سائے اتر آئے۔ اس کے ننھے اور معصوم ذہن کے لئے یہ سب کچھ نیا تھا لیونکہ اس سے پہلے اس نے ایسی کوئی بات نہیں دیکھی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ خشک مالی اور قحط کا خاتمہ ہو گیا ہے اور مہارانی دوبارہ پردے میں چلی گئی ہے۔

جیہ کی پیدائش کے بعد سے ہی مہارانی کی کوشش رہی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کی پرورش اپنے پیشروں کے انداز میں کرے تاکہ جیہ زمانے کے سرد گرم سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت حاصل کر لے اور زنان خانے سے باہر کی دنیا کو اپنے لئے اجنبی نہ سمجھے۔

سورج طلوع ہونے سے پہلے خدامیں جیہ کو جگاتیں اور غسل کے بعد اسے زنان خانے کے صحن کے پتھوں بچ واقع مہارانیوں کے مندر میں لے جاتیں۔ جب مہارانی دیوتاؤں کی شنودی کے لئے بھجن گاتی تو جیہ بتوں کے سامنے بیٹھ کر جھروکے میں سے تاریکی کو سفیدی میں مدغم ہوتے دیکھتی رہتی۔ جب روشنی کا شیر اندھیرے کو نگل لیتا تو جھلسا جھیل کی جانب

سے پرندوں کے چھمانے کی آوازیں سنائی دینے لگتیں اور مہارانی کی آواز خود بخود مدہم پڑنے لگتی۔

بعض اوقات مہارانی اپنی بیٹی کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنے ساتھ بھجن گانے کو کہتی۔ وہ اسے بالمیر کی سابق ملکاؤں، پشپوتی، سیتا دیوی اور آشادیوی کے پسندیدہ بھجن کے بارے میں بھی بتاتی۔

بالمیر کی یہ وہ ملکائیں تھیں جنہوں نے اپنے شوہروں کی لاشوں کے ساتھ ستی ہونے کی رسم نبھائی تھی۔ جیہ ہر روز ان ملکائوں کو یاد کرتی اور انتہائی احترام سے ان کا نام لیتی۔ اب جیہ کو پتا تھا کہ ان ملکائوں نے کیسے اپنے سہاگ کے کپڑے اتار کر اپنے ہاتھ سرخ پاؤڈر میں ڈبو کر قلعے کی دیوار پر ثبت کئے اور بہادری سے موت کو گلے لگا لیا۔

جیہ کا ننھا مانا ذہن الجھ جاتا اکثر وہ سوچتی کہ ملکائیں ستی کیوں ہوئیں۔ شاہی خاندان کے لئے اتنی پابندیاں کیوں ہیں؟ جب تک صحرائی علاقوں میں بارش نہیں ہو جاتی شاہی خاندان کی عورتوں پر مچھلی کھانے کی پابندی کیوں ہے؟ جانوروں کے تولیدی موسم میں شاہی عورتیں کسی قسم کا گوشت کیوں نہیں کھاتیں؟ جب تک غیر ملکی سود خور اور مہاجن ہندوستان چھوڑ نہیں دیتے گانے اور بولنے والا کوئی پرندہ پنجرے میں قید کیوں نہیں کیا جاسکتا؟

ان رسوم اور روایتوں کی تعلیم کے بعد جیہ ناشتہ کرتی اور گھڑ سواری کے کپڑے پہن کر اپنے والد کے ساتھ قلعے سے باہر گھڑ سواری کے لئے چلی جاتی۔

نکا بھی ایک بہترین شہسوار تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے گھوڑے کو تیز دوڑاتا لیکن بے سنگھ اسے ہدایت کرتا کہ اپنی بہن کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ چلو۔ دونوں بہن بھائی ہاؤس ہولڈ کیولری کے افسران اور مہاراجہ کے اے ڈی سی میجر دیر سنگھ کے ہمراہ جھیل کے کنارے دور دور تک گھڑ سواری کا لطف اٹھاتے۔

راستے میں کئی مقامات آتے جن میں جیہ بے حد دلچسپی لیتی۔ وہ ساتھیوں سے بہت سے سوالات کرتی اور تقاضہ کرتی کہ ایسے جوابات دیئے جائیں جن سے وہ مطمئن بھی ہو۔

واپس آ کر نکا، مہاراجہ بے سنگھ کے ساتھ جھیل جھیل کے کنارے نئے دفاتر معتمدی میں چلا جاتا کہ اپنے والد سے انتظامی امور سیکھ سکے۔ مینے میں ایک بار وہ مہاراجہ کے ساتھ ریاست کے مختلف علاقوں کے دورے چر جاتا جہاں مہاراجہ ماہانہ دربار منعقد کرتا اور متعلقہ علاقوں اور اضلاع کے ضروری امور نمٹاتا۔

لیکن جیہ چونکہ لڑکی تھی اس لئے اس کے تمام معمولات کو قلعے سے منسلک کر دیا گیا

تھا۔

مہاراجہ اس بات پر ہند تھا کہ اس کی بیٹی پردے میں نہیں بیٹھے گی لیکن مہارانی کی خواہش تھی کہ جیہ کی پرورش اسی انداز میں کی جائے جس انداز میں صدیوں سے بالمیر کی شہزادیوں کی پرورش ہوتی آئی ہے۔

سب سے پہلے موسیقی کا سبق تھا۔ بوڑھا استاد جیہ کو راگ رنگ کی تربیت دے رہا تھا جس کی سماعت اور غصہ عمر کے ساتھ ساتھ بڑھ رہا تھا۔ جیہ اکثر اپنے اندھے استاد کو چمکے دے کر قلعے کے اوپر اڑنے والی پتنگوں کا نظارہ کرتی رہتی لیکن استاد کو جانے کیسے جیہ کی اس حرکت کا پتہ چل جاتا اور سزا کے طور پر جیہ کو شروع سے سارے گاما کی گردان سنائی پڑتی۔ راگ رنگ کے بعد بین اسے ساتھ لے جا کر برآمدے کے ٹھنڈے فرش پر بٹھا دیتی۔ یہ وقت رنگوں کا تھا۔ جیہ کو مختلف رنگوں، موسموں، سبزیوں اور پھلوں کے رنگ ان کے موسم اور ذائقے کی پہچان کروائی جاتی تھی۔

ہفتے میں ایک بار دوسری لڑکیوں کے ہمراہ جیہ کو محل کے گودام میں لے جایا جاتا تھا جہاں مہارانی خداموں سے محل کی ضروریات کے مطابق غلہ اور کھانے پینے کی دوسری اشیائی تلوایا کرتی تھی۔

لیکن جیہ کے دن بھر میں سے دو مصروفیت ایسی تھیں جنہیں دنیا کی کوئی طاقت تبدیل نہیں کروا سکتی تھی۔ وہ اپنی سہ پہر ہر حال میں کوکی بائی کے کمرے میں اور شام میجر دیر سنگھ کے ساتھ گزارتی تھی۔

میجر ہر شام جیہ اور نکا کو پولو گراؤنڈ میں نشانہ بازی کی مشق کروایا کرتا تھا۔ جیہ کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ ٹھیک ٹھیک نشانہ لگائے۔ نشانہ بازی کا باقاعدہ مقابلہ ہوتا تھا جس میں اکثر نکا جیت جاتا لیکن کبھی کبھی وہ چھوٹی بہن کا جی رکھنے کے لئے جان بوجھ کر ہار جاتا۔ ایسے میں جیہ شکایت بھری نگاہوں سے اسے دیکھتی تو وہ ہنسنے لگا لیتا۔

نشانہ بازی کے ہر مقابلے کے بعد میجر دیر سنگھ دونوں کی تعریف کرتا اور پھر وہ لوگ پولو گراؤنڈ میں موجود ایسے گھوڑوں کی طرف بڑھ جاتے جن پر زین نہیں ہوتی تھی۔ یہ گھڑ سواری بھی ایک امتحان ہوتا تھا۔

جیہ کو گھوڑے کی تنگی پیٹھ پر سواری کرنی پڑتی تھی۔ اس سواری کے دوران گھوڑے کو بعض چھوٹے ندی نالے اور دیگر رکاوٹیں بھی پھلانگی ہوتی تھیں۔ میجر اسے گھوڑے پر سوار کروا کر باگ اسے تھما دیتا۔ جیہ کو میجر سے دو سکے ملتے جو اسے اپنے گھنٹوں اور گھوڑے کے

جسم کے درمیان دبائے ہوتے تھے۔ اسے یہ کوشش کرنا ہوتی تھی کہ چھلانگ لگانے یا گھوڑے کو ٹھوکر لگنے کے باوجود سکے گرنے نہ پائیں۔ وہ اپنی پوی کوشش کرتی تھی کہ اس امتحان میں کامیاب رہے۔ نکا اپنی بہن کو میجر کی سزا سے بچانے کے لئے اکثر اس کی جیبوں میں دو سکے مزید ڈال دیتا تھا تاکہ میجر کے سکے گر جانے کی صورت میں جیب جیب سے دوسرے سکے نکال کر رکھ لے لیکن اس کی ضرورت کبھی کبھی پڑتی تھی۔

ایک بار جیب بری طرح گھوڑے سے گر گئی۔ بہت سے بچے راجبکار اور راجبکاری کی گھڑ سواری دیکھنے کے لئے گراؤنڈ میں جمع ہو جاتے تھے۔ انہوں نے شور کیا تو گھوڑا بدک گیا دار جیب گھوڑے سے نیچے جا گری۔ وہ فوراً ہی ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔

جب جیب کو ہوش آیا تو وہ میجر کے بازوؤں میں تھی۔ اس نے میجر کی بھوری مونچھوں کو دیکھ کر سرگوشی کی ”میں نے سکے نہیں گرنے دیئے!“

نکا نے بڑھ کر اپنی بہن کا ہاتھ چوم لیا۔ وہ فخر محسوس کر رہا تھا کہ اس کی بہن چوٹ لگنے کے باوجود روئی نہیں تھی۔

ہر سال بارشوں کے بعد رنگ ساز، قلعے کی دیواروں پر رنگ کرنے اور تصاویر بنانے کے لئے قلعے میں آتے تو جیب اور نکا کو ایک اور تفریح مل جاتی۔ وہ دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر شور کرتے اور ایک دوسرے پر رنگ اچھالتے۔

ایسے میں رنگ سازوں کی حالت دیدنی ہوتی تھی۔ وہ بانس کی بنی ہوئی لمبی سیڑھیوں کے آخری سرے پر کھڑے ہو کر چلاتے اور بچوں کو ایسا کرنے سے منع کرتے۔

”تم لوگوں کو تو تصویریں بنانی بھی نہیں آتیں۔“ بچے بھی جواباً ”چیتھے“ تم لوگوں کو تو یہ بھی نہیں پتا کہ چھکڑے کی تصویر کیسے بنتی ہے۔ اس کے پسے تمہارے بنائے ہوئے پیسوں سے زیادہ بڑے ہوتے ہیں۔“

رنگ ساز پھر چیتھے ”جھگوان جانے“ تم لوگ کس دنیا میں رہتے ہو۔ تم لوگوں کو چھکڑے اور ریل گاڑی میں فرق کا بھی پتا نہیں۔“

بچے تجسس کے مارے رک جاتے اور ایک جگہ بیٹھ کر حیرت سے ایک نئی دنیا کو تصویروں کی صورت قلعے کی دیواروں پر اترتے دیکھتے رہتے۔

رنگوں کی اس دنیا کو دیکھتے دیکھتے جیب کو احساس ہوا کہ اس کے والد کی بادشاہت میں بہت سی تبدیلیاں آتی جا رہی ہیں۔ جب اس نے کسی انگریز کو نہیں دیکھا تھا کہ وہ کیسا ہوتا ہے لیکن اسے یہ علم ضرور تھا کہ انگریز لوگ جھلسا جھیل کے کنارے ایک نئی کالونی میں

بے کے لئے آئے ہیں۔ وہ انجینئرز اور کارخانوں کے مالک تھے۔
 جلد ہی جیہ کو یہ احساس ہو گیا کہ قلعے کے صحن میں ہانس کی میزبانیوں کے نیچے بھاگتے
 "اے بچوں میں سے وہ اکیلی بچی ایسی ہے جو شہر سے باہر بچائی جانے والی ریلوے لائن یا
 اگر یزوں کے لئے تعمیر ہونے والے چرچ کو دیکھنے نہیں جاسکے گی۔ اسے یہ بھی محسوس ہو رہا
 تھا کہ اسے پردے میں بٹھا دیا گیا ہے۔

اب اسے کبھی کبھی قلعے سے باہر جانے کی اجازت ملتی تھی۔ اسے پتا چلتا تھا کہ حقیقت
 لی دنیا اس کی تصوراتی دنیا سے خاصی مختلف تھی۔

پھر وہ دن بھی آیا جب بالمیر اسٹیٹ میں ٹرین پہلی بار دارالحکومت کے نواح میں بنے
 "اے ریلوے اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ جیہ خود کو اپنے والد کے بائیں جانب بیٹھے ہوئے
 اگر یزوں کی طرف دیکھنے سے نہیں روک سکی۔ وہ سوچنے لگی کہ ان لوگوں کو اپنے لیے
 پہڑوں اور بھاری کوٹوں میں یقیناً گرمی لگ رہی ہو گی اس کے علاوہ تو وہ بڑے مہربان دکھائی
 رہے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی برٹش پولیٹیکل آفیسر جیسا نہیں تھا جو بالمیر ریلوے کے
 سرکاری افتتاح میں شریک تھا اور سارا وقت گردن اکڑائے اور منہ بسورے کھڑا تھا۔ جب
 قلعے سے اسے تیرہ توپوں کی سلامی دی گئی تب بھی اس کے چہرے کا تناؤ ختم نہ ہوا تھا۔

طویل تقریبات کے بعد بچوں کو ٹرین میں داخلے کی اجازت دے دی گئی۔ نکار ریلوے
 بن دیکھنے بھاگا اور جیہ ایک ڈبے میں چڑھ کر بنوں سے کھیلنے لگی۔

پھر قلعے میں پہلی موٹر کار داخل ہوئی۔ اس سے پہلے جیہ نے محض ہاتھی گھوڑے اور
 لٹڑے ہی دیکھے تھے۔ لیکن اس چھوٹے سے ڈبے میں کوئی ہاتھی گھوڑا یا اونٹ نہیں جوتا گیا
 تھا۔ وہ ان سے کہیں زیادہ تیز بھی چلتی تھی۔

اگر جیہ کی کزن اور اس کے دشمن راجہ مان سنگھ کی بیٹی کار میں نہ بیٹھتی تو شاید جیہ
 ہی ایسا نہ کرتی بھلاہ اپنی دشمن سے پیچھے کیسے رہ سکتی تھی۔

یوں بھی جیہ اپنی کزن کے والد سے نفرت کرتی تھی۔ راجہ مان سنگھ نے اپنی بیٹی اور
 بیٹے جن کے لئے جو نکاح کے بعد تخت کی وراثت میں دوسرے نمبر پر تھا انگریز یونیورسٹی رکھا تھا۔
 اس کے بچوں کو انگریزی ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ وہ کانٹے اور چھوٹے سے کھانا کھاتے
 تھے اور اپنے والدین کو بھی اور ڈیڑی کہتے تھے۔

جیہ اپنی کزن کی حرکتوں کو بے وقوفی کہتی تھی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ اپنی کزن
 ایک عجیب طرح کا احساس کمتری محسوس کرنے لگی تھی، حتیٰ کہ وہ دن آگیا جب مہاراجہ

جے سنگھ اپنی دھرم پتی کی خواب گاہ میں داخل ہوا اور جیہ کو باہر جھروکے میں بھیج دیا گیا۔ اپنے والد کے چہرے پر چھائی گھمبیرتا کے باعث جیہ ان کی باتیں سننے کی غرض سے پردے کے پیچھے چھپ گئی۔

”اس کا کوئی متبادل نہیں ہے؟“ مہارانی نے دھیمے لہجے میں سوال کیا۔ جیہ نے پردہ تھوڑا سا سرکا کر دیکھا اس کے والدین کمرے کے وسط میں کھڑے تھے۔ ”نہیں“ مہاراجہ کی آواز تفکرات سے بھاری ہو رہی تھی۔ ”انگریزوں نے روسیوں کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کئے ہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اس صورت میں زار کے ساتھ ہمارے روابط زیادہ دیر تک چھپے رہ سکیں گے۔“

”یہ تو برطانویوں اور روسیوں کے آپس کا معاملہ ہے وہ اپنے اختلافات ختم کر رہے ہیں۔ اس میں آپ کا معاملہ کہاں سے آگیا؟“ مہارانی نے سوال کیا۔ اس کا چہرہ بھی کئی مسائل کی آماجگاہ دکھائی دے رہا تھا۔

”برطانوی کھلے ذہنوں کے حکمرانوں کو پسند نہیں کرتے“ مہاراجہ نے وضاحت کی ”وہ ہمیں خطرناک سمجھتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ہم لوگ اپنے زنان خانوں میں محض شراب اور شباب سے جی بسلامیں اور بس!“

”تو کیا نکا کے لئے انگریز یور کی تقرری سے حالات بدل جائیں گے؟“ ”نہیں“ مہاراجہ نے نفی میں سر ہلایا ”لیکن اس سے برطانویوں کو اس بات پر قائل کرنے میں آسانی ہوگی کہ ہم اپنے بیٹے کو انگریز بادشاہت سے وفاداری کا سبق پڑھا رہے ہیں۔“

جیہ بات چیت تو نہ سمجھ سکی لیکن یہ دیکھ کر اسے ایک جھٹکا سا لگا کہ اس کی ماں نے اپنا سربے سنگھ کے شانے پر رکھ دیا تھا..... جھی!“

اسی سہ پہر جیہ اپنی ماں کے ساتھ کار میں سوار ہوئی دونوں نقاب میں تھیں۔ چار خدامیں بھی ان کے ہمراہ تھیں کار قلعے سے نکل کر انگریز کالونی کے قریب سے نکل کر کوکی بائی کے پرانے گھر چاند محل جا رہی تھی۔

جیہ باغ میں آم کے درخت کے ساتھ لٹکے ہوئے جھولے کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی جبکہ مہارانی، خداموں کے ساتھ مل کر محل کے معائنے میں مصروف ہو گئی۔ چاند محل کی تزئین و آرائش کا فیصلہ کیا گیا تھا کیونکہ اب یہاں اس انگریز نے رہائش اختیار کرنی تھی جسے نکا کو انگریزی پڑھانے کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔

جیہ یہ دیکھنے کے لئے ان کے پیچھے پیچھے گئی تھی کہ انگریز کس طرح رہتے ہیں۔ بھاری دروازوں کے عقب میں اسے ایک عجیب سی اجنبیت کا احساس ہوا تھا۔ نرم گدیلوں والا ایک صوفہ چڑے میں منڈھی ہوئی میز، چار ٹائٹلوں پر کھڑی سخت کرسیاں جیہ کو کسی اور دنیا کی چیزیں محسوس ہوئی تھیں۔

خواب گاہوں میں بڑے بڑے بیڈ بچھے ہوئے تھے جو نہایت نرم تھے۔ غسل خانوں میں سفید ٹب تھے جو کرسیوں کی طرح زمین سے اٹھے ہوئے تھے۔ جیہ نے بے اختیار اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

جیہ نے ہاتھ ٹب کی طرف اشارہ کیا ”کیا یہ کپڑے دھونے کے لئے ہے؟“
مارلانی ہنسی ”نہیں، نہانے کے لئے۔“

”لیکن وہ پانی کیسے تبدیل کرتے ہوں گے؟“ جیہ نے اگلا سوال داغ دیا۔
مارلانی اسے غسل خانے سے باہر لے آئی ”اسے پانی سے بھر لیا جاتا ہے اور پھر انگریز خود کو اس میں صاف کر لیتے ہیں۔“

وہ ایک ہی پانی سے اپنے منہ اور پیر تو نہیں دھو سکتے نا؟ پھر وہ اپنے پیر کہاں دھوتے ہوں گے؟ کیا ان چیزوں میں؟ وہ سفید کرسیاں....؟“

”اتنا تجتست بہت ہے، جیہ۔“ وہ اسے گھر سے باہر لے آئی۔

جیہ محل واپسی تک حیران حیران رہی۔ اب ایک اور سوال اسے تنگ کرنے لگا تھا کہ کیا نکا اس گندے پانی میں نہانے والے سے پڑھ لے گا؟“

انگریز ٹیوٹر پولو کا ایک شاندار کھلاڑی نکلا۔ چھ فٹ قد کا حامل سرمئی آنکھوں والا یہ شخص شاندار فوجی ماضی بھی رکھتا تھا۔ جب وہ درہ خیبر کے قبائلیوں کے ساتھ جنگ کے واقعات سناتا تو اس کی آنکھیں بھی بولتی محسوس ہوتی تھیں۔

کیپٹن آبرن، برٹش انڈین آرمی میں سروس کرنے والے خاندان کی تیسری نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ رسمی تقریبات کے موقع پر وہ بہت سے اعزاز پہنا کرتا تھا جنہیں نکا بے حد پسند کرتا تھا..... ان اعزازات میں شمال مغربی سرحدی صوبے میں خدمات پر ملنے والا انڈیا میڈل۔ تبت میڈل اور سب سے زیادہ اہم سروس آرڈر شامل تھے۔ یہ ایوارڈ اسے افغانوں کے خلاف جنگ کے بعد دیا گیا تھا۔

نکا، کیپٹن آبرن کا گرویدہ تھا۔ اس لئے کوئی بائی کا پرانا محل نکا کی دنیا کا مرکز بن گیا۔ جونہی وہ دفاتر معتمدی میں اپنا کام ختم کرتا اپنے دوستوں کو جمع کر کے چاند محل لے جاتا

تاکہ کیپٹن صاحب سے کرکٹ میچ کھیل سکے کھیل کے اختتام پر مسز آبرن لیموں کے شر کی بھری ہوئی صراحیاں باہر بھیجا کرتی تھی۔

لڑکے بالے باہر لان پر پڑی کرسیوں پر بیٹھ جاتے اور کیپٹن سے لندن کی زیر زمین ریلوے، ہوائی جہاز بنانے والے کارخانوں اور دنیا کے گرد چکر لگانے والے مہم جوؤں کہانیاں سنا کرتے۔

ٹکا نہیں جانتا تھا کہ یہ کیسے ہوا، مگر یہ حقیقت تھی کہ آبرن کی موجودگی کے باعث بالمر کی حیثیت کم ہو گئی تھی۔ گو کہ یہ غداری کے مترادف تھا لیکن اس نے والد کو اس سے بالبد ایک ایسا شخص سمجھنا شروع کر دیا تھا جو اپنی ریاست سے باہر کی دنیا کے بارے کچھ نہ جانتا تھا۔ اس نے اپنی ماں کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ اس کے خیال میں اس ماں حرم کی چار دیواری میں قید ایک دقیانوسی عورت تھی۔ وہ خود کو اپنے والدین سے سمجھنے لگا۔ اس کی خواہش تھی کہ انگریز ٹیوٹر اسے اس کے والدین جیسا نہ سمجھے۔

انگریزوں پر رعب جھاڑنے کی خاطر وہ جیہ سے بھی کھینچا کھینچا رہنے لگا۔ وہ ہر کام اپنی بہن کو حیران کر دیا کرتا تھا۔ جیہ اپنے بھائی کے کمرے میں برطانوی اخبار اور رسالے دیکھ کر خوفزدہ تھی کہ وہ مکمل انگریز بنے جا رہا ہے۔ ملازمین کو سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ وہ اس کے کمرے میں موجود ان چیزوں کو قطعی نہ چھوئیں جو اس نے لندن آری اور نیوی اسٹورز سے منگوائی تھیں۔

اکثر ٹکا جب چاند محل سے لوٹتا تو اس کی بغل میں کئی کتابیں دبی ہوتیں جو میز پر سے موجود کتابوں کے ساتھ رکھ دی جاتیں۔ ان میں 'کپلنگ'، 'بروک'، 'بیڈن ہاول'، 'میکاولے' کی کتابیں شامل تھیں۔ جیہ نے جب ان کتابوں کو چھوا تو ان میں سے عجیب خوشبو آ رہی تھی۔ جیہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ یہی انگلینڈ کی خوشبو ہے۔ ٹکا کے کمرے دیواروں سے بھی انگلینڈ جھانک رہا تھا۔ دیوی دیوتاؤں کے مجسموں کی جگہ انگریز کھلاڑیوں تصویروں نے لے لی تھی۔ ایک پوری دیوار پر ایک بھارتی مہاراجہ کی مختلف تصاویر تھیں کرکٹ بیٹ ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ تصاویر کے نیچے پیتل کی پیلٹوں پر..... رانچی، سویسکر رانچی، لارڈز..... رانچی، برے کے الفاظ تحریر تھے۔

کیپٹن آبرن کی تجویز پر گول مینار کے نیچے ایک کرکٹ پولین تعمیر کر دیا گیا تھا۔ گول مینار کسی زمانے میں گرفتار ہونے والے معززین کے لئے جیل کا کام دیتا تھا۔ اب ٹکا سارا وقت اس پولین کے ساتھ بنے ہوئے نیٹ میں پریکٹس کرتے گزار دیتا۔ جب

جیہ، مہارانی کا کوئی پیغام لے کر اس کے پاس جاتی تو وہ زنان خانے کی طرف آئے ہوئے جیہ کو کرکٹ کے بارے میں اتنا لیکچر دیتا کہ وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی کہ اب اگر مہاراجہ رانجی کے مشہور عالم لیگ گلانس اسٹروک کے بارے میں ایک لفظ بھی کہا گیا تو وہ چیخ اٹھے گی۔

”تم جان کی طرح دوغلے بنتے جا رہے ہو“ وہ چڑ کر اپنے بھائی سے کہتی ”تم محض انگلینڈ اور اپنے محبوب رانجی کے بارے میں ہی بات کرنا پسند کرتے ہو۔“

نکا سختی سے اس کا بازو پکڑ لیتا ”انگریز کہتے ہیں کہ کوئی کالا..... تم جانتی ہو، وہ ہمیں کالا کہتے ہیں..... کبھی بھی صحیح کرکٹ نہیں کھیل سکتا“ وہ اپنی بہن کی معلومات میں اضافہ کرتا ”لیکن ایک ہندوستانی دنیا کا عظیم ترین کھلاڑی بن گیا۔ اتنا عظیم کہ اسے برطانوی ٹیم کی طرف سے کھیلنے کے لئے مدعو کیا گیا۔ اور اب تک صاحب لوگ اس کو چھوڑنے کو تیار نہیں ہوئے“ اس نے اپنی بہن کو گھورا ”لیکن اس عظیم کھلاڑی کو محض اپنے رنگ کی وجہ سے کرکٹ کلب آف انڈیا میں شامل ہونا پڑا۔ ہم اسی چیز کو بدلنا چاہتے ہیں“

جیہ کو نکا اپنے کزن سے بے حد مختلف لگا۔ وہ انگریزوں کی تقلید نہیں ان سے برتری اور ان کی نظروں میں اپنے آپ کو منوانا چاہتا تھا۔

جیہ کو اپنے والد کے بارے میں بھی شبہ تھا کہ وہ بھی انگریز سے مرعوب ہو گئے ہیں۔ رات کے کھانے کے بعد مہاراجہ جے سنگھ اور انگریز، دونوں نے شاہی جھروکے میں غائب ہو جانے کو اپنی عادت بنا لیا تھا۔ زنان خانے کی طرف جاتے ہوئے جیہ نے ایک روز جھانک کر اندر دیکھا۔ باہر محافظ اسٹاہو تھے جبکہ اندر ٹیوٹر آرام کرسی پر نیم دراز سگار کے کش لگا رہا تھا اور مہاراجہ اپنی سنگ مرمر کی بیچ پر ٹیک لگائے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔

”لارڈ کرزن نے وائسرائے کی حیثیت سے اپنے آخری کام کے طور پر ریوا کے مہاراجہ کو تخت سے دستبردار کروا کر زبردست کارنامہ انجام دیا ہے“ جیہ کو انگریز کی آواز سنائی دی ”تصور تو کریں کہ ایک انسان کو دیکھتے ہی دیکھتے حیوان بنا دیا جائے تو کیسا لگتا ہے؟“

”وہ لوگ ساہو کار اور مہاجن تھے جنہوں نے قحط کے دنوں میں کسانوں کو اکسایا تھا“ مہاراجہ جے سنگھ نے وضاحت پیش کی۔

”ریوا نے ان مہاجنوں پر عدالت میں مقدمہ ضرور چلایا تھا لیکن انہیں سزا نہیں دی“ انگریز بولا ”اور لارڈ کرزن نے ہندوستانیوں کو انصاف کا درس دیتے اپنے آپ کو آدھا کر لیا ہے۔“

”یہ سچ ہے کہ لارڈ کرزن انصاف سے محبت اور استحصال سے نفرت کرتے ہیں“ جیہ کو

حیرت ہوئی کہ مہاراجہ وائسرائے کا ذکر انتہائی ادب اور احترام سے کر رہا تھا ”ابھی شاہی دربار کا ذکر ہے لارڈ کرزن نے اپنے ساتھی انگریزوں کو نویں گھڑ سوار دستے کے ان برطانوی افسران کو سیلوٹ کرنے سے نہیں روکا جنہوں نے ایک کھیل کے طور پر اپنے بے یار و مددگار ہندوستانی ملازموں کو زمین پر رینگ کر آگے بڑھنے پر مجبور کیا اور پھر اپنے گھوڑوں سے روند ڈالا۔ ہم نے اپنے کانوں سے نہ سنا ہوتا تو کبھی یقین نہ کرتے کہ انگریز اپنے ہم نسل قاتلوں کو بچانے کے لئے کسی بھی کام سے دریغ نہیں کرتے۔“

”آپ زیادتی کر رہے ہیں، یور ہائی نیس۔“ انگریز نے احتجاج کیا ”ہندوستانی حکمران اس سے کہیں زیادہ ظلم کرتے ہیں۔“

”بعض لوگ تو کرزن کو متعصب اور ظالم گردانتے ہیں، کیپٹن صاحب!“ مہاراجہ کا لہجہ تیز تھا ”اس نے ہندوستانی اخبارات بند کر دیے“ اب کرزن کے لئے پہلے والا احترام باقی نہ رہا تھا۔ ”اس نے ہندوستانیوں کو مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے سے منع کر دیا۔ اس نے اپنے قلم کی ایک جنبش سے بنگال کے دو ٹکڑے کر دیئے اور یہ جانے بغیر کہ برطانویوں کے لئے نظام آف حیدر آباد کے جذبات کیا ہیں اسے دربر کر دیا۔“

”لیکن آپ اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ لارڈ کرزن ایک عظیم وائسرائے تھا؟“ انگریز کا انداز سوالیہ لیکن لہجہ مسکینی سے بھرپور تھا۔ ”اس نے برصغیر کو ایک ملک بنانے کے لئے دن رات کام کیا۔ اس نے شاہراہوں، ریلوے، ٹیلی گراف اور آبپاشی کے نظام کو بے حد ترقی دی۔ ممکن ہے اس نے آلیٹ بناتے ہوئے چند انڈے بھی توڑے ہوں لیکن میرے خیال میں یہ سب ہندوستان کی بھلائی کے لئے تھا جس کے لئے ہند کو اس کا احسان مند ہونا چاہئے!“

اک بار شاہی جھروکے کے قریب سے گزرتے ہوئے جیہ نے اپنے بھائی کا نام سنا۔ ”آپ ٹکا کو تعلیم کے لئے انگلینڈ کے کسی اسکول کیوں نہیں بھجوا دیتے؟ یور ہائی نیس؟ وہ باصلاحیت لڑکا ہے اور ترقی کا خواہش مند۔۔۔۔۔ کوچ بہار کا مہاراجہ اور سیر پور کے دو راجہمار، مہاراجہ وکٹر اور پرنس پرتاپ دونوں ہی اسٹن کے پڑھے ہوئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس اعلیٰ تعلیم سے ٹکا ایک بہترین حکمران بن کر ابھرے گا۔“

جیہ کو اپنے والد کا سخت جواب سن کر بے حد حیرت ہوئی تھی۔ ”ایک اچھا حکمران وہ ہوتا ہے کیپٹن! جو اپنی رعایا کی ضروریات جانتا ہو۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اسے یہ معلومات انگلینڈ کے کسی اسکول میں مل سکیں گی۔“

قلعے کے چڑیا گھر کے قریب سے گزرتے ہوئے جب جیہ نے اپنے بھائی کو اس بات چیت کے بارے میں آگاہ کیا تو وہ پھٹ پڑا۔

”اگر بابا اس انداز میں سوچتے ہیں تو میں کبھی بھی اس پرانے قلعے کو چھوڑ کر صحرا کی طرف نہیں جاؤں گا“ نکا نے حتمی لہجے میں کہا ”راجہ مان سنگھ اپنے بیٹے جان کو اجیر کے انگریزی سکول بھجوا رہا ہے، آخر بابا، راجہ مان سنگھ کی طرح ماڈرن کیوں نہیں۔ وہ مجھے بھی انگلینڈ یا کسی انگریزی سکول میں بھجوا سکتے ہیں۔“

جیہ بس چڑیا گھر کے جانوروں کو دیکھتی رہ گئی۔ وہ نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ اپنے بھائی کو کیسے تسلی دے۔

”میں بالمیر میں دفن نہیں ہونا چاہتا۔“ نکا کی سوچ سختی اور انتہا پسندی کی کچھ اور منزلیں طے کر چکی تھی ”انگریز سوچ سکتے ہیں کہ جان، مجھ سے زیادہ اچھا حکمران ثابت ہو سکتا ہے۔ اب کیا میں اس ریاست کو ترقی کے بجائے ماضی کا سفر کرتے ہوئے دیکھوں؟“

جیہ شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ انگریز ٹیوٹر کے آنے سے محض چند دن پہلے تک نکا اس ریاست کے راجہ کی حیثیت سے سوچتا تھا جس نے آگے چل کر اس ریاست کا مہاراجہ بننا تھا لیکن اس کے ذہن میں بغاوت کھس آئی تھی۔ وہ اپنی حیثیت بھول گیا تھا۔

”بابا نے تمہارے بارے میں درست فیصلہ کیا ہے“ جیہ نے پھٹ سے کہہ دیا ”تم ہندوستان سے نفرت کرنے لگے ہو اور یہ سب اس انگریز کا کیا دھرا ہے۔“

”یہ سچ نہیں۔“ نکا چلا ٹھا ”کیپٹن صاحب ہندوستان سے پیار کرتے ہیں تم نے انہیں ان ہندوستانی فوجیوں کے بارے میں باتیں کرتے سنا ہے جنہوں نے ان کی کمان میں کام کیا ہے۔ کیا انہوں نے سوائے ان فوجیوں کی تعریف کے بھی کچھ کہا ہے؟“

”تو کیا ہوا“ جیہ نے بے پروائی سے کندھے اچکائے ”کوئی ہندوستانی اب تک انگریزی فوج میں افسر بھی تو نہیں بنا۔“

”اوہ!“ نکا نے اپنا سر پیٹ لیا ”تم صرف ایک لڑکی ہو۔ تم بھلا ان باتوں کو کیسے سمجھ سکتی ہو؟ آؤ میں تمہیں پولو گراؤنڈ میں دوڑ لگواؤں۔“

گوگو کی کیفیت سے دوچار جیہ، اپنے بھائی کے پیچھے دوڑنے لگی، لیکن اس کا ذہن نکا کے لہجوں اور انداز کو تسلیم نہیں کر پایا تھا۔

ایک دن جیہ نے میجر ویر سنگھ اور کیپٹن آبرن کو برابر برابر کھڑے دیکھا۔ اسے میجر کے چہرے پر کبیدگی کے آثار نظر آئے تھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میجر، نکا کی وفاداریاں

تبدیل ہونے پر رنجیدہ ہو۔

ذرا دیر بعد جب انگریز چلا گیا تو میجر بڑوانے لگا ”میں انگریز کو جھوٹا نہیں کہتا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ ہر شخص کو کچھ کہنے یا کرنے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانک لینا چاہئے۔“ جیہ، میجر ویر سنگھ کے الفاظ کا مطلب نہ سمجھ سکی۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ یہ نہ سمجھ سکی تھی کہ وہ اب اپنے بھائی کے ساتھ خود کو آرام دہ اور پرسکون محسوس نہ کرتی تھی۔ صرف ایک ہی سال میں انگریز نے کوکی بائی کے محل کی طرح قلعے کے ماحول اور فضا کو ہی بدل ڈالا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ تبدیلیاں صرف قلعے کی فضا میں ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں آئی ہیں۔ ہندوستانی اخبارات آخر کار لارڈ کرزن کے سنسر شپ سے آزاد ہو گئے تھے اور اب وہ برطانوی ہندوستان کے لئے ہوم رول کے مطالبات پر لکھے جانے والے اداریوں سے بھرے پڑے تھے۔ ہندوستانی باشندے اب برطانوی اشیاء کا بائیکاٹ کر رہے تھے تاکہ وہ برطانویوں کی طرف سے ہندوستانی وسائل کو حقیر جاننے کا بدلہ لے سکیں۔ قوم پرست لیڈروں کو جلا وطن کیا جا رہا تھا۔

نئے وائسرائے نے آنے والے طوفان کو سونگھ لیا تھا۔ اس نے ہندوستانیوں کو دعوت دی تھی کہ وہ اس شاہی کونسل میں شریک ہو جائیں جو ہندوستان کا انتظام و انصرام چلاتی تھی صرف یہی نہیں اس نے برطانوی تخت کے نمائندوں اور ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں کی ایک کانفرنس بھی طلب کی تھی۔

لیکن جیہ ان باتوں کو نہیں جانتی تھی۔ وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے بہت کچھ بدل گیا تھا اور بہت کچھ بدلنے جا رہا تھا۔ جیہ اب اتنی بڑی ہو گئی تھی کہ دسرے کے تہوار پر اس نے نودن کا برت رکھا یہ نودن محض پوجا پاٹ میں ہی گزرے تھے۔

لیکن نودن کے برت کے فوری بعد اسے شاہی جھروکے میں طلب کر لیا گیا جہاں اس کے والد وائسرائے کی کانفرنس کے لئے روانہ ہونے سے قبل اس سے ملاقات کے منتظر تھے۔ محافظ کے عقب میں کھڑی جیہ جھجک گئی کیونکہ جھروکے میں مہاراجہ تنہا نہیں تھے۔ جھروکے کی جالیوں کے پاس ایک موٹی عورت بھی موجود تھی۔

اجنبی عورت نے پہلے جیہ کا گھاگھا دیکھا جس پر سونے کے تاروں کا کام کیا تھا اور پھر اس کی نگاہیں چولی سے ہوتی ہوئی جیہ کے چہرے پر آکر ساکت ہو گئیں۔ لاج اور گھبراہٹ کے مارے جیہ اپنی ناک کو مسلتے لگی۔ وہ دراصل اپنے بائیں نتھنے میں پہنی ہوئی سونے کی

نقصدی چمپانا چاہتی تھی۔

ماراجہ جے سنگھ نے بانوں میں بھر کر اسے اپنے قریب کر لیا ”یہ ہماری بیٹی ہے، مسز رائے“ اجنبی عورت نے ہاتھ باندھ کر نمستے کیا لیکن تعظیم کے لئے جھکی نہیں ”مسز رائے کے شوہر بالیر کے آپاشی کے نظام کو از سر نو ڈیزائن کر رہے ہیں تاکہ ہماری بجلی کی فراہمی میں اضافہ ہو سکے، ایسے میں جبکہ وہ بالیر میں انقلاب لائیں گے مسز رائے، تمہیں انگریزی میں طلاق کر کے زنان خانے میں معجزے دکھائیں گی۔“

جیہ اس سے پہلے مسز رائے جیسی کسی ہندوستانی عورت سے نہ ملی تھی۔ اس نے سفید کھردرے کپڑے کی ساڑھی پہن رکھی تھی جس کا بارڈر رنگین تھا تاکہ پتا چل سکے کہ وہ بیوہ نہیں ہے۔ وہ عام ہندو عورتوں سے دور کی کوئی شے تھی۔ اسی لئے اس نے پجاریوں کی موجودگی میں مہارانی کی پوجا پاٹ میں شرکت سے انکار کر دیا تھا۔

جیہ نے کسی ہندوستانی عورت کو مسز رائے کی طرح باتیں کرتے نہیں سنا تھا۔ وہ اپنی مدھر آواز میں گھنٹوں برطانوی راج کے خلاف باتیں کرتی تھی۔

جیہ نے اب اس بات پر برا ماننا چھوڑ دیا تھا کہ نکا اپنے انگریز کی کتابوں میں مصروف ہوتا تھا یا اس کے بغیر زنان خانے کی خداموں کے ساتھ آنکھ پھولی کھیلتا تھا۔ مسز رائے کے سبق نکا کی کتابوں سے کہیں زیادہ دلچسپ ہوتے تھے ان اسباق میں برطانویوں کی ناانصافیوں کی کہانیاں ہوتی تھیں۔ ایک بار مسز رائے نے اپنے ایک کزن کا تذکرہ بھی کیا تھا جسے برطانوی پولیس نے گولی مار دی تھی۔

مسز رائے اسے وہ انگریزی اخبارات بھی پڑھنے کو دیتی تھی جو ہندوستان سے ہی شائع ہوتے تھے۔ جوں جوں پڑھائی آگے بڑھتی گئی جیہ کو بہت سی باتیں سمجھ میں آنے لگیں۔ لیکن اسے میجر ویر سنگھ کا وہ جملہ بھی یاد تھا جو میجر نے کیپٹن کے بارے میں کہا تھا لیکن جیہ کے سر پر سے گزر گیا تھا، مگر اب جیہ جان گئی تھی کہ اس جملے کا مطلب کیا ہے۔ جیہ نے یہ بات بھی بطور خاص محسوس کی تھی کہ کیپٹن کے برطانوی ہندوستان اور مسز رائے کے برطانوی ہندوستان میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

شام کے وقت جیہ گرکٹ پولیس چلی گئی جہاں لڑکے چوبی پنوں پر بیٹھے کیپٹن کی ہندوستان کے بارے میں تقریر سن رہے تھے جس کی تین نسلوں نے بقول اس کے اس ملک کی خدمت انجام دی تھی۔

”میرے بٹ مین کی طرح کے لوگ صحیح ہندوستانی ہیں بہادر، قابل عزت، وفادار افراد۔“

یہ ان کے مذہب کی بنیاد ہے کہ صاحب ہم نے تمہارا نمک کھایا ہے۔ ہماری زندگیاں تمہاری ہیں لیکن یہ کلکتہ اور بمبئی کے جھوٹے لوگ خود کو ہندوستان کی آواز کہتے ہیں۔ سڑکوں پر برطانوی کاٹن جلاتے ہیں۔ یہ احسان فراموش بھول جاتے ہیں کہ ہندوستان کو ترقی دینے والا یہی انگریز ہے۔“

اگلی سہ پہر مسز رائے نے اپنی ساڑھی بچی کے سامنے لہرائی ”کیا میں تمہیں بتاؤں کہ میں نے یہ کیوں پن رکھی ہے؟ اس لئے کہ یہ میرے اپنے ملک میں بنائی گئی ہے اسے خام مال کی صورت میں مانچسٹر اور لنکاسٹر کے ارب پتیوں کو نہیں بھجوا یا گیا تھا۔ میں جب بھی اس قسم کا کوئی کپڑا خریدتی ہوں، بھارتیوں کے منہ میں نوالہ رکھتی ہوں۔“

کرکٹ پولیٹین میں موجود ٹکا اور اس کے دوستوں نے اثنائی انداز میں سر ہلایا ”وائسرائے دوبارہ مقامی پریس پر پابندی عائد کر دیں گے۔ یہ بلاو ایڈیٹر صرف برطانوی راج کے خلاف بغاوت کو ہوا دیتے ہیں۔“

اگلے دن جیہ نے مسز رائے کی آنکھوں میں جھانکا جو موٹے شیشوں کے چشمے کے عقب میں بھی چمکتی دکھائی دے رہی تھیں۔

”برطانوی راج نے ایک اور آزادی پسند لیڈر تلک کو جیل میں ڈال دیا ہے لیکن اس کے الفاظ ایک نعرہ بن کر ہمارے اخبارات کے ذریعے پورے ہندوستان میں گونج رہے ہیں۔ آزادی میرا پیدائشی حق ہے اور میں اسے حاصل کر کے رہوں گا۔ ہزاروں لوگ اس وقت بہ آواز بلند یہ نعرہ لگا رہے تھے جبکہ انہوں نے سنا کہ تلک کو ایک برطانوی جیل میں چھ سال قید کی سزا دی گئی ہے۔“

چند دن بعد کیپٹن آبرن نے پولیٹین میں بیٹھے ہوئے لڑکوں کے سامنے لندن ٹائمز کی ایک کاپی لہرائی۔ اس کا چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا ”میں نہ کہتا تھا کہ ان حرام زادوں کو ضرورت سے زیادہ آزادی دینا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے؟ لندن میں ہندوستان کے لئے برطانوی سیکریٹری آف ایٹم کو گولی مار دی گئی ہے۔ گولی ہندوستان سے آئے ہوئے دوستوں سے ملاقات کے دوران اس کے گھر میں بیوی کے سامنے ماری گئی۔ قاتل ایک ہندوستانی طالب علم ہے اور اس کا کہنا ہے کہ اسے اپنے اس فعل پر فخر ہے۔ وہ اسے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کا ایک انداز قرار دیتا ہے۔“

کیپٹن آبرن کو لال بھبھوکا دیکھ کر جیہ کو نہ جانے کیوں بے حد خوشی ہوئی تھی۔ مسز رائے اس سے پہلے دن میں کہہ چکی تھی ”اب نوجوانوں کے جذبات کو روکنا ممکن

نہیں وہ کب تک کتے اور ہندوستانی کا داخلہ منع ہے جیسے الفاظ برداشت کریں گے۔ گزشتہ تین ماہ کے دوران کلکتہ میں ایک برطانوی جج کو گولی مار دی گئی۔ بمبئی میں برطانوی کروڑپتی کو قتل کیا گیا اور اب برطانوی بادشاہت کے مرکز میں ایک وزیر کو جنم رسید کر دیا گیا۔ دراصل برطانوی راج اپنی ناانصافیوں کی بوٹی ہوئی فصل کاٹ رہے ہیں۔“

جیہ اپنی ریاست کی سرحدوں کے پار واقع برطانوی ہندوستان پر اپنی جاگیر سمجھ کر حکومت کرنے والے گوروں کے بارے میں پڑھتے ہوئے دونوں ٹیوٹوں کی سوچ کے فرق کا موازنہ کرتی۔ ہندوستانیوں نے اب اپنے مطلق العنان آقاؤں کی حاکمیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور آقاؤں کو اپنے غلاموں کی یہ جسارت پسند نہ آئی تھی۔

جیہ جب اپنی ٹیوٹر کے گھر گئی تو اسے دیواروں پر کئی تصاویر لگی دکھائی دی تھیں۔
”یہ کونم ہیں مسز رائے؟ آپ کے بھائی؟“

”میرے شوہر کے کزن ہیں ان میں سے ایک کو انگریزوں نے گولی مار دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اور میرے شوہر نے برطانوی ہندوستان چھوڑ دیا“ اس نے ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا ”اس کی شادی کو صرف ایک سال ہوا تھا اور اس کی بیوی ماں بننے والی تھی جب کزن نے بنگال کو تقسیم کیا تو وہاں فساد شروع ہو گئے۔ پولیس نے ہجوم پر گولی چلا دی۔ جس میں وہ بھی مارا گیا اور اب دس سال بعد برطانیہ نے کزن کا فیصلہ واپس لے لیا ہے۔ لیکن کاش ایسا بھی ہوتا کہ فیصلوں کی طرح چلائے جانی والی گولیاں بھی واپس لی جاسکتیں‘ کاش....!“

”اور وہ دوسرا؟“

”بچ جانے والا بھائی اردن رائے‘ ایک وکیل ہے اور کلکتہ کا متحرک ترین قوم

پرست۔“

جیہ غور سے تصویر دیکھتی رہی۔ چوڑے چکلے چہرے پر بھاری مونچھیں اور ہونٹوں کی مسکراہٹ بے حد بھلی لگ رہی تھی وکیل کی آنکھوں میں ایک ایسی معنی خیز چمک تھی جیسے وہ کسی راز میں جیہ کے ساتھ شریک ہو۔

”کیا یہ بھی شادی شدہ ہے؟“ جیہ نے پوچھا۔

”ابھی نہیں لیکن ہو جائے گا۔ ایک بیوی ہی اس کی دھنوں پر قابو پاسکتی ہے۔“ مسز رائے نے ایک الہم نکال کر جیہ کو تھما دی۔ جس میں اردن کی بے شمار تصاویر لگی ہوئی تھیں۔ بھائی کی موت کے بعد اسے جلاں بھیج دیا گیا تھا۔ زیادہ تر تصاویر وہیں کی تھیں۔ ہر

تصویر کا انداز مختلف لیکن معنی خیز چمک اور مسکراہٹ ایک جیسی تھی۔

”میں یہ سمجھتی ہوں کہ اردن رائے انتہا پسندی کے راستے پر چل نکلا ہے۔ وہ انصاف نہیں انتقام چاہتا ہے۔“ مسز رائے نے جیہ کو بتایا۔ ”اردن ابھی جوان ہے اور ہر جوان آدمی جنگ کو کھیل سمجھتا ہے۔“

جیہ اپنی ٹیوٹر کی طرف متوجہ نہیں تھی مسز رائے نے کھٹکار کر اسے مخاطب کیا ”آپ بیرونی دنیا میں دلچسپی لیا کریں، بائی سا! کیا آپ جانتی ہیں کہ آپ کے والد اور ان کی دوسرے ساتھی حکمرانوں نے وائسرائے سے کہا ہے کہ وہ برطانوی افسران کو ان کی ریاستوں کے معاملات میں مداخلت سے روکیں؟ اس سے اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے کہا ہے کہ اپنے بچوں کو ایک ہندوستانی کی حیثیت سے بڑا کرنا چاہتے ہیں برطانوی راج کے صاحب حیثیت سے نہیں۔“

جیہ بے اختیار ٹکا پر کیپٹن آسبرن کے اثر و رسوخ کے بارے میں سوچنے لگی۔
”مہاراجاؤں نے برطانوی معاہدوں کی خلاف ورزی سے روک تھام کے لئے جمیمر آف پر نسر بنانے کا فیصلہ کیا ہے پورے ہندوستان میں لوگ ہاتھ سے ہاتھ باندھ رہے ہیں۔ آدھکھنا ایک دن یہ بادشاہت ہمارے بازوؤں کے حلقے میں قید بری.... طرح پھڑپھڑا رہی گی۔“

مہاراجہ وائسرائے کی کانفرنس سے واپس آئے تو کسی کو بھی شاہی جھروکے میں داخلے اجازت نہیں دی گئی۔ محل کے محافظوں کے عقب میں کھڑے ہوئے ٹکا اور جیہ۔ انجینئروں کو دیواروں میں سوراخ کرتے دیکھا تھا تاکہ بجلی کی وائرنگ کو شاہی جھروکے سے بڑھایا جاسکے۔ قلعے کے بڑھی ایک خیمہ نصب کرنے میں مصروف تھے لیکن محافظوں اس کی وجہ بتانے سے انکار کر دیا تھا۔

سورج غروب ہونے کے بعد جھروکے کے دروازے کھول دیئے گئے۔ مہارانی اور دہ پروہ دار خواتین خیمے میں چلی گئیں جبکہ دوسرے لوگ سنگ مرمر کے فرش پر بچھے ہوئے قالین پر براجمان ہو گئے۔ سامنے کی جانب ریشمی پردے لٹک رہے تھے جن میں کوئی سلوٹ تھی۔ جب مہاراجہ بے سنگھ نے اپنی مخصوص نشست سنبھالی تو جھروکے اور خیمے کی رو گل کر دی گئی۔

جیہ نے ایک اجنبی کو ایک سیاہ رنگ کے صندوق کے پاس کھڑے دیکھا جس سوراخ سے تیز روشنی پھوٹ رہی تھی۔ روشنی اتنی تیز تھی کہ اس پر نظر جمانی مشکل تھی۔

”یور ہائی نیس، خواتین و حضرات“ اچانک اجنبی کی آواز سنائی دی۔ ”آپ اس بات سے آگاہ ہیں کہ دنیا ترقی کر رہی ہے۔ گھوڑے کی جگہ کار نے، ہاتھی کی جگہ ٹرین نے اور پرندے کی جگہ اڑنے والی مشین نے لے لی ہے۔ دوسرے الفاظ میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ جادو بھرے افسانے حقائق کا روپ دھارنے لگے ہیں لیکن خاطر جمع رکھیں کہ یہ جادو حقیقت میں بدلنے والے دیوی دیوتا نہیں بلکہ انسان ہیں۔“

وہ ایک لمحے خاموش رہ کر حاضرین پر اپنی بات کا رد عمل دیکھتا رہا، جب کسی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تو وہ دوبارہ گویا ہوا ”اسی طرح کے دو جادوگر لیومیری برادران بمبئی آئے اور انہوں نے یہ جادو ہمارے ذہن آدمیوں کو سکھایا۔ آج رات میں آپ کو یہی جادو دکھانے جا رہا ہوں، جسے آپ کے لئے دادا صاحب پالکی نے ترتیب دیا ہے۔“

اس نے روشنی کو کسی شے سے ڈھانپ دیا اور وہ سب گھپ اندھیرے میں گم ہو گئے۔ پھر جیہ نے کلک کی آواز سنی اور صندوق میں سے روشنی کی لکیر دوبارہ برآمد ہو کر سامنے پردوں پر منعکس ہونے لگی۔

جیہ دم سادھے بیٹھی تھی۔ حیرت سے اس کے لب سلے ہوئے لیکن آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں۔ روشنی چند چلتے پھرتے سیالوں میں تبدیل اور پھر پردے پر باقاعدہ انسان چلتے پھرتے نظر آنے لگے۔

یہ فلم تھی لوگ دم بخود اسے دیکھتے رہے۔ بعض کے حلق سے مارے حیرت کے خرخراتیں برآمد ہو رہی تھیں، لیکن مہارانی کرشن مہاراج کا بھجن گنگتا رہی تھی جیہ البتہ پوری توجہ سے فلم دیکھ رہی تھی۔ اس نے کسی قسم کا کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔

لوگ اتنے حیران تھے کہ فلم ختم ہونے اور روشنیاں جلنے کے بعد بھی بہت دیر تک ساکت و جلد اپنی جگہوں پر بیٹھے رہے تھے۔ حتیٰ کہ جب مہاراج نے اپنی جگہ چھوڑی تو باقی لوگوں کو مجبوراً وہاں سے اٹھنا پڑا۔

اس عرصے میں مزید واقعات رونما ہوتے رہے۔ احمد آباد میں وائسرائے پر بم پھینکا گیا لیکن وہ بال بال بچ گیا۔ کیپٹن آسٹن اور مسز رائے اس بارے میں الگ الگ نظریہ رکھتے تھے۔ راجہ مان سنگھ اجیر چلا گیا تاکہ اپنے بیٹے جان کو انگریزی سکول میں داخل کروا سکے۔ شہنشاہ برطانیہ ایڈورڈ ہفتم کا انتقال ہو گیا اور ایک ہفتے کے سرکاری سوگ کے دوران قلعے پر لہرانے والے تمام پرچم سرنگوں کر دیئے گئے۔

نیا وائسرائے لارڈ ہارڈنگز ہندوستان آیا تو اس نے ایک عجیب خبر سنائی۔ انگلینڈ کا نیا

شہنشاہ جارج پنجم دہلی میں شہنشاہ ہند کی حیثیت سے تاجپوشی کا خواہش مند تھا۔ بے شک دہلی چلا گیا تاکہ اس عظیم الشان تقریب کے انتظامات پر تبادلہ خیال کر سکے۔ کیپٹن آبرن اور اس کی بیوی مہاراجہ کے ساتھ دہلی گئے کیونکہ ان کا بیٹا جیمس انگلینڈ سے دہلی پہنچا تھا۔ لیکن جیہ کی اپنی مصروفیات تھیں۔ وہ مسلسل فلم چلانے والوں کے مغز چاٹتی رہی تھی کہ لوگ اڑتے کیسے ہیں اور اس چھوٹے سے ڈبے میں اتنی بڑی بڑی فلمیں کس طرح پوری آ جاتی ہیں؟ اس نے انگریز ٹیوٹر کے لڑکے کو ہالیر آ جانے کے باوجود اب تک نہیں دیکھا تھا۔ حتیٰ کہ ایک روز کوکی بائی نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر زنان خانے کی منقش دیوار کے عقب میں گھسٹ لیا۔

ایک کار باہر آ کر رکی اور شو فر نے جلدی سے اتر کر عقبی دروازہ کھول دیا۔ اپنے بھائی کے پیچھے جیہ کو ایک نوجوان لڑکا دکھائی دیا جو کیپٹن آبرن سے بھی طویل قامت تھا۔ اس کی گردن مٹنی اور بال سیاہ تھے۔ کوکی بائی نے ایک طویل سانس لی ”زنان خانے کی لڑکیاں اگر جذبات سے بے قابو ہو جائیں تو مجھے کوئی حیرت نہیں ہوگی۔“

جیہ نے ایک جھروکے سے باہر جھانکا ”یہ تو ایک کرین کی طرح نظر آتا ہے۔ یہ بھلا زنان خانے کی عورتوں کو کیونکر بے قابو کرنے لگا؟“ کوکی بائی نے تہقہ لگا کر گویا جیہ کے جملے کا مضحکہ اڑایا ”صبر کرو۔۔۔ وہ زنان خانے میں آئے گا تو تم بھی اپنا فیصلہ بدل لوگی۔“

جیہ کو ایک دھچکا سا لگ۔ ”ایک مرد زنان خانے میں آ رہا ہے۔“ اس کے لہجے میں دنیا بھر کی حیرت تھی ”ناممکن۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا۔“

”تمہارے والد اور والدہ اس کو مدعو نہ کرتے تو ایسا ہی ہوتا۔“ کوکی بائی نے کہا۔ ”اور انہوں نے یہ اس لئے کیا ہے کہ نیا وائسرائے چاہتا ہے کہ تمہارے والد ٹکا کو اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ بھجوا دیں اور اگر ٹکا جاتا ہے۔۔۔“

”آپ مذاق کر رہی ہیں، کوکی بائی“ جیہ نے ان کا جملہ کاٹا ”بابا نے انگریز ٹیوٹر کو بتایا تھا کہ ٹکا کو کبھی برطانیہ جا کر پڑھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔“

کوکی بائی نے نظریں جھکا لیں جیہ کو یہ اعتراف شکست محسوس ہوا تھا ”بعض اوقات تمہارے والد کے پاس کوئی متبادل راستہ نہیں ہوتا۔ بہت سال پہلے تمہارے والد کو قحط کے دوران ہالیر کے لئے رقم کی ضرورت تھی اور وہ مدد کے لئے زار روس کے پاس گیا تھا۔ اس

لئے اب برطانوی راج کو تمہارے والد پر اعتبار نہیں، نئے وائسرائے کا کہنا ہے کہ اگر نکا اب بھی سلطنت بالمیر کا ولی عہد ہے تو اسے لازمی انگلینڈ جانا ہو گا۔ مہارانی صاحبہ اس لئے اس لڑکے سے ملنے کی متمنی ہیں کیونکہ نکا نے اسی کے ساتھ لندن جانا ہے۔“

کوکی بائی نے خادماؤں اور خواجہ سراؤں کو اشارہ کیا اور وہ جیہ کو پکڑ کر ایک طرف لے گئے۔ اسے تیار کرنے کا مرحلہ درپیش تھا۔ خادماؤں نے اس کے لمبے بالوں میں خوشبودار تیل ڈالا اور سبز آنکھوں میں سرمہ لگا دیا تھا۔

”تم تو بہت خوبصورت ہوتی جا رہی ہو، لڑکی!“ کوکی بائی نے اس کے ماتھے پر سرے سے سیاہ نشان لگا دیا تاکہ کسی کی نظر نہ لگے۔ ”تمہارے شوہر کو تمہیں پردے میں رکھنا ہو گا ورنہ تم تو محض کمرے میں آکر ہی بہت سوں کا دل توڑ دو گی۔“

جیہ نے کوکی بائی کے آئینے میں اپنا جائزہ لیا اس نے اپنے بدن میں سرور کی سی کیفیت محسوس کی تھی۔ اس کی سبز آنکھیں غضب ڈھا رہی تھیں جبکہ ان کے درمیان ستواں ناک مہاراجہ کی تلوار کی مانند تھیکھی اور اٹھی ہوئی تھی۔ بائیں نتھنے میں ہیرے کی نقشنی سانولی رنگت پر چمک رہی تھی اسی سانولی رنگت نے اس کی والدہ کو پریشان کر رکھا تھا۔ اس کے لمبے بال گھٹنوں تک آ رہے تھے اس نے سر جھکا تو یوں لگا جیسے آئینے میں بہت سے ناگ اتر آئے ہیں۔ آج پہلی بار جیہ نے خود کو بچی نہیں ایک نوخیز لڑکی سمجھا تھا۔

مہارانی نے کمال مہربانی اور میزبانی کی اعلیٰ ترین روایات کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹیوٹر کے اہل خانہ کو اپنی نجی رہائش گاہ کے بیرونی دروازے پر خوش آمدید کہا تھا۔

زنان خانے کی خادماؤں اور خواجہ سرا اپنے اپنے انداز میں اس انگریز خاندان کے بارے میں تبصرے کر رہے تھے۔ انگریز عورت کا چوڑا ہیٹ اور سفید رنگ کا لباس بطور خاص زیر بحث تھا جو اس کے کندھوں سے گھٹنوں تک جسم پر لپٹا ہوا تھا۔

”اس کی آنکھیں تو دیکھو“ سکاریوں میں ڈوبی ایک زنانہ آواز ابھری ”دیوی نے اس لڑکے کی آنکھوں کو کسی خاص رنگ سے بنایا ہے۔“

”نہیں، نہیں، یہ تو سمندر کا رنگ ہے“ کسی نے تصحیح کی ”غور سے دیکھو یہ کبھی نیلی اور کبھی سبز دکھائی دیتی ہیں۔“

”اگر یہ ہم میں سے ہوتا تو ہم اسے اپنی راجکماری کے لئے مانگ لیتے۔“ ایک اور آواز سنائی دی۔

”درست ہے“ ایک خادمہ نے تصدیق کی ”اس کے سر پر پگڑی رکھو اور ہاتھ میں تلوار

تھا دو تو کسی ریاست کا راج کمار لگے گا۔“

وہ اپنے اپنے پلوؤں میں منہ چھپائے ہنس رہی تھیں اور اوندھے سیدھے تبصرے
رہی تھیں۔ جیہ کو ان کی ان باتوں کا کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ البتہ اس کے لاشعور
کہیں خادماؤں کا مذاق ایک خوفناک حقیقت کا روپ دھار رہا تھا۔

”اپنی لمبی زبانیں قابو میں رکھو، بے وقوفو!“ کوکی بائی نے تیز آواز میں انہیں ڈانٹ پلا
”ہماری راج کمار کی کسی انسان سے بیاہی جائے گی۔ ہم بدیسی سبزیوں سے اس کا دھ
بھرشت نہیں کریں گے۔“

جیہ نے نظریں اٹھائیں تو اسے انگریز لڑکا عجیب سی نگاہوں سے کوکی بائی کو دیکھتا ہوا
آیا یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ان کی باتیں سمجھ گیا ہو۔

”کیا تم جانتے ہو کہ تم کوکی بائی کے پرانے محل میں رہتے ہو؟“ جیہ نے لڑکے
پوچھا وہ ایک لمحے کے لئے بھول گئی تھی کہ زندگی میں پہلی بار کسی انگریز سے براہ راس
مخاطب ہے لڑکے نے نفی میں سر ہلایا ”ہمارے دادا نے یہ محل ان کے لئے تعمیر کرایا
کیونکہ یہ ان کی پسندیدہ عورت تھیں“ جیہ کی بات چیت میں پہلی بار راجکمار کا سا
پیدا ہوا تھا ”تمہیں یہ بھی علم نہیں ہو گا کہ کوکی بائی ایک عظیم رقاصہ ہیں اور یہ موتی
ایک ہاتھی کے دانتوں پر رقص کیا کرتی تھیں۔“

مہارانی اور مسز آبرن جھلسا جھیل کی خوبصورتی کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں
اس لئے انہوں نے جیمس آبرن کے چہرے کی رنگت نہیں دیکھی تھی جو جیہ کے منہ
پسندیدہ عورت کے الفاظ سن کر بدلی تھی۔ خود جیہ کو بھی شاید اس کا احساس نہیں تھا کہ وہ
کہہ گئی ہے البتہ وہ اس بات پر خوش تھی کہ نکا کہیں اور مصروف تھا اس لئے وہ اسے
نہیں سکا تھا۔

”اور ہاں!“ جیہ اپنی رو میں بولے جا رہی تھی ”چاند محل کی دیواروں پر بہت سی
تصاویر بنی ہوئی تھیں رومانوی تصاویر، لیکن ان پر رنگ پھیر دیا گیا ہے کیونکہ انگریز
چیزیں دیکھنا پسند نہیں کرتے۔“

”جیمس آبرن کا چہرہ سرخ ہو گیا دونوں بزرگ خواتین نے بات چیت ترک کر دی
اس نوجوان جوڑے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

مہارانی تھوڑا سا آگے کو جھک آئی۔ ”تم نکا کے دوست کے ساتھ کیا باتیں کر رہی
ہو؟“

”ہم یہ پوچھ رہے تھے، کیا یہ سچ ہے کہ انگریز اپنے گھروں میں روغنی تصاویر کو پسند نہیں کرتے۔“

مہارانی نے کڑے تیوروں سے اسے گھورا، لیکن مسز آبرن مسکرا دی ”براہ کرم یور ہائی نیس، بچی کو پوچھنے دیں..... ہاں، شہزادی، ہمارے نئے گھر میں بہت سی روغنی تصاویر موجود ہیں میری پسندیدہ پینٹنگ نیپو سلطان کے ہاتھوں وٹری کی شکست کی ہے۔“

”مرتے ہوئے انسان؟“ جیہ کا لہجہ تاسفانہ تھا۔ ”کیا آپ لوگوں کو عورتوں اور بادشاہوں کی رومانوی تصاویر اچھی نہیں لگتیں جیسے یہاں ہمارے زنان خانے میں لگی ہوئی ہیں؟“

مسز آبرن کی مسکراہٹ دم توڑ گئی ”آپ کسی دقت چاند محل آئیں، شہزادی، پھر خود ہی فیصلہ کیجئے گا“ اس کی آواز تھرا رہی تھی ”ہو سکے تو اگلے ہفتے، شہزادی، کرکٹ میچ کے دوران۔“

اس موسم گرما میں جیس آبرن صبح کے وقت مہاراجہ کی گھڑ سواری پارٹی کا ایک باقاعدہ رکن بن گیا۔ جیہ نے بھی جیمس کے گھوڑے کے برابر اپنا گھوڑا رکھنا ایک عادت سی بنائی تھی لیکن ٹکا کی طرح وہ اسے گھڑ سواری کے دوران قطعی پریشان نہیں کرتا تھا۔

وہ بالمیر کی ہرٹھ میں دلچسپی لیتا نظر آتا تھا۔ جلد ہی جیہ قلعے میں اس کی گائیڈ بن گئی۔ وہ ہاتھیوں کے باڑے میں لے گئی اور اسے بتایا کہ کوکی بالی اور موتی کس طرح بالمیر آئے تھے اس نے اصطبل دکھائے اور پینٹنگ میں بالمیر کے گھڑ سواروں کے کارنامے سنائے جو خود جیہ نے میجر ویر سنگھ کی زبانی سن رکھے تھے۔ جیہ نے قلعے کی دیواروں پر ہاتھوں کے وہ نشانات بھی جیمس کو دکھائے جو بالمیر کی قدیم مہارائیاں ستی ہونے سے پہلے ثبت کیا کرتی تھیں تاکہ بھگوان قلعے کو ہمیشہ قائم رکھے۔ جب لڑکے کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار دکھائی دیئے تو جیہ کو کتنا پڑا کہ ہمارے مذہب میں ستی ہونے والی مہارائیاں کو بے حد مقدس مانا جاتا ہے۔

اس دوران جیہ جب کبھی اس کی گہری نیلی آنکھوں میں جھانکتی تو اسے زنان خانے کی خادماؤں اور خواجہ سراؤں کے تمبرے یاد آ جاتے۔ وہ خود کو کمزور محسوس کرنے لگتی اور یوں لگتا جیسے کسی گہرائی میں گرتی جا رہی ہے۔

اس سہ پہر کو جب وہ کوکی بالی کے کمرے میں اپنے جسم کا مساج کروا رہی تھی تو کوکی بالی نے اچانک ہی اسے مخاطب کیا تھا ”کیا تم اب بھی ٹکا کے دوست کو کرین سمجھتی ہو؟“

جیہ نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا لیکن اس کا چہرہ بتاتا تھا کہ اسے کوکی بالی

کا جملہ اچھا نہیں لگا اور جب کوکی بائی نے اسے طعنہ دیا کہ اب وہ دس سال کی ہو گئی۔ اور یہ کہ اب وہ بچی نہیں آدمی عورت بن چکی ہے تو مارے غصے کے جیہ لال سرخ ہو گئی تھی لیکن کوکی بائی کو کچھ کہنے کے بجائے خاموشی سے اٹھ کر ان کے کمرے سے نکل آ گئی۔

جیہ پولو گراؤنڈ کی طرف جا رہی تھی کہ اچانک انگریز لڑکے سے ٹکرا گئی وہ شرم۔ سرخ ہو گئی۔ اس کی آنکھیں جیسے زمین میں گڑی جا رہی تھیں۔ جیمس آبرن کا شریفانہ انداز اسے اندر سے درہم برہم کر گیا تھا۔ جب جیمس نے اس سے پوچھا کہ کیا اس نے اسے خوفزدہ کر دیا ہے تو جیہ نے منہ کھولا مگر کوشش کے باوجود کچھ کہہ نہ سکی۔ اسے اپنی زبانی بھاری لگ رہی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے الفاظ حلق میں اٹک گئے ہوں۔

وہ شرم اور لاج سے دھری ہو گئی اور زبان خانے کی جانب بھاگ کھڑی ہوئی۔ جونہی راہداری میں پہنچی خادمائیں اسے گھیر کر مہارانی کی خوابگاہ میں لے گئیں۔

جیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ سب سے پہلا خیال جو اس کے ذہن میں سانپ بن گیا۔ کلبلا یا وہ یہی تھا کہ شاید اس کی چوری پکڑ لی گئی ہے۔ اس کی آنکھوں کی کمائیاں اور دل۔ افسانے لوگوں پر بے نقاب اور عیاں ہو گئے ہیں۔

لیکن وہاں صورت حال ہی دوسری تھی۔ مہارانی نے ایک پارسل جیہ کو تھما دیا۔ ”تمہارے لئے ہمارے پاس ایک تحفہ ہے بیٹی!“ مہارانی نے نہایت شیریں لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ”یہ ایک ایسے شخص کی تصویر ہے جس سے ایک دن تمہاری شادی ہو گی۔“

جیمس آبرن کا ہیولی جیہ کے دل کے آئینوں میں تھرا کر رہ گیا۔ پانیوں پر بنی تصویر بھنور میں جا پھنسی۔ اس کے دل کی دھڑکن جیسے رک گئی اسے یوں لگا جیسے کسی نے نہایت بلندی سے اسے نیچے دھکا دے دیا ہو۔

وہ کانپتے بدن کے ساتھ مہارانی سے نظریں چرائے کھڑی رہی۔ ”سیرپور کی شیر دل مہارانی نے مہاراجہ سیرپور کے چھوٹی بھائی پرنس پر تپ کی تصویر بھجوائی ہے“ مہارانی کہہ رہی تھی ”ان کی خواہش ہے کہ پرنس پر تپ کے ساتھ تمہارا شادی کر دی جائے تاکہ تمہارے والد اور مہاراجہ سیرپور کے درمیان اتحاد ہو سکے۔“ جیہ کے ہوش و حواس اس کا ساتھ چھوڑنے لگے۔ وہ لہرا کے رہ گئی۔ اگر وہ خود کو سنبھالتی تو ہاتھی دانت پر بنی ہوئی تصویر فرش پر گر کر چمکتا چور ہو جاتی۔

جیہ نے سینے میں بھیکے ہاتھوں سے تصویر کو کچھ اور مضبوطی سے تھام لیا لیکن وہ اپنی
 ہمت کو چکنا چور ہونے سے نہ بچا سکتی تھی۔ اس محبت کو جس کا ذائقہ اس نے ذرا دیر پہلے
 اہلی بار چکھا تھا۔

پاکستانی
 ڈاٹ کام

جیہ کو اپنی ماں کی آواز کیسے دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔
 ”خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں بیٹی“ مہارانی، جیہ کی حالت کو کچھ اور سمجھی تھی۔
 پرنس پر تپ کا شمار ہندوستان کے خوبصورت مردوں میں ہوتا ہے اور اس کا بھائی مہاراجہ وکٹر
 ایک طاقت ور ریاست کا حکمران ہے اگر تمہاری شادی سیرپور میں ہو گئی تو وہاں تمہیں
 سہرے پنجرے میں کسی فاختہ کی طرح رکھا جائے گا۔“
 جیہ نے اپنی آنکھیں ہاتھی دانت کے اس ٹکڑے پر مرکوز کر دیں جو اب تک اس کے
 ہاتھوں میں تھا۔ گول چہرے والا ایک جوان آدمی اس کے سامنے تھا جس کی بڑی بڑی آنکھیں
 رخساروں پر جھکی ہوئی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر ہزار سی مسکراہٹ تھی۔ جیہ کے ذہن میں
 فوراً ایک ایسے جانور کا تصور ابھرا جو شکار کے لئے نکلا ہو۔
 مہاراجہ بے سنگھ جب مہارانی کی خوابگاہ میں داخل ہوا تو خدامیں اور دیگر خواتین اور
 ادھر کھسک گئیں۔

”یہ تصویر اس بچی کو کیوں دکھائی جا رہی ہے؟“ مہاراجہ کی باجھوں سے جھاگ نکلا
 رہے تھے ”سیرپور اور بالمیر کے درمیان کسی قسم کا اتحاد ناممکن ہے۔ سیرپوری، برطانویوں
 کے گود کے پالے ہوئے کتے ہیں۔ حکمران، وکٹوریہ کا منہ بولا بیٹا ہے وہ اس کا نام نہ صرف
 فخر سے لیتا ہے بلکہ اپنے آپ کو بھی مہاراجہ وکٹر کہلاتا ہے“ غصے کی زیادتی سے بے سنگھ
 آنکھیں جلنے لگیں ”کیا یہ کافی نہیں کہ ہمارا کو اگر ہم انگلینڈ نہ بھیجیں تو برطانوی ہمارے خلاف
 کچھ بھی کر سکتے ہیں؟ اب کیا وہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنی بیٹی کو کسی انگریز کی گود میں ڈال
 دیں؟“

معاملہ ختم ہو گیا لیکن جیہ کے ذہن میں اس خیال نے جڑ پکڑ لی تھی کہ ایک بچی
 حیثیت سے اس کی زندگی ختم ہوئی اور اب اسے کچھ ہی سال بعد قلعے سے باہر ایک
 اجنبی شخص کے ساتھ رہنے کے لئے بھیج دیا جانا تھا جسے وہ جانتی بھی نہیں تھی جو نئی
 حقیقت کا ادراک ہوا اس کے دل سے جیسے آہن کا خوف جاتا رہا۔
 دوسرے کی پوجا کے لئے کئی روز قبل تیار ہی شروع کی گئی تھی۔ ہاتھیوں کے نگران

نے اس روز کے لئے ہاتھیوں کو بطور خاص سجایا تھا ان کے جسموں پر طرح طرح کے نقش و نگار بنائے گئے تھے۔

موتی کی خاکی جلد رنگ برنگی سبزیوں میں کہیں کھو گئی تھی۔ اس کی ٹانگوں کے زخم اور بڑے سے سینے کے نیچے کوہرا کے زخم کا نشان بنایا گیا تھا۔ کانوں پر شیر کی تصویر تھی جبکہ اطراف پر ہرن بھاگ رہے تھے۔ ٹکا کے ہاتھی پر دوسرے مصوروں نے جنگل بنایا تھا۔ جس ہاتھی پر مہارانی اور زنان خانے کی دوسری عورتوں نے سوار ہونا تھا اس کے دو منزلہ ہودج پر پھولوں کے ہار ڈالے گئے تھے۔

پوجا کی صبح جیہ اپنے ہاتھی کے ہودج پر سوار ہوئی تو میجر ویر سنگھ گھڑ سوار دستے کے آگے اپنے گھوڑے پر سوار اسے نظر آیا تھا۔ ٹکا وزارتی کونسل کے ہاتھیوں کی قیادت کرنے والے ہاتھی کے نفرتی ہودج میں تھا جبکہ ہاتھیوں کے جلوس کے اختتام پر محافظوں کا دستہ تھا۔ موتی کو مہاراجہ نے اپنی سواری کے لئے منتخب کیا تھا۔ جے سنگھ جب جلوس میں شرکت کے لئے آیا تو ایک چوہی سیڑھی لگا دی گئی اور مہاراجہ زر و جواہر سے اٹے ہوئے ہودج میں سوار ہو گیا۔ میجر ویر سنگھ کی تلوار بلند ہوئی جو مہاراجہ ہودج کے اندر پہنچا تلوار والا ہاتھ نیچے ہو گیا اور ٹھیک اسی وقت قلعے کی توپوں نے گرجنا شروع کر دیا۔ مہاراجہ کو سات توپوں کی سلامی دی گئی تھی۔

جلوس روانہ ہوا تو نقارہ بجا کر اس کی اطلاع دی گئی۔ اس نقارے کا ساز ایک بڑے ہاتھی کی لمبائی کے برابر تھا۔ یہ قلعے کے بیرونی دروازے پر نصب تھا اور پچھلے گیارہ سو سال سے اسے بجا کر مہاراجہ کے جنگ پر روانہ ہونے کا اعلان کیا جاتا تھا۔

جلوس بڑے مندر کے سامنے رک گیا خواجہ سراؤں نے جالی دار پردے تان دیئے اور جیہ اپنی ماں اور دیگر خادماؤں کے ساتھ ہاتھی سے اتر کر مندر میں داخل ہو گئی، جیہ کو پردے کے باوجود وہ مینڈھا صاف دکھائی دے رہا تھا جو دیوی کی بھیئت کے لئے قریان گاہ پر باندھا گیا تھا۔

پجاریوں نے مہاراجہ کے القاب و آداب پڑھنے شروع کئے تو وہ آگے بڑھ کر قریان گاہ تک پہنچ گیا۔ اب اس نے بالمیر کی شاہی تلوار سر سے بلند کر دی۔ تلوار کا چمکتا ہوا پھل وہاں موجود تمام افراد کو صاف دکھائی دے رہا تھا۔ لوگ خاموش ہو گئے۔ ایسے عالم میں اگر وہاں سوئی بھی گرتی تو اس کی آواز سنائی دیتی۔ اچانک جے سنگھ کی تلوار بلند ہوئی اور اس کا ننگا پھل گوشت کو کاٹتا چلا گیا۔ خون مینڈھے کے نیچے پڑے ہوئے چارے اور پھلوں پر گرا

تھا۔

ہجوم سے ایک شور بلند ہوا لیکن بے سگھ کی تلوار دوبارہ اوپر نہیں آئی تو آوازیں اچانک ہی دم توڑ گئیں۔ جیہ نے اپنے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی محسوس کیں۔ بالآخر مہاراجہ کا ہاتھ اٹھا اور مینڈھے کا سرکٹ کر دور جاگرا۔ اس کی سیاہ زبان اور آنکھیں اب بھی حرکت میں تھیں۔

پجاراں اپنے اپنے نقرئی پیالے لے کر آگے بڑھے تاکہ مینڈھے کی کٹی ہوئی شریانوں سے اپنے والا خون جمع کر سکیں۔ فضا ”دیوی کی جے ہو۔ مہاراجہ کی جے ہو“ کے نعروں سے گونج اٹھی تھی۔

ایک پجاری مہین پر دوں کے سامنے نمودار ہوا۔ مہارانی نے تازہ اور گرم لہو سے پہلے اپنی پیشانی اور پھر جیہ کی پیشانی پر نشان بنایا۔ جیہ کے جسم میں ایک عجب سی لرپیدا ہوئی تھی۔ پجاری پیالہ لے کر دوسری جانب چل دیا۔ ہر طرف خون ہی خون نظر آ رہا تھا۔ لوگوں میں بھاگ دوڑ شروع ہو گئی تھی وہ بھینٹ کے خون میں اپنے ہاتھ رکتے کو بے چین نظر آتے تھے۔

”یہ درست ہے مہارانی صاحب!“ کوکی بائی نے سرگوشی کی ”مہاراجہ نے دوبارہ تلوار نہیں اٹھائی۔“

”بھینٹ ایک وار سے نہیں چڑھائی گئی“ مہارانی نے خود کلامی کے انداز میں کہا ”اس لئے بھینٹ پوتر نہیں ہے۔“

جے سگھ مندر سے واپس چل دیا۔ تلوار اب اس کے دائیں ہاتھ میں تھی جس سے خون ٹپک رہا تھا۔ جیہ اپنے والد کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار دیکھ کر خوفزدہ سی ہو گئی تھی۔ اس کا خوف اپنی ماں کے جملے سن کر دوچند ہو گیا تھا۔

”مہاراجہ جانتے ہیں کہ بھینٹ مقدس نہیں ہے یہ تخت و تاج کے لئے برا شگون ہے۔“

جلوس جونہی واپس قلعے میں پہنچا جیہ اپنے بھائی کو مہارانی کی پیش گوئی بتانے کے لئے بھاگ کھڑی ہوئی۔

”احتمالاً رسم ہے“ ٹکا کا جواب جیہ کی توقعات کے بالکل خلاف تھا ”میری تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ بابا ہر سال بھینٹ دیتے کیوں ہیں؟ کیا وہ نہیں جانتے کہ اب ہم بیسیویں صدی میں داخل ہو چکے ہیں۔“

دوسرے کی پوجا کے فوراً بعد قلعہ خالی ہونا شروع ہو گیا۔ مہاراجہ اور اس کے درباری اہل جا رہے تھے جہاں تاجدار برطانیہ جارج پنجم کی شاہ ہندوستان کی حیثیت سے تاج پوشی کا ارہار منعقد ہونے والا تھا۔ آخر کار ہندوستانی اس ہستی کو دیکھنے جا رہے تھے جس کا نام لے کر انگریز کئی سالوں سے ان پر حکومت کر رہے تھے۔ کسی برطانوی تاجدار کی ہند میں تاج پوشی، تاریخ کا پہلا واقعہ تھا۔

وائسرائے نے جشن تاج پوشی میں شرکت کرنے والوں کے لئے خیموں کا ایک شہر بسایا تھا جس پر بے دریغ دولت لٹائی گئی تھی۔ دہلی میں چالیس ہزار خیمے نصب کئے گئے تھے۔ ان میں سے بعض خیمے اتنے بڑے تھے کہ ان میں ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم، خوابگاہیں اور ابھیریاں تک موجود تھیں۔ باقاعدہ پولو گراؤنڈ اور پھولوں کے باغ لگائے گئے تھے جبکہ آنے والوں کی سہولت کے لئے چھتیس ریلوے جنکشن اسٹیشن تعمیر کئے گئے تھے۔

راجہ مان سنگھ اور وزیر اعظم سب سے پہلے کاریں اور ریاستی بگھی لے کر قلعے سے روانہ ہوئے اس کے بعد میجر ویر سنگھ گھڑ سواروں کے حفاظتی دستے کے ہمراہ دہلی گیا تھا۔ وہ ترین کے ذریعے گئے تھے۔

”آپ دہلی کیوں نہیں گئیں، مسزرائے؟“ جیہ نے اپنی ٹیوٹر سے پوچھا وہ اس بات پر ہنسی بٹھی تھی کہ اسے مہارانی نے مہاراجہ اور نکا کے ہمراہ دہلی جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ ”تاج پوشی کا دربار اب تک ہندوستان میں ہونے والی تمام تقریبات سے خوبصورت ترین ہو گا۔“

مسزرائے نے شاید جھلا کر چائے کا کپ پرچ میں رکھا تو خاصی آواز پیدا ہوئی تھی ”برطانوی راج ہر پانچ سال بعد ایسی شاندار تقریبات منعقد کر کے ہندوستان کو کھوکھلا کر رہا ہے۔ پہلے وکٹوریہ کی ڈائمنڈ جوبلی، پھر کرزن کا شاہی دربار اور اب یہ قطعی غیر ضروری دربار تاج پوشی۔“

”لیکن مسزرائے، تصور تو کریں کہ خیموں کا ایک پورا شہر بسایا گیا ہے۔“

”درست“ مسزرائے نے ایک طویل سانس لی ”مغربی ہند میں لوگ اب بھی قحط سے مرے جا رہے ہیں اور دوسری طرف برطانوی راج نے خیموں کا شہر بسانے پر لاکھوں پاؤنڈ خرچ کر ڈالے ہیں اور اب ہندوستان کی کمائی میں سے مزید لاکھوں پاؤنڈ شاہی تاج پر خرچ کئے جائیں گے۔“

”لیکن شاہ کو شہنشاہ کا تاج پہنایا جا رہا ہے، ظاہر ہے تاج تو ہو گا۔“

ٹیوٹر نے شانے جھٹکے ”طاقت بادشاہوں کا تاج ہوتی ہے، شہزادی، جارج پنجم کو کسی تاج کی ضرورت نہیں۔ اس وقت کون ہے جو برطانوی تاج کی طاقت کا معترف نہ ہو؟ انگریز دارالحکومت کلکتہ سے دہلی منتقل کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ انہوں نے لاکھوں پاؤنڈ کی مالیت سے ایک نیا شہر بسایا ہے یہ شہر ہندوستانیوں کی لاشوں پر بسایا گیا ہے اور تم پوچھتی ہو کہ میں دہلی کیوں نہیں گئی؟“

مہرزائے کو غصے میں دیکھ کر جیہ خاموشی سے چائے پینے لگی اب اسے اس بات پر کون دیکھ نہ تھا کہ ٹکا تو دہلی میں موجود ہے لیکن وہ نہیں تھی۔

جیہ نے کوئی اور مصروفیت نہ دیکھی تو رائفل اٹھالی۔ دن بھر وہ نشانے بازی کی مشق کرتے گزار دیتی۔ اس نے کبوتروں کی لاشوں اور بوتلوں کی کرچیوں کے ڈھیر لگا دیئے تھے کئی دن اس نے گولیوں سے چھید ڈالے تھے۔ اس کی خواہش تھی کہ شکار کا موسم آنے سے پہلے اپنا نشانہ اتنا بہتر کر لے کہ کم از کم ایک شیر کا شکار کر سکے۔ ٹکا نے اپنی اسٹڈی دیواروں پر تین شیروں کی کھال لٹکا رکھی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ ٹکا کی برتری ختم ہو جائے لیکن جب شاہی قافلہ واپس پہنچا تو دربار تاج پوشی کی داستانیں ٹکا کی زبانی سن کر جیہ اپنی ٹیوٹر کے اعتراضات یکسر بھول گئی۔

”رانجی خالص چاندی کی بنی ہوئی بگھی میں آیا تھا جبکہ مہاراجہ پٹیلہ پگڑی باندھ سات فٹ کا لگتا تھا لیکن بد قسمتی سے انگلینڈ کا بادشاہ قد کا چھوٹا ہے۔ جب دہلی میں اس سرکاری آمد ہوئی تو ہم اسے دیکھ بھی نہیں سکے۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ ہاتھی پر آئے گا لیکن اس نے کہا کہ جب تاج برطانیہ کا بادشاہ گھوڑے پر سواری کر سکتا ہے تو ہندوستان کا بادشاہ کیوں نہیں کر سکتا۔“

”اور دربار؟“

”شاہی خاندان دو تختوں پر براہمن تھا جبکہ ان کے طویل و عریض لباس سیڑھیوں پہلے ہوئے تھے۔ بہوودہ کے مہاراجہ نے کوئی زر و جواہر نہیں پہنے بلکہ اس نے پوری دھڑلے کے سامنے شہنشاہ کی طرف پشت کر کے اس کی توہین کر دی۔“

”تو کیا اسے اس کے تخت سے محروم کر دیا گیا؟“

”ہر کوئی یہی کہہ رہا تھا۔“

”اور پھر؟“

”ہر شب وہاں پارٹیاں ہوتی تھیں۔ ہر حکمران کو اپنے محل جیسا خیمہ رہنے کو دیا گیا

جس کے دروازے پر باوردی محافظ مستعد کھڑے رہتے تھے۔ مہاراجہ بیکانیر کے خیموں کے سامنے اونٹوں کی ایک طویل قطار تھی۔ وہ اپنے ذاتی محافظوں کے طور پر اونٹ سوار فوجی دستے لایا تھا اور ہاں ایک رات وہاں آگ لگ گئی اور تاج پوشی کے لئے آتشبازی کی غرض سے جمع کیا جانے والا سارا سامان جل کر راکھ ہو گیا۔ بہر حال تمام لوگوں میں سے سیرپور کی رہائش گاہیں سب سے بہتر تھیں۔ سیرپور کے بھائیوں کے پاس ایک ہل روم ٹینٹ، شیشے کا ایک بہت بڑا جھاڑ اور پچیس حصوں پر مشتمل ڈانس بینڈ تھا۔ مہاراجہ وکٹر اور شہزادہ پرناپ عظیم کھلاڑی ہیں۔ تمام غیر ملکی عورتیں ان سے محبت جتا رہی تھیں۔ جن میں روسی کاوٹیس، فرانسیسی مارکونیز اور امریکہ سے آنے والی فلمی اداکارائیں تک شامل تھیں۔“

نکا شرارتی انداز میں مسکرایا ”اگر تم تھوڑی سی بڑی ہوتیں جیہ، تو تم سیرپور کے شہزادے کے ساتھ بیاہ کر لیتیں۔ پھر میں تم سے ملنے آتا اور ہم دونوں مل کر پولو اور کرکٹ کھیلتے اور خوب رقص کرتے۔“

جیہ کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے۔ اسے ایک بور آدمی کی، ہاتھی دانت پر بنی تصویر یاد آ گئی تھی۔

اس سہ پہر جیہ مہارانی کے ساتھ بالکونی میں بیٹھی دربار ہال کی کارروائی دیکھ رہی تھی جہاں امراء اور عوام دہلی سے مہاراجہ کی بالمر واپسی پر اس کے دیدار کے لئے آئے تھے برٹش پولیٹیکل آفیسر مہمان خصوصی تھا۔ سیاہ سوٹ پہنے ہوئے وہ مہاراجہ کے برابر میں اکڑا بیٹھا تھا۔

لیکن جب وقت گزرتا رہا اور آنے والوں کی طویل قطار میں کوئی کمی نہ آئی تو اس کی اکڑ میں ڈھیلا پن آتا گیا۔ خود جیہ بھی اس طویل کارروائی سے بیزار ہو گئی تھی۔ اس پر غنودگی طاری ہو رہی تھی لیکن ایسے میں بھی اسے وہ راقفل یاد تھی جو اس کے والد دہلی سے اس کے لئے لائے تھے۔ جیہ کی خواہش تھی کہ وہ شیر کا شکار اسی راقفل سے کرے۔

مہارانی نے راجہ مان سنگھ اور وزیر اعظم کی طرف اشارہ کیا جو ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں مصروف تھے ”ان کی خوشی دیکھو، آج تمہارے والد نے تعلیم کے لئے نکا کو انگلینڈ بھیجنے کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔ کتنے سنگدل ہیں انگریز، جو ایک باپ سے اس کا بیٹا چھین رہے ہیں اور وہ بھی امن کے زمانے میں۔ اگر ہم حالت جنگ میں ہوتے اور وہ تمہارے بھائی کو برغالی بنا کر اپنے ساتھ انگلینڈ لے جاتے تو....“

مہارانی خاموش ہو گئی جیہ نے آگے جھک کر نیچے دیکھا، نکا اور جیمس آبرن کسی بات

پر ہنس رہے تھے۔ اسے اپنا بھائی کیس سے بھی پریشان نظر نہیں آ رہا تھا۔
 آخر کار اگلے روز شکار کا موسم شروع ہو گیا سورج طلوع ہونے سے ایک گھنٹے پہلے جیہ
 اپنے والد اور کیپٹن آبرن کے درمیان کار میں بیٹھ کر جنگل کی طرف روانہ ہوئی۔
 نیم خوابیدگی کے عالم میں جیہ نے جے سنگھ کی آواز سنی ”انگریز اور کب تک ہندوستان
 میں رہیں گے، کیپٹن صاحب؟ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ وہ ہندوستان کو اس کے اصل حکمرانوں
 کے ہاتھوں میں دے دیں؟“

انگریز نے سگار کی راگھ کار کی کھڑکی سے باہر جھاڑی اور بولا ”اگر ہم چلے جائیں تو کیا
 ہندوستان کے عوام اپنے حکمرانوں کی طرف لوٹ جائیں گے؟ ان میں سے بیشتر حکمرانوں کو
 سوائے قیّش پسندی کے اور کوئی کام نہیں؟“

”تو دہلی میں جو کچھ ہوا“ اس سے برطانوی راج کی قیّش پسندی ظاہر نہیں ہوتی؟“
 ”وہ ایک اشاراتی تقریب تھی، یورپائی نہیں۔۔۔ یوں تو شاہ جارج ایک برائے نام حکمران
 ہیں۔ ہندوستانی حکمرانوں کی طرح وہ اختیارات کا مرکز نہیں۔ کسی فقیر منش انسان کے لئے
 اتنی زیادہ طاقت و قوت کے ساتھ حکومت کرنا ایک مشکل امر ہے اور شاہی ہندوستان پر
 حکمرانی کرنے والے پانچ سو مہاراجاؤں میں سے صرف چند ایک فقیر منش انسان ہیں۔“
 ”لیکن برطانوی ہندوستان کا انتظام چلانے والے دس ہزار انگریزوں میں بھی تو فقیر منش
 ہوں گے؟“

”ہمارے قوانین نے اس کی ضرورت ختم کر دی ہے یہی وجہ ہے کہ ٹکا وہاں بہت کچھ
 دیکھے گا۔“

سڑک کے کنارے دیہاتیوں کا ایک گروہ دیکھ کر مہاراجہ کار سے اتر گیا لیکن جیہ کو اس
 سے ان سے مہاراجہ کی بات چیت سے کوفت ہو رہی تھی کیونکہ ٹکا اور جیمس آبرن ایک
 ہاتھی پر سوار جنگل کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔

جے سنگھ کار میں واپس آ گیا ”مسٹر رائے کی منہروں نے اس فصل میں بہت مدد کی ہے
 کیا آپ جانتے ہو کیپٹن صاحب کہ برطانوی راج نے جو سب سے برا کام کیا ہے وہ کیا ہے؟
 ہمیں یعنی ہندوستان کے باواشاہوں کو اب اپنے عوام سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں رہ
 گئی۔ وہ ہمیں سزا نہیں دے سکتے اب یہ اختیارات غیر ملکیوں کو مل گئے ہیں“ اس نے جیہ
 کے رخسار تھپتھپائے ”آج ہماری بچی شیر کا شکار کرے گی کیا تم جانتی ہو کہ جنگل کا خطرناک
 ترین جانور کون سا ہے؟“

جیہ نے اپنی گن کو مضبوطی سے پکڑ لیا اسے خوشی ہوئی تھی کہ بات چیت کا موضوع آخر کار شکار کو بنالیا گیا تھا ”ہر کوئی جانتا ہے بلا۔ زخمی شیر!“

”کیوں؟“

”زخمی شیر فطری انداز میں شکار نہیں کر سکتا اس لئے وہ آدم خور بن جاتا ہے، حکم!“

کیپٹن آبرن ہنسا تو بے سنگھ اس کی طرف پلٹ گیا ”میری صورت حال ہمارے ساتھ بھی ہے کیپٹن!“ مہاراجہ کا لہجہ بے حد تلخ تھا ”زخمی شیر کو مار دینا انصاف ہے اور تم انگریز اس لفظ یعنی انصاف سے بے حد محبت کرتے ہو۔ ہمارے پاس بھی کبھی انصاف کا کوئی نظام تھا، کیپٹن۔ ہمارے بھی چند قوانین تھے لیکن تمہاری بادشاہت نے ہماری فوجیں تحلیل کر دیں، معززین کو رسوا کر دیا، تعلیم یافتہ لوگوں کو بے کار کر دیا اور پجاریوں کو بے عزت کر دیا آزادی کی آواز کے سوا ساری آوازیں برطانوی راج نے سنیں۔ تم لوگ انتہائی اعتماد کے ساتھ ہندوستان کے جنگلوں میں گھس آئے لیکن تم کیا ہو کیپٹن صاحب؟ فاعل یا مفعول؟ بے قصور یا مجرم؟ تم لوگ بھی شکاری ہو نا؟ ہندوستانیوں کا خوب شکار کیا ہے تم لوگوں نے لیکن تم لوگ ہمیں زخمی کرنے کے بجائے جان سے کیوں نہیں مار دیتے؟“

کیپٹن آبرن خاموش بیٹھا رہا۔ جیہ کن انکھیوں سے اپنے والد کو دیکھ رہی تھی وہ اتنے شدید غصے میں تھے کہ جنگل کی سمت سے آنے والی ٹھنڈی ہوا بھی گرم محسوس ہو رہی تھی۔ تین ہاتھی آگے پیچھے جنگل میں داخل ہوئے تھے۔ اگلے ہاتھی پر میجر ویر سنگھ دوسرے پر نکا اور کیپٹن آبرن اور تیسرے ہاتھی پر جیہ اور جیمس آبرن سوار تھے۔

جیہ بے حد پر جوش تھی۔ وہ بار بار اپنی گن کی بیرل پر ہاتھ پھیرتی اور دل ہی دل میں دیوی سے پرارتھنا کرتی کہ آج اس کا نام بھی شیر کے شکاریوں میں لکھا جائے۔

ہسٹل سے ہونے والا اکلوتا فائر اس بات کا اشارہ تھا کہ شیر کو دیکھ لیا گیا ہے۔ جیمس آبرن نے اپنی گن کا سیفٹی کیچ ہٹا لیا جبکہ جیہ کی انگلی اپنی رائفل کے ٹرائیگر پر سختی سے جم گئی تھی۔ اچانک ہی نکا کے ہاتھی کے سامنے سیاہ اور زرد دھاریوں والی کوئی تیز رفتار شے لہرائی۔ نکا نے فوراً ہوا میں گولی چلا دی۔ جیہ کو اندازہ ہوا کہ اس کا بھائی شیر کو اس کی طرف دھکیل رہا ہے وہ جھاڑیوں کی جانب گمراہ ہو گئی جبکہ اس کی گن مہات کی پگڑی کے اوپر سے شکار کو تلاش کر رہی تھی۔

شاخیں ٹوٹنے کی آواز عقب سے سنائی دی جیہ تیزی سے پلٹی۔ شیر کوئی سو فٹ کے فاصلے پر اپنی پچھلی ٹانگوں پر بیٹھا چھلانگ لگانے کو بالکل تیار تھا۔ جیہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً

ٹرائیگر دبا دیا۔ گولی کی قوت سے شیر اچھل کر پیچھے گرا۔ جیہ نے ایک سیکنڈ کے لئے آنکھیں بند کر لیں لیکن جب اس نے پلکیں دوبارہ اٹھائیں تو شیر ایک بار پھر چھلانگ لگانے کو تیار تھا۔

ہاتھی خوفزدہ ہو کر اچانک بھاگ کھڑا ہوا۔ شیر نے فوراً اس کا تعاقب کیا۔ زخم کے باعث شیر کی رفتار قدرے کم تھی۔ درختوں کی شاخیں جیہ کے چہرے پر لگ رہی تھیں جبکہ مہاتو ہاتھی کو قابو کرنے کی ناکام کوششوں میں مصروف تھا۔

جیس آبرن بھاگتے ہوئے ہاتھی پر اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوششوں میں مصروف تھا جیہ نے اپنی گن پھینکی اور اس کی کمر سے لپٹ گئی تاکہ توازن برقرار رکھنے میں اس کی مدد کر سکے۔ شیر نے ایک فلک دھاڑ کے ساتھ ہاتھی کی جانب ایک لمبی چھلانگ لگائی۔ اس کی باپھیں مٹی سے لتھڑی ہوئی تھیں جبکہ تکلیف کے مارے چہرہ بگڑ کر کچھ اور خوفناک ہو گیا تھا۔

جیس نے نشانہ لے کر فائر کیا۔ گولی نے شیر کا حلق پھاڑ دیا۔ وہ ایک لمحے کے لئے ہوا میں جیسے معلق سا ہوا اور پھر زمین پر گر پڑا، ہاتھی محض چند انچ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ مہاتو نے خوفزدہ ہاتھی کو روک لیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، شیر بے حس و حرکت تھا۔ مہاتو نے درختوں کی چند شاخیں توڑ کر شیر پر پھینکیں لیکن جنگل کا بادشاہ کوئی رد عمل ظاہر کرنے کے لئے زندہ نہیں رہا تھا اور پھر مہاتو کی چیخ جنگل کا سینہ چیرتی چلی گئی۔ یہ گویا شیر کی موت کا اعلان تھا۔

جیہ کو اپنا بدن خوف سے کانپتا محسوس ہو رہا تھا۔ جیس نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا اس کے جسم پر لگے ہوئے بارود کی بو جیہ کو اپنی ناک میں محسوس ہوئی تھی۔ وہ بہت دیر جیہ کو قید کئے کھڑا رہا حتیٰ کہ جیہ کا بدن پرسکون ہو گیا۔ اس نے نظریں اٹھائیں تو جیس آبرن اسی کو دیکھ رہا تھا۔ جیہ کو محسوس ہوا کہ وہ ہرے اور نیلے سمندر میں تیر رہی ہے۔

”آپ کا پہلا شکار، شہزادی۔ مبارک ہو۔“ وہ ہولے سے بولا تھا۔

نکا اور جیس آبرن کے انگلیٹ چلے جانے کے بعد بھی کیپٹن آبرن بالمیر میں مقیم تھا مہاراجہ نے کیپٹن آبرن سے کہا تھا کہ وہ بالمیر یونیورسٹی کے قیام اور اس کی توسیع میں مدد دے۔

شہای جھروکے کی شام کی محفلوں میں اب ایک نئے سائنس کالج کے قیام کے معاملات پر بحث ہونے لگی تھی۔ مسٹر رائے اور کیپٹن آبرن اکثر مہاراجہ کے ساتھ مل کر عمارت

کے نقشوں یا اسٹاف کے ناموں پر تبادلہ خیال کرتے۔ جے سنگھ اپنے بیٹے کا کبھی کبھار ہی ذکر کرتا تھا۔

ٹکا کے خطوط سے کہیں اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ گھر والوں کو یاد کرتا ہے لیکن خط میں وہ کسی دوست کا ذکر بھی نہیں کرتا تھا پر جوش خطوط میں مہاراجہ کو یہ بھی بتایا جاتا تھا کہ ٹکا نے اسکول کی کرکٹ ٹیم میں سب سے زیادہ اسکور کیا لیکن ساتھ ہی یہ نوٹ بھی تحریر ہوتا تھا کہ اسے اسکول ٹیم میں منتخب نہیں کیا گیا۔

بھائی کا نام سنا تو جیہ جھروکے کے دروازے پر ٹھہر گئی ”تم نے بتایا تھا کہ انگریز لوگ کرکٹ کے دیوانے ہیں اور اس کھیل میں وہ بے ایمانی بالکل نہیں کرتے، کیپٹن صاحب پھر آخر ہمارے بیٹے کو اسکول ٹیم میں شامل کیوں نہیں کیا گیا جبکہ وہ اپنے ساتھیوں سے کہیں زیادہ بہتر کھلاڑی ہے؟“

”پورا ہائی نہیں.... اگر ہم بچوں کے ساتھ دنیا میں ہونے والی ناانصافی میں الجھ....“
”بد قسمتی سے ناانصافی بچوں والی نہیں ہے کیپٹن صاحب!“ مہاراجہ نے آہرن کا جملہ پورا نہیں ہونے دیا۔ ”یہ اسکول کے قوانین ہیں جو ایک کالے کو اسکول کی سرگرمیوں میں شرکت سے روکتے ہیں۔ کیا تم یہ نہیں کہتے کہ تمہاری بادشاہت کے قوانین سب کے لئے ایک سے ہیں؟“

کیپٹن آہرن کا چہرہ سرخ ہو گیا ”ممکن ہے ٹکا کو اس تجربے سے کوئی فائدہ حاصل ہو اور وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سیکھ لے۔“

مہاراجہ نے اٹھ کر بالکونی سے نیچے شہر کی روشنیاں دیکھیں ”تم لوگوں نے ہمیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قاتل چھوڑا ہی کب ہے؟“

لیکن جیہ جانتی تھی کہ مہاراجہ اب بھی بہت کچھ کر سکتا تھا۔ مہاراجہ نے اسے ہدایت کر دی کہ وہ راج نیٹی کا سبق پڑھے۔ حکومت چلانے کا فن جو کم از کم انگلینڈ میں رہ کر ٹکا نہیں پڑھ سکتا تھا۔ بوڑھے استاد کے ساتھ اس کی موسیقی کی کلاسیں اور مسز رائے کے ساتھ سبق ختم کر دیئے گئے۔ اب اس کا زیادہ تر وقت قلعے کی لائبریری میں گزرتا جو پرانے سرکاری دفاتر، جنہیں نئے دفاتر معتمدی بننے کے بعد متروک قرار دے دیا گیا تھا کے اوپر واقع تھی۔

ایک روز جب جیہ لائبریری کی دیوار پر آویزاں جے پور کے مہاراجہ جے سنگھ اور نامور اسکالر، کوچین کے مہاراجہ ورما کی تصویریں دیکھ رہی تھی، عقب سے کسی نے کھنکار کر اپنی

جانب متوجہ کیا۔ جیہ فوراً پلٹی اور یہ دیکھ کر وہ پسینے میں شرابور ہو گئی کہ بالمر کا مہا پجاری راج گورو کمرے میں موجود ہے۔

جیہ، مہا پجاری کی موجودگی سے کچھ خوفزدہ ہو گئی تھی۔ مہا پجاری صبح تین بجے اٹھ کر پہلے یوگا کی پریکٹس کرتا تھا اور پھر قلعے کے مندر میں سرکاری پوجا کرواتا تھا۔ وہ گھنٹوں ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر پوجا کرتا تھا لیکن جیہ نے اسے گرمیوں کی کڑی دوپہر میں بھی کبھی پانی پیتے نہیں دیکھا تھا۔

جیہ کا خوف دراصل پجاری کی عالمانہ حیثیت سے تھا جس کے بالمر کے حکمران دل و جان سے معترف تھے۔

جیسے گرد کے طوفانوں میں خشک پتے، شاخوں سے ٹوٹ کر دھرتی کے سینے پر بکھرتے ہیں تو ایک عجیب سی آواز پیدا ہوتی ہے، بالکل اسی طرح مہا پجاری کی آواز جیہ کے کانوں کو اجنبی محسوس ہوئی تھی۔

”بادشاہت کے چار اصول بتاؤ، شہزادی۔“

”سام۔ یعنی بادشاہ لازمی طور پر اپنے عوام کی ضروریات کا خیال رکھے۔ دان۔ یعنی ہمیشہ ان کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرے۔ ڈنڈ۔ نا انصافی پر مشتمل سزائیں نہ دے۔ بھید۔ بادشاہت کے مفاد میں معاہدوں اور اتحادوں کی قدر کرے۔“

”بادشاہ کے فرائض بتاؤ، شہزادی۔“

جیہ نے ایک بادشاہ کے کئی فرائض بیان کر دیئے۔

”اگر بادشاہ اپنے فرائض بہتر طور پر انجام دے، تو اس کا انعام کیا ہے، شہزادی؟“

”تو عوام اس کی صلاحیتوں کے اعتراف کے طور پر اس کے سامنے سر جھکا دیں۔“

”اور اگر بادشاہ میں کوئی صلاحیت نہ ہو تو؟“

”اس سے حکمرانی کا حق چھین لینا چاہئے۔“

”انگریزوں نے بادشاہت کو خاندانی حق قرار دیا ہے، کیا ہم اس پر یقین رکھتے ہیں؟“

شہزادی؟

”نہیں، حکم! صلاحیت، حکمرانی کا حق ہے پیدائش نہیں۔“ جیہ نے جواب دیا۔

میتوں جیہ دیوانی اور فوجداری معاملات میں عدالتی طریقہ کار کے بارے میں تربیت حاصل کرتی رہی۔ اسے پتا چلا کہ برطانوی ہندوستان کا مالیاتی نظام، چانکیہ کے مالیاتی نظام کی جدید شکل ہے۔ اس نے مختلف جرائم میں دی جانے والی سزاؤں کے بارے میں پڑھا۔ اسے

بتایا گیا کہ سب سے سخت سزا جلاوطنی ہے اور وہ انگریزوں کے سرد ملک کو نکا کی جلاوطنی کے بارے میں سوچے بغیر نہ رہ سکی۔

قلعے کی لائبریری میں جیہ کی تربیت نے کئی تضادات کو جنم دیا۔ راج گورو اپنی خشک آواز میں اسے بادشاہت کی اونچ نیچ سکھا رہے تھے جبکہ دوسری جانب مسز رائے دنیا کے مختلف ممالک میں دم توڑتی بادشاہتوں کے بارے میں اسے بتا رہی تھی۔

”ان آخری سالوں میں جو کچھ ہوا ہے، اسے ذہن میں رکھو، شہزادی۔“ مسز رائے نے اسے بتایا۔ ”پرنگال کے شاہ کو قتل کر دیا گیا اور پرنگال جمہوریہ قرار پائی۔ چین میں منچو شہنشاہیت کا خاتمہ ہو گیا۔ جمہوریت پسندوں نے یونان کے بادشاہ کو قتل کر دیا۔ سلطنت عثمانیہ کا سلطان انقلابیوں کے ہاتھوں تخت سے محروم ہو گیا جو سب کے سب نوجوان ترک تھے۔ روسی بادشاہت کا وزیر اعظم قتل ہو گیا اور زار روس کی بیوی نے ایک پاگل راہب راسپوٹین کو ملک پر حکمرانی کا اختیار دے دیا اور زار کچھ نہ کر سکا۔“

”جہاں تک اس عظیم برطانوی بادشاہت کا تعلق ہے۔۔۔۔۔ آئرلینڈ میں انگریزوں کے خلاف بغاوت ہو چکی اور یہاں وائسرائے کی دہلی آمد پر اس پر بم سے حملہ کیا گیا۔ مسز رائے ظالمانہ انداز میں ہنسی۔ ”میری بات لکھ لیں شہزادی۔ برطانوی بادشاہت اپنے دو زخموں سے بننے والے خون کے نتیجے میں دم توڑ دے گی۔ ان میں سے ایک زخم ہوم رول برائے آئرلینڈ اور دوسرا ہوم رول برائے ہندوستان ہے۔“

کبھی کبھار جیہ سوچتی کہ میجر دیہ سنگھ کے ساتھ گزرنے والی شامیں اس کی زندگی کے بہترین لمحات ہیں کیونکہ ایسے میں وہ صرف نشانہ بازی کرتے اور شکروں، عقابوں اور چیتوں کے ذریعے شکار کھیلتے۔

اگلے ایک سال کے اندر نئے کالج کی تعمیر شروع ہو گئی۔ کیپٹن آبرن اور مسٹر رائے بہت دیر تک زیر تعمیر کالج کی جگہ پر موجود رہتے تھے۔ مہاراجہ بلیئرڈ روم میں ان کی واپسی کا انتظار کرتا، ایسے میں کبھی کبھار وہ جیہ کو بھی وہیں بلا لیتا اور بلیئرڈ کو بھول کر راج نیٹی کے حوالے سے اپنی بیٹی کے ساتھ ایک طویل بحث کرتا۔

نکا کو انگلینڈ گئے دو سال ہو چکے تھے۔ اس عرصے میں آنے والے خطوط سے انداز ہوا کہ اس نے وہاں سیرپور کے شہزادوں کے ساتھ جو وقت گزارا وہ اس کی زندگی کا بہترین اور شاندار حصہ ہے۔

جب سیرپور کی پولو ٹیم نے ہر لنگھم کپ میں حصہ لیا تو مہاراجہ وکٹر نے نکا کو سرے

میں اپنے کنٹری ہاؤس میں رہنے کے لئے بلایا۔

”امریکی فلمی اداکارائیں مہاراجہ وکٹر کی کمزوری ہیں اور پرنس پرتاپ فرانسیسی لڑکیوں کو پسند کرتا ہے۔“ نکا نے خط میں لکھا تھا۔ ”میں نے پرنس پرتاپ سے دریافت کیا کہ آپ لوگ ہندوستانی عورتوں کے ساتھ وقت کیوں نہیں گزارتے تو اس نے جواب دیا کہ ہندوستانی عورتیں ایسی بھینسیں ہیں جنہیں ضرورت سے زیادہ کھلا دیا گیا ہے۔“

ایک اور خط میں نکا نے لکھا۔ ”پرنس پرتاپ نے مجھے اپنا نیا بال روم ڈانس جسے ٹانگو کہتے ہیں، سکھانے کے لئے ایک رقاص کو ملازم رکھا ہے۔ یہ اس سیزن کی وبا ہے۔ پرنس پرتاپ کہتا ہے کہ جسے ٹانگو نہیں آتا وہ جاہل ہے۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ جب میں ٹانگو سیکھ جاؤں گا تو وہ میرے لئے ایک فلمی اداکارہ بلوائے گا اور پھر ہم ڈانس کرنے رنر جائیں گے۔“

ایک شام وہ پولو گراؤنڈ سے واپس آئی تو نکا کا ایک خط اسے اپنے بیڈ پر رکھا ملا۔ اس نے لفافہ چاک کیا تو ایک تصویر فرش پر جاگری۔ پشت پر نکا نے لکھا تھا۔ ”میری سالگرہ پر میرا نعم البدل۔“

جیہ نے تصویر پلٹی اور اس کا دل جیسے دھڑکنے لگا۔ جیس آہرن اس کے بھائی کے برابر کھڑا تھا۔

جیہ یک ٹک تصویر دیکھتی رہی اور جیس کی وجاہت آنکھوں میں سموتی رہی۔ جیس کے نقوش اب مردانہ ہوتے جا رہے تھے لیکن جیہ کی آنکھوں اور دل میں وہ اپنی پہلی تصویر کے ساتھ موجود تھا۔

جیہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ نکا سیرپور والوں سے اپنی محبت کم کر لے مگر وہ یہ ضرور چاہتی تھی کہ کاش کبھی وہ جیس آہرن کے بارے میں بھی لکھے۔ بالمر چھوڑنے کے بعد انگریز لڑکے نے سال میں دو بار جیہ کو یاد کیا تھا، ایک بار اس کی سالگرہ اور دوسری بار کرسمس پر، لیکن جیہ نے ان دونوں کارڈوں کا کوئی جواب نہ دیا تھا۔

جیہ کی تعلیم کے انداز میں تبدیلی مہارانی کے لئے خطرے کی گھنٹی تھی۔ اس نے اپنی تشویش کا اظہار کوکی بائی اور زنان خانے کی دیگر خواتین سے بھی کیا تھا۔

”ضرورت سے زیادہ تعلیم یافتہ لڑکی سے کون شادی کرے گا؟ اس کے سرسرا لے والے برا

مانیں گے اور جب یہ اپنے شوہر پر علیت کا رعب بھائے گی تو وہ اسے اپنی توہین محسوس کرے گا۔ یہ بارہ سال کی ہو گئی ہے اور ہماری اس عمر میں منگنی ہو گئی تھی۔ اب جبکہ وہ

مرت بننے جا رہی ہے اس کے والد اسے لڑکا بنانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔“
 مہارانی نے جیہ کی تربیت اپنے ہاتھوں میں لینے کا فیصلہ سنا دیا تاکہ بقول ان کے راج
 گورو اور مہاراجہ نے اب تک جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی ہو سکے۔

اب جیہ موسم گرما کی تپتی دوپہرس کو کی بائی کی ٹھنڈی خواب گاہ میں کمائیاں اور قصبے
 سنتے نہیں گزارتی تھی بلکہ اب زنان خانے کی خواتین اسے سولہ سنگھار سکھایا کرتی تھیں جو
 مرت کا ایک بنیادی ہتھیار ہوتا ہے۔

روزانہ گندم کے آٹے اور اٹھن سے بنی ہوئی کریم سے اس کے جسم کی مالش کی جاتی تا
 کہ جلد کا سانولا پن کم ہو سکے اور اس کا کھردرا پن ختم کیا جاسکے۔ بعض اوقات اسے بیرن
 کی خواب گاہ میں لے جایا جاتا جہاں اسے لباس کے حساب سے زیورات کے انتخاب کی
 تربیت دی جاتی۔ اسے بتایا جاتا کہ کس تقریب کے لئے قیمتی پتھر پہننے مناسب ہوں گے اور
 کب اسے اپنے کانوں میں بھاری بالی پہننے ہوں گے۔ وہ اس کی پنڈلیوں میں پازیب پہن کر
 اسے اٹھلا اٹھلا کر چلنا سکھاتیں اور جب کبھی جیہ کے قدم ذرا تیز ہو جاتے تو وہ چلا اٹھتیں۔
 میجر ویر سنگھ کو جب جب موقع ملتا وہ گھڑ سواری کے لئے جیہ کو پولو گراؤنڈ لے جاتا اور
 وہاں ایک جم غفیر کے سامنے جیہ کو شہسواری کے کرتب دکھانے پڑتے۔ ماں کی باتوں کا جیہ
 پر بھی کچھ اثر ہوا تھا اس لئے وہ بہت سے مردوں کے سامنے گھڑ سواری سے گھبرانے لگی۔
 اس نے میجر ویر سنگھ سے درخواست کی کہ اسے اکیلے میں پریکٹس کی اجازت دے دے لیکن
 میجر نے انکار کر دیا اور جیہ کو پہلی بار مہارانی کے انڈیشوں کی تصدیق ہوتے محسوس ہوئی کہ
 مہاراجہ جیہ کو اپنے دوسرے بیٹے کے روپ میں پروان چڑھا رہا تھا۔

جیہ کی محبوب خلوہ چاندنی اسے عورت بننے کا فن سکھایا کرتی تھی۔

”یہ بوڑھی عورتیں جس انداز میں ہمیں عورت بننے کی تربیت دے رہی ہیں اس سے
 تو مرد قریب آنے کے بجائے دور بھاگ جائے۔“ جیہ نے چاندنی سے کہا تھا۔

چاندنی کی شادی کو چھ ماہ ہو چکے تھے۔ اس نے کندھے اچکائے اور ہنس دی۔ ”وہ
 عورتیں صرف وہی بتا سکتی ہیں جو زنان خانے کی اونچی اونچی دیواروں کے عقب میں ہوتا ہے
 میں آپ کو بتاؤں گی کہ عورت کیسے بنتی ہے، شہزادی۔ عورت درحقیقت ایک مزاج کا نام
 ہے۔ اب مجھے دیکھیں، میرا نام چاندنی ہے، یعنی چاند کی روشنی۔ میں اس نسبت سے محسوس
 کرتی ہوں کہ میرے اندر وہی اسرار ہیں جو چاندنی رات میں ہوتے ہیں۔“

جیہ نے ناک بھونچڑھائی۔ ”شادی نے شاید تمہارا دماغ الٹ دیا ہے، چاندنی۔ تم نے

اس سے پہلے تو کبھی ایسی بے وقوفی کی باتیں نہیں کی تھیں۔“

”اور زیادہ گھڑ سواری اور تعلیم نے آپ سے نوانیت چھیل لی ہے، شہزادی۔ آہ شاید بھول گئی ہیں کہ آپ کا تعلق ایک عظیم خاندان سے ہے اور آپ کی شادی شاید بالآخر تاریخ کی اہم ترین شادی ہوگی۔ اگر آپ کی شادی کسی مہاراجہ سے ہوتی ہے تو یہ آئیں کہ آپ کے علاوہ ان کے اور بیویاں بھی ہوں گی۔ ان کا حرم بھی ہو گا۔ اگر آپ عورت کے عشوے اور ناز اندازیاں نہیں آئیں گی تو اس ہجوم میں اپنی پہچان کیسے کروائیں گی؟“

”ہش، چاندنی۔“ جیہ نے اسے ڈانٹا۔ ”تم ہمیں کسی شخص کی محبوبہ یا داشتہ بننے ترغیب دے رہی ہو۔ اگر ہماری والدہ نے تمہاری باتیں سن لیں تو تمہیں فوری طور ملازمت سے نکال دیا جائے گا۔“

”داشتائیں، پردے میں رہنے والی عورتوں کی نسبت عورت بننے کے فن کو کہیں زہتر جانتی ہیں۔ آپ ان سے مل کر بہت کچھ سیکھ سکتی ہیں۔“ جیہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ چاندنی شہزادی کے اس اچانک رد عمل پر کھل کر ہنس دی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے، چاندنی؟“ جیہ کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ جانتی تھی۔ بالیر کی پو تاریخ میں صرف ایک عورت کو نہ صرف داشتہ کے روپ میں شاہی رہائش گاہ کے اندر آ کی اجازت دی گئی بلکہ اسے اس وقت کی مہارانی، راج کماریوں حتیٰ کہ ولی عہد راجکمار بھی فوقیت دی گئی اور اس بات کا انتظام کیا گیا کہ وہ جب تک زندہ رہے، شاہی محل کی رکن کی حیثیت سے وہیں مقیم رہے۔ یہ واحد عورت کو کی بائی تھی جسے شیر بالیر یعنی کے دادا نے شاہی محل میں داخل کیا تھا۔

”میں آپ کو لے چلوں گی۔“ چاندنی نے رازدارانہ انداز میں پیش کش کی۔

”اور اگر خواجہ سراؤں نے دیکھ کر ہماری والدہ کو ہتا دیا تو؟“

”آپ فکر نہ کریں، کسی کو پتا نہیں چلے گا۔“

شور مچاتی اور موسیقی بکھیرتی پازیب سے خوف زدہ جیہ اپنی محبوبہ خلامہ چاندنی کی آ میں زنان خانے کے نیچے تاریک راہداریاں عبور کر کے ایسی سیڑھیوں میں داخل ہوئی جو خانے کی جانب جاتی تھیں۔ ایک بار پھر پے پیچہ راہداریوں کا سلسلہ شروع ہوا جو اب بھاری چوبی دروازے پر ختم ہوا۔

دروازہ خاموشی سے کھلا اور اس سے پہلے کہ جیہ کچھ سمجھ سکتی، چاندنی نے ہاتھ پکڑ کر اسے اندر گھسیٹ لیا۔ ایک سیاہ رنگت کی بوڑھی عورت نے اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا۔

”کیا یہ سچ ہے؟“ ایک عورت نے جیہ کی شور مچاتی پازیب کی طرف اشارہ کیا۔ ”شاہی مامدان کی ایک راجکماری آخر کار ہم سے ملنے یہاں تک آ پہنچی ہے۔“

جیہ نے غور سے اس کی طرف دیکھا تو اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ عورت کی آنکھیں بے اور تھیں۔ وہ جلدی سے چاندنی کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گئی لیکن اندھی عورت کی دعائیں اس کا حاقب کر رہی تھیں۔ ”بھگوان راج کماری کی رکھشا کرے..... بھگوان راج کماری کی رکھشا کرے.....“

طویل راہداریاں خالی پڑی تھیں۔ وہاں ویرانی بال کھولے نوحہ کنناں تھیں۔ جیہ کو اب اسے ان دو بوڑھی عورتوں کے سوا کوئی دکھائی نہ دیا تھا۔ اندھی عورت وہیں رہ گئی تھی جہکہ ”ہی ان کے ساتھ تھی۔“

راہداری کا اختتام ایک بہت بڑے کمرے میں ہوا جو کسی بھی طرح دربارہال سے چھوٹا تھا۔ کمرہ روشن اور عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔

کمرے کے عین وسط میں سنگ مرمر کا ایک سو منگ پول تھا جس کی سطح پر تازہ گلاب کی پتیاں تیر رہی تھیں۔ پول کے کناروں پر نصب چاندی کے مور فوارے کی صورت عطر پانی میں پھینک رہے تھے۔ بہت سی لڑکیاں جن کے جسموں پر ناکانی لباس تھا پول میں تیر رہی تھیں۔ گلاب کی پتیاں جا بجا ان کے بدنوں پر چپکی ہوئی تھیں۔

داشتاؤں نے جیہ کو گھیر لیا۔

”موسم خاصا گرم ہے، شنراوی۔ کپڑے اتار دو۔“

”آؤ ہمارے ساتھ پیرا کی کرو، شنراوی۔“

بھانت بھانت کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ جیہ گھبرا کر پیچھے ہٹی لیکن پول سے نکل کر آنے والی لڑکیوں نے اسے پکڑ لیا اور ذرا سی دیر میں جیہ اپنے لباس سے محروم ہو چکی تھی۔ اس نے اپنا بدن ڈھانپنے کے لئے چاندنی کی اوڑھنی چھین لی لیکن اسے بدن پر ڈالنے کی نوبت نہ آئی۔

”ہم سب عورتیں ہیں، شنراوی۔“ ایک نوجوان لڑکی نے کہا۔ ”آؤ ہم تمہیں بتائیں کہ عورت اپنے جسم سے کیا اور کیسے کام لیتی ہے؟“

کسی نے جیہ کو دھکا دیا اور وہ پانی میں جا گری۔ باقی لڑکیوں نے اس کے تعاقب چھلانگیں لگا دیں۔

جیہ کو بدن کے استعمال کا فن سکھائے جانے کی ابتدا ہو چکی تھی۔

کئی ماہ جیہ کو زنان خانے کی پردہ دار خواتین کی نگرانی میں لڑکی سے عورت بننے اسرار اور رموز پڑھائے جاتے رہے۔ اس تمام عرصے میں وہ بیرونی دنیا کے واقعات سے لاعلم رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یورپ میں کوئی خلاف توقع بات ہونے جا رہی ہے کہ اس نے اکثر مسٹر رائے اور کیپٹن آبرن کو اپنے والد کے ساتھ سر جوڑے بیٹھے دیکھ ٹیلی گراف کاریسور ان کے ہاتھوں میں ہوتا تھا اور وہ شاہی جھروکے میں بیٹھے لندن سے والی خبروں پر تبصرے کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھار وہ انہیں قیصر ولیم کے بارے میں باتیں سنتی۔

”یورپ مختلف اتحادوں میں بٹ رہا ہے جس کا نتیجہ جنگ کی صورت میں بھی نکل رہا ہے۔“ مہاراجہ کی پر تفکر آواز اسے سنائی دی۔ ”ہم نہیں چاہتے کہ نکالیں صورت حال لندن میں رہے۔ لیکن وائسرائے نے ہمیں اپنے بیٹے کو واپس بلانے کی اجازت نہیں دی۔“ نکا کو لندن میں کچھ نہیں ہو گا، یورپ ہائی نیس۔“ کیپٹن آبرن نے اسے یقین دلا شاہ جارج، روس کے زار کی طرح کچھ اتنا پر جوش نہیں ہے کہ اپنی بیویوں کو ہنگاموں کو دینے کی اجازت دے دے۔ باقی یورپ میں کچھ بھی ہو، میں نہیں سمجھتا کہ وہ انگلیں اس جنم میں دھکیلنے کا فیصلہ کرے گا۔“

انگریزی کے سبق کے دوران مسز رائے نے ایک اخبار جیہ کو تھما دیا۔ ”برطانیہ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان سے تقریباً نکالے جا چکے تھے کیونکہ انہوں نے مسلمانوں کو کارتوس دیئے تھے جن پر سور کی چربی لگی ہوئی تھی۔ آپ خود سوچو شہزادی کہ اس وقت ہو گا کہ جب جنگ شروع ہوئی اور مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ اپنے خلیفہ یعنی سرترکی کے خلاف جنگ میں حصہ لیں۔“

جیہ خالی خالی نگاہوں سے مسز رائے کو دیکھتی رہی۔ پھیلا ہوا اخبار اس کے ہاتھوں تھا۔ ٹیوٹر نے اس سے لا تعلقی پر ایک طویل سانس لی۔

”توجہ دو شہزادی! دن میں دیکھے جانے والے اپنے سپنوں کے ساتھ ساتھ اس آدمی بارے میں بھی سنو اور دیکھو جسے انگریز نے ہندوستان چھوڑنے کی صورت میں مسلمانوں نئے لیڈر کے طور پر چنا ہے۔ ان کے خیال میں یہ لیڈر مسلمانوں کو سلطان ترکی کے

جنگ میں حصہ لینے پر آمادہ کر سکے گا۔ کیا تم نے محسوس نہیں کیا کہ کس طرح آغا خان نامی یہ شخص اچانک ہی وائسرائے کے ہمراہ تمام اہم تقریبات میں دیکھا جانے لگا ہے؟“

”مسز رائے، کیا یہ سچ ہے کہ اگر آپ بڑی پوجا سے پہلے والی رات اپنے شوہر سے جھوٹ بولیں گی تو کسی شیطان کو جنم دیں گی۔“

مسز رائے نے غصے سے اخبار جیہ کے ہاتھوں سے چھین لیا لیکن جب اس نے جیہ کی سبز آنکھوں میں جھانکا تو اس کا غصہ معمول پر آ گیا۔ ”آپ نے یہ بے وقوفی کی باتیں کہاں سے سنی ہیں، شہزادی؟“

”پردہ دار عورتوں سے۔“ جیہ نے جواب دیا۔ ”انہوں نے کہا تھا کہ اگر میں پورے چاند میں حاملہ ہوں تو ایک اندھے بیٹے کو جنم دوں گی اور داشتاؤں نے مجھے بتایا ہے کہ اگر میں اپنے شوہر کو وفادار رکھنا چاہتی ہوں تو اس کے گلے میں سونے کی زنجیر اور.....“

مسز رائے نے اپنی سوتی ساڑھی کو کمر کے گرد کچھ اور کس لیا۔ ”داشتائیں بھلا پیدائش کے عمل کے بارے میں کیا جانیں؟ وہ تو صرف ایک مرد کی خوشنودی کے لئے غلاموں کی طرح رکھی جاتی ہیں۔ وہ اس طرح کی داستانیں سنا کر ان بچوں کا احساس محرومی دور کرتی ہیں جنہیں پیدا کرنے کی انہیں کبھی اجازت نہیں دی گئی۔“

”مسز رائے، نہیں، آپ سمجھی نہیں۔ یہ حرم کے وہ ٹوٹکے ہیں جو سالوں سے سینہ بہ سینہ منتقل ہو رہے ہیں۔“

”یہ محض بے وقوفی ہے، شہزادی!“ مسز رائے نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر آپ نے اپنی پردہائی کی طرف دھیان نہ دیا تو آپ بھی ان داشتاؤں کی طرح توہم پرست ہو جائیں گی۔ اب بتائیں میں نے آغا خان کے بارے میں آپ کو کیا بتایا تھا؟“

ایک خادمہ نے آکر جیہ کو مہارانی کی طلبی کی اطلاع دی تو جیہ نے بھگوان کا شکر ادا کیا۔ مسز رائے نے نہ چاہتے ہوئے بھی جیہ کو جانے کی اجازت دے دی۔

خواب گاہ کے جھروکے میں مہارانی اور کوکی بائی درمیانی میز پر رکھے کانگذاٹ کا جائزہ لے رہی تھیں۔ دوسری خواتین کا ایک گروپ قریب ہی قالین پر بیٹھا ہوا تھا۔ مہارانی نے جیہ کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ کھڑکی کی جانب کیا۔

”لوگ اس روشنی کو کیا کہتے ہیں، بیٹی؟“ وہاں موجود تمام عورتیں مہارانی کے اس سوال پر قہقہہ لگا کر ہنس دیں۔ ان کے انگ انگ سے شرارت ٹپک رہی تھی۔

جھلسا جھیل سے آنے والی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جیہ کو اپنے رخساروں پر محسوس ہو رہی

تھی۔

”گائے بھینسوں کے قدموں سے اٹھنے والی گرد کی گھڑی حکم! اس وقت گوالے اپنے مویشیوں کو گھر واپس لے جاتے ہیں۔“

مہارانی مسکرا دی۔ ”مشرقی ہندوستان میں اس روشنی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ عورت اس میں بے حد خوبصورت دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس وقت کو دلہن کی گھڑی کہتے ہیں۔“

پردہ دار خواتین بیک زبان بولی تھیں۔ ”اس میں کہاں تک صداقت ہے، مہارانی صاحبہ؟“

”دیکھو شہزادی کی جلد اس روشنی میں کتنی چمک رہی ہے۔“ مہارانی نے جواب دیا۔ مہارانی نے اپنی بیٹی کی ٹھوڑی چھوڑ دی۔ ”تمہارے والد آخر کار تمہاری نسبت طے کرنے پر رضامند ہو گئے ہیں۔ اب تم ایک عورت بن چکی ہو، تقریباً تیرہ سال کی عمر ہو گئی ہے اور پھر اس سال تم پہلی بار مینوار کی تقریبات میں شرکت کرو گی۔“ اس نے میز پر رکھی تصاویر کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ ان خاندانوں کے بیٹوں کی تصاویر ہیں جنہیں تمہارے لئے تجویز کیا گیا ہے۔“

جیہ نے کافذات پر ابھرے نقوش کی طرف دیکھا۔ پگڑی باندھے ہوئے اجنبی چہرے ہماری کرسیوں پر بیٹھے اور میزوں پر کہنیاں نکائے ہوئے تھے۔ بعض تصاویر پر یورپی بادشاہوں کے دستخط بھی موجود تھے۔ کچھ اجنبی گدیوں پر نیم دراز حقہ پینے میں مصروف تھے۔ بعض تصاویر پر شیشہ جڑا ہوا تھا۔

مہارانی نے ایسی ہی ایک تصویر اٹھائی اور کوکی بائی کی طرف دیکھا۔ ”دیکھنا کوکی بائی! کیا یہ ہماری شہزادی کے لئے بہتر شوہر ثابت نہیں ہو گا؟“

”یہ عورت نے تصویر اپنی آنکھوں کے قریب کر لی۔“ یہ شہزادہ نہیں لگتا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی وجہ سے یہ کوئی بنیا یا ساہوکار لگتا ہے۔“

”اور یہ تو یقیناً کوئی مہاراجہ ہے..... تیرہ توپوں کی سلامی والا۔“

”تیرہ توپوں کی سلامی سے اس کے خاندان کی حیثیت تو نہیں بدل جائے گی۔ سارا ہندوستان ان کی حیثیت کے بارے میں جانتا ہے۔“

تیسری تصویر دیکھ کر کوکی بائی نے ناک بھوں چڑھائی۔ ”یہ اس کی ٹانگیں ہیں یا کیا؟ پیر زمین کو چھو ہی نہیں رہے۔“

زنان خانے کی عورتیں باری باری تصویریں دیکھ رہی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بوڑھی کوکی بائی کے تبصروں سے بھی محفوظ ہوتی جا رہی تھیں۔ جیہ بھی ہنسنا چاہتی تھی لیکن جب اس نے مہارانی کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار دیکھے تو ہنسی دبا کر رہ گئی۔

مہارانی نے طلائی پاندان میں سے ایک بیڑا اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ دوسری خواتین نے بھی جب مہارانی کے تاثرات دیکھے تو وہ بھی خاموش ہو گئیں۔

مہارانی کچھ دیر پان چباتی رہیں، پھر وہ کوکی بائی سے مخاطب ہوئی۔ ”ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ آپ کو کوئی لڑکا پسند نہیں آیا۔ اس لئے بہتر ہے کہ آپ خود ہی جیہ کے لئے کوئی دلہا پسند کریں۔“

کوکی بائی نے فوراً چیلنج قبول کر لیا۔ ”اگر وہ انگریز لڑکا ہے.... مس ہم میں سے ہوتا تو میرا سب سے پہلا انتخاب وہی ہوتا۔“

سارا خون جیسے جیہ کے چہرے پر اتر آیا۔ زنان خانے کی عورتوں نے بڑے ذومعنی انداز میں جیہ کو دیکھا تھا۔

”.... لیکن چونکہ وہ ہم میں سے نہیں اس لئے اب ہمیں فیصلہ کرتے وقت بہت سی چیزوں کو سامنے رکھنا ہو گا۔ مثلاً ہماری شہزادی ایک ایسی دنیا میں رہے گی جس کے ارد گرد طاقتور انگریزوں کا گھیرا ہے۔ اس لئے اس کی شادی ایسی بادشاہت میں ہونی چاہئے جس کے برطانوی راج کے ساتھ دوستانہ مراسم ہوں۔ جیسے گوالیار کی سلطنت ہے۔ دوسری بات، چونکہ شہزادی کی تربیت گھڑ سواری، نشانے بازی اور تلوار سے ہوئی ہے اس لئے اس کے شوہر کو کھلاڑی ہونا چاہئے۔ جیسے مہاراجہ رانجی یا مہاراجہ کوچ بہار۔ تیسری بات، چونکہ ہماری شہزادی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اس لئے اس کے شوہر کو بھی خاصا پڑھا لکھا ہونا چاہئے جیسے میسور اور بیروہ کے موجودہ حکمران۔“

کوکی بائی چند ثانیے خاموش رہ کر دوبارہ گویا ہوئی۔ ”لیکن یہ تمام حکمران چونکہ پہلے سے شادی شدہ ہیں اس لئے میرے خیال میں صرف ایک رشتہ ایسا ہے جو شہزادی کے لئے مناسب ہو سکتا ہے اور وہ ہے سیرپور کا پرنس پر تپ۔“

جیہ نے بڑی شدت سے نفی میں سر ہلایا۔ لیکن کوکی بائی نے اس کے انکار پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ ”اور بھی بہت سی باتیں ہیں جن کی وجہ سے میں سیرپور کے اس لڑکے کو پسند کرتی ہوں....“

جیہ خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ وہ بے اختیار بول اٹھی۔ ”وہ لڑکا نہیں ہے کوکی بائی، آدمی

ہے۔“

وہاں موجود ساری عورتیں کھکھلا کر ہنس دیں۔ ”ایک لڑکا تمہاری سہاگ رات پر کیا کرے گا، شہزادی؟“

”ہمیں تو ایک ایسے مرد کی ضرورت ہے جو تمہیں لڑکی سے عورت بنا سکے، شہزادی۔“

”تجویز بے حد معقول ہے، کوکی بائی۔“ مہارانی نے اثبات میں سر ہلا کر گویا اپنی منظوری دے دی۔ ”پرنس پر تپ ایک ماڈرن شہزادہ ہے۔ اس کی دادی، یعنی سیر پور کی شیر دل مہارانی پہلے ہی جیہ کی تعلیم و تربیت پر اپنی خوشی اور مسرت کا اظہار کر چکی ہے۔“

جیہ نے یوں دہشت سے اپنی ماں کو دیکھا جیسے وہ کوئی سانپ ہو۔ مہاراجہ اس قسم کی کسی شادی سے پہلے ہی انکار کر چکا تھا۔

”تمہارے والد کی انگریز دشمنی اب اتنی مشہور ہو چکی ہے کہ تمہاری شادی صرف وہیں ہو سکتی ہے جہاں انگریز کا کوئی خطرہ نہ ہو، شہزادی۔“ مہارانی نے انتہائی نرم لہجے میں اپنی بیٹی کو مخاطب کیا۔ ”سیر پور، برطانیہ سے بے حد قریب ہے اس لئے بالمیرہ والوں سے شادی ان کے لئے نقصان دہ ثابت نہیں ہوگی۔“ جیہ نے آنکھیں جھکا لیں تو مہارانی نے پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”مگر اس کے باوجود تم کسی اور کے لئے تجویز دو گی تو ہم غور کریں گے۔“

اسی شب بیرن تصاویر کا بکس جیہ کے کمرے میں اٹھا لائی۔ جیہ اپنے وسیع و عریض بیڈ پر لیٹی ایک ایک کر کے تصویروں کا جائزہ لے رہی تھی اور اس کی ملازما کیں خاموشی سے اس کے پیرہانے میں مصروف تھیں۔

جب خادمائیں چلی گئیں تو جیہ نے جیمس آسبن کی تصویر نکال لی۔ وہ بڑے غور سے اسے دیکھتی رہی اس کے نقوش کا جائزہ لیتی رہی اور اس کی نیلی آنکھوں میں ڈوبتی رہی۔ اور پھر اسی طرح ڈوبتے ابھرتے جانے کب وہ نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔

صبح جب جیہ نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے والد کے سامنے شادی کے خلاف اپیل دائر کرے گی اور اسے امید تھی کہ وہ مہارانی کے فیصلے کی منسوخی میں کامیاب ہو جائے گی۔ جب وہ بلیوڈ روم میں پہنچی تو کمرہ خالی تھا۔ وہ ایک بیچ پر بیٹھ کر اپنے والد کا انتظار کرنے لگی۔

مہاراجہ خاکی رنگ کا ایک لفافہ لہراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ جیہ ایک طویل عرصے سے ایسے لفافے دیکھ رہی تھی، لہذا اسے فوراً ہی پتہ چل گیا کہ یہ انگریزوں کی کوئی چٹھی ہے۔

مہاراجہ کی آنکھیں جس انداز میں چمک رہی تھیں وہ اس سے پہلے جیہ نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ ”نکا واپس آ رہا ہے۔“ مہاراجہ کا لہجہ بھی پر جوش تھا۔

جیہ نے ایک ہی جست میں اپنے اور مہاراجہ کے درمیان فاصلہ طے کیا۔ ہنستے ہنستے ہوئے بے سنگھ نے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ ”وہ اگلے ماہ جہاز پر سوار ہو گا اور جولائی کے آخر تک بالمیر پہنچ جائے گا۔“

”اوہ بابا! آتش بازی کا ایک شاندار مظاہرہ ہونا چاہئے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ نکا کو آتش بازی کس قدر پسند ہے اور....“

مہاراجہ نے کندھے اچکائے۔ ”نکا اس لئے بالمیر آ رہا ہے کیونکہ یورپ میں جنگ کے خوف میں اضافہ ہو رہا ہے۔“

”یہ یورپی تو ہمیشہ کہیں نہ کہیں لڑتے ہی رہتے ہیں۔“ جیہ نے ناک بھونچ رہا تھا۔ ”برحال اب ہمیں بمبئی سے ریکارڈز اور ایک فوٹو گراف منگوانا ہو گا۔ نکا بہت اچھا رقص کر لیتا ہے۔ وہ ہمیں بال روم ڈانس ناٹکو سکھائے گا۔“

مہاراجہ کی سخت آواز نے اس کے سارے منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ ”شنزادی اگر جنگ چھڑ گئی تو بالمیر کو بھی اپنی فوجیں بھیجینی ہوں گی۔ ہم اپنے ایک بیٹے کی واپسی کی خوشیاں نہیں منا سکتے کیونکہ ہمارے پانچ سو دیگر بیٹے جنگ کے میدان میں ہوں گے۔ کیپٹن آسرن کا بیٹا پہلے ہی اپنے والد کی رجمنٹ میں شامل ہو چکا ہے۔ حالات اتنی تیزی سے بدل رہے ہیں کہ اگر انگلینڈ جنگ میں کودا تو وہ وہیں اس میں شامل ہو جائے گا۔“

مہاراجہ کو اپنی بیٹی کی آنکھوں میں اتر آنے والی اداسی کی بھی خبر نہیں ہوئی تھی۔ ”ہمیں اس پر بے حد افسوس ہے کہ نکا مینوار کی تقریبات میں شرکت نہیں کر پائے گا۔“ مینوار کی تقریبات دراصل جنگجو ذات کے لوگوں کے لئے ہوتی تھیں۔ قلعے کے بیرونی حصے میں آدمیوں کے مقابلوں کے لئے نقارے پیٹے جاتے رہے اور تمام بھانوں کے جتھے گزری ہوئی جنگوں کی کہانیاں سناتے رہے۔ لیکن زنان خانے میں مینوار کی تقریب خفیہ انداز میں منعقد ہوئی تھی۔

جیہ نے ان تقریبات میں بڑے بھرپور انداز میں شرکت کی تھی۔ زنان خانے کی خواتین اور دیگر امراء کی بیگمات نے جب پہلی بار جیہ کو مکمل میک اپ اور خوبصورت تراش خراش کے لباس میں دیکھا تو وہ دانتوں میں انگلیاں دبا کر رہ گئی تھیں۔

جیہ بھی تقریبات کے دوران بے حد خوش تھی بس اسے اس بات کا افسوس تھا کہ نکا

شریک نہیں ہو سکا تھا۔ موسم گرما کی شدت نے اس انتظار کو کچھ اور طویل کر دیا تھا۔ جیہ بے قراری سے ٹکا کی واپسی کی منتظر تھی اور زنان خانے کی عورتیں اپنے اپنے انداز میں ٹکا کے بارے میں تبصرے کر رہی تھیں۔

”اب مہارانی تمہارے بھائی کے لئے دلہن تلاش کرنا شروع کر دیں گی، شہزادی۔“
 ”اور وہ ولایت پلٹ ہے! اس وقت دنیا میں سب سے بہترین ملک سے پڑھ کر آ رہا ہے۔“

ہر شام جیہ اداس اداس شاہی جھروکے کے ایک کونے میں کھڑی ہو جاتی۔ برف کی سلوں کے پیچھے رکھے ہوئے برقی پکھے جھروکے کو خاصا ٹھنڈا رکھتے تھے۔ ایسے میں مختلف کلرک جیہ کو اخبارات میں یورپ میں ہونے والی تبدیلیوں کی خبریں پڑھ پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔

ٹکا کی آمد پر جنگ کچھ وقت کے لئے پس منظر میں چلی گئی۔ قلعے سے توپیں داغی گئیں اور مہاراجہ نے اپنے بیٹے کی واپسی پر دربار منعقد کیا۔ آتش بازی کا پروگرام بارش کے سبب دھڑے کا دھڑا رہ گیا کیونکہ پورا قلعہ جل تھل ہو رہا تھا۔ بالمر کے عوام اپنی بیگلی پگڑیاں اور کپڑے خشک کرتے ہوئے ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ ٹکا کی واپسی بادشاہت کے لئے بے حد سعادت ثابت ہو گی۔

جونہی واپسی کی تقریبات ختم ہوئیں، ٹکا نے زنان خانے میں آنا بند کر دیا۔ لائبریری جاتے ہوئے جیہ کو اپنا بھائی مسٹر رائے کے تعاقب میں بھاگتا نظر آیا۔

”کیا یہ درست ہے کہ جاپانیوں نے روسیوں کے خلاف زہریلی گیس استعمال کی ہے؟ کیا آپ کے خیال میں جرمن یورپ میں گیس استعمال کریں گے؟“

لائبریری کی کھڑکی میں سے وہ ٹکا کو بے قراری سے سوالات کرتے اور میجر ویر سنگھ یا کمانڈر انچیف کو ان سوالوں کے جوابات دیتے دیکھتی۔ یہ سوالات عام طور پر ہاپکس گن، ٹرنچ مارٹز یا میکسم گن کی فائرنگ کی استعداد کے بارے میں ہوتے تھے۔

ہر شام ٹکا شاہی جھروکے میں پہنچنے والا پہلا آدمی ہوتا کیونکہ وہاں ٹیلی گراف نصب تھا جہاں انگلینڈ سے آنے والی خبریں اسے مل جاتی تھیں۔

جب جیہ نے ٹکا کو مہارانی کے اس فیصلے سے آگاہ کیا کہ اسے ہر حال میں پرنس پر تپ سے شادی کرنی ہو گی تو اس نے جیہ کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کے لئے کہا۔ ”تمہیں اس بارے میں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پرنس پر تپ فی الحال شادی کے

بارے میں نہیں سوچ رہا۔ وہ سیرپور کا گھڑ سوار دستہ لے کر یورپ جا رہا ہے۔“
 اور پھر اس نے شرماٹے لجاتے جیمس آبرن کے بارے میں دریافت کیا تو ٹکا کے چہرے
 پر حسد اور رشک کے طے جلے جذبات دکھائی دیئے تھے۔ ”وہ پہلے ہی کیپٹن آبرن کی
 رجنٹ جوائن کر چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میرے فوج میں جانے سے پہلے ہی عملی لڑائی
 دیکھ چکا ہو گا۔“

اگست کی شب شور شرابہ سن کر جیہ بھاگتی ہوئی زنان خانے کی راہداریوں سے نکل کر
 شاہی جھروکے میں داخل ہوئی تو ہر ایک اسے ٹیلی گراف مشین کے ارد گرد جمع نظر آیا۔ ٹیلی
 گراف مشین مسلسل چل رہی تھی اور وہاں موجود سب لوگ اس طویل پیغام کے ختم ہونے
 کے منتظر تھے۔ آخر کار کلرک نے پیغام حکمران کو تھما دیا اور مہاراجہ نے بہ آواز بلند اس
 پیغام کو پڑھنا شروع کیا۔

”گذشتہ روز وزیر اعظم مسٹر اسکوٹھ نے پارلیمنٹ کو بتایا کہ جرمنی نے ایک الٹی میٹم دیا
 ہے جس کی مدت آج نصف شب کو ختم ہو رہی ہے۔ ہاؤس کے اسپیکر اور دیگر ارکان اس
 وقت اپنی نشستوں سے کھڑے ہو گئے۔ جب وزیر اعظم نے شاہ انگلستان اور شہنشاہ ہندوستان
 ہر میمبھی جارج پنجم کا فوجوں کی نقل و حرکت کے بارے میں باضابطہ اعلان پڑھ کر سنایا۔ اس
 حکم کی رو سے برطانیہ عظمیٰ نے نصف شب کو جرمنی اور آسٹریلیا کے خلاف جنگ کا اعلان کر
 دیا ہے۔ جاپان نے روس کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے اور.....“

مہاراجہ کے الفاظ ختم ہونے سے پہلے ہی کیپٹن آبرن اچھل کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو
 گیا۔ ”یور ہائی نیس! میں اپنی رجنٹ دوبارہ جوائن کرنے کے لئے فوری طور پر روانہ ہونا
 چاہتا ہوں۔“

مہاراجہ نے اپنی نشست کے عقب میں کھڑے ایڈیز کو اشارہ کیا اور وہ کیپٹن آبرن
 کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل گئے مہاراجہ مسٹر رائے کی طرف مڑا۔ ”آپ اور آپ کی
 بیوی ہمارے فوجیوں کو تھوڑی بہت انگریزی پڑھا دیں۔ اپنی رجنٹ سے سمجھنے کی صورت
 میں انہیں کم از کم سڑکوں کے نشانات اور نقشے وغیرہ پڑھنے آنے چاہئیں۔“

مہاراجہ نے پلٹ کر میجر دیر سنگھ کو دیکھا۔ ”سینا پتی کو بتا دیا جائے کہ کل سے بالمر کی
 فوجیں جنگ میں شرکت کے لئے ہر وقت تیار رہیں گی۔ مکمل فوجی مشقیں فوری طور پر
 شروع ہو جانی چاہئیں۔“

میجر دیر سنگھ نے دایاں بازو اوپر اٹھایا۔ ”بل۔ حکم!“ جیہ اپنی کرسی پر کسمسا کر رہ گئی۔

آج پہلی بار اس نے بالمر کا جنگی نعرہ سنا تھا۔

موسم برسات کی موسلا دھار بارش میں جیہ اور نکا بالمر لائسنز کی ڈرل دیکھنے کے لئے کیولری گراؤنڈ گئے۔ سینا پتی ایک گھوڑے پر سوار تین سو گھڑ سواروں کو لائسنز کی دو کمپنیوں کی صورت، میجر ویر سنگھ کی سربراہی میں جنگی تربیت حاصل کرتے دیکھ رہا تھا۔

ان کی تربیت دیکھ کر نکا فوری طور پر فوج میں شامل ہونے کو بے قرار ہو گیا تھا۔ صرف وہی نہیں، بلکہ پورا ہندوستان جنگ کے نشے میں مدہوش نظر آتا تھا۔ شاہی جھروکے میں نصب ٹیلی گراف مشین ہر وقت ان افراد کے نام ٹائپ کرتی رہتی تھی جنہوں نے جنگ کے لئے رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ دوسری طرف مسز رائے نے قوم پرست رسالوں اور اخبارات کا ایک ڈھیر جیہ کے سامنے پھینک دیا تھا۔

”ان اخبارات کو دیکھو، شہزادی۔ سینکڑوں ہزاروں ہندوستانی رضاکارانہ طور پر جنگ میں شامل ہو چکے ہیں۔ کیا ان کے خیال میں برطانوی بادشاہت اس قربانی پر ان کی احسان مند رہے گی؟“

مسز رائے کے غصے سے بے پروا جیہ ہر صبح نکا کے ساتھ فوجی دستوں کی تربیت اور نشانے بازی دیکھنے جاتی۔ شام میں وہ میجر ویر سنگھ کے ہمراہ اصطبل جاتے۔ جہاں وہ گھوڑوں کا معائنہ کرتا اور انہیں جنگ کے لئے تیار کرتا۔ اس کے بعد دونوں قلعے کی فوجی بیرکوں کے بڑے بڑے کمروں میں بیٹھ کر دن بھر کے تھکے ماندے فوجیوں کو انگریزی الفاظ کی پہچان کراتے۔ بعد میں سینا پتی اپنے نقشوں کے ساتھ وہاں آ جاتا اور ان کی مدد سے روس، فرانس، برطانیہ، جرمنی اور آسٹریلیا کی فوجوں کی پیش قدمی کے بارے میں آگاہ کرتا۔

مہاراجہ، جودھ پور کے بادشاہ سر برتپ سنگھ کے ساتھ مسلسل رابطے میں تھا۔ سر برتپ پہلے بھی بالمر لائسنز کو اپنے ساتھ چین لے جا چکا تھا۔ ستر سال کی عمر میں سر برتپ کو ایک بار پھر بادشاہت ہندوستان کی شاہی افواج کا کمانڈر انچیف مقرر کیا گیا تھا۔

آخر کار مہاراجہ کو خبر ملی کہ سر برتپ ہندوستان کی شاہی افواج کا پہلا دستہ لے کر یورپ روانہ ہو رہا ہے۔ ”وہ کل روانہ ہوں گے۔ ہمارے دستے دوسرے قافلے کے ساتھ روانہ ہوں گے۔“

مہاراجہ نے برا سامنہ بنا کر ٹیلی گرام کو دیکھا اور شاہی جھروکے میں اس پیغام کے غصے لوگوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”سر برتپ نے مجھے ہندوستان کی شاہی عملداری سے جمع کئے جانے والے فوجی دستور

کی تفصیلات بھجوائی ہیں۔ پندرہ کیولری رجمنٹ، تیرہ انفنٹری بٹالین، تین اونٹ سوار دستے، انہیں سوز کینال کے دفاع میں صحرائی جنگ کے دوران مغربی مورچوں پر متعین کیا جائے گا۔ دو پہاڑی بیٹریاں۔ طبی اور ٹرانسپورٹ دستے اس کے علاوہ ہیں۔ ہم یہ کہیں گے کہ یہ امداد ہمارے معاہدوں سے کہیں زیادہ ہے۔“

نکا نے اپنے والد کی آواز میں چنگاری کی طرح دبے غصے پر کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔ وہ اچھل کر اپنی کرسی پر کھڑا ہو گیا۔ ”اگر ہمارے گھڑ سوار دستے دوسرے قافلے کے ساتھ جا رہے ہیں تو میرے پاس ان کے ساتھ شامل ہونے میں تیاری کے لئے خاصا وقت موجود ہے۔“

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو نکا!“ مہاراجہ بھنا گیا۔ ”تمہاری عمر صرف سولہ سال ہے۔“

”سرپر تپ، مہاراجہ جودھ پور کو بھی ساتھ لے جا رہے ہیں۔ اس کی عمر بھی سولہ سال ہے۔ وہ اپنے بیٹے ہنوت سنگھ کو بھی ساتھ لے جا رہے ہیں۔ اس کی عمر تو مجھ سے بھی کم ہے۔۔۔۔ وہ ابھی پندرہ سال کا بھی نہیں ہوا۔“

”وہ سرپر تپ کا مسئلہ ہے۔ ہم اپنے بیٹے کو برطانوی راج کا بازو بننے کی اجازت نہیں دیں گے۔“

”لیکن بالمر لانسز تو جا رہے ہیں۔ ہمارے لئے یہ ایک اعزاز ہو گا کہ ہم میں سے کوئی ایک ان کی قیادت کرے۔“

”ان لوگوں کے ہاتھ مضبوط کرنے میں ہمارے لئے کون سا اعزاز پوشیدہ ہے۔ جنہوں نے ہمارے ہی ملک میں ہمیں دوسرے درجے کا انسان بنا دیا ہے اور ہمیں اپنی ہی چیزیں مانگنے کے لئے ان کے سامنے ہاتھ پھیلانے پڑتے ہیں؟ ہمیں تو اس بات کا خدشہ بھی لاحق ہے کہ وہ بالمر کی گدی کی وراثت تمہیں دینے کے سلسلے میں بھی ہمیں بلیک میل کریں گے۔“

اکتوبر، باپ بیٹے کے درمیان انہی اعتراضات اور بحث و مباحثے کی نذر ہو گیا۔ پھر نکا کو پرنس پر تپ آف سیرپور کا ایک خط موصول ہوا۔ یہ خط سیرپور کے گھڑ سوار دستے کے فرانس پہنچنے پر لکھا گیا تھا۔

”اس جنگ میں چھ راجپوت بادشاہ حصہ لے رہے ہیں۔ اگر تم نے اس لڑائی، جسے لوگ جنگ عظیم کہہ رہے ہیں میں حصہ نہ لیا تو تمہارے آدمی تمہیں کبھی معاف نہیں کریں

گئے۔

خط کو ہاتھوں میں مسل کر نکالنے گولہ بنایا اور ایک جانب پھینک دیا۔ ”چھ راجپوت بادشاہ، لیکن بابا نے ہماری ٹاک کیوں کٹوا دی؟ میدان جنگ میں اپنے فوجی دستے کسی شاہی قیادت کے بغیر بھیجنا بے عزتی ہی تو ہے!“

”لیکن نکال! چین جانے والے دستوں کی قیادت تو ہمارے خاندان کے کسی فرد نے نہیں کی تھی۔“ جیہ نے اسے یاد دلایا۔

”میں اس وقت اتنا بڑا نہیں تھا، لیکن اب ہوں۔“

سر پر تاپ نے لندن سے ایک ٹیلی گرام بھیجا جس میں یہ ہدایت دی گئی تھیں کہ شاہی فوج کے تمام افسران اور جوان دست بدست لڑائی میں بھی مہارت حاصل کریں تاکہ بہ وقت ضرورت وہ پیدل دستوں کے طور پر بھی جنگ میں حصہ لے سکیں۔ بالیر کے گھڑسوار فوجی دستوں نے جب کیولری گراؤنڈ میں بھوسے اور پیال سے بنے ہوئے نقلی فوجی دیکھے اور انہیں اپنی رانقلوں پر سنگینیں دکھائی دیں تو انہوں نے گھوڑوں سے اترنے سے انکار کر دیا۔ فوجیوں نے سینا پتی سے مطالبہ کیا کہ مہاراجہ کو بلایا جائے۔

جے سنگھ فوری طور پر کیولری گراؤنڈ پہنچا۔ اس نے انتہائی تحمل کے ساتھ فوجیوں کو بتایا کہ سنگینوں کی تربیت کیوں ضروری ہے، لیکن لائسنرز کا طرز عمل اب بھی باغیانہ تھا۔ ”ہمارا تعلق کیولری سے ہے، حکم! ہم گھوڑوں پر سوار ہو کر جنگ لڑتے ہیں۔ ہم اپنی رانقلوں پر سنگینیں لگا کر کمینوں کے بل زمین پر نہیں ریٹکتے۔“

”آپ نے دست بدست لڑائی کے دوران بھارتی فوجی سپاہیوں کی چیخیں اور نعرے تو سنے ہوں گے، حکم! صرف یہی بے خدا اور لادین انگریز فوجی افسر لڑائی کے دوران ماں اور بہنوں کی گالیاں کھا سکتے ہیں اور دے سکتے ہیں، حکم!“

”اگر ہم عورتوں کو گالیاں دیتے ہوئے مر گئے تو ہماری یہ موت بہادروں کی موت نہیں ہوگی، حکم! پنڈت ہمیں ہمارے مذہب کے مطابق آخری رسومات نہیں کرنے دیں گے۔“

مہاراجہ نے انہیں اجازت دی کہ وہ جنگ کے دوران صرف اور صرف اپنے نعرے لگائیں گے لیکن اس کے باوجود جب وہ لوگ مطمئن نہ ہوئے تو مہاراجہ ہتھ سے اکھڑ گیا۔

”تم لوگ عزت کی بات کرتے ہو، لیکن تمہیں وہ حلف یاد نہیں، جو تم نے بالیر دربار کی فرماں برداری کے لئے اٹھایا ہے۔ ہم تمہارے دربار اور بالیر کے حاکم کی حیثیت سے تم لوگوں کو حکم کی اطاعت کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔“

نکا غصے سے اپنے گھوڑے کی رکاب پر کھڑا ہو گیا۔ ”یہ ان بہت سی اجنبی اور بے ہودہ چیزوں میں سے ایک تھی جن کا سامنا ان گھڑ سواروں کو بیرون ملک کرنا پڑے گا۔ بابا ان کے خوف کو کم کرنے کے لئے بھی اگر مجھے ان کے ساتھ نہیں بھیجیں گے تو بے وقوفی کریں گے۔“

جیہ نے اڑیاں اپنے گھوڑے کی پسلیوں میں گاڑ دیں اور وہ جھٹکے سے نکا کے گھوڑے کے تعاقب میں بھاگ کھڑا ہوا۔

قلعے کے آخری حصے میں ایک منہدم مندر موجود تھا جو قلعے کو جنگ کے میدان سے الگ کرتا تھا۔ نکا گھوڑے سے اترا اور مندر کی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

”بابا کو آخر صورت حال کی سنگینی کا احساس کیوں نہیں ہوتا؟ اگر میں فرانس چلا جاؤں تو بابا کے سارے خدشات ایک دم ختم ہو جائیں گے۔ برطانویوں کو اس فخر کا اندازہ نہیں جو ایک جنگجو ہونے کے ناطے ہم اپنے دھرم پر کرتے ہیں۔ ہماری عزت و احترام اور احساس وقار ان کی لئے خطرے کی گھنٹی ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہماری عزت پر مجبور ہوں تو ہمیں انہیں ان کے پیانوں سے شکست دینی ہو گی۔“

جیہ کو اپنے بھائی کا وہ غصہ بھی یاد تھا جب راجہ مان سنگھ نے اپنے بیٹے جان کو انگریزی اسکول بھجوا دیا تھا لیکن مہاراجہ نے نکا کو جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اب نکا ایک مرد بن چکا تھا۔ ایک ماہ بعد ہی وہ سترہ سال کا ہو جاتا۔

نکا نے اچانک اپنی بہن کا ہاتھ پکڑا اور اسے ٹوٹے ہوئے ستون کے پاس موجود دیوی کی مورتی کے پاس لے گیا۔

”میں دیوی کے سامنے قسم کھا رہا ہوں کہ میں بالمیر لانسرز کے دستے کو فرانس لے جاؤں گا۔ مجھے بابا اس کی اجازت دیں یا نہ دیں۔ اگر مجھے اس مقصد کے لئے بابا کے خلاف راجہ مان سنگھ کے ہاتھ بھی مضبوط کرنے پڑے تو میں دریغ نہیں کروں گا۔“

لانسرز کی یورپ روانگی سے ایک ہفتہ پہلے دستوں کی فل ڈریس پریڈ ہوئی۔ نکا اپنی بہن جیہ کے ساتھ گھوڑے پر سوار بڑی آزر دگی سے سینا پتی کو گھڑ سواروں کے لئے ہدایات اور احکامات جاری کرتے دیکھ رہا تھا۔ سردی کے آثار دکھائی دینے لگے تھے اور بیشتر فوجیوں نے موسم سرما کا لباس پہن رکھا تھا۔

مبجرویر سنگھ بالمیر کا جھنڈا لئے پریڈ کی قیادت کر رہا تھا۔ جس پر بالمیر کا قومی نشان بنا ہوا تھا۔ یہ ایک عقاب تھا جو دشمنوں پر جھپٹنے دکھایا گیا تھا۔

جے سنگھ کا سفید گھوڑا آہستہ روی سے پریڈ کے آخری سرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بھی مکمل جنگی لباس میں تھا۔ اس کے سر پر سرخ پگڑی تھی۔ جو بالمیر کی قوت و طاقت منظر تھی۔ اس نے دائیں بازو پر ایک بازو بند باندھ رکھا تھا جس پر لگے ہوئے دو بڑے ہیرے اور ایک یا قوت سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ ہیرے جنگجو کی آنکھوں یا قوت سورج کی طاقت کی نشاندہی کرتے تھے جبکہ بازو بند بذات خود ایک جنگجو کے تلوار ہونے کی نشانی تھی۔ مہاراجہ کی کمر کے ساتھ سرخ رنگ کا کمر بند، بندھا ہوا تھا جس میں کی تلوار لٹک رہی تھی۔

میجر دیر سنگھ ہاتھوں میں بالمیر کا قومی پرچم پکڑے راجپوتوں کا جنگی نعرہ بلند کر رہا تھا جے ماما کی.... جے ماما کی۔“

پانچ سو شہسوار بیک زبان اس جنگی نعرے کا جواب دے رہے تھے۔ ”بل حکم.... حکم....“

جے سنگھ اب اپنے فوجی دستوں سے خطاب کر رہا تھا۔ ”بالمیر کے شہسوار! چودہ پہلے تم لوگ انگریز کی مدد کے لئے پیکنگ گئے تھے اور آج ان کی مدد کے لئے فرانس جا ہو۔ انگلینڈ نے ہمارے ساتھ کئے جانے والے معاہدوں کی پابندی نہیں کی۔ اس لئے ہمیں کہہ سکتا کہ ہم نے انگریز کا نمک کھایا ہے۔ لیکن برطانوی تخت جنگ سے دوچار نہیں ہمارے معاہدے کا تقاضہ ہے کہ ہم ان کی مدد کے لئے اپنی فوجیں روانہ کریں۔ ایک بار تم لوگ بالمیر کی عزت و آبرو کے محافظ بن کر باہر جا رہے ہو اور اس بار پوری دنیا تم بہادری کی گواہی دے گی۔“

”بل۔ حکم!“ وفاداری کے قدیم نعرے سے کیولری گراؤنڈ گونج اٹھا۔

”تم سب جانتے ہو کہ آفتاب ہندوستان اور راجپوت حکمران مہارانا آف اودھ نے یہ کہہ کر اس جنگ میں حصہ لینے سے انکار کر دیا ہے کہ غیر ملکی غاصبوں کے لئے جانے والی جنگ راجپوتوں کے لئے کسی بھی طرح قابل فخر نہیں۔ اس نے شاہی خزانہ دوسرے سپاہی بھرتی کرنے پر خرچ کر کے برطانوی تاج و تخت کی توہین کی ہے۔ چنانچہ کے اس انداز اور مہارانا اودھ پور اور اس کی سلطنت کے دوسرے راجپوت بہادر ہندوستانی فوج میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ اس لئے کرائے کے فوجی اچھے درکنار اچھے سپاہی بھی نہیں ہیں۔“

حکمران کی آواز غم و غصے کے باعث جب زیادہ بلند ہوئی تو کیولری گراؤنڈ کا ماحول

گیا۔

”ہم ان انگریز افسروں سے جو اپنی تنخواہیں جنگ سے حاصل کر رہے ہیں، پوچھتے ہیں کہ انہیں اودے پور کو بزدل کہنے کا حق کس نے دیا ہے؟ ہم ان بے غیرتوں سے کہیں گے کہ وہ چٹوڑ کے راجاؤں، مہاراجوں اور رانا پر تپ کے پیش روؤں کو بزدل کہنے سے پہلے جنگ میں کام آنے والے ہزاروں بادشاہوں اور عزت و آبرو پر جل مرنے والی دس ہزار لاکھوں کے نام ضرور یاد کریں۔“

پورے میدان سے داؤد تحسین کے نعرے بلند ہونے لگے۔

”یہ کبھی نہیں کہا جائے گا کہ بالمر کے شہسواروں نے پیسے کے لئے لڑائی میں حصہ لیا ہے۔ ہم شہرِ لاہور میں لڑتے وقت ہمہ وقت یہ ذہن میں رکھتے گا کہ راجپوتوں کی عزت و آبرو آپ لوگوں کے ہاتھ میں ہے اور آپ ہی لوگوں نے یہ ثابت کرنا ہے کہ مہارانا اودے پور اور دوسرے راجپوت بزدل نہیں بہادر قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔“

اس نے اپنے لبائے سے ایک کلمہ نکالا۔ ”ہمیں آج ہی جودھ پور کے سر پر تپ سنگھ کا ایک پیغام موصول ہوا ہے۔ برطانوی تاج ہم سے چاہتا ہے کہ ہم اس کی سرسوز کی حفاظت کریں لیکن سر پر تپ نے یہ احکامات نظر انداز کر کے ہمارے دستوں کو فرانس لے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔“

جے سنگھ نے میدان کے آخری سرے کی طرف دیکھا جہاں جیہ اور نکا اپنے گھوڑوں پر سوار کھڑے تھے۔ ”ہمارے بیٹے نے ایک طویل مباحثے میں ہم سے اجازت مانگی ہے کہ اسے اپنے دھرم کے لئے لڑنے کی اجازت دی جائے۔ وائسرائے کے نام پر تپ کا پیغام پڑھ کر ہم نہیں سمجھتے کہ اب نکا کو جنگ پر جانے کی اجازت نہ دینا کوئی بہتر فیصلہ ہو گا۔ لہذا خاطر جمع رکھو، ہمارا بیٹا اور بالمر کا راج کمار جو ایک دن آپ لوگوں کا بادشاہ ہو گا اس جنگ میں آپ لوگوں کے شانہ بشانہ حصہ لے گا۔“

نکا نے خوشی کے مارے ایک نعرہ مستانہ بلند کیا لیکن اس کی آواز پانچ سو دہانوں سے نکلنے والے نعرے میں دب کر رہ گئی۔ ”جے ماتا کی..... جے ماتا کی.....“

نکا کی روانگی کی خبر نے زنان خانے کو درہم برہم کر دیا۔ پردہ دار خواتین اپنے ہاتھوں سے نکا کا لباس سینے پر باندھتیں۔ ادھر عورتیں نکا کا جنگی لباس سی رہی تھیں اور ادھر مہارانی اپنے بیٹے کی سلامتی کے لئے منتروں کا جاپ کر رہی تھی۔

ٹکا کی پٹریاں تیار ہو رہی تھیں۔ جیہ اپنے بھائی کے کمرے میں کھڑی ملازموں کو ہم کرتے دیکھ رہی تھی۔ اس کی گتیں کھلی ہوئی بستر پر رکھی تھیں۔ جیہ نے خود کپڑے سے اس کی ایک گن کو تیل لگایا تھا جبکہ ٹکا نے اپنی شاٹ گن صاف کی تھی۔

”میں فرانس میں جیس سے ملنے کا بڑی بے تابی سے منتظر ہوں۔“ ٹکا اچانک بول اٹھا۔
 ”ویسے تم بھی تو اسے کچھ بھیجو گی یا نہیں....؟“

”ہم نے پہلے ہی ایک شال پیک کر دی ہے اور ایک خط لکھ دیا ہے۔“ جیہ نے بھائی کے جملہ درمیان سے اچک لیا لیکن ہمیں اسے کیسے مخاطب کرنا چاہئے؟ محترم جیس صاحب ٹھیک ہے نا؟“

ٹکا چونک کر سیدھا ہو گیا۔ ”بے وقوف مت بنو، جیہ۔ تم اسے میرے پیارے جیس لکھو!“

”یہ بہت زیادہ بے تکلفی ہو گی۔ وہ کیا سوچے گا؟“
 ”وہ سوچے گا کہ تم نے مسز رائے سے جو انگریزی سیکھی ہے وہ بابو انگلش سے کثیر زیادہ بہتر ہے۔“

”اگر ہم کسی کو عزت سے پکاریں تو ہمیں غیر تعلیم یافتہ اور جاہل سمجھا جاتا ہے؟ لوگوں کے انگریزوں کو جنگلی کہنے پر ہمیں کوئی تعجب نہیں۔“

”آل رائٹ.... آل رائٹ!“ ٹکا نے ہار مان لی ”اپنے خط میں تم نے لکھا کیا ہے؟“
 جیہ نے اپنے سکرٹ کی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور شرماتے شرماتے بھائی کے حوالہ کر دیا۔ ٹکا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے کہا کہ وہ خود ہی پڑھ کر سنائے۔ جیہ کا چہرہ سر ہو گیا۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز کے ساتھ خط پڑھنا شروع کیا۔

”ہمارے بھائی کے عزیز ترین دوست، محترم جیس صاحب! تم مبینوں سے میدان جنگ میں ہو۔ ہم نے تقریباً ہر روز اپنی والدہ کے مندر میں تمہاری کامیابی کے لئے پوجا کی ہے اور تمہیں یقین ہے کہ دیوی ماتا تمہاری رکشا کرے گی اب ہم اپنے بھائی اور اس کے شہسواروں کو تمہاری مدد کے لئے بھیج رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ بالیہ کے ٹکا راجہ اور اس کے لانسز کی مدد سے تم یہ جنگ جیت جاؤ گے۔ تمہارے دوست کی بہن کی جانب سے بہت سی مناسبت۔ راجکماری جیہ آف بالیہ۔“

ٹکا نے سبز آنکھوں میں آنسو جھللاتے دیکھے تو اٹھ کر اسے اپنے حلقے میں قید کر لیا۔
 ”تم جانتی ہو شنزادی۔“ اس نے اپنی بہن کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ ”راجپوت راجکماریوں کو آنسو

ہمانے کی اجازت نہیں، خاص طور پر ایک جنگ جو کے میدان جنگ پر جاتے وقت اسے
الوؤں سے نہیں، دعاؤں سے رخصت کیا جاتا ہے۔“

”پہلے تمہیں انگلینڈ بھیجا گیا اور اب تم فرانس جا رہے ہو اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو....“
نکانے اسے زور سے لپٹایا اور پھر اپنی گن کی صفائی میں مصروف ہو گیا۔ ”مجھے کچھ
نہیں ہونے والا۔ میں دشمنوں کو شکست دے کر سرفراز واپس آؤں گا تاکہ تمہارے دولہا کو
جنگ کی کہانیاں سنا سکوں۔“ جیہ نے ایک جھرجھری سی لی تو نکانے انگلی کے اشارے سے
اسے ایسا کرنے سے منع کیا۔ ”راج گورو نے جو کہا ہے اسے یاد رکھو جیہ۔ فرض، احترام کا
دوسرا نام ہے اور یہ ہمارے فرائض ہیں۔ جنگ میرے لئے اور دولہا تمہارے لئے،“
فرزادی۔“

روانگی سے ایک رات پہلے نکانا اپنی ماں سے ملنے زنان خانے میں آیا۔ مہارانی نے آشنا
کا ایک جام، جنگ پر جانے والے بیٹے کی حوصلہ مندی کی نشانی کے طور پر اس کے حوالے
کیا۔ نکانے جام خالی کیا اور ماں کے پاؤں چھونے کے لئے جھک گیا۔ بہت دیر تک مہارانی
کے ہاتھ اپنے بیٹے کے سیاہ بالوں پر رہے اور پھر وہ بالکونی سے چلا گیا۔

”اٹھو جاؤ، جیہ! بیرن تمہیں کل کی پوجا کے لئے تیار کرے گی۔ کوئی غلطی نہیں ہونی
چاہئے۔ بھائی کے میدان جنگ پر جاتے وقت بہن کی پوجا میں کوئی غلطی اچھا لگھون نہیں
ہوتی۔“

جیہ اپنی ماں کے حوصلوں پر حیران تھی۔ مہارانی کی آواز میں کوئی ارتعاش نہ تھا جس
سے اندازہ ہوتا کہ تین سال دور رہنے والا اس کا بیٹا ایک بار پھر اسے چھوڑ کر جا رہا ہے اور
اس مرتبہ وہ پڑھنے نہیں بلکہ جنگ کے لئے روانہ ہو رہا ہے۔

بیرن نے زیورات کے ایک بکس سے بیر کی شکل کا ایک زیور نکالا اور اسے جیہ کی
پیشانی کے اوپر بالوں میں لگا دیا۔

”ایک ہزار سال پہلے ہم جنگ جوؤں کے روپ میں اس صحرا میں آئے تھے۔“ مہارانی
نے راجکمار کی کو آگاہ کیا۔ ”اس وقت ہماری واحد خوراک بیر کی پھل تھا۔ ہم اسی یادگار کے
طور پر بیر کی شکل کا زیور بدن کے سب سے اوپری حصے پر پہنتے ہیں۔“

زنان خانے کی دوسری عورتوں نے جیہ کو بھاری ہار اور دیگر زیورات پہننے میں مدد دی
تھی۔

”ہمارے خزانے قیمتی پتھروں کی صورت میں ہوتے تھے۔ جنہیں ایک میدان جنگ سے

دوسرے میدان جنگ کو منتقل کرنا آسان ہوتا تھا۔ جب ہمارے مرو جنگ پر جایا کرتے تھے تو عورتیں قوم کے ان خزانوں کی رکھوالی کیا کرتی تھیں۔ تمہارے زیورات اسی حفاظت کا اشارہ ہیں۔“

بیرن نے ایک بڑا سا بنڈل کھولا۔

”جو کپڑے تم پوجا کے وقت پہنو گی، اسے دیوی ماتا کا رنگ بھی کہا جاتا ہے۔“

جیہ نے ایک لمبا اسکرٹ اور قمیض زیب تن کی۔ وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ یہ رنگ دیوی کا ہی نہیں، خون کا بھی ہے۔

آخری پارسل میں سے بیرن نے ایک نقاب نکالی جو جیہ کو اوڑھا دی گئی۔

”جنگ کے دنوں میں قلعے کی حفاظت شاہی خواتین کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ کل تمہارا جسم جنگ کی امانت کے طور پر ڈھک دیا جائے گا۔ یاد رکھو بالمیر کے قلعے کی حفاظت اس وقت سے تمہاری ذمہ داری ہو گی جب تم اپنے بھائی کے ہاتھ پر خون سے تلک لگاؤ گی تو۔۔۔“

پہلی بار مہارانی کی آواز بھرا گئی۔ جیہ کو خود اپنی آنکھوں سے آنسو بہتے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے اپنا رخ پھیر لیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ عورتیں اسے روتا ہوا دیکھیں۔ اگلی صبح جیہ قلعے کے مندر میں پوجا کا لباس پہنے مہاراجہ جے سنگھ اور راج گورو کے سامنے بیٹھی تھی۔ ساتھ ہی پتھر کی قربان گاہ پر ایک مینڈھا بندھا ہوا تھا۔ لائرنز کے گھوڑے مندر کی ایک سمت قطار میں کھڑے تھے جبکہ دوسری سمت موتی تھا۔ قلعے کے دروازے پر رکھے دونوں نقارے اٹھائے گئے تھے۔ یہ نقارے جو ایک بڑے ہاتھی کے ساز کے تھے اس وقت دو ہاتھیوں پر رکھے ہوئے تھے۔ نقاروں کے بڑے ہونے کی وجہ سے ہاتھیوں کی مہات، ہاتھیوں کی گردنوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

تین سولائرنز، نکا اور میجر ویر سنگھ کی سربراہی میں مندر کے سامنے زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ہتھیار رائفلیں، سنگینیں، تلواریں، چاقو ایک قطار میں ان کے سامنے سرخ قالین پر رکھے تھے۔ پجاریوں کا ایک گروہ منترؤں کے جاپ میں مصروف تھا۔

راج گرو نے نکا کی تلوار نیام سے نکال کر جیہ کے ہاتھ میں دے دی۔ جیہ جانتی تھی کہ اس وقت وہاں موجود ہر شخص کی نگاہیں اس پر مرکوز ہیں۔ نکا اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے بڑھ رہا تھا۔

جب جیہ نے تلوار کا رنگا پھل اپنے اور اپنے بھائی کے درمیان فضا میں بلند کیا تو جیہ

اٹا ہاتھ کچھ بھاری محسوس ہوا۔ جیہ کا جی چاہا کہ وہ تلوار پھینک دے اور ٹکا کے بھرپور اور لمبور بدن کو اپنی بانہوں میں لے کر بسن کی ساری محبتیں اس پر نچھاور کر ڈالے۔ شاید وہ ایسا کر بھی گزرتی لیکن جب اس نے نگاہیں اٹھائیں تو ٹکا نے آنکھ کے اشارے سے اسے ہاجا مکمل کرنے کا اشارہ کیا۔

جیہ نے تلوار کی نوک سے اپنے انگوٹھے کی اندرونی جانب ہلکا سا زخم لگایا تو خون نوارے کی صورت ابل پڑا۔ اس نے اپنے زخمی انگوٹھے سے ٹکا کے ماتھے پر تلک لگانے کو ہاتھ اٹھایا تو اس کی کلائی میں موجود شیشے کی چوڑیاں کھٹک اٹھیں۔

ٹکا نے بسن سے تلوار لی اور مینڈھے کی طرف بڑھا۔ جیہ اب اپنے بھائی کے شاندار ہم کو دیکھ رہی تھی۔ ٹکا نے صرف ایک انگلی تلوار کے پھل کے متوازی رکھی تھی جبکہ باقی چار انگلیاں تلوار کے دستے پر تھیں۔ جیہ کو ادراک ہوا کہ اس کا بھائی ”نسبتاً“ ایک مشکل وار سے بھینٹ پوری کرنے جا رہا ہے۔

اچانک ٹکا بہ آواز بلند چلایا۔ ”جے ماتا کی!“ ساتھ ہی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ تلوار نیچے آئی اور مینڈھے کا سرکٹ کر دور جا گرا۔

نقارے بجنے شروع ہو گئے اور پجاریوں نے نفرتی پیالے مینڈھے کے خون سے بھرنے شروع کر دیے۔ لانسرز اٹھ کھڑے ہوئے تاکہ پجاری مینڈھے کے خون سے ان کی پیشانیوں پر نشان بنا سکیں۔ ”جے ماتا کی“ کے نعروں سے میدان گونج رہا تھا۔ راج گرو نے پہلے ہتھیاروں پر خون چھڑکا اور پھر گھوڑوں کی پیشانیوں کو لہو سے رنگین کر دیا گیا۔

لانسرز نے مہاراج کی قدم بوسی کے لئے قطار بنالی۔ انہوں نے اطاعت کی رسم پوری کی اور پھر ”بل۔ حکم!“ کی آوازیں لگاتے اپنے اپنے گھوڑوں کی طرف بڑھ گئے۔ جب میجر دیر سنگھ مہاراج کے پاؤں چھونے کے لئے جھکا تو جے سنگھ نے اسے سینے سے لگا لیا۔ ”دیوی تمہیں وجے سے ہمکنار کرے، دوست!“ مہاراج نے سرگوشی کی تو جیہ کو اپنا حلق آنسوؤں سے بھرتا ہوا محسوس ہوا۔

اور پھر ٹکا اپنے باپ کے قدموں پر تھا۔ بہت دیر تک وہ اپنے باپ کے قدموں پر جھکا رہا لیکن مہاراج کے ہاتھ اسے آئینہ دینے کو نہیں اٹھے۔ جیہ، مہاراج کو دیکھ رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ برطانوی تخت کے خلاف مہاراج کی سوچ اپنے بیٹے کو جنگ پر جانے کی اجازت دینے کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہے۔

جے سنگھ نے اپنا بازو بند کھولا اور ٹکا کے بازو پر باندھ دیا۔ جیہ نے اپنے والد کی گلوگیر

آواز سنی۔ ”آج ہم اپنی زندگی کی عزیز ترین شے برطانوی تخت کے حوالے کرتے ہیں۔ یہ بازو بند ہماری قوت و طاقت کا محافظ اور ہماری حکمرانی کا نشان ہے ہماری پرارتنا ہے کہ تمہارے اس ملک کے بادشاہ بننے تک اور اس کے بعد بھی یہ تمہاری حفاظت کرے۔“

نکا نے ایڑیاں بجائیں، مہاراجہ کو سیلوٹ کیا، اور ”بل حکم“ کا نعرہ لگا کر اپنے گھوڑے کی طرف بڑھ گیا۔

موتی اب قلعے کے بیرونی دروازے کی طرف رخ کئے کھڑا تھا اور اس کے عقب میں شہسوار دستہ چار چار کی قطار میں تھا۔ مہاراجہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا تاکہ جلوس کی خارجی دروازے تک قیادت کر سکے۔ جیہ بھی اپنے گھوڑے پر سوار ہو گئی تھی تاکہ دور تک جلوس کا نظارہ کر سکے۔

مبجرویر سنگھ نے اپنی تلوار بے نیام کی تو قلعے کی توپوں نے گرجنا شروع کر دیا۔ مہاراجہ نے گھوڑا آگے بڑھایا تو شہسوار دستے نے اس کی تقلید کی۔ جیہ آنسوؤں کو اپنی آنکھوں میں روکے اپنے بھائی کو قلعے کے خارجی دروازے کی طرف بڑھتے دیکھتی رہی۔

لیکن جب بہت دیر بعد ٹرین کے دسل نے بالمیر لائنرز کی روانگی کا اعلان کیا تو جیہ خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ دو موٹے موٹے آنسو سبز گھروں سے نکل کر رخساروں کی سلونی ڈھلانون پر اتر آئے تھے۔

مارچ 1915ء تک ہندوستان نے برطانوی تاج کی حفاظت کے لئے دس لاکھ افراد پر مشتمل فوج میدان میں اتار دی۔ یہی وہ وقت تھا جب ہندوستانی بادشاہوں اور حکمرانوں کو سرکش اور نافرمان بچے قرار دینے والا ہندوستان کا سابق وائسرائے لارڈ کرزن، برطانیہ عظمیٰ کے ہاؤس آف لارڈز میں اپنی مفتوحہ مملکت کا دفاع کر رہا تھا۔

نکا کے موصول ہونے والے خطوط بھی ہندوستانیوں کے لئے برطانویوں کے اچھے جذبات کے آئینہ دار تھے۔

”25 نومبر 1914ء گذشتہ روز ہم لیور پول کی بندرگاہ پر اترے۔ سڑکیں انگریزوں سے بھری پڑی تھیں جو ہندوستانی فوجیوں کا استقبال کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ عورتیں سکھوں کی پگڑیوں میں پھول لگانے کے لئے ٹوٹی پڑ رہی تھیں جبکہ ہندوستانیوں کے گھوڑے اس جہوم کو دیکھ کر کنٹرول سے باہر ہوئے جا رہے تھے۔“

”10 دسمبر لندن، ہم لوگ وکٹوریہ اسٹریٹ پر زخمی ہندوستانی فوجیوں کا ہسپتال دیکھنے گئے۔ بلوچ رجمنٹ کے 560 میں سے 500 جوان کام آئے ہیں جبکہ برہمن رجمنٹ کا

لنھان اس سے کہیں زیادہ ہے۔ برطانوی آخرکار ہندوستانی فوجیوں کو بھی وکٹوریہ کر اس دینے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ انگریزوں نے اس وقت ہماری قدر کی جب ہم نے کئی سو جانیں گنوا دیں۔“

”30 دسمبر۔ آخرکار فرانس۔ لیکن یہ گھوڑوں کی جنگ نہیں۔ اس میں تو فوجی مورچوں اور خندقوں میں پیٹ کے بل ریگتے ہوئے چوہے لگتے ہیں۔ دشمن کی آرٹلری اتنی قریب ہے کہ اس کے گنز توپوں میں گولے ڈالتے صاف دکھائی دیتے ہیں اور ہمارے خوبصورت گھوڑے سپلائی وینگنوں کو کھینچنے کے کام آ رہے ہیں۔“

جنگ یورپ کے میدانوں میں ہو رہی تھی لیکن قلعے کے در و دیوار بھی اسی سے نا آشنا نہیں تھے۔ ایک کمرے کی پوری دیوار جنگ کے نقشوں سے بھری ہوئی تھی۔ جن پر یورپی جنگ کے بڑے بڑے مرکزوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔ ایک اور کمرے میں آویزاں بڑے بڑے چارٹوں پر سینا پتی ہندوستانی بادشاہوں کے فوجیوں کے کارناموں کو نشان زد کرتا تھا۔ ایک کمرے میں صرف اس کام پر متعین تھا کہ دہلی سے ٹیلی گراف پر پیغامات وصول کرے۔ مہاراجہ جے سنگھ دفاتر معتمدی سے واپسی پر روزانہ ان پیغامات کا مطالعہ کرتا تھا۔

ایک بڑے کمرے میں مہاراجہ اور سینا پتی جنگی امور پر تبادلہ خیال کرتے تھے اور جیہ دن بھر کی وہ رپورٹ تیار کرتی تھی جو اسے زنان خانے کی عورتوں کو سنائی پڑتی تھی۔ مہارانی نے جنگ میں اپنا حصہ یوں ادا کیا تھا کہ وہ دن بھر بالیر کی مہارانیوں کے مندر میں پوجا پات کرتی اور بالیر لانسز کی وجہ کے لئے پرار تھا کرتی۔

”فروری 1915ء..... بے چارے گھوڑے، بالکل ہماری طرح کچڑ اور برف سے نفرت کرتے ہیں۔ گزشتہ روز ہندوستانی شاہی فوجی دستوں کی ڈریس پریڈ ہوئی۔ اس وقت فوجیوں کا جوش دیدنی تھا جب فیلڈ مارشل سر جان فرینچ نے تقریر کے دوران ہندوستانی زبان کے چند جملے بولے۔ وہ اس بات پر فخر کر رہے ہیں کہ برطانوی فوجوں کے کمانڈر انچیف نے بھی ہندوستانی فوج کی قیادت کی ہے۔“

”مارچ 1915ء..... آخرکار ہم اگلے مورچوں کی طرف جا رہے ہیں..... مزید نہیں لکھ سکتا..... آدمیوں کو پوپرز جانے کے لئے تیار کرنا ہے۔“

اس خط کے بعد ٹکا کی جانب سے خاموشی چھا گئی۔ ٹیلی گراف پر ملنے والے پیغامات نے صورتحال مزید خراب کر دی۔ جنگ ایک نئی اور خوفناک سمت کو جا رہی تھی۔ فضا سے فوجوں پر بمباری کے لئے ہوائی جہاز استعمال کئے جا رہے تھے۔ جرمنوں نے انگریزوں کے

بچے ادھر دیئے تھے۔ وہ ٹینک اور مارٹر توپیں استعمال کر رہے تھے جبکہ ایک نئی گن جسے بگ بر تھا کہا جاتا تھا اس نے فوجیوں کی صفیں کی صفیں تباہ کر دی تھیں۔

جنگ کی صورت حال بگڑی تو مہارانی کی دن کی پوجا کے ساتھ ساتھ رات کی پوجا بھی شروع ہو گئی۔ مہارانیوں کے مندر میں مہارانی کا بستر بچھا کر دروازے مقفل کر دیئے گئے۔ جیہ جانتی تھی کہ ان بند دروازوں کے پیچھے اس کی ماں اپنے بیٹے کی سلامتی کے لئے دیوتاؤں کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھی ہے۔

مسی کا مہینہ آگیا اور گرمیوں میں شدت آنے لگی، لیکن نکا کی جانب سے کوئی اطلاع نہیں آئی۔ ایسے میں ایک روز بیرن، جیہ کے کمرے میں داخل ہوئی۔

”مہارانی کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو جاؤ، شہزادی وہ ایک ایسی عورت سے ملنے جا رہی ہیں جو صحرا کے اختتام پر ایک غار میں رہتی ہے۔“

”ماں اس عورت کو یہاں کیوں نہیں بلو لیتیں؟“

”مہارانی نے بارہا اس عورت کو بلوایا ہے، لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ ستی، ماتا کہلاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کا تعلق شاہی خاندان سے ہے لیکن جب اسے اپنے شوہر کے ساتھ ستی ہونے سے روک دیا گیا تو اس نے جوگ لے لیا۔“ بیرن نے سر گھما کر ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی اس کی باتیں سن تو نہیں رہا ”وہ پچھلے بیس سالوں سے جلتی ہوئی گھاٹوں اور سڑی ہوئی لاشوں کے پار بنارس میں رہتی ہے کہتے ہیں کہ وہ مرے ہوئے بچوں کا گوشت کھاتی ہے۔“

”لیکن ہمارا اس سے ملنا کیوں ضروری ہے؟“

”کیونکہ اس کے پاس بہت سی قوتیں ہیں۔ شہزادی اور مہارانی صاحبہ....“ بیرن کی آواز ڈوب گئی۔

”بولتی رہو۔“

”مجھے یہ نہیں کہنا چاہئے، شہزادی، لیکن آپ کی والدہ جادو ٹونے اور غیر فطری قوتوں پر بے حد یقین رکھتی ہیں اور ان کے برت بھی بے حد خوفناک ہیں، میں ڈرتی ہوں کہ کہیں ان کے ذہن....“

لیکن جب جیہ پردے لگی ہوئی رولس رائس میں اپنی ماں کے برابر بیٹھی تو اسے مہارانی کی آنکھوں میں دیوانگی کی کوئی جھلک دکھائی نہ دی تھی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی آزر دگی تھی لیکن بے قرار انگلیاں مسلسل گلے میں پڑی ملا سے کھیل رہی تھیں۔ آواز میں کوئی

لہراہٹ نہیں تھی بلکہ لہجہ معمول کے مطابق تھا۔ شیشے کے پارٹیشن کی دوسری جانب بڑا نواجہ سرا ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تہہ کیا ہوا پردہ تھا جسے وہ کار سے اترتے وقت مہارانی کے سامنے تان دیتا تاکہ وہ لوگوں کی گستاخ نگاہوں سے محفوظ رہ سکیں۔

کار دارالحکومت کی تنگ گلیوں سے نکل کر جنوب کی سمت چل دی۔ جلد ہی آبادی بچے رہ گئی اور ان کا سفر دیہی علاقے میں شروع ہو گیا۔ بادشاہت کی جنوبی سرحدیں آرادل کے پہاڑی سلسلے تک پھیلی ہوئی تھیں جن کے دامن میں قدیم قلعے اور مندر بنے ہوئے تھے۔

پہاڑی علاقے کی ٹیڑھی میڑھی سڑک پر ایک جگہ بڑے خواجہ سرا نے کار رکوا دی۔ پہلے وہ دروازہ کھول کر نیچے اترا اور اس کے بعد مہارانی نے زمین پر قدم رکھے۔ خواجہ سرا نے پردہ مہارانی کے سامنے تان دیا تاکہ ڈرائیور اسے دیکھ نہ پائے۔

ان کا سفر بلندی کی طرف جاری تھا۔ اوپر سورج چمک رہا تھا جس کی وجہ سے جیہ خاصی گرمی محسوس کر رہی تھی۔ چڑھائی کی وجہ سے اس کی سانس بھی پھول رہی تھی لیکن مہارانی سورج کی تپش اور راستے کی مشکلات سے بے پروا مسلسل آگے بڑھ رہی تھی۔

سفر کا اختتام پہلی اینٹوں سے بنے ایک شمشان گھاٹ پر ہوا تھا۔ پیلا رنگ ستی کی نشانی تھا۔ گھاٹ کے متصل ایک مقبرہ نما عمارت تھی۔ مہارانی نے اپنے جوتے اتارے اور ننگے پاؤں مندر کی بوسیدہ اور ٹوٹی پھوٹی سیڑھیاں چڑھنی شروع کر دیں۔

جیہ، مہارانی کے پیچھے تھی۔ چمکتی ہوئی دھوپ کے بعد مقبرے کی نیم تاریکی اسے نعمت سے کم محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اندھیرے کی عداوت ہوئیں تو بہت سے چمگاڑ چھت سے لٹکے دکھائی دیے۔ چھت ٹوٹی پھوٹی تھی اور کئی جگہ سے اینٹیں اکھڑ کر نیچے گری ہوئی تھیں۔

مہارانی ایک دروازے پر پڑا ہوا کسی جانور کی کھال کا پردہ اٹھا کر دوسری سمت چلی گئی تو جیہ نیم تاریک مقبرے میں چمگاڑوں اور بندروں کے ساتھ تنہا رہ گئی۔ کوئی چیز جو گیلی تھی، جیہ کے پیروں سے لپٹی تو وہ جیننی اور بھاگتی ہوئی پردہ اٹھا کر دروازے کی دوسری سمت چلی گئی۔ وہ اتنی بدحواس تھی کہ دوسری سمت صحن میں آم کے ایک درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی عورت کی گود میں جا گری جس نے لباس کی جگہ شیر کی کھال پہن رکھی تھی۔

عورت نے تقبہ لگایا۔ یوں لگا جیسے ہڈیوں کے بہت سے پنجر تیز ہواؤں میں آپس میں

کھرا گئے ہوں۔ وہ آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ لوہے کا ایک تیر اس کے پہلو میں زمین پر گڑا ہوا تھا۔ اس کے کھلے بال زمین تک پہنچ رہے تھے اور ایک ٹوٹے ہوئے ناریل کا پانی ٹپک ٹپک کر انہیں بھگو رہا تھا۔

گود میں گرنے سے جیہ کا چہرہ عورت کے شانوں کے عین اوپر تھا۔ ایک ہی لمحے بعد دوسری چیخ جیہ کے طلق سے آزاد ہو گئی۔ عورت کے پیچھے ایک شیش ٹاگ بیٹھا تھا جو اپنی لمبی سرخ زبان سے ناریل کے پانی سے بھیکے ہوئے بالوں کو چاٹ رہا تھا۔

عورت نے اپنی استخوانی انگلیوں سے جیہ کے گل تھپتھپائے ”کاش تم اس خوف کا اندازہ کر سکو جو تمہیں اپنی زندگی میں درپیش ہے۔ یہ خوف اس بے ضرر سانپ کی دہشت سے کہیں زیادہ ہے۔۔۔۔“ اس نے جیہ کا ہاتھ پکڑا اور سانپ کے نزدیک رکھ دیا۔ ٹاگ فوراً آگے بڑھا اور اس کا لالچا جسم جیہ کی کلائی سے لپٹ گیا۔ اس کی دو شاخہ زبان اب جیہ کی کالنج کی چوڑیوں کو سہلا رہی تھی۔

عورت کی سیاہ آنکھوں کی کشش نے جیہ کو اپنی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ”اپنے خوف کا جائزہ لو بیٹی! بس اسی طرح تم اپنے اندر حوصلہ پیدا کر سکتی ہو جو تمہاری جنس سے بے پروا ہو کر اس خوف کے ختم ہونے کا سبب بنے گا۔“

”ہم نے اس کے والد کو متنبہ کیا تھا۔“ مہارانی بے قراری سے بول اٹھی۔ ”ہم نے انہیں بتایا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی تربیت ایک مرد کی حیثیت سے کر رہے ہیں۔“

عورت نے مہارانی کی بے قراریوں یا اس کے الفاظ پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ ”صرف چند لوگ ہی تمہاری برتری اور اعلیٰ حوصلگی کو سمجھ پائیں گے۔ اس لئے تمہارے اندر اتنا حوصلہ اور ہمت ہونی چاہئے کہ تم اپنی بانجھ زندگی کسی اور کے سہارے کے بغیر گزار سکو۔“

”بانجھ زندگی“ مہارانی تقریباً چلا اٹھی۔ ”کیا ہماری بیٹی بانجھ ہے؟“ ”خود کو پریشان مت کرو“ مہارانی صاحب ”عورت نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ”تمہاری بیٹی کی شادی ہوگی اور یہ ایک بیٹے کی ماں بنے گی۔“

”ہم نہیں سمجھتے کہ دیوی اس قدر ظالم ہوگی بسر حال اس کی شادی کس سے ہوگی؟“ ”ایک بہادر اور عظیم فخر سے!“

”کوئی حکمران بادشاہ؟“ ”ایک عظیم اور قدیم تلواری۔“

مہارانی کے چہرے پر پھر تشویش کے سائے لہرانے لگے۔ ”کیا ہماری بیٹی کسی بوڑھے مہاراجہ کی تیسری یا چوتھی بیوی بنے گی؟ اس کے والد ایسی کسی شادی پر رضامند نہیں ہوں گے۔“

ستی ماتا نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا۔ اسے تواتر کے ساتھ کئے جانے والے یہ سوالات پسند نہیں آئے تھے وہ جیہ سے مخاطب ہوئی تھی۔ ”تمہاری خواہشیں ابھی نوجوان ہیں، لڑکی.... شادی، جوانی اور طاقت.... لیکن یہ سب کچھ موت سے پہلے گرد کے کسی طوفان کی طرح گزر جاتا ہے۔ میں نے بیس سال بتارس میں مقدس دریا کے کنارے گزارے ہیں۔ میں نے بیٹیوں کو اپنے باپوں کے سرتن سے جدا کرتے دیکھا ہے۔ میں نے وہ عورتیں بھی دیکھی ہیں جو اپنے شوہروں کی چتا میں کودنے کے لئے باقاعدہ لڑا کرتی تھیں۔ میں نے ایسے پجاریوں کو بھی دیکھا ہے جو انسانی لاشوں سے کسی گدھ کی طرح گوشت نوح نوح کر کھاتے ہیں تاکہ ان کی فطرت میں اضافہ ہو سکے۔“

”مگر تمہارا نام.... لوگ تمہیں بھی تو ستی ماتا کہتے ہیں کیونکہ تم نے بھی اپنے شوہر کی چتا میں جل مرنے کی کوشش کی تھی؟“ جیہ کا لہجہ سوالیہ تھا۔

ستی ماتا نے ایک بلند آہنگ تھقہ لگایا۔ ”ستی کا خطاب اس عورت کو نہیں دیا جاتا جو خود کو چتا میں جلا کر راکھ کر لے۔ یہ تو کسی عورت کی پاک دامنی اور پارسائی کا خطاب ہے اور عظیم پارسائی، صبر و استقامت اور حوصلہ ہے میری بیٹی! مجھے اس لئے ستی ماتا کہا جاتا ہے کیونکہ میری گورو وہ پانچ ستی عورتیں ہیں جنہوں نے اپنے شوہروں کی چتاؤں میں جلنے سے انکار کر دیا تھا۔ اصل ستی تو یہ ہے کہ محافظ کے مرجانے کے بعد بھی آپ، اپنے کو زمانے کی آلودگیوں سے محفوظ رکھیں۔“ وہ چند ٹانپے رکی اور پھر گویا ہوئی۔ اس بار اس کی مخاطب مہارانی تھی۔ ”تمہیں بھی ستی ماتا کے نام سے یاد کیا جائے گا، مہارانی۔ بہت جلد قلعہ بالمیر کے نقارے تمہاری نگاہوں کے سامنے ٹوٹ جائیں گے۔“

”بالمیر کے نقارے صرف اسی صورت ٹوٹ سکتے ہیں کہ دشمن بالمیر کو فتح کر لے۔ تم اشاراتی زبان میں گفتگو کرتی ہو اس لئے میں تمہاری باتوں کو سمجھ نہیں پاتی۔ براہ کرم کوئی ایسا طریقہ بتا دو کہ میں ان واقعات سے نمٹ سکوں۔“

مہارانی، عورت کے قریب ہو کر بیٹھ گئی۔ اسے یہ فکر نہ تھی کہ شیش ناگ کا رخ اب اس کی سمت ہو چکا ہے۔

”ہمارے تمام تر اقدامات عوام کی فلاح و بہبود کے لئے ہوتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ

دیوی ہم پر رحم کرے گی۔ مجھے کوئی ایسا منتر بتا دو جس سے دیوی کی ناراضگی ختم کی جا سکے۔“

مہارانی کو ٹوٹاؤیکھ کر جیہ کو حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا، لیکن مہارانی اس سے بھی بے پرواہ تھی۔

”کیا تم بچی ہو مہارانی!“ عورت کے پہلے جملے کے ساتھ ہی مہارانی کی رنگت پیلاہٹ کا شکار ہو گئی تھی۔ ”جو تم دیوی دیوتاؤں اور منتروں پر اعتقاد رکھتی ہو۔“

مہارانی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا سر عورت کے سامنے جھکا دیا۔ ”یہ الفاظ صرف وہی بول سکتا ہے جس نے انتہائی منزلیں سر کر لی ہوں، لیکن میں تو ایک عام سی عورت ہوں۔“ مہارانی شاید اتنی ٹوٹ گئی تھی کہ اس کا انداز گفتگو بدل گیا تھا۔ وہ ہم سے میں پر آگئی تھی۔ ”میرا بیٹا ایک دوسری قوم کی جنگ لڑنے گیا ہے۔ میرا شوہر اپنے ہی قلعے میں اپنی وزارت کی کونسل کے ہاتھوں زیرِ غلام ہے۔ تم کہتی ہو کہ ہماری آنکھوں کے سامنے بالیر کا فقاہہ ٹوٹ جائے گا۔ تمہارے الفاظ سے موت کی بو آتی ہے۔“ آنسو مہارانی کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔ ناگ نے ان آنسوؤں کو پینا شروع کر دیا۔ ”مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے سستی ماتا! میں تمہاری منت کرتی ہوں مجھے کوئی ایسا منتر دے دو، جس سے میں اپنے گھر کی ٹوٹی دیواروں کو بچا سکوں۔“

ستی ماتا نے ایک طویل سانس لی اور دعائیہ انداز میں دایاں ہاتھ بلند کر دیا۔ ”تم نے منتر پر اصرار کیا ہے، سو میں تمہیں منتر ضرور دوں گی۔ اس منتر سے تمہارا خوف یقیناً دور ہو جائے گا۔ مہارانی صاحبہ.... رام نام ست ہے.... رام نام ست ہے.... زام نام....“

”یہ تو موت کا منتر ہے، سستی ماتا!“ مہارانی چلا اٹھی وہ جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ہمارے گھر کی بنیادیں گرتی ہیں تو گر جائیں، لیکن ہم وہ منتر کبھی نہیں پڑھیں گے جو مرنے والے کی بیوی اس کی ارحس پر پڑھتی ہے۔ ہم جے سنگھ جی کی بیوی ہیں اور ان کی بیوہ کی حیثیت سے کبھی زندہ نہیں رہیں گے۔ ہم بدوا نہیں بنیں گے۔“ جیہ کو یقین نہیں آیا کہ اس کی ماں نے اپنے شوہر کا نام لیا ہے، کیونکہ راجپوت عورتیں مرجاتی تھیں، لیکن شوہر کا نام ہونٹوں سے ادا نہیں کرتی تھیں۔ ”ہم بالیر کی مہارانی ہیں۔ اپنے عظیم پیش روؤں کی طرح ہم بھی یہ منتر پڑھنے سے پہلے خود کو جلا کر راکھ کر لیں گے۔“

مہارانی کے غصے سے عورت جھلا اٹھی۔ ”تم نے بھی تو کھلونے کے لئے بچے کی ضد کی طرح ہم سے موت سے بچنے کے منتر کا مطالبہ کیا تھا۔ اپنے منتر کو دہراؤ، تمہیں اس کا حقیقی

مطلب سمجھ میں آجائے گا۔“

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ شاید وہ مراقبے میں چلی گئی تھی۔ کوہراب اس کے عریاں کھننے پر سرسرا رہا تھا۔ خاموشی کا وقفہ ذرا سا طویل ہو گیا، لیکن ایک بار پھر عورت کے ہونٹ وا ہوئے اور سرسراقتی ہوئی آواز اس کے حلق سے آزاد ہونے لگی۔ ”رام نام ست ہے۔۔۔۔۔“

رام نام ست ہے۔۔۔۔۔ رام نام ست ہے۔۔۔۔۔ شانتی۔۔۔۔۔ شانتی۔۔۔۔۔“

ملاقات ختم ہو چکی تھی لیکن واپسی پر بھی جیہ کے کانوں میں ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔ ”رام نام ست ہے۔۔۔۔۔ رام نام۔۔۔۔۔“

جنگ شروع ہونے کے دس ماہ بعد شاہ جارج پنجم نے پہلی بار ریڈیو پر برطانوی بادشاہت سے خطاب کیا۔ شاہ کی تقریر اس خواب پرست ریڈیارڈ کپلنگ کی لکھی ہوئی تھی جسے ایک مرحلے پر یقین تھا کہ اس کی محبوب ہندوستانی فوج کے وفادار کالے فوجی اور شاندار برطانوی افسر ترقی یافتہ بادشاہت کے لئے متمدن دنیا کی حفاظت کریں گے۔

کپلنگ جیسے مذہب اور متمدن دنیا کے متوالے شخص کی تقریر میں ان لاکھوں ہزاروں فوجیوں کا کوئی ذکر نہ تھا جنہیں جنگ کے پہلے تین ماہ کے دوران فلنڈر کی دلدلوں میں گائے بھینسوں کی طرح ذبح کر دیا گیا تھا۔ ذبح ہونے والے ان تمام فوجیوں کا تعلق برطانوی شاہی فوج سے تھا۔ تقریر میں انور پاشا کی فوج کے ڈھائی لاکھ ترکوں کا بھی کوئی حوالہ نہ تھا جو افغانستان کے راستے ہندوستان فتح کرنے سے قبل روسی تیل کے کنوؤں پر قبضے کی کوشش میں مارے گئے تھے۔ نہ ہی آسٹریلیا، نیوزی لینڈ کے ان دستوں کا نام لیا گیا تھا جو انڈیا کی کھوہ کے سامنے فخریہ انداز میں آئے تھے لیکن مشین گنوں سے بھون ڈالے گئے۔ یہ گیلی پولی میں پانچ لاکھ افراد کے قتل عام کا پہلا حصہ تھا۔ کپلنگ کی تقریر دیر ڈن میں مرنے والے دس لاکھ نازیوں یا سوی یا قط العارہ میں ذبح ہونے والے ہزاروں برطانوی نوی فوجیوں کے ذکر سے خالی تھی۔

شاید کپلنگ ایک اچھا شاعر تو تھا لیکن ایک اچھا نثر نگار نہ بن سکا ہو یا ممکن ہے اس وقت تک انگریزی زبان میں ایسے الفاظ نہ بن چکے ہوں جو قتل و غارت گری کے ان واقعات کا احاطہ کر سکتے۔

حتیٰ کہ لارڈ کچر جس نے کپلنگ کی محبوب ہندوستانی فوج کی سربراہی کے لئے لارڈ کرزن سے باقاعدہ جنگ لڑی تھی اس قتل عام پر چیخ اٹھا تھا۔ ”میں نہیں جانتا تھا کہ یہ ہو گا۔“ اس نے برملا کہا تھا۔ ”یہ جنگ نہیں قتل عام ہے۔“

”جرمن ہمارے خلاف زہریلی گیس استعمال کر رہے ہیں۔“ نکا نے پوپرز سے تحریر کیا۔ لیکن ہمارے پاس چونکہ گیس ماسک نہیں تھے اس لئے ہمیں پیشاب سے بھیگے ہوئے رومال اپنے چروں پر رکھنے پڑے تھے۔“

”آپ کو یاد ہے جب برطانویوں نے بالمیر لائرسز کو اصل جنگی ہتھیاروں کے ساتھ تربیت دینے سے انکار کر دیا تھا تو آپ کو بے پناہ غصہ آیا تھا۔ کیونکہ انہیں خوف تھا کہ وہ اپنے ہتھیار دہلی پر آزمائیں گے۔“ نکا نے ایک اور خط میں مہاراجہ کو یاد دلایا۔ ”اور اب یہاں پر ہتھیاروں کی اس قدر کمی ہے کہ ہم نے جیلی کی خالی بوتلوں اور پٹرول کے ڈبوں سے دستی بم بنائے ہیں۔ خاردار تاروں کو اڑانے کے لئے کھوکھلے پائپوں میں بارود بھر کر استعمال کرتے ہیں۔ برطانوی فوجی افسر اسے بنگوری تار پیڈو کہتے ہیں۔ کبھی کبھی ہم کئی بم ایک ساتھ پھینکتے ہیں۔ تاکہ جرمنوں کو دھوکہ دے سکیں کہ ہمارے پاس توپیں موجود ہیں۔“

جے سنگھ خود کو بے بس سمجھنے کے باوجود گھنٹوں محل کی لائبریری میں بیٹھا یورپ میں فوجی توازن کا جائزہ لیتا رہتا تھا۔ طویل و عریض کمرے کے آخری سرے پر بیٹھی جیہ راج گورو کی ہدایات یاد کرتی رہتی تھی لیکن کن انکھیوں سے وہ اپنے والد کو گھنٹوں میز پر جھکے دیکھتی رہتی۔ جیہ کو مہاراجہ کی سفید داڑھی ہلتی دکھائی دیتی رہتی لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے والد سامنے رکھی کھلی کتاب سے کیا پڑھتے ہیں۔

نکا کے خطوں سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ توپوں یا کتابوں سے جنگ ختم نہیں ہو سکتی۔ ”جیمس آبرن کی رجمنٹ ہم سے نیو دہلی کے مقام پر آئی ہے، کیا ملاقات تھی؟ لوگ اتنی تیزی سے مر رہے ہیں کہ زندہ افراد کو دیکھ کر حیرت کا شدید جھٹکا لگتا ہے۔ ہم سب اب مورچوں کی لڑائی کے ماہر ہو گئے ہیں۔ اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ جرمن ہم پر گیس فائر کرنے والے ہیں تو ہم فوراً کسی خندق یا کھائی میں کود جاتے ہیں۔“

اکتوبر میں اس نے لکھا۔ ”کیپٹن آبرن، جیمس اور میں، اپنے ہوائی جہازوں کو دیکھنے جا رہے تھے کہ تین جرمن فوکر طیاروں نے حملہ کر دیا۔ کیپٹن آبرن کا گھوڑا بدک گیا اور سوار کو گرا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ جرمن طیارے ہمارے ارد گرد ایک سو بیس پونڈ وزنی بم گرا رہے تھے اور ہمیں دھوئیں کی چادر میں سے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کیپٹن صاحب شدید زخمی تھے اور ان کے زخموں سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ بم کے ایک ٹکڑے نے ان کا حلق چیر ڈالا ہے۔ فیلڈ اسپتال کے ڈاکٹروں نے کہہ دیا ہے کہ وہ کچھ نہیں کر سکتے۔“

مہاراجہ نے کیپٹن آبرن کی یاد میں ریاست کے لئے ایک روزہ سوگ کا اعلان کیا جبکہ

ہیہ نے اس کے بیٹے کو تعزیت کا ایک خط روانہ کیا۔

موسم سرما میں جنگ کی عمر اٹھارہ ماہ ہو گئی۔ لائبریری کے نیچے کمروں میں کام کرنے والے کلرک اب بھی جنگ کی تفصیلات جمع کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ انہوں نے دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں کے پیش نظر اپنے کو ڈیجیٹل کر لئے تھے۔

روس ایک ایسا ٹوٹا ہوا امڈہ تھا جسے سیاہ لباس پادری کے ہاتھ میں تھما دیا گیا تھا۔ افریقہ ایک ایسا ننگا جنگ جو تھا جس نے اپنے دو ہاتھوں میں دو جھنڈے تھام رکھے تھے جن میں ایک برطانیہ اور دوسرا جرمنی کا تھا۔ ترکی ایک پھٹی ہوئی کتاب تھی جس کے صفحے پانی میں گر رہے تھے۔ ان میں سے ایک صفحے پر بدوین عرب کی تصویر تھی جس کے بادشاہ شاہ ابن سعود نے برطانویوں کے ساتھ اتحاد کا اعلان کیا تھا۔

جے سنگھ متعدد بار جیہ کی پڑھائی کا سلسلہ منقطع کروا دیتا تاکہ راج گورو کے نام میجر ویر سنگھ کی رپورٹس پہنچا سکے۔

”علاقے میں موجود تمام درخت کاٹ دیئے گئے ہیں اور تپش سے بچنے کے لئے فوجی پانی سے بھرے ہوئے ندی نالوں میں کود رہے ہیں ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمارے صرف چار فوجی مارے گئے ہیں لیکن پہلی بار لائبریری موت سے خوفزدہ دکھائی دے رہے ہیں اور ہاں یہاں مرنے والوں کی چتا میں جلانے کے لئے لکڑی بھی دستیاب نہیں۔“

”گیتا میں لکھا ہے کہ ہر شخص کو اپنے فرائض ادا کرنے دو۔“ بوڑھے گورو نے دور کہیں دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”لیکن ہم اپنے فرائض سے آگاہ نہیں بابا۔“ جے سنگھ چیخ اٹھا تھا۔ ”جب آسمان سے موت برسی شروع ہو جائے تو بہادر کا فرض کیا رہ جاتا ہے؟ جب ہم اور بارودی سرنگیں کھیت تباہ کر دیں تو کاشتکار کیا کرے؟ جب کارخانے ہی موت بنانے لگیں تو تاجر کا فرض کیا رہے گا؟“

راج گورو کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

1917ء کے موسم گرما میں یوں محسوس ہوا کہ دیوی دیوتاؤں نے مہارانی کے برتنوں

میں پوجا پاٹ کا جواب دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ نکا کیمبرائے میں زخمی ہو گیا تھا۔

پیرس کے اسپتال سے نکا نے لکھا۔ ”جب ہم بولی کورٹ سے نوین لینڈ میں داخل ہوئے تو برف کی صورت حال اتنی خراب تھی کہ ہم پیدل آگے بڑھنے پر مجبور ہو گئے۔ گھوڑوں کی باگیں ہمارے ہاتھوں میں تھیں۔ اچانک ہی ایک جانب.... تباہ شدہ ٹینکوں کی آڑ

سے مشین گن سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ ہمیں بہت دیر سے احساس ہوا کہ جرمن، تباہ شدہ ٹینکوں کو ہمیں دھوکہ دینے کے لئے استعمال کر رہے تھے۔ فائرنگ عقب سے بھی شروع ہو گئی۔ ممکن تھا کہ ہم کراس فائرنگ میں بری طرح مارے جاتے کہ برف کا طوفان شروع ہو گیا۔ تب ہم نے قسم کھائی کہ اب کبھی برف کو برا بھلا نہیں کہیں گے ہماری کارروائی پر جبک ہارس کے ایک نوجوان کو ملٹری کراس دیا گیا ہے۔ میرے خیال میں پرنس پر تپ کو بھی اسی اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ وہ مجھے بچانے کے لئے دشمن کی تاروں کے نیچے گھس گیا اور آخر کار مجھے واپس اپنی لائنز میں لے آیا۔ مجھے جب بھی ہوش آیا میں نے پرنس پر تپ کو اپنے سرہانے موجود پایا۔ بالمر لانسرز نے تو پرنس پر تپ کو کسی دیوتا کا رتبہ دے رکھا ہے۔“

ٹکا کا خط پڑھتے ہی جیسے مہارانی کو موقع مل گیا۔ ”سیرپور والوں نے ہم پر ایسا احسان کیا ہے جس کا بدلہ ہم زندگی بھر کبھی نہیں چکا پائیں گے۔ پرنس پر تپ نے ٹکا کی زندگی بچائی ہے۔“ وہ جیہ کی طرف مڑی.... ”اب تمہیں اس شادی میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔“

”کیا آپ کے بیٹے کی زندگی آپ کی بیٹی کے ساتھ منسلک ہے؟“ مہاراجہ نے اعتراض کیا۔

”لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ جیہ سیرپور میں خوش رہے گی۔ شیردل مہارانی اس طرح کے اتحاد کی خواہش مند ہیں وہ لڑکی کو بے حد خوش رکھیں گی اور اس کی حفاظت کریں گی۔“

”شوہر کو بیوی سے کون بچا سکتا ہے؟“

”آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے پرنس پر تپ کوئی بلا ہو کیا بھول گئے کہ اس نے آپ کے بیٹے کی زندگی بچائی ہے؟“

پرنس پر تپ جیسے مردوں کے لئے خطرہ تو ایک کھیل ہے۔ ”مہاراجہ بھی شاید دلائل دینے پر مصر تھے۔“ وہ اس لئے حوصلہ مند ہے کیونکہ اس کی فطرت مہم جویمانہ ہے۔“

”بے مقصد فلسفہ ہے یہ!“ مہارانی نے اپنے شوہر سے اختلاف کیا۔ ”وہ اور اس کا بھائی پرنس وکٹر ہمیشہ ٹکا پر مہمان رہے ہیں اب ٹکا اپنی زندگی کے لئے ان کا احسان مند ہے۔ اب آپ کو اور کیا ثبوت چاہئے کہ وہ لوگ جیہ کے ساتھ بھی اسی طرح مہمان رہیں گے؟“

”تب پھر وہ جیہ کے لئے اتنا جیز کیوں مانگ رہے ہیں؟“

”یہ تو برطانوی راج کے خلاف آپ کے خیالات کی ضلالت ہے۔ اس کی قیمت ہے۔ ٹکا یہ قیمت پہلے چکا رہا ہے۔ البتہ جیہ کے سلسلے میں ہم خوش قسمت ہیں کہ یہ قیمت دولت کی

صل میں ہے، زندگی کی صورت میں نہیں۔“

مہاراجہ نے کندھے اچکائے، اس کا سروں سینے پر جھک آیا جیسے اپنی روح کے دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ایک کونے میں بیٹھی ہوئی جیہ اپنے والد کی بے بسی محسوس کر رہی تھی۔

”ہم نے کبھی یہ نہیں چاہا تھا کہ ہمارے بچے ہمارے اعمال کی سزا بھگتیں۔ آپ جو بہتر سمجھتی ہیں کریں۔“

جیہ کے دماغ پر مہاراجہ کا جملہ کسی ہتھوڑے کی طرح برسا تھا۔ یہ اس کی توقع کے خلاف تھا لیکن فیصلہ برحال ہو چکا تھا۔

جیہ کی شادی کے بارے میں فیصلے نے مہاراجہ اور مہارانی کا ایک اختلاف گویا ختم کر دیا تھا۔

مہاراجہ! اس فیصلے کے فوری بعد ہندوستانی بادشاہوں اور قوم پرست لیڈروں کے ایک خفیہ اجلاس میں شرکت کے لئے سکھ بادشاہت پٹیالہ روانہ ہو گیا۔ ہندوستان میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا اجلاس تھا۔

زبان خانے کی ہوا کا رخ بھی بدل گیا تھا۔ مہارانی کی دل چسپی اپنے بیٹی کی زندگی کے لئے پوجا پاٹ سے ہٹ کر سیرپور کی مہارانی کے ساتھ رشتہ داری کے معاملات پر مرکوز ہو گئیں۔ اس نے مہارانی کو پیرس سے آنے والے اپنے بیٹے کے خطوط کی نقول بھی روانہ کی تھیں۔

ٹکا سے پرنس پر تپ کی ملاقات اجڑی ہوئی آسٹریں بادشاہت کے ایسے شہر میں ہوئی تھی جو مہاجرین سے بھرا پڑا تھا۔ تب تک جرمن، ہاشویک لیڈر لینن کو ایک خفیہ ٹرین کے ذریعے ماسکو بھیج چکے تھے۔ ٹکا کے خطوط سے یہ پتا چلا کہ پرنس پر تپ سیرپور کے خزانے پر ہماری مالی بوجھ کا باعث کیسے بنتا ہے۔ ہر شب پرنس پر تپ کم و بیش پچاس افراد کو رات کے کھانے پر مدعو کرتا تھا۔ پرنس پر تپ کے تعلقات ہر شعبہ ہائے زندگی میں بے حد وسیع تھے۔ پرنس پر تپ کے ساتھ رہ کر ٹکا نے فرانسیسی قتبہ خانوں تک رسائی حاصل کی۔ ”فرانسیسی ہوٹل کبائیز کے بارے میں بہت فخر کرتے ہیں۔ آپ تصور کر سکتی ہیں کہ وہ دورے پر آئے ہوئے سربراہان مملکت کو بطور خاص یہ دکھانے لے جاتے ہیں۔ ایڈورڈ ہفتم نے جب ملکہ وکٹوریہ کو اس ہوٹل میں ٹھہرایا تو اس کے لئے ہندو روم بک کروایا۔ ملکہ اس کمرے کو دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی اور پرنس پر تپ ہمیشہ اسی ہندو روم کی بنگ کی اصرار کرتا ہے۔“

جیہ کو محسوس ہوا کہ اس کا بھائی تصورات کی دنیا میں رہ رہا ہے۔ دوسری جانب شیردھارانی کے خطوط سے جیہ نے اندازہ لگایا تھا کہ پرنس پر تاپ کی شاہ خرچیوں سے ملک کے خزانے پر پڑنے والے بوجھ کو اس کے جیہ کی دولت سے کم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

جس دن جیہ کی شادی بیاہ کے انتظامات مکمل ہوئے اس روز سستی ماما نے گیندے کے پھولوں کا ہار جیہ کے لئے بھجویا اور وہ پیش گوئی دہرائی کہ جیہ کی شادی ایک بہادر شخص سے ہوگی۔ مہارانی کو اتنی خوشی پھولوں کے ہار سے نہیں ہوئی جتنا دکھ اسے یہ خبر سن کر ہوا کہ صحت یابی کے بعد نکاح اپنی رجنٹ میں واپس جا رہا تھا۔

جلد ہی سیرپور سے متغنی کے تحائف آنا شروع ہو گئے۔ بھاری آہنی صندوق جن میں مغل کی تہہ چڑھی ہوئی تھی زنان خانے کے بیرونی دروازے پر اتارے گئے۔ صندوق اتنے بھاری تھے کہ خواجہ سرا انہیں اٹھاتے اٹھاتے دہرے ہو گئے تھے۔

جب صندوق کھولے گئے تو جیہ اپنی والدہ کی بالکونی میں بے بسی کی تصویر بنی بیٹھ تھی۔ زنان خانے کی عورتیں ساڑھی کے بارڈر میں استعمال کئے جانے والے سونے کے وزرا کا اندازہ لگا رہی تھیں۔ تحائف میں آنے والے زر و جواہر اور قیمتی پتھروں کو تیز روشنیوں کے سامنے پرکھا جا رہا تھا کہ ان میں کوئی داغ تو نہیں۔

متغنی کے تحائف کے ساتھ ساتھ راج گورو کے پاس جیہ کی پڑھائی جاری تھی۔ مہاراجہ کو قلعے سے گئے ہوئے تین ہفتے ہوئے تھے کہ جیہ نے لائبریری کے نیچے صحن میں ایک کار رکنے کی آواز سنی اور پھر مہاراجہ اور مسٹر رائے گرد میں اٹے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔

خاوم نے بڑھ کر مہاراجہ کو ٹھنڈا پانی پیش کیا۔ مہاراجہ نے ایک گھونٹ لیا اور راج گورو سے مخاطب ہوا۔ ”گورو جی! ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ جب بڑی بڑی یورپی بادشاہتیں ختم ہو رہی ہیں تو ہم جیسے چھوٹے ملکوں کا کیا ہو گا؟“

جیہ کو اپنے والد کی آنکھوں میں عجیب سی چمک نظر آئی تھی اس نے مسٹر رائے گرد دیکھا لیکن وہ لائق سا چھت کی کڑیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔

”بہت سال پہلے لندن میں ہربائی نیس ڈنگرا نے ہمیں اس دنیا کے بارے میں متنبہ کیا تھا جس کے بارے میں ہم جانتے تھے کہ وہ ختم ہو چکی ہے۔“ مہاراجہ کی بات جاری تھی۔ ”انہوں نے ہمیں کہا تھا کہ خود کو نئے دور کے لئے تیار کریں مگر ہم نے ان کی بات پر کوئی

نہہ نہیں دی تھی۔ ہم نے برطانویوں کو بالمیر میں کارخانے لگانے اور ریلوے لائن بچھانے کی اہلیات دینے کے بجائے باقاعدہ ان کے ساتھ جنگ لڑی۔ مہارانی اودے پور کی طرح ہمارا لہال تھا کہ ایک بار ہم نے انگریزوں کی مشینوں اور ان کے اداروں کو اپنا لیا تو ہمیشہ کے لئے اپنی پہچان اور روح کو کھو بیٹھیں گے۔“

”پٹیاہ میں ہونے والی اس خفیہ کانفرنس میں ہم نے بیکانیر، بڑودہ، ٹراونکور، اور میسور سمیت متعدد ریاستوں کے حکمرانوں سے ملاقات کی جنہوں نے اپنے ہاں پارلیمانی نظام حکومت کا تجربہ کیا ہے۔ کئی قوم پرست رہنماؤں سے بھی ہماری ملاقات ہوئی اور اب یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے بلکہ ہم نے ذاتی طور پر اسے قبول بھی کر لیا ہے کہ ہماری بقا صرف اسی صورت ممکن ہے کہ ہم آزاد ملکوں کی حیثیت سے انگریزی اداروں کی تقلید کریں اور عوام کو کاروبار حکومت میں شریک کریں۔“ مہاراجہ نے ایک طویل سانس لی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے ریاضی کا کوئی مشکل سوال حل کر لیا ہو۔ ”ایک عرصے تک ہم نے اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے کہ ایک جنگجو کی حیثیت سے ہمارا دھرم ختم ہو چکا ہے آپ خود ہی ہائیں بھلا اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا؟ لیکن اب اسے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ دھرم سے رہنمائی حاصل کئے بغیر کوئی شخص کاروبار حکومت نہیں چلا سکتا۔“

راج گورو نے گہری دلچسپی کے ساتھ مہاراجہ کی باتیں سنی تھیں اور جب وہ بولا تو یوں محسوس ہوا جیسے کسی بچے کو سمجھا رہا ہو۔

”آپ تبدیلیوں کے لئے انگریزوں کو قصور وار کیوں ٹھہراتے ہیں، حکم! آپ اپنے دھرم کا مطالعہ کریں۔ ہماری عظیم اور قدیم تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جن کی تقلید ہم فخریہ انداز میں کر سکتے ہیں۔ سماجی اور فلاحی بہبود کا وہ کونسا طریقہ ہے جو ہم نے نہیں اپنایا۔ ہمارا ماضی عظیم جمہوری حکومتوں سے روشن ہے۔ عالموں نے ملکوں کی حکمرانی کی ہے۔ بادشاہتیں مقدس کتابوں کے احکامات کے تحت چلائی گئی ہیں۔ ہماری حکومتوں میں عوامی نمائندوں کی شرکت کی روایت خاصی پرانی ہے آپ جانتے ہیں کہ پانچ دیہات کے بڑے بوڑھے اب بھی متفقہ طور پر بادشاہ کے احکامات پر عمل درآمد معطل کروا سکتے ہیں۔“

”اب ایسا نہیں ہے گورو جی!“ مہاراجہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”برطانوی بادشاہت نے اس رسم کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ہے۔ انگلینڈ صرف تحریری قوانین پر عمل درآمد پر یقین رکھتا ہے۔“

”میرے خیال میں ہمارا دھرم اس سلسلے میں بہترین رہنما ثابت ہو گا۔“ مسٹر رائے نے

پہلی بار گفتگو میں مداخلت کی تھی۔ ”اس وقت برطانوی بادشاہت اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہے اگر آپ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر بالمیر کے لوگوں کے لئے کچھ کر گزریں تو کوئی نہیں کہہ سکے گا کہ آپ نے اپنے دھرم سے انحراف کیا ہے۔“

جے سنگھ نے احسان مندانہ مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔ ”مہاراجہ ڈنگرا کو کئی سال پہلے آئینی بادشاہ منتخب کیا جا چکا ہے۔ ہماری رہنمائی کے لئے وہ یہاں آنے پر رضامند ہو گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مسٹر رائے کے کزن ارون رائے جو ایک وکیل بھی ہیں بالمیر آ رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ بالمیر کے لئے ایک آئین تشکیل دینے میں ہماری مدد کریں گے۔“ اگلے پورے ماہ کے دوران مہاراجہ بالمیر کے نظام اور حکومت کی تبدیلی کے معاملات میں مصروف رہا۔ اس نے صرف سیرپور کے پرنس پر تپ کے ساتھ جیہ کی ممکنگی کی مختصر قریب میں شرکت کے لئے بہ مشکل وقت نکالا تھا۔

سیرپور کے تین پجاریوں نے اس قریب کے لئے سیرپور کے محل کے باورچی خانے میں تیار ہونے والی مٹھائی طلائی تھالیوں میں رکھ کر بالمیر لانے کے لئے طویل سفر کی خاصی صعوبتیں اٹھائی تھیں۔

سرخ اور سنہرے کپڑوں میں ملبوس جیہ کو جس نے نقاب اوڑھی ہوئی تھی زنان خانے کی عورتوں نے باہر صحن میں موجود ہاتھی دانت کے تخت پر لا بٹھایا تھا۔ جیہ نقاب کی اوٹ سے وہاں موجود حاضرین کا جائزہ لے رہی تھی۔

سیرپور کی مہارانی کی نمائندگی کرنے والے مہابجاری نے ناریل سے بنی ہوئی مٹھائی توڑی اور اسے جیہ کو پیش کیا۔ کافی دیر تک جیہ نے کوئی حرکت نہیں کی۔ خوف کے مارے اس کے ہاتھ سن ہو رہے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ ایک بار سیرپور کی مٹھائی نے اس کا منہ چھو لیا تو پھر واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہو گا۔ مہارانی نے جیہ کے نقاب کا کونا اٹھایا اور جیہ نے فرمانبرداری سے ہونٹ وا کر دیئے۔

لیکن جب مہابجاری نے پرنس پر تپ کی تصویر سے نقاب اٹھایا اور جیہ کو وہی بھاری پوٹوں اور بور مسکراہٹ کا حال چہرہ دکھائی دیا تو اس کے منہ میں موجود مٹھائی جیسے کڑوی گولی میں بدل گئی۔

پرنس پر تپ کی تصویر کو جیہ کے کمرے میں نمایاں جگہ دی گئی تھی۔ ہر صبح تصویر کے لئے تازہ پھولوں کا ہار لاتی تاکہ جیہ اپنے ہونے والے شوہر کی سلامتی کے لئے دعا مانگ سکے۔ لیکن تنہائی میں جیہ کو شش کرتی تھی کہ تصویر کی طرف نہ دیکھے کیونکہ جانے کیوں جیہ

۱ موسم گرما کے باوجود اپنے جسم میں سردی کی ایک لہری دوڑتی محسوس ہوتی تھی۔
 مہارانی کو جیہ کی منتگنی سے بے حد مسرت ہوئی تھی اور مہاراجہ کے لئے یہ خبر بہت دل
 لوش کن تھی کہ ارون رائے اور مہاراجہ ڈنگرا بالیر کے لئے روانہ ہو چکے ہیں۔

اسی اثنا میں انہیں نکا کا اگلا خط بھی موصول ہوا تھا۔

”ہمیں پہلے ہی علم ہو گیا تھا کہ فیلڈ مارشل بیگ، کیمبرائے پر حملہ کرنے والا ہے
 جرمنوں نے گھڑ سوار دستوں کو راستہ دینے کی غرض سے علاقے کے ہر گاؤں اور قصبے کو صفحہ
 ہستی سے مٹا دیا تھا اور اب اس علاقے کو آفت زدہ علاقے کے نام سے پکارا جاتا ہے۔“

”20 دسمبر کی صبح کیمبرائے پر حملے کا آغاز ہوا۔ ہم لوگ سر برتاپ آف جو دھور کی
 قیادت میں پانچویں انڈین کیولری ڈویژن کے ساتھ تھے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ
 اس دوران سر برتاپ نے کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ اس کی عمر 72 سال ہے اس
 نے جرمن کیولری کو ناکوں پنے چبوا دیئے تھے اور یہ اسی کی قیادت تھی کہ ہم نے جرمنوں
 کی پیش قدمی کو روک دیا تھا۔ یوں یہ بھی ہمارے لئے ایک اعزاز تھا کہ ہم نے تاریخ کی پہلی
 ٹینکوں کی لڑائی میں بہ نفس نفیس حصہ لیا اور اس میں کامیابی حاصل کی۔“

”اور ہاں اب ہم لوگ یورپ سے روانہ ہو رہے ہیں تاکہ فلسطین میں جنرل امین کی
 فوجوں میں شامل ہو سکیں.... دعا کیجئے گا۔“

جلد ہی پورے ملک کو پتا چل چکا تھا کہ نکا اور اس کے لانسرز اس وقت ہندوستان سے
 صرف ایک ہزار میل کے فاصلے پر موجود ہیں۔ دوسری طرف مہاراجہ کے مہمان بھی آچکے
 تھے۔ ان کی آمد سے بالیر قلعے کی وہ رونقیں دوبارہ لوٹ آئی تھیں جو لانسرز کی یورپ روانگی
 سے پہلے تھیں۔

جیہ اور زنان خانے کی دوسری عورتوں نے بالکونی سے دربار ہال میں اس خصوصی دربار
 کی کارروائی دیکھی تھی جو وہاں راجہ نے اپنے مہمان مہاراجہ ڈنگرا کی آمد کی خوشی میں برپا کیا
 تھا۔

جنوری کی سرد صبح کے پیش نظر ہال میں کونکوں کی چھوٹی چھوٹی اگیٹھیاں جلائی گئی
 تھیں۔ جن میں ذرا دیر بعد صندل کا براہہ چھڑک دیا جاتا تھا۔ اس لئے پوری فضا پر صندل
 کی مہک چھائی ہوئی تھی۔

”ایک خوبصورت مشرقی آدمی!“ ایک عورت کی آواز پر جیہ نے نیچے دیکھا۔ مسٹر رائے
 کلکتہ سے آنے والے اپنے کزن کے ہمراہ دربار ہال میں داخل ہو رہا تھا۔ ارون کی طویل

قامت، ایک ریشمی شرٹ اور سفید رنگ کی دھوتی میں ملبوس تھی جبکہ چوڑے چکے شالوں پر بھورے رنگ کی ایک شال پڑی ہوئی تھی۔

”اس کے انداز شریف آدمیوں جیسے ہیں۔“ مہارانی نے تبصرہ کیا۔ زنان خانے کی عورتوں کو شاید اسی اذن کا انتظار تھا۔ وہ سب کی سب اس ”شریف آدمی“ کو دیکھنے کے لئے بالکونی کی جالیوں سے لپٹ پڑیں۔

دکیل ایک انگلیٹھی کے قریب بیٹھا تھا۔ اس نے ایک حقے کی نے دانتوں تلے دبائی اور ہولے ہولے کش لینے لگا۔ جیہ دوسری عورتوں کے ساتھ خود بھی اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھی۔

مسٹر رائے نے دکیل کو ایک کانڈ تھمایا تو اس نے شال کے نیچے ہاتھ ڈال کر کسی جیب سے ایک چشمہ نکال کر ٹاک پر جمالیا۔ کئی عورتوں کے حلق سے متاسفانہ آوازیں برآمد ہوئی تھیں۔

”دیوتا بھی کتنے ظالم ہیں!“

”اتنے خوبصورت آدمی کو اندھا بنا دیا۔“

ان کے تبصرے جیسے ہی ختم ہوئے۔ راجہ مان سنگھ دربار ہال میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے ایک سنہرے گلدان سے سفید گھوڑے کی دم نکل کر زمیں کو چھو رہی تھی۔ یہ مطلق العنان حکمرانی کا نشان تھا۔ اس کے پیچھے سینا پتی جنگ کا نشان یعنی مور کے پروں کا ایک گچھا لے کر ہال میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے وزارتی کونسل کے ارکان تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ہاتھی کا نفرتی سر مگرچھ کا نفرتی سر اور شیر کا نفرتی سر تھا۔ یہ سب حاکمیت پر اعتقاد و اعتماد کی نشانیاں تھیں بالمر کے وزیر اعظم کے سامنے منظم اعلیٰ کا نشان یعنی سرخ ہاتھ تھا۔ اور پھر مہاراجہ جے سنگھ کی آمد کا اعلان ہوا۔

”بابوب بلاملاحظہ ہو شیار.... شاہ گراں عطا، صاحب لشکر آرا، بندہ فرخ سریر، شاہ دور

گیر، حاکم بالمر مہاراجہ جے سنگھ جلوہ افروز ہوتے ہیں۔“

نگاہیں جھک گئیں اور دربار ہال میں موجود ہر شے ساکت ہو گئی اور مہاراجہ جے سنگھ ایک شان بے نیازی سے چلتا ہوا صدر دروازے سے نمودار ہوا اور شاہانہ چال چلتا ہوا اپنی مخصوص گدی پر آ بیٹھا۔

اس کے نشست سنبھالنے کے باوجود عمائدین سلطنت اور دیگر درباری استادہ تھے۔ چوہدرار کی آواز ایک بار پھر دربار ہال میں گونجنے لگی۔

”نگاہیں سجدہ ریز ہوں..... نگاہیں سجدہ ریز ہوں..... خرو خرواں، شاہ دلیراں، سالار اہد ہوش، شاہ فلک پوش، مہاراجہ ڈنگرا تشریف لاتے ہیں۔“
عورتوں نے ایک محرابی دروازے کی طرف اشارہ کیا جہاں سے مہاراجہ ڈنگرا دربار ہال میں داخل ہو رہا تھا۔

”یہ تو کوئی موٹی سیاہ بطخ لگتی ہے۔“ ایک جانب سے نسوانی آواز سنائی دی۔
”مگر اس نے اتنے زیادہ ہیرے کیوں پہن رکھے ہیں؟“ کسی اور نے سوال کیا۔
مہاراجہ ڈنگرا کا بیٹا اس کے پیچھے تھا۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک عورت نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”دونوں بے شک ہیرے جواہرات سے لدے ہوئے ہیں لیکن دونوں بھینسوں کی جوڑی دوس ہوتے ہیں۔“

”کم از کم بیٹے کا پھیلاؤ بھولنے کی چیز نہیں۔“ جیہ نے دبے الفاظ میں گرہ لگائی۔
”اور اسی بھینسے کو چھوٹا کہہ کر بلایا جاتا ہے، حکم!“ اسی عورت نے جیہ کی معلومات میں اضافہ کیا۔ ”کیا آپ یقین کریں گی؟“
”خاموش رہو۔“ مہارانی کی ڈانٹ سنائی دی لیکن آواز سرگوشی سے بلند نہ تھی۔ ”وہ رے مہمان ہیں۔“

”لیکن حکم! ایک اتنے موٹے تازے آدمی کو چھوٹا کہہ کر کیسے بلایا جا سکتا ہے؟“ جیہ نے ہل کو مخاطب کیا دوسری عورتوں نے سوال پر دبا دبا سا قہقہہ لگایا۔

”جیہ!“ مہارانی کا لہجہ اس بار سخت تھا۔ ”خاموش بیٹھو، ورنہ یہاں سے اٹھ کر چلی جاؤ!“ مہارانی کے چہرے پر ناگواری تھی۔ ”مہاراجہ ڈنگرا کیا کہیں گے کہ ان کا استقبال محل کی خواتین نے نہیں بلکہ رقاصاؤں نے کیا ہے۔“

جیہ نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ خاموش رہنے کی یہی ایک صورت تھی۔ اس نے نگاہیں نیچے جمالیں، جہاں اب معززین اس کے والد کو نذر گزار رہے تھے۔ یہ نذر طلائی سکوں کی صورت میں تھی۔ بہت سے تحائف مہاراجہ ڈنگرا اور اس کے بیٹے کی نذر بھی کئے گئے تھے۔ اردن رائے نامی وکیل اس کارروائی سے بے حد متاثر نظر آ رہا تھا اور بار بار اپنے کانڈ پکھ لکھتا جا رہا تھا۔

اور پھر راج گورد آشر باد کے لئے بے شک کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بالکونی میں بیٹھی وہی عورتوں سمیت دربار ہال کا ہر شخص اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ پورے ہال میں صرف

راج گورو کی آواز گونج رہی تھی جو سنسکرت میں اشلوک پڑھ رہا تھا۔

اسی شام مہمانوں کے اعزاز میں ایک رنگا رنگ تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ شاہی جو کے باہر کھلے حصے میں بالمر کی بہترین رقاص لڑکیوں نے رقص سے مہمانوں کا جی بھلا لڑکوں کی ایک ٹولی نے بالمر کا قومی ”تکوار رقص“ پیش کیا۔ مہاراجہ ڈنگرا نے شاہی جو کے ساتھ بنے ڈرائنگ روم میں جانے سے قبل رقاص لڑکے اور لڑکیوں کو سونے کے کی تھیلیوں سے نوازا تھا۔

ڈرائنگ روم میں بچے دیوان کے پاس حقے تازہ کر دیئے گئے تھے۔ جبکہ سر شدت کم کرنے کے لئے آتش دان میں صندل کی لکڑی جلائی گئی تھی۔ مہاراجہ ڈنگرا جیہ کو بہ اصرار اپنے برابر بٹھایا تھا۔ جیہ کی ہر ممکن کوشش تھی کہ وہ مہاراجہ ڈنگرا کی پیک سے رنگے ہوئے ہونٹوں کو نہ دیکھے جو دوران گفتگو کچھ اور مونے نظر آئے۔ ”ہندوستان کے لئے سیکرٹری آف اسٹیٹ پچھلے ماہ ڈنگرا آیا تھا۔“ مہاراجہ ڈنگرا

کمرے میں موجود لوگوں کو آگاہ کیا۔ ”بقول اس کے برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستان بارے میں ایک قرار داد کی منظوری دی ہے اور میرے خیال میں اس قرار داد کی منظوری اشارہ ہے کہ انگریز ہوم رول فار انڈیا سے ملتا جلتا کوئی منصوبہ بنا رہے ہیں۔ جنگ۔ انگریز یقینی طور پر برطانوی ہند میں حکمرانوں کی کوئی کونسل یا اسمبلیاں قائم کریں گے۔“

اردن رائے بوڑھے حکمران کو دیکھ کر مسکرایا۔ ”کئی سال سے برطانیہ، ہندوستان کینیڈا اور آسٹریلیا کی طرح داخلی خود مختاری دینے کا وعدہ کر رہا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وعدے کب پورے کرتا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ 1915ء میں ساڑھے بار ہندوستانی، برطانیہ کے دفاع کے لئے رضاکارانہ طور پر محاذ جنگ پر گئے ہیں جبکہ دس پونڈز کی امداد ہندوستان برطانیہ کو فراہم کر رہا ہے۔“

مسٹر رائے نے دخل اندازی کی۔ ”یہ بات بھی ذہن میں رکھئے کہ 1915ء میں میں برطانیہ کے خلاف تحریک زوروں پر تھی۔ اور ہندوستانیوں نے انگریزوں کے خلاف طرح کا احتجاج بند کر دیا تھا۔ کسی پر ہم سے کوئی حملہ نہیں ہوا اور نہ ہی کسی کو قتل کر کوشش کی گئی۔ اب اگر انگریز جنگ کے بعد ہمیں نمائندگی نہیں دیتے تو صورتحال قابو سے باہر ہو جائے گی۔ ہم آئرلینڈ کی طرح برطانیہ کے پڑوسی نہیں اس لئے فوجیں ہمیں کچل نہ سکیں گی۔“

”جنگ کے بعد ایک اور صورتحال ہماری منتظر ہو گی۔“ مسٹر رائے نے کہا تو

کی جانب متوجہ ہو گئے۔ ”انگریز مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کو ایک دوسرے سے لڑوانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس طرح شاہی ہندوستان کو برطانوی ہندوستان کے خلاف اکسایا جا رہا ہے لیکن ہم یہ سب نہیں ہونے دیں گے۔“

چھوٹے ڈنگرا نے نفی میں سر ہلا دیا۔ انداز اعتراض کرنے کا تھا۔ ”مسلمان پہلے ہی سکھوں سے رابطہ کئے بیٹھے ہیں اور یہ دونوں گروپ گاندھی سے اتحاد کی فکر میں ہیں جو انڈین نیشنل کانگریس کا سربراہ ہے۔“

”یہ گاندھی کون ہے؟“ جیہ نے دریافت کیا۔

”ایک ننگ دھڑنگ اور کمزور انسان جو ہندوستانی عوام کو انگریزوں کے مقابلے پر لا کھڑا کرے گا۔“ ارون رائے سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ ”میرے الفاظ یاد رکھنا۔ وہ ہندوستان کے رہنے والوں کے موجودہ خوف کو حوصلے میں بدل دے گا۔“

ماراجہ ڈنگرا نے قہقہہ لگایا تو اس کے ساتھ چوٹی دیوان پر بھی جیسے زلزلہ اتر آیا تھا۔ ”پہلے ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں میں تو حوصلہ پیدا ہونے دو۔ عوام کی باری تو بعد میں آئے گی بیٹے!“ پھر وہ ماراجہ جے سنگھ کی طرف مڑا۔ ”ہمیں پٹیالہ میں ہندو قوم پرست لیڈروں سے ہونے والے اپنے خفیہ اجلاس کے بارے میں تو بتاؤ۔ جے!“

”ہم اپنے معاملات پر سے برطانوی اثر و نفوذ ختم کرنے پر متفق ہو گئے ہیں۔“ ماراجہ نے نہایت محتاط الفاظ کا انتخاب کیا تھا۔

ارون رائے نے مسکرا کر ماراجہ جے سنگھ کو دیکھا ”لیکن حکمران تو یقیناً برطانیہ کا ساتھ دیں گے۔“

”یہ ہماری مجبوری ہے مسٹر رائے۔“ جے سنگھ نے ایک طویل سانس لی۔ ”اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو اپنے تاج و تخت سے محروم ہو جائیں گے۔“

ڈنگرا نے جیہ کا گھٹنا پھینٹ دیا۔ ”تم بھی کچھ بولو بیٹی! ہماری بات چیت سے تمہارے ذہن میں بھی تو کچھ خواب پیدا ہوئے ہوں گے۔ یا ابھی....“

جیہ نے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ سر اٹھایا۔ ”ہمارے خوابوں میں تو اس وقت بحری جہاز ہیں، حکم! ہمارے بھائی اور ان کے لانسرز ان دونوں بحری جہازوں میں فلسطین کے سفر پر ہیں۔“

اگلے روز کاروں کا ایک قافلہ ماراجہ جے سنگھ اور ان کے مہمانوں کو لے کر بالمیر کے دورے پر روانہ ہو گیا۔ دورہ کئی ہفتوں پر محیط تھا لیکن ماراجہ اس عرصے میں بالمیر کے امور

مملکت سے دور نہ تھا۔ دارالحکومت اور مہاراجہ کے قافلے کے درمیان قاصدوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔ جب بھی کوئی قابل اعتماد قاصد مہاراجہ کے پاس جانے کے لئے روانہ ہوتا مہارانی وزارت کی کونسل کے اجلاس اور راجہ مان سنگھ کی سرگرمیوں کی رپورٹیں اپنے شوہر کو بھجواتی۔ جیہ خود ان سربراہانوں کو قاصد کے حوالے کرتی اور بعض اوقات اپنی طرف سے بھی چند الفاظ تحریر کرتی تھی۔

پھر ایک روز ایک قاصد مہاراجہ کا پیغام لے کر دارالحکومت پہنچا کہ جیہ بھی اس قافلے میں شامل ہو جائے۔ چنانچہ جیہ، سینا پتی کے ہمراہ قلعے سے روانہ ہوئی سفر کا اختتام جنگل کے بچوں بچہ بسائے گئے خیموں کے ایک شہر پر ہوا تھا۔

جیہ کو ایک خیمے میں پہنچا دیا گیا اور بتایا گیا کہ وہ فوری طور پر تیار ہو کر شکاری قافلے سے آئے۔ جیہ نے جلدی سے غسل کیا اور کپڑے بدل کر اس قافلے سے آلی جو ایک نالے کے کنارے اس کا منتظر تھا۔ اردن اور چھوٹا ڈنگرا اس قافلے میں شامل تھے جیہ کو مہاراجہ جے سنگھ اور مہاراجہ ڈنگرا کہیں دکھائی نہ دیئے تھے۔

شکار کا سلسلہ رات تک جاری رہا اور اس مہم میں کئی جنگلی سور شکار کئے گئے۔

رات ہوئی تو آسمان پر پورے چاند نے ایک عجیب سا باندھ دیا۔ سب لوگ خیموں کے بچوں بچہ کرسیاں ڈالے خوش گہموں میں مصروف تھے۔ ان کے قریب ایک لاؤ پر جنگلی سور بھونے جا رہے تھے۔ دو ملازم تھوڑے تھوڑے وقفے سے ابلتا ہوا پانی جنگلی سوروں پر ڈال رہے تھے۔

جیہ ان کے قریب پہنچی تو کسی نے بھی اس کی طرف توجہ نہیں دی بلکہ وہ لوگ مسلسل سفید مونچھوں والے ایک شخص سے بات چیت میں مصروف تھے۔ وہ کوئی دیہاتی تھا۔ ذرا دیر بعد اس نے لاؤ پر بھونے جانے والے سور کی طرف اشارہ کیا۔

”دھاتی ہیرا، حکم! آپ کے آدمی اس ہیرے کو تلاش کرنا بھول گئے ہیں۔“

چھوٹا ڈنگرا اپنی کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ خاصا بے قرار دکھائی دے رہا تھا۔ ”یہ دھاتی ہیرا کیا بلا ہے؟“

”شہزادی نے جس جنگلی سور کا شکار کیا ہے۔ وہ اتنا بوڑھا تھا کہ اس کے سر میں ہیرا ہونا چاہئے، حکم!“ دیہاتی نے جواب دیا۔ ”ایسا ہی ہیرا کبھی کبھی بوڑھے ہاتھی کے سر سے بھی نکلتا ہے۔ سمندر سے نکلنے والا کوئی موتی یا کوئی اور ہیرا اس دھاتی ہیرے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ حکم!“

”یہ کس طرح کا ہوتا ہے؟“

”یہ چاند کی طرح چمکتا ہے، حکم! اور اس کی خصوصیات جادوئی ہوتی ہیں۔ شہزادی کے جنگلی سور کے سر میں یقینی طور پر ہیرا موجود ہو گا۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ اگر ہیرا مل گیا تو وہ شہزادی کی ملکیت ہو گا؟“ چھوٹے ڈنگرا کی آواز سے ناامیدی جھلک رہی تھی جیہ نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ ارون رائے نے اپنا بازو جیہ کی کرسی کی پشت پر رکھ دیا۔ اس نے بھی قہقہہ میں جیہ کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ اور جیہ کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ ہمیشہ سے اس وکیل کو جانتی ہے۔

قلعے میں واپس آکر مہاراجہ کے نئے مہمان نئے آئین کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ وہ دیوالی کی تقریبات سے پہلے اپنا کام ختم کر کے گھروں کو لوٹ جانا چاہتے تھے کیونکہ دیوالی سے ہندوؤں کا نیا سال شروع ہوتا تھا۔

اس عرصے میں جیہ شاید ہی کسی سے ملی ہو۔ بس ایک بار اس کے والد اور ڈنگرا کے مہاراجہ نے اسے جے سنگھ کے دفتر بلوا بھیجا تھا۔

دونوں حکمرانوں کے سامنے رکھی میز سبز فالتوں سے بھری ہوئی تھی۔ ”یہ اشاک سرٹیکلیٹ ہیں، شہزادی۔“ جے سنگھ نے اسے بتایا۔ ”ہم انہیں تمہارے نام منتقل کر رہے ہیں مگر تم ان کے بارے میں کسی کو نہیں بتاؤ گی نہ اپنی ماں کو اور نہ ہی اپنے شوہر کو۔“ جیہ نے سسمے ہوئے انداز میں کلمذات کے ان پلندوں کو دیکھا۔ اسے اپنے والد کے جملوں سے خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔

”ہرا چھی بیوی برے وقتوں کے لئے کچھ رقم بچا کر رکھتی ہے شہزادی۔“ مہاراجہ ڈنگرا نے اس کی ڈھارس بندھائی۔ ”تم بہت ساجیز لے کر سیرپور جا رہی ہو لیکن ممکن ہے کوئی ایسا وقت آئے جب تمہیں اپنے پاس سے کسی چیز کی ضرورت پڑے۔ جب تک میں اور چھوٹا یہ دولت ڈنگرا میں تمہارے لئے محفوظ رکھیں گے۔“

”کیا یہ کلمذات، دولت ہیں۔ حکم!“

ڈنگرا ہنسا۔ ”ایک نئی قسم کی دولت شہزادی، میں نے انہیں تمہارے والد کے لئے 1898ء میں لندن سے خریدا تھا۔ ان بیس سالوں میں ان کی قیمت کئی گنا بڑھ چکی ہے۔“

جیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور کچھ سمجھنے اور کچھ نہ سمجھنے کی کیفیت لئے واپس چلی آئی۔ یوں بھی شادی کے ذکر نے اس کے اچھے موڈ کو غارت کر دیا تھا۔ اسی لئے جب ارون رائے روانگی کے وقت اس سے ملنے اور ایک چھوٹا سا پیکٹ دینے آیا تو وہ بہ مشکل مسکرا

سکی تھی۔

موٹھوں کے نیچے ارون رائے کے پتلے پتلے ہونٹوں پر ایک شرارتی سی مسکراہٹ تھی۔ ”میرے خیال میں یہ آپ کی ملکیت ہے شہزادی!“

جیہ نے پکٹ پر لپٹا کلنڈ اتارا۔ مٹیلیں ڈبیا میں انڈے کے برابر ایک ہیرا اس کے سامنے تھا۔ جیہ کے حلق سے ایک طویل سانس خارج ہو گئی۔ ”دھاتی ہیرا!“

”اگلی بار ہم اکٹھے ہاتھی کا ہیرا تلاش کریں گے۔“ وکیل نے کہا تو جیہ شرما کر سرخ ہو گئی لیکن وکیل جانے کے لئے پلٹ چکا تھا۔ اس نے جیہ کی سرخی نہیں دیکھی تھی۔

مصور آتے اور جاتے رہے۔ دیواریں رنگین ہوتی رہیں اور دیوالی کی تیاریاں زور و شور سے جاری رہیں۔ یہ وہ رات تھی جب ریاست کے ہر گھر میں دولت کی دیوی لکشی کی خوشنودی کے لئے دیئے جلائے جاتے۔

ایسے میں فلسطین سے ٹکا کا خط موصول ہوا۔

”اس وقت جب کہ تم لوگ دیوالی منانے کی تیاریاں کر رہے ہو، ہم لوگ وادی اردن کی حفاظت میں مصروف ہیں۔ یہاں ملیریا اور بیضے کی وباء نے تباہی مچا رکھی ہے۔“ ٹکا نے لکھا تھا۔ ”سرپر تپ یہاں بھی ایک داستان بن کر ابھرا ہے۔ لارڈ ایلن بی نے بارہا اسے کہا کہ وہ یروشلم کے اپنے ہوٹل میں ٹھہرے لیکن وہ گھوڑوں کے ساتھ اصطبل میں سوتا ہے۔“

”بے پناہ محنت اور بھاگ دوڑ کے باعث 13 جولائی کو بخار نے سرپر تپ کو آیا اور اسی وقت ترکوں نے حملہ کر دیا۔ جودھ پور لانسز کے ایک دستے نے ترکوں کا مقابلہ کیا لیکن سب کے سب مارے گئے۔ سرپر تپ کے اس دستے کے ایک آفیسر میجر دپت سنگھ کو ملٹری کراس دیا گیا ہے کیونکہ اس نے خالی ہاتھ ایک مشین گن پر حملہ کیا اور گنز کو مار کر گن پر قبضہ کر لیا اور بعد میں ترکوں کے کمانڈنگ آفیسر کو بھی گرفتار کر لیا۔“

”اس معرکے میں سرپر تپ کی ٹانگ چوتھی مرتبہ ٹوٹی لیکن وہ تیس گھنٹے ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ گھوڑی پر سوار جنگ میں شریک رہا۔ ہم ایک راجپوت بہادر کی حیثیت سے اسے ہمیشہ یاد رکھیں گے اور دیوالی پر اس کے لئے خاص پوجا کریں گے۔“

جیہ زنان خانے سے چھکڑوں کو دیکھتی رہی جو دیئے لے کر قلعے میں آئے تھے۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی سوچتی رہی کہ جانے کب اس کا بھائی دیوالی اس کے ساتھ منائے گا۔

زنان خانے کے اندرونی حصے میں خادماؤں نے نفرتی پیالے نکال لئے تھے۔ وہ دیوالی کی

اب ختم ہونے پر ان پیالوں میں دیوؤں کی سیاہی کھرچ کر ڈال لیتیں اور پھر اس سے سرمہ
ماہیں خواجہ سرا وہ خیمہ نصب کرنے میں مصروف تھے جہاں عورتوں نے مہاراجہ کے سامنے
رقص کرنا تھا۔

اور پھر دیوالی کی رات آگئی۔ قلعہ بقیہ نور بنا ہوا تھا۔ اس کی بلند و بالا فصیلوں پر مٹی
کے ہزاروں چراغ روشن تھے۔ شہر کی تنگ گلیوں میں پٹائے، توپ کے گولوں کی طرح پھٹ
رہے تھے جب کہ مکانات کی چھتوں سے ہونے والی آتش بازی نے آسمان کو رنگین بنا دیا
تھا۔

زنانہ خیمے میں مہاراجہ جے سنگھ عورتوں کی طرف رخ کر کے بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے
مہارانی اپنی جگہ سے اٹھی اور اپنے شوہر کے لئے رقص کرنے کی غرض سے آگے بڑھی۔
ایک طویل وقت تک مہارانی تنہا رقص کرتی رہی مگر پھر ایک ایک کر کے زنان خانے کی
مورتمیں اس رقص میں شامل ہوتی گئیں۔ رقص میں تیزی آتی گئی اور ان کی کلائیوں کی
پوٹیاں ٹوٹ ٹوٹ کر انہیں زخمی کرتی رہیں، لیکن خوشیوں کے ان لمحات میں اس کا خیال
کے تھا۔

دو دن بعد یوں لگا جیسے دیوالی لوٹ آئی ہو۔ مہاراجہ جے سنگھ اپنی بیوی کے کمرے میں
داخل ہوا اور اس کے ہونٹوں کے درمیان مٹھائی کا ٹکڑا رکھ دیا۔ ”آپ نے بلاشبہ شیر کو جنم
دیا ہے، مہارانی!“

اس کے پیچھے خواجہ سراؤں کا سردار ٹیلی گراموں کا ایک پلندہ اٹھائے ہوئے تھا۔ جے
سنگھ نے ایک ٹیلی گرام اٹھالیا۔

”یہ آپ کے بیٹے کے کمانڈر انچیف جنرل ایلن بی کی طرف سے ہے۔ لکھا ہے، آپ
کو مبارک ہو کہ آپ کے آدمیوں نے حیضہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ حملے میں انہوں نے کئی
ترکوں کو ہلاک کر دیا ہے اور سات سو کو قیدی بنا لیا ہے۔“

وہ باری باری ٹیلی گرام اٹھاتا رہا اور خوشی سے نہال مہارانی کو سنا تا رہا۔ اس کے بعد
بھی ایسے ٹیلی گراموں کا سلسلہ جاری رہا اور وہ نکا کی خوشیوں میں شریک ہوتے رہے۔

نومبر گزر گیا لیکن بالمر میں بارشیں اب بھی ہو رہی تھیں۔ اس بات کا شدید خطرہ پیدا
ہو گیا تھا کہ شدید بارشوں کے باعث بالمر میں کہیں انفلوئنزا نہ پھوٹ پڑے۔ اس وقت تک
ہندوستان میں اس مرض سے تیس لاکھ افراد مارے جا چکے تھے۔ شہر سے بعض لوگوں کے
بیمار ہونے کی اطلاع ملی تھی لیکن کوئی شخص ہلاک نہیں ہوا تھا۔

کل میں کوکی بائی اس بخار کا شکار ہوئی تھی۔ کئی دن وہ بخار میں مبتلا رہی۔ بخار اٹا شدید تھا کہ وہ عالم بے ہوشی میں اول فول بک رہی تھی۔ جیہ نے بطور خاص ذاتی طور پر کوکی بائی کی تیمارداری کی تھی۔

اس وقت بھی جیہ، کوکی بائی کے پاس تھی، لیکن کوکی بائی کا بخار پہلے سے ہلکا تھا، اسی لئے جب اسے مہارانی کی طلبی کا پروانہ ملا تو اس نے اٹھنے میں جھجک کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا۔ مہاراجہ بھی مہارانی کی بالکونی میں موجود تھا اور دونوں انفلونزا کی وبا پر بحث کر رہے تھے۔ مہارانی کے لمبے میں تشویش ہی تشویش تھی۔ ”پورے ہندوستان میں بارشیں ختم ہو چکی ہیں، لیکن یہاں تو لگتا ہے کہ دیوی پوری سلطنت کو ڈوبنے کا ارادہ کئے بیٹھی ہے اور ہر جھڑی کے ساتھ انفلونزا میں اضافہ ہو رہا ہے۔“

مہاراجہ نے نفی میں سر ہلادیا۔ ”صورتحال ہر جگہ بے چیدہ اور پریشان کن ہے، حتیٰ کہ دمشق میں بھی یہی حال ہے۔ ٹکا کے پورے ڈویژن میں سے بارہ سو آدمی بچے ہیں۔ چار سو فوجی انفلونزا سے مارے جا چکے ہیں۔“ اس نے کالڈزات کی تہہ کھولی اور اپنے بیٹے کا تازہ ترین خط پڑھنے لگا۔

”لوگ انفلونزا سے کھینوں اور چھروں کی طرح مر رہے ہیں۔ گزشتہ دو ہفتوں میں ہم نے تین سو میل کا سفر گھوڑوں کی پشت پر طے کیا ہے اور اس تمام عرصے میں صرف چائے، بسکٹ اور جام پر گزارا کیا ہے اور اس ڈر سے ڈبے کے بند کھانوں کو ہاتھ نہیں لگایا کہ کہیں ان میں گائے کا گوشت نہ ہو۔“

”تمام راستے ہم ترکوں کو تہہ و بالا کرتے اور انہیں قیدی بناتے آئے ہیں۔ ہومز، دمشق روڈ پر ہمارے اسکوادرن نے عربوں کا ایک جتھہ دیکھ کر اس پر حملہ کر دیا۔ عرب اپنے ایک ساتھی کو کار میں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ رسالدار میجر حمیر سنگھ نے اسے ترک جاسوس سمجھ کر پکڑ لیا لیکن جب اس شخص نے ہمارے یونٹ کے برطانوی افسران کو اپنی شناخت کرواتے تو ہٹا چلا کہ وہ تو ماورائی شخصیت کا حامل لارنس آف عربیہ تھا۔“

”یکم اکتوبر کو ہم دمشق میں داخل ہوئے تو ہمارا شاندار خیر مقدم کیا گیا۔ ایلن بی چاہتا ہے کہ وہ تمام فوجی، جو فٹ ہیں فوری طور پر ایلی پو پر حملہ کر دیں۔ ہر کسی کو امید ہے کہ اس محاذ پر لڑی جانے والی یہ آخری لڑائی ہوگی۔ فوجی تھک چکے ہیں اور وہ گھروں کو واپس جانا چاہتے ہیں۔ میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔“

مہاراجہ نے اپنا بازو رانی کی کمر میں حائل کر دیا۔ ”یہ سب جلد ہی ختم ہو جائے گا“

مہارانی۔ ممکن ہے آپ کا بیٹا دیوالی کا اگلا تہوار آپ کے ساتھ منائے۔“
 مہارانی اپنے شوہر کے کندھے پر سر رکھ کر رو دی۔ ”ہم نے اس کا دیکھا بھی کیا ہے، پہلے وہ اسکول میں رہا اور وہاں سے آکر جنگ پر چلا گیا۔“
 جیہ بالکونی سے چلی گئی۔ مہارانی کو روتے دیکھ کر خود اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔
 بہر حال وہ بھی بہن تھی۔ ابھی اس نے چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ بیرن نے اس کا راستہ روک لیا۔ ایک کانڈ اس کے ہاتھ میں تھا جو اس نے جیہ کو تھما دیا۔

”ٹیلی گراف کلرک کا کہنا ہے کہ دربار فوری طور پر اسے پڑھ لیں۔“
 جیہ اٹے قدموں بالکونی کو پلٹی۔ بے سنگھ کا بازو اب بھی آنسو بہاتی بیوی کی کمر کے گرد حائل تھا۔ مہاراجہ نے پیغام جیہ سے لے کر پڑھا اور پھر کانڈ اس کی انگلیوں سے پھسل گیا۔
 جیہ نے برہ کر کانڈ زمین سے اٹھالیا۔ بے سنگھ نے ایک جھٹکے سے اپنی بیوی کو خود سے الگ کر دیا تھا۔

”نہیں!“ وہ بری طرح چلا اٹھا۔ اس نے کمر بند سے خنجر کھولا اور سامنے والی کھڑکی پر دے مارا۔ شیشہ چکنا چور ہو کر نیچے جا گرا۔ ”کچھ بھی ہوا مگر یہ.....“ وہ بلک رہا تھا اور بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

زنان خانے میں کھلبلی مچ گئی۔ عورتیں اپنے کمروں سے نکل آئیں۔ وہ حیرت سے بالمیر کے حکمران کو دیواروں سے سر ٹکراتے دیکھ رہی تھیں۔

”یہ نہیں ہو سکتا۔“ مہاراجہ کے حلق سے دھاڑیں نکل رہی تھیں۔ وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ کسی زخمی درندے کی طرح وہ کمرے کے قالین کو پیروں تلے کچل رہا تھا۔
 اس کا خنجر بار بار کھڑکیوں پر برس کر شیشے کو کرچیوں میں تبدیل کر رہا تھا۔ کمرے میں قیامت برپا تھی۔

جیہ نے پیغام پڑھا اور اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

”چراغ، شنراوی“ جیہ نے اپنی ماں کی آواز کانوں پر محسوس کی۔ اس نے سر اٹھا کر ماں کے سفید پڑتے چہرے کو دیکھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ماں پیغام کے مندرجات سمجھ چکی ہے۔ عورتوں سے کہو کہ پوجا بند کر دیں اور زنان خانے کے چراغ گل کر دیئے جائیں، فوری۔“

مہارانی کی آواز میں کوئی ارتعاش نہ تھا۔ آواز مدہم ضرور تھی لیکن اس میں بلا کا ٹھہراؤ تھا۔ جیہ کو حیرت تھی کہ ماں اتنی پرسکون کیوں ہے؟ اور پھر شاید مہارانی کو اپنے بیٹے کی

والہی یاد آگئی تھی۔ وہ بری طرح چیخ اٹھی۔ ”زنان خانے کی عورتوں سے کہو کہ بولنا بند کر دیں۔“

جیہ مڑی اور سیڑھیوں کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ بیرن اس کے پیچھے تھی۔
 ”کیا نکا مہاراج کی کوئی خبر ہے، شنزادی؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”نکا صاحب کو کچھ ہو گیا ہے؟“

جیہ کے بندھن ٹوٹ گئے۔ اس نے چوڑیوں بھری کلائی قرمبی ستون پر دے ماری۔
 اگلے ہی لمحے اس کے بین راہداری میں گونج رہے تھے۔
 ”زنان خانے کے چراغ گل کر دو، بیرن!“ اس نے ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان حکم دیا۔

بیرن کی چیخ اس سے بھی زیادہ بلند تھی۔ اس نے چہرے سے نقاب نوچ ڈالی عورتیں چیخ و پکار کرتی زنان خانے کی راہداریوں میں نکل آئیں۔
 ”نکا راج چلے گئے..... انگریزوں نے نکا راج کو مار ڈالا.....“

جیہ نے جو ٹیلی گرام پڑھا تھا وہ متحدہ افواج کے کمانڈر انچیف جنرل الین بی نے بالمیرہ کے مہاراجہ کو بھیجا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ ٹکا الپو کے مقام پر ایک حملے کے دوران مارا گیا اور اسے وہیں پورے فوجی اعزاز کے ساتھ سپرد خاک کر دیا گیا تھا۔

بیرن نے چلا کر زنان خانے کے در و دیوار کو ٹکا کے مرنے کی اطلاع دی تو عورتوں نے اپنے سر ننگے کر لئے، بال نوچ ڈالے۔ جیہ پاگلوں کے طرح دوڑ رہی تھی اس کے پیر فرش کے بجائے ان دوپٹوں، اوڑھنیوں اور نقابوں پر پڑ رہے تھے جنہوں نے فرش کو ڈھانپ رکھا۔ انہوں نے دوڑ کر جیہ کو پکڑا تھا کیونکہ خطرہ یہی تھا کہ کہیں وہ پاگلوں کی طرح دوڑتی ہی خود کو زخمی نہ کر بیٹھے۔

بالمیرہ کی مہارانیوں کے مندر میں پردہ دار خواتین سوگ میں بیٹھ چکی تھیں۔ وہ دیوی کے سامنے پراتھنا کر رہی تھیں کہ ٹکا کی آتما کو سوگ میں جگہ دے۔ مندر میں دیوی کے سامنے صرف ایک دیا جل رہا تھا جس کی ٹاکانی روشنی حرم اور گرد و نواح کے حصے کی تاریکی دور کرنے کو ٹاکانی تھی۔

جیہ اپنی ماں کی خواب گاہ کی طرف واپس آئی تو اسے برتن توڑے جانے کی آوازیں ملنے لگیں۔ خواجہ سرا باورچی خانے کے برتن توڑ رہے تھے تاکہ سوگ کے اگلے تیرہ دنوں میں کچھ پکایا نہ جاسکے۔ قلعے کے مرکزی دروازے پر ہمیشہ ایک چراغ روشن رہا تھا لیکن آج چراغ بجھا دیا گیا تھا یہ اس بات کی نشانی تھی کہ بالمیرہ کے تخت کا ولی عہد اب اس دنیا میں نہیں رہا۔

اگلے تیرہ دنوں تک مہاراجہ مسلسل کھلا دربار منعقد کرتا رہا وہ سوگ کی نشانی کے طور پر طبعی گپڑی باندھا کرتا تھا دربار ہال کے قالینوں پر سفید چادریں ڈال دی گئی تھیں۔ ریاست کے عوام اپنے حکمران سے تعزیت کے لئے لٹ پڑے تھے۔ ایسے میں دارالحکومت کے پجاری دربار ہال کے ایک کونے میں راج گورو کی قیادت میں مسلسل اشوک پڑھنے میں مصروف رہے تھے۔

سوگ کے پانچویں دن مہاراجہ نے دربار ہال میں موجود لوگوں کو آگاہ کیا کہ جنگ ختم ہو

گئی ہے اب مشرق وسطیٰ میں امن ہے اور سلطنت عثمانیہ کے خلیفہ نے غیر مشروط ہتھکست تسلیم کر لی ہے مہاراجہ کی آواز خاصی کمزور تھی جسے بعض لوگوں نے سنا اور نے نہیں سنا۔ البتہ اس بات پر تمام ہی متفق تھے کہ ان کا حکمران بیمار ہے۔

ہاتھی دروازے کے اوپر نصب نقارہ دھیمے سروں کے ساتھ بجایا جا رہا تھا۔ بالیر اپنے مہاراجہ کی طرف بڑھے تو اس نے سارے کے لئے راج گورو کا کندھا پکڑ لیا۔ جیہ زنان خانے کی جالیوں میں سے بالیر کے گھڑ سواروں کی واپسی کا نظارہ کر رہی سواروں کے سرنگے اور رائفلیں جھکی ہوئی تھیں ان کی قیادت نکا کا خالی گھوڑا کر رہا تھا پر سفید چادر ڈال دی گئی تھی۔ سواروں کے عقب میں میجر ویر سنگھ تھا جس نے ایک مرتبان میں نکا کی راکھ اٹھا رکھی تھی۔

بیٹے کی راکھ دیکھی تو مہارانی کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ آنسوؤں کا وہ دھواں آج تک بند باندھ کے روکا گیا تھا اچانک بہہ نکلا۔

”ہمارے نکا کو انگریزوں نے مارا ہے۔“ مہارانی نے جیہ کے کندھوں پر دو ہتھکڑی بارش کر دی وہ بلند آواز سے چیخ رہی تھی۔ ”تمہارے باپ نے میرے بیٹے کو مار ڈالا۔ میرے بیٹے کا قاتل تمہارا باپ ہے۔۔۔۔“

”کوئی بائی نے مہارانی کو کھینچ کر اپنے بازوؤں میں لے لیا اور بالیر کی خاتون بوڑھی گود میں سر رکھ کر بلک بلک کر رونے لگی۔

”شنراوی!“ کوئی بائی نے جیہ کو مخاطب کیا۔ ”ستی ماتا کو بلوا بھیجو۔ تمہاری ماں حواس میں نہیں وہ آکر ضرور کچھ نہ کچھ کہے گی۔“

ایک تیز رفتار قاصد‘ ستی ماتا کو بلانے کے لئے بھیج دیا گیا۔ کوئی بائی‘ مہارانی کو کمرے میں لے گئی تاکہ اسے سنبھال سکے ذرا دیر بعد ہی جیہ کو بتایا گیا کہ مہارانی نے بیٹے کے لئے خصوصی پوجا کا فیصلہ کیا ہے لیکن اس کی حالت بہتر نہیں اس لئے جیہ اپنے کو اس صورت حال سے آگاہ کر دے۔

سینا پتی اور راج گورو‘ مہاراجہ کی خواب گاہ کے باہر ٹہل رہے تھے ان کے چہرہ تشویش کے سائے تھے ”ڈاکٹر اس وقت آپ کے والد کے پاس موجود ہیں شنراوی“ ان نے جیہ کو آگاہ کیا ”آپ اس وقت ان سے نہیں مل سکتیں۔“

جیہ کوئی بائی کے کمرے میں واپس آگئی‘ مہارانی اس بازو بند کو چوم چوم کر رو رہی جو جے سنگھ نے جنگ پر رواںگی سے قبل اپنے بیٹے کو دیا تھا‘ ستی ماتا آچکی تھی وہ فری

اپنی ہاتھی مارے بغور مہارانی کا جائزہ لے رہی تھی اس کا سانپ اب بھی اس کی گود میں تھا۔
 ”اسے اپنے بیٹے کی حفاظت کرنی چاہئے تھی۔“ مہارانی اب بھی اول فول بک رہی تھی
 اس کی دماغی حالت شاید الٹ گئی تھی اس لئے وہ مرتبے کا احساس بھی کھو بیٹھی تھی ”لیکن
 اپنے بیٹے کی حفاظت نہ کر سکتا ہو وہ کسی اور کی حفاظت کیا کرے گا؟ اس نے ایک بیوہ
 ایک نپاک عورت کو تعظیم دی..... اس نے اپنی بیوی کو پردہ ختم کرنے پر مجبور
 دیوی کے چرنوں میں اس کی دسرے کی بھینٹ نپاک تھی..... اس نے اس گھر کو برباد
 کیا ہے۔“

ستی ماما نے ہاتھ بلند کر دیا۔ مہارانی خاموش ہو گئی وہ بے دم ہو کر کوکی بائی کے بستر پر
 لڑ پڑی۔

”کیا تم نے اپنے والد کو اطلاع دی ہے، شنراوی؟“

کوکی بائی نے سرگوشی کی ”ان کی ہدایات کیا ہیں؟“

”انہوں نے مجھے بابا کے پاس جانے کی اجازت نہیں دی“ جیہ نے جواب دیا ”بابا بیمار
 ہیں۔“

”انفلوئنزا ہو گا؟“ کوکی بائی کا انداز سوالیہ تھا لیکن جب جیہ نے نفی میں سر ہلایا تو کوکی
 لایوں چونکی جیسے کوئی بہت ہی اہم بات یاد آگئی ہو ”شنراوی!“ وہ تیزی سے بولی۔ ”بھاگ
 رہاؤ اور اپنے والد کو بتاؤ کہ وہ راجہ مان سنگھ کے گھر سے کچھ نہ کھائیں۔“

جیہ زنان خانے کی راہداریوں میں بھاگ کھڑی ہوئی تاکہ اپنے والد کو کوکی بائی کا پیغام
 سکے لیکن محل کے ذاتی محافظوں نے مہاراجہ کی نجی رہائش گاہ کو جانے والے دروازے
 لاکر رکھے تھے۔

”دربار“ اپنی وزارت کی کونسل سے اہم اجلاس میں مصروف ہیں، شنراوی ”محافظوں کے
 بار نے جیہ کو آگاہ کیا ”انہوں نے ہدایت کی ہے کہ مداخلت نہ کی جائے۔“

وہ ایک جانب بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔ ایک طویل وقت کے بعد دروازے کھلے اور
 راجہ مان سنگھ باہر آیا اس کے چہرے پر کڑھکی کے آثار تھے لیکن جیہ کو دیکھ کر اس نے
 پر افسوس کا رنگ جمایا ”بہت کٹھن وقت ہے شنراوی“ اس نے جیہ کو مخاطب کیا ”
 لپرا تھنا کرنی ہو گی کہ سب کچھ جلد ٹھیک ہو جائے۔“

اس نے راج گورو کو دروازے سے نکلتے دیکھا۔ جیہ راجہ مان سنگھ کے پیچھے پیچھے اپنے
 رکی تاریک خواب گاہ میں داخل ہو گئی مہاراجہ کا بلیاں پاؤں چھوٹی چارپائی سے باہر نکلا ہوا

تھا جیہ کو اس کی پنڈلی میں حاکمیت کا طلائی کڑا دکھائی نہیں دیا جب جیہ کی آنکھیں تھک جیہ ہوئیں تو اسے طلائی کڑا مہاراجہ کے ہاتھ میں دکھائی دیا۔

جے سنگھ نے بیٹی کو دیکھ کر بہ مشکل سراٹھایا ”ہم نے وزارت کی کونسل کو مطلع کر کے تم بالمیر کی آئندہ حکمران ہو گی۔“

اس نے طلائی کڑا جیہ کو تھما دیا ”راجہ مان سنگھ تمہاری بلوغت تک سرپرست فرائض انجام دے گا لیکن اس کے بعد۔۔۔۔۔“

وہ تھک کر دوبارہ لیٹ گیا ”لوگوں کی خدمت کرنا شہزادی“ اس نے بیٹی کو ہدایہ ان اصلاحات کی تکمیل کرنا جو ہم نے شروع کی ہیں۔“

جیہ، باپ کی طرف جھکی ”حکم! آپ راجہ مان سنگھ کے گھر کا کھانا ہرگز نہیں گے“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر نکلنے پر گر رہے تھے لیکن مہاراجہ نے آنکھیں لی تھیں اس نے جیہ کی آواز بھی نہیں سنی تھی ”ببا! ہماری بات سنیں“ جیہ کے گھگھیاہٹ تھی ”راجہ مان سنگھ کے گھر سے آنے والے کھانے کو آپ ہاتھ بھی نہیں گے۔“

راجہ گورو نے جیہ کا شانہ تھپتھپایا ”جیہ روتی ہوئی اس کی طرف پلٹی“ ”راجہ کے گھر میں تیار ہونے والا کھانا، ببا کو مت کھانے دیجئے گا“ اس نے آنسوؤں کے راجہ گورو کو آگاہ کیا۔

راجہ گورو نے روتی بلکتی جیہ کا سر بازوؤں میں چھپا لیا ”ایسی باتوں کی طرف دو، شہزادی، جن کا وجود نہیں ہے۔“ اس نے سرگوشی کی ”کیا آپ نہیں جانتیں کہ دنوں میں کتنی اموات ہوئی ہیں“ اس نے جھک کر جیہ کی آنکھوں میں جھانکا ”آپ اس لئے مر رہے ہیں کہ ان کا وقت آ گیا ہے۔۔۔۔۔ جالیئے اپنی والدہ کو بلا لائیں۔“

جیہ حیران تھی کہ بیٹے کی موت کے بعد شوہر کی موت پر بھی مہارانی نے کیسے سنبھال رکھا ہے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ سستی مانتا نے اپنی قوتیں مہارانی کو تفویض کر جیہ نے مہاراجہ کے بستر مرگ کے قریب بیٹھی اپنی ماں کے منہ سے صرف ”ہائے“ الفاظ سنے تھے، وہ بھی شاید اس لئے کہ اب مہارانی کو بیوگی کا ایک طویل دور گزارنا تھا مہارانی نے جھک کر ہیرے کی پازیب اتاری اور اسے اپنے شوہر کے بستر پھینک دی۔ پھر اس نے بال کھولے اور گردن سے لپٹا ہوا منگل سوتر اتار دیا جو تیرہ عمر میں دلہن بننے کے بعد سے کبھی گردن سے جدا نہ ہوا تھا، جیہ کو منگل سوتر سے

دائرہ نما نشان صاف نظر آ رہا تھا جو طویل عرصے تک پہننے کے باعث حلق کے گرد ابھر آیا تھا۔ آخر میں مہارانی کا ہاتھ آہستگی کے ساتھ ماتھے پر پہنچا اور اس نے ساگنوں کا نشان یعنی سرخ تلک مٹا ڈالا اور مانگ میں پڑا سیندور صاف کر دیا۔

خود کو ساگن سے ابھاگن میں تبدیل کرنے کے بعد مہارانی اپنے شوہر کی ارٹھی کے پاس بیٹھ گئی جبکہ پجاری مہاراجہ کے کریا کرم کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے محض ایک بار مہارانی نے قینچی کی فرمائش کی اور جیہ نے اپنی ماں کو قینچی تھادی۔

مہارانی نے قینچی سے اپنے بالوں کی لٹوں کو کاٹنا شروع کر دیا حتیٰ کہ اس کے ارد گرد بالوں کا ایک فرش سا بچھ گیا۔

پجاریوں نے آنجنابی مہاراجہ کو اس کا شہی لباس پہنایا اور اس کی نقش کو پھولوں سے لدی ہوئی ارٹھی پر رکھ دیا۔ باہر ایک ہاتھی تیار کھڑا تھا جس پر مہاراجہ کی ارٹھی رکھ کر دارالحکومت کی گلیوں اور سڑکوں پر گھمائی جانی تھی۔

مہارانی ارٹھی کے ساتھ مہاراجہ کی رہائش گاہ کے بیرونی دروازے تک گئی تھی راہداریاں لوگوں سے بھری ہوئی تھیں جو مہاراجہ کے آخری دیدار کے لئے ایک دوسرے کے اوپر گرے جا رہے تھے۔ زنان خانے کے اندر ایک کہرام برپا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ دارالحکومت کی ہر عورت مہارانی کو پر سادینے اور اس کے ساتھ بین کرنے محل میں آگئی ہو۔

”بد قسمت عورت، تمہاری تو زندگی ختم ہو گئی!“

”بدو! اب تم گندی ہو گئی ہو، بدو!“

”ایک سنگی صلیب مہارانی کے سامنے رکھ دی گئی جبکہ پر سے کے لئے آئی ہوئی عورتوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ جیہ جب انہیں دھکیلتی آگے بڑھی تو اس نے اپنی ماں کو دونوں کلائیوں کی چوڑیاں اس سنگی صلیب پر توڑتے دیکھا جیہ نے آگے بڑھ کر اپنی ماں کی دونوں کلائیاں تھام لیں۔

اور پھر جب مہارانی شاہی کبھی میں زنان خانے سے مندر جانے کے لئے روانہ ہوئی تو بائیں پہلو میں واقع اونچی دیوار کے عقب سے گویا ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کی بارش ہونے لگی یہ دیوار زنان خانے کو واشتاؤں کے حصے سے الگ کرتی تھی۔ مہاراجہ کے مرنے کی خبر سن کر واشتاؤں نے بھی اپنی چوڑیاں توڑ کر دیوار کی دوسری جانب پھینکنی شروع کر دی تھیں۔ جیہ نے خواجہ سراؤں کو دیکھا ان کے ہاتھوں میں مہارانی کے بالوں کی کٹی ہوئی لٹیں تھیں وہ یہ

انہیں مہاراجہ کی آخری رسومات کے بعد بازار میں فروخت کرتے۔

”تمہارے والد کی آخری رسومات کسی بھی لمحے ادا ہونے والی ہیں“ مہارانی نے جیہ کو بتایا ”ہماری خواہش ہے کہ جب توہیں سلامی دیں تو ہمیں تنہا چھوڑ دیا جائے۔“

مہارانی کی خواہش کا احترام کیا گیا اور جونہی وہ بالمیر کی مہارانیوں کے مندر میں داخل ہوئی اس کے دروازے بند کر دیئے گئے جیہ چوہی دروازے کے باہر تنہا کھڑی رہ گئی اسی وقت قلعے کی توپ گرجنے لگی یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ مہاراجہ کی چتا کو آگ لگا دی گئی ہے جیہ جانتی تھی کہ اس کے کزن جان نے اس کے بھائی نکا کی جگہ چتا کو آگ دکھائی ہوگی اور اب مہاراجہ کے سر پر ضربیں لگا رہا ہو گا تاکہ اس کی آتما کو آزادی دے سکے اس نے ہاتھی دروازے کی طرف دیکھا نکا کی موت کی اطلاع دینے والا دیا اب بھی بچھا ہوا تھا۔

جیہ مارے بے بسی کے چلا اٹھی وہ بھگوان کو کوس رہی تھی کہ اسے لڑکی کیوں پیدا کیا؟ کیونکہ ایک لڑکی ہونے کے ناطے وہ چتا کو آگ نہیں دکھا سکتی تھی۔

جیہ کو کوکی بائی اور سستی ماتا دکھائی دیں جو بھاگتی ہوئی اس کی طرف آرہی تھیں ”تم کیوں چلا رہی ہو، بیٹی؟“ کوکی بائی نے قریب آتے ہی دریافت کیا ”تمہاری ماں کہاں ہے؟“

جیہ نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن جونہی اس نے مندر کے بند دروازے کو دیکھا، کوکی بائی پوری بات سمجھ گئی وہ تیزی سے آگے بڑھی اور اس نے بند دروازے کو کھولنے کی کوششیں شروع کر دیں ساتھ ہی وہ مہارانی کو پکار بھی رہی تھی۔ سستی ماتا نے اپنا سرخ لبادہ اپنے بدن کے گرد کچھ اور کس لیا تھا انداز ایسا ہی تھا جیسے جنگ کے لئے تیار ہو رہی ہو۔

مندر کا دروازہ کھل گیا۔ مہارانی بالکل سامنے کھڑی تھی۔ دھوئیں نے اس کے ویلے پتلے جسم کا احاطہ کر رکھا تھا اس کے ہاتھ پشت پر تھے جبکہ سبز آنکھوں سے دھوئیں کی وجہ سے آنسو جھپکے پڑ رہے تھے۔

”تم نے کیا کیا ہے مہارانی؟ کوکی بائی کی آواز غصے سے لبریز تھی۔ مہارانی نے احساسِ تفاخر کی ایک بھرپور نگاہ کوکی بائی پر ڈالی جب تک توہیں گرجتی رہیں دونوں نے کچھ کہا نہ اپنی جگہ سے حرکت کی جونہی توہیں خاموش ہوئیں مہارانی نے دونوں ہاتھ بوڑھی عورت کے سامنے کر دیئے ہاتھ رسیوں سے بندھے ہوئے تھے اور رسیاں جل رہی تھیں۔

”میں سستی ہوں“ مہارانی نے فخر سے تن کر کہا۔ اس نے جلتے ہوئے ہاتھ اپنے گھاگرے سے مسلتے شروع کر دیئے کپڑے نے فوراً آگ پکڑ لی۔ مہارانی نے بہ آواز بلند کہنا شروع کر دیا ”رام.... رام“ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ چتا میں اپنے شوہر کا سر گود میں رکھے بیٹھی ہے۔

”ستی ماما نے کوکی بائی کو ایک طرف دھکیلا اگلے ہی لمحے مہارانی کا نرم و نازک اور دہلا ہوا جسم اس کے ہاتھوں پر تھا اس نے مہارانی کو اٹھائے اٹھائے چند قدم اٹھائے اور پھر اس کا ہاتھ ہوا بدن قریبی تالاب میں پھینک دیا۔ جیہ نے اپنی ماں کو پانی میں ڈوب کر ابھرتے اور پھر اہٹے دیکھا لیکن اس کا جسم ایسے سن ہو رہا تھا کہ وہ اس کی کوئی مدد نہیں کر پا رہی تھی۔

تالاب میں کودنے والی بھی ستی ماما ہی تھی اس نے ایک بار پھر مہارانی کو اپنے مضبوط بالوں پر اٹھایا اور لا کر باہر لٹا دیا۔ کوکی بائی مہارانی کے قریب بیٹھ کر توجہ سے اس کے جلے ہوئے ہاتھوں کا جائزہ لینے لگی ”تم نے ایسا کیوں کیا؟“ اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں پوچھا ”

غیر بالمیر نے اس رسم پر ہمیشہ کے لئے پابندی عائد کر دی تھی۔“

ستی ماما جیہ کی طرف متوجہ ہوئی ”اپنی ماں کے زخموں پر لگانے کے لئے کوئی مرہم لے کر آؤ شہزادی۔ راج گورو جلد ہی اسے بلانے والے ہیں اور ہاں، بیرن سے کہو کہ مہارانی کے صاف کپڑوں کا ایک جوڑا بھی لائے۔“ جیہ بدستور ساکت کھڑی رہی تو ستی ماما نے ایک بار پھر اسے مخاطب کیا اس بار اس کے لہجے میں تنبیہ تھی ”تمہارے والد کی خواہش تھی کہ تم خود مختارانہ اس ریاست پر حکمرانی کرو اگر تم اسی طرح بے حس و حرکت کھڑی رہو گی تو حکومت کیسے کرو گی؟“

سرد آواز کی کاٹ نے جیسے جیہ کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا اور وہ زنان خانے کی طرف ہٹاگ کھڑی ہوئی۔

ستی ماما کی ہدایات کے مطابق بیرن نے مہارانی کو ایک سفید جوڑا پہنا دیا اور اس کے زخموں پر مرہم لگا دیا اور بیرن فارغ ہوئی اور اوہر ایک عورت چہرے پر بدحواسی لئے وہاں آ پہنچی۔ مہاراجہ نے مہارانی کو بلا بھیجا تھا۔ جیہ کو بے حد حیرت ہوئی کہ کیا واقعی ستی ماما، مستقبل میں جھانک سکتی ہے۔

راج گورو زنان خانے کے صحن میں ٹہل رہا تھا جونہی اس کی نظر مہارانی کے جلے ہوئے ہاتھوں پر پڑی، دو آنسو اس کی آنکھوں سے آزاد ہو گئے۔

”مہاراجہ کی آتما آزاد ہو گئی ہے حکم!“ اس نے مہارانی کو آگاہ کیا ”میری خواہش ہے کہ آپ کریا کرم کی آخری رسومات کے وقت موجود رہیں۔“

کوکی بائی اور ستی ماما، مہارانی کو تمام کر زنان خانے سے باہر لے گئیں۔ مہارانی نے کسی معمول کی طرح ان کا ساتھ دیا تھا سو گواروں کا ہجوم اب بھی صحن میں جمع تھا ان کے آگے وزارت کی کونسل کے اراکان تھے جنہوں نے سوگ کے طور پر سروں پر سفید پگڑیاں باندھ رکھی

تھیں۔

ہجوم نے مہارانی کو دیکھتے ہی ”مہاراجہ جے سنگھ امر ہے..... مہاراجہ جے سنگھ امر ہے“ کے نعرے لگائے وہاں موجود ہر شخص سوگوار تھا صرف راجہ مان سنگھ ایک ایسا شخص تھا جس کے چہرے پر سوگ نہیں غصہ تھا شاید ان نعروں سے اسے تکلیف ہوئی تھی۔

”بالمیر کے لوگو!“ راج گورو کی پاٹ دار آواز نے نعرے لگانے والوں کو خاموش کر دیا تھا ”دیوتاؤں کی نظر میں ہمارا عظیم ترین اعزاز ہمارے بادشاہوں کا جاری و ساری سلسلہ تھا انتالیس نسلوں تک راج کمار بیٹوں نے اپنے مہاراجہ باپوں کی جگہ لی اور بالمیر پر حکومت کی اور ہم بھی اس سلسلے میں کسی تنازعے کا شکار نہیں رہے لیکن میں یعنی بالمیر کا بد نصیب مہابجاری اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ چونکہ بادشاہت کا یہ سلسلہ آج ٹوٹ گیا ہے لہذا میں قلعہ بالمیر کے نقارے توڑے جانے کا اعلان کرتا ہوں۔“

مہات نے موتی کو فوراً آگے بڑھایا نقارے اس کے جسم کے اطراف بندھے ہوئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ راج گورو کے حکم پر عمل درآمد ہوتا راجہ مان سنگھ کی غصیلی دھاڑ سنائی دی ”نقارہ اس وقت ٹوٹ سکتا ہے جب ہم قلعہ کو کھودیں میں بالمیر کے تخت و تاج کا سرپرست ہوں میں اس پاگل پن کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔“

راج گورو نے راجہ مان سنگھ کے چیخنے چلانے پر کوئی توجہ نہیں دی، ہاتھی گھنٹوں کے بل بیٹھ گیا تھا نقارے بجانے والوں نے دونوں نقارے ہاتھی کے پیٹ سے الگ کئے اور انہیں راج گورو کے سامنے لا ڈالا۔ راج گورو نے بالمیر کی شاہی تلوار اٹھائی اور پے درپے نقاروں پر کئی وار کئے، نقارے ٹوٹ گئے تھے۔

”مہارانی، زنان خانے کی طرف پلٹی جیہ نے اپنی ماں کی وحشی و وحشی آواز سنی ”رام نام ست ہے..... رام نام ست ہے..... رام نام ست ہے۔“

ستی ماتا کی ایک اور پیش گوئی درست ثابت ہوئی تھی۔

سوگ کے اگلے دنوں میں جیہ نے اپنا زیادہ تر وقت ماں کے ہمراہ مہارانیوں کے مندر میں گزارا جہاں وہ دونوں مہاراجہ کی آتما کے لئے پوجا پاٹ کرتیں البتہ جب کبھی وہ اپنے کمرے میں جاتی تو بیرن ریاست میں گردش کرنے والی افواہوں سے اسے آگاہ کرتی۔

”ہر شخص کہہ رہا ہے کہ راجہ مان سنگھ نے آپ کے والد کو زہر دیا تھا، شہزادی“ بیرن نے ایک روز اسے بتایا۔ ”اور اب راجہ مان سنگھ دہلی گیا ہے“ وائسرائے سے اپیل کرنے کے آپ کے والد کا فیصلہ کالعدم قرار دے کر اس کے بیٹے کو بالمیر کا حکمران تسلیم کیا جائے۔“

”دہلی سے واپسی پر راجہ مان سنگھ نے مہارانی کو شاہی جھروکے کے باہر عوامی صحن میں بلا بھیجا۔

مہارانی آخری بار اس صحن میں اس وقت کھڑی ہوئی تھی جب مہاراجہ نے بالمیر کے معززین کے سامنے اس کا پردہ ختم کروایا تھا لیکن اب وہ ملکہ نہیں رہی تھی اب وہ سفید رنگ کے سوتیلبوسات پہنتی تھی۔

مہارانی جونہی صحن میں پہنچی، راجہ مان سنگھ چلا اٹھا ”ہاؤس آف بالمیر کے ساتھ اس عورت کا تعلق اب ختم ہو گیا ہے“ اس نے انتہائی بدتمیزی کا مظاہرہ کیا ”بڑھاپے کے سہارے کے لئے اس کے پاس شوہر بچا ہے نہ بیٹا پھر بھلا ہم اس بدوا کو کیا دے سکتے ہیں؟“ سوال صحن میں گونج کر رہ گیا جیہ نے جھوم کی طرف دیکھا جسے سانپ سونگھ گیا تھا وہ حیران تھی کہ لوگوں نے اپنی مہارانی کے لئے ایسے جملے کس طرح برداشت کر لئے؟

”ہم بدوا کو کیا دیتے ہیں؟“ راجہ مان سنگھ پھر بلند آواز میں چیخا ”ہماری قدیم کتابوں میں لکھا ہے کہ ہم کسی بدوا کو کچھ نہیں دیتے.... نہ اپنے برتنوں میں کھانا اور نہ اپنے کتوؤں کا پانی.... پھر اس بدوا کو کیا دیں گے؟“

پگڑیوں کے شٹلے جھک گئے۔ زبانیں تلو سے لگی رہ گئیں لوگ شش و پنج میں مبتلا ہو کر انگلیوں سے فرش کریدنے لگے، لیکن کسی کو جرات نہیں ہوئی تھی کہ وہ راجہ مان سنگھ کی اس بد زبانی کا جواب دیتا۔

ایسے میں ایک تنہا شخص آگے بڑھا غصے سے اس کا دہلا پتلا جسم کانپ رہا تھا۔
 ”لغت ہو بالمیر کے لوگو! تم پر لعنت ہو“ راج گورو کی آواز کوڑے کی طرح لہرائی ”تم لوگوں نے اس عورت کو اپنی ماں کہا تھا اور آج اس ماں کو تم لوگوں کے سامنے بے آبرو کیا جا رہا ہے جبکہ اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کرنا تم لوگوں کا فرض تھا“ اس نے اپنے ہاتھ فضا میں بلند کئے تو اس کی انگلیوں کے درمیان سونے کی چمک دکھائی دی ”لیکن خوش قسمت ہے مہارانی، کہ اسے ان لوگوں سے رحم کی بھیک نہیں مانگنی پڑی جنہیں وہ اپنا بیٹا سمجھتی تھی، اپنا بھائی سمجھتی تھی“ وہ چند ثانیئے خاموش رہ کر پھر گویا ہوا ”سن لو بالمیر کے بے غیرت لوگو! مہاراجہ ونگرا نے یہ چیزیں ایک بھائی کی حیثیت سے بھجوائی ہیں۔“

راج گورو نے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے تاکہ سارا جھوم اس کی انگلیوں کی درمیان موجود سونے کی چوڑیوں کو دیکھ سکے۔

”ایک اجنبی نے تمہاری مہارانی کے لئے اپنے گھر کے دروازے کھول دیئے ہیں ایک

انہی نے اپنی بہن کے قدموں میں دولت کے ڈھیر لگا دیئے ہیں کل میں راجہ مان سنگھ کے بیٹے کے سر پر مہاراجہ بالمیر کا تاج رکھنے جا رہا ہوں قدیم کتابوں میں یہی لکھا ہے لیکن آج راج گورو کی حیثیت سے میں اپنی خاموشی توڑتا ہوں اور تم لوگوں کو بتاتا ہوں کہ قدیم کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ جو شخص نقارے ٹوٹنے کے بعد اس بے تابی کے ساتھ بالمیر کے تخت پر بیٹھے گا وہ تمہارا آخری بادشاہ ہو گا۔“

شاہی اعلان 1919ء

جارج پنجم جو اللہ کے فضل و کرم سے برطانیہ عظمیٰ اور آئرلینڈ کا بادشاہ اور سمندر پار برطانوی نو آبادیات کا ولی اور ہندوستان کا شہنشاہ ہے کی جانب سے....

میرے وائسرائے اور گورنر جنرل۔ ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں، ہندوستان میں میرے تمام خیر خواہوں بلا امتیاز رنگ و نسل اور مذہب کو مبارک ہو۔

جب سے ہندوستان کی سرحدوں میں برطانوی حکومت کی عمل داری قائم ہوئی ہے وہاں کے باشندوں کی فلاح و بہبود اور بہتری کے لئے متعدد اقدامات کئے گئے ہیں اور انہیں بہت سی رعایتیں دی گئی ہیں جو ہمارا فرض تھا لیکن ایک ایسا تحفہ جو ہم پر قرض تھا اور جس کے بغیر کوئی بھی ملک ترقی کی راہوں پر گامزن نہیں ہو سکتا.... وہ ہے ہندوستانی عوام کو ان کے اپنے معاملات کے فیصلے کا حق دینا۔

اس ایکٹ جسے اب قانون کا درجہ دے دیا گیا ہے کے تحت عوام کے منتخب نمائندوں کو باقاعدہ طور پر حکومت میں شامل کیا جائے گا۔ ذمہ داری بہت اہم ہے اور اس کے لئے تجربہ بھی بے حد ضروری ہے لیکن یہ موقع بہر طور دیا جا رہا ہے تاکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تجربہ حاصل ہو سکے۔

اسی طرح میں یہ اعلان کرتے ہوئے بھی خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ چیئرمین آف پر نر کے قیام کی اجازت دی جا رہی ہے مجھے یقین ہے کہ اس چیئرمین کے مشورے نہ صرف خود حکمرانوں اور ان کے عوام بلکہ مجموعی طور پر برطانوی بادشاہت کے لئے بھی مفید اور کارآمد ثابت ہوں گے۔

1919ء میں ہندوستان کو محدود خود مختاری دینے کا شاہی حکم نامہ جاری ہوا اور اسی

سال ایک مختار نامے کے ذریعے جیہ کی شادی سیرپور کے پرنس پر تپ کے ساتھ انجام پائی۔

لیکن اس سال رونما ہونے والے واقعات نے ہندوستان کے عوام اور ان کے برطانوی حکمران کے درمیان غلط فہمی کو وسیع کر دیا۔ شاہ برطانیہ کی جانب سے طویل اعلان خود مختاری میں

دی جانے والی رعایتوں کی تفصیل جب شائع ہوئی تو ہندوستان میں مقیم برطانوی بری طرح خوفزدہ ہو گئے اور ان کے اخبارات نے مقایسوں کو حکومت میں برابر کا حصہ دینے کے خلاف باقاعدہ مہم شروع کر دی۔

بین الاقوامی دباؤ سے صورت حال کچھ اور پیچیدہ ہو گئی۔ ہندوستان کے چھ کروڑ مسلمان اس بات پر برگشتہ تھے کہ برطانویوں نے جنگ کے دوران مکہ اور مدینہ کے مقدس شہروں کی توہین کی ہے اور اب اسلامی دنیا کے خلیفہ، عثمانی شہنشاہ کے خلاف مصروف کار ہیں۔ ہندوستان کی شمالی سرحدوں پر آباد افغانی اس سلسلے میں کچھ زیادہ متعصب واقع ہوئے اور انہوں نے برطانویوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کے لئے ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملنے کی پیش کش کر دی۔

معاشی صورت حال بھی کچھ زیادہ معتبر نہ تھی۔ انفلوئینزا نے پچاس لاکھ جانوں کا نذرانہ لیا اور اس کے فوراً بعد تباہ کن بارشیں شروع ہو گئیں ملک میں خوراک کی کمی کے باوجود نہ صرف بادشاہت نے غلے کی برآمد شروع کر دی بلکہ تباہ ہونے والی اراضی پر مالیانہ اور آبیانہ معاف کرنے سے انکار کر دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سرکاری واجبات کی عدم ادائیگی کی مہم شروع کر دی گئی تاکہ انگریز حکمرانوں کو اپنی تباہی و بربادی کا احساس دلایا جاسکے۔

برطانوی بادشاہت کے ظالمانہ اقدامات کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ہندوستانی مارکس اور لینن کے پیروکار ہو گئے جن کی بھرپور سرپرستی روس کی ایک سالہ بالشویک حکومت کی جانب سے کی گئی جبکہ ایک اور دھڑا ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر ولسن سے متاثر دکھائی دینے لگا اور امریکہ کے صدر کو دنیا کا طاقتور ترین شخص تصور کرنے لگا۔

اس ساری صورت حال میں ایک نئے قانون کی منظوری نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا اس کے بجائے کہ اصلاحات کے وعدے پورے کئے جاتے، ایسے وقت میں جب ہندوستانی اس بارے میں پر یقین تھے کہ جنگ میں ان کی قربانیوں کا کچھ نہ کچھ صلہ ملے گا۔۔۔ شاہی حکومت نے روزویلٹ ایکٹ منظور کر لیا جس کے تحت ہندوستانیوں پر خصوصی برطانوی عدالتوں میں مقدمات چلائے جاسکتے تھے جبکہ انہیں اپیل کا کوئی حق حاصل نہ تھا اگر کسی شخص کے بارے میں یہ شبہ ہوتا کہ وہ نقص امن کا مرتکب ہو رہا ہے تو اسے جیل میں ڈال دیا یا بحرہند میں واقع جزائر انڈیمان بھیج دیا جاتا اسے کالے پانی کی سزا بھی کہا جاتا تھا۔ یہاں قیدیوں کو زنجیروں سے باندھ کر رکھا جاتا تھا اور اکثر اوقات اس سزا کی مدت دس سے پندرہ سال ہوتی تھی۔ بسا اوقات سزا اس سے بھی طویل ہوا کرتی تھی۔

مسلمان سیاسی لیڈروں نے اپنے حامیوں کو برطانوی حکومت کے لئے کام کرنے سے منع کر دیا جبکہ کانگریس نے ملک گیر پیمانے پر سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی تاکہ برطانوی راج کے اس بلیک ایکٹ پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا جاسکے۔ برطانوی راج نے ان تحریک کو ناکام بنانے کے لئے برطانوی ہندوستان میں پانچ افراد کے جمع ہونے پر پابندی عائد کر دی۔ ہندوستانیوں نے اس کے خلاف بڑے بڑے جلسے منعقد کئے جس کے نتیجے میں ہزاروں افراد کو جیلوں میں ٹھونس دیا گیا۔

جا بجا برطانوی راج کے خلاف اشتعال انگیز تقریریں ہونے لگیں۔ امرتسر سے دو قوم پرستوں کو ان تقریروں کی پاداش میں شہر بدر کر دیا گیا۔ غم و غصے سے بھرے ہوئے ان کے پیروکاروں نے متعدد بینکوں اور نجی عمارتوں کو آگ لگا دی۔ پانچ انگریز مارے گئے جبکہ ایک مشہری عورت کو بری طرح مارا پیٹا گیا اس کے باوجود کہ بہت سے ہندوستانیوں نے متعدد انگریزوں کو مشتعل ہجوم سے بچایا، پنجاب کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل آر ای ایچ ڈائر نے فساد زدہ علاقوں میں کرفیو نافذ کر کے امرتسر کی گلیوں اور سڑکوں میں لوگوں کے چلنے پھرنے پر پابندی عائد کر دی۔ جو کوئی اس پابندی کی خلاف ورزی کرتا اسے چاروں ہاتھوں پیروں پر چلنے پر مجبور کر دیا جاتا۔

جنرل ڈائر کے اس آرڈیننس پر احتجاج کے لئے ایک عوامی جلسے کا انعقاد کیا گیا۔ فوج کے مسلح دستوں نے جلیانوالہ باغ کا محاصرہ کر لیا اور دیواروں پر پوزیشن سنبھال لی۔ باغ کا واحد دروازہ بند کر دیا گیا لیکن ہجوم کو منتشر کرنے کے لئے کوئی وارننگ نہیں دی گئی اور پھر جنرل ڈائر کے احکامات پر فوج نے ہتھیار مردوں، عورتوں اور بچوں پر براہ راست فائر کھول دیا۔ ہندوؤں سے فائر ہونے والی ہر گولی نے کسی کو زخمی کیا یا ہلاک کیا اور اس سے زیادہ ظلم کی بات یہ تھی کہ کسی زخمی کو کوئی طبی امداد فراہم نہیں کی گئی۔

پنجاب سے ہر قسم کی خبروں پر پابندی عائد کر دی گئی۔ باقی علاقوں کے رہنے والے بس اندازے لگا رہے تھے کہ پنجاب میں کیا ہو رہا ہے لیکن جب پنجاب کے قتل عام کی افواہیں دیگر علاقوں میں پہنچیں تو برطانویوں سے ہندوستانیوں کی نفرت اور بڑھ گئی نوبل انعام یافتہ ہندوستانی ادیب راجہ راہندر ناتھ ٹیگور نے اپنا اعزاز برطانیہ کو واپس دے دیا تیس دیگر ہندوستانیوں نے بھی اپنے اعزازات اس ناانصاف حکومت کو لوٹا دیئے۔

جنرل ڈائر نے اپنی غلطی تسلیم کرنے کے بجائے مارشل لاء مزید سخت کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک نیا آرڈیننس بھی نافذ کر دیا گیا جس کی رو سے ہر مقامی کا ہر سفید فام کو سلام

لنا لازمی قرار دے دیا گیا۔

ان تمام اقدامات نے پنجاب کو باغی بنا دیا اور وہ دیہات جہاں سے جنگ کے لئے سب سے زیادہ فوجی بھرتی کئے گئے تھے ایک ایک کر کے انگریزوں کے خلاف ہوتے چلے گئے۔ انگریزوں نے اس بغاوت کو کچلنے کے لئے ان دیہات پر ہوائی جہازوں کے ذریعے بم گرانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔

چھ ماہ کے پر تشدد ہنگاموں کے بعد بالآخر برطانوی حکومت نے امرتسر کے قتل عام کی حقیقتات کے لئے ایک انکوائری تشکیل دی۔ جنرل ڈائر نے اس کمیشن کے سامنے بیان دیتے ہوئے اپنے اس اقدام کو جائز قرار دیا اور بقول اس کے اگر وہ یہ قدم نہ اٹھاتا تو لوگ اس کا معکمہ اڑاتے۔

ہندوستان کے سیاسی لیڈروں اور سات مہاراجاؤں کو لندن طلب کر لیا گیا تاکہ وہ فکر مند انگلینڈ کو یہ باور کرا سکیں کہ منقسم مزاج ہندوستانی ہر انگریز کو قتل کرنے کی خواہش بہر حال نہیں رکھتے۔ بیشتر ہندوستانیوں کا خیال تھا کہ 1919ء کے واقعات سے شاہ جارج کے اعلان کا اثر زائل ہو گیا تھا۔

انڈین نیشنل کانگریس نے کچھ عرصے بعد ایک قرار داد منظور کی جس میں طے کیا گیا کہ ہندوستانی باشندے اپنے ملک کا انتظام و انصرام چلانے کے مکمل طور پر اہل ہیں۔

قرار داد منظور ہونے کے چند گھنٹوں بعد جیہ اپنے ہاتھنگ پول میں داخل ہوئی تو گلاب کے عطر کی خوشبو کے بھبھکوں نے اس کا استقبال کیا۔ پچھلے سات دن سے اس کا جسم مٹی اور اٹن سے لتھڑا رہا تھا۔ صبح کے وقت جب قلعے کی بیرونی دیواروں کے پار شمنائیاں بج رہی تھیں، خادمائیں بادام کا تیل لگا کر جیہ کے بدن سے سفید مٹی اور اٹن صاف کر رہی تھیں اور اب ہاتھنگ پول میں بیٹھی ہوئی جیہ ان واقعات کے بارے میں سوچ رہی تھی جو اس کی شادی تک رونما ہوئے تھے۔

گذشتہ ایک سال اس نے محل کے زنان خانے میں کسی قیدی کی حیثیت سے گزارا تھا جبکہ پوری ریاست اس کے والد کی وفات کے سلسلے میں مختلف افواہوں سے دوچار تھی۔ اسی سال کے دوران راجہ مان سنگھ کا بیٹا جان برطانوی حکومت کی مدد سے بالمیر کا مہاراجہ بن گیا تھا۔

نئے حکمران خاندان نے مملکت میں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لئے مہارانی پر تباہ توڑ حملے کئے اور متعدد الزامات لگائے، حتیٰ کہ وہ بالمیر چھوڑ کر مہاراجہ ڈنگرا کے پاس چلی گئی۔

اس کے بعد رائے خاندان کو بالمیر چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا ان قوم پرستوں کو عام کے سامنے غدار بنا کر پیش کیا گیا تھا۔ رانی مان سنگھ نے خواجہ سراؤں اور خادماؤں کے کٹے میں آکر کوکی بائی کو تمام مراعات سے محروم کر دیا اور اسے داشتاؤں کے حصے میں رہنے کے لئے بھیج دیا۔

اپنے بیٹے کے تاج و تخت کو لاحق سب سے عظیم خطرہ دور کرنے کے لئے راجہ مان سنگھ نے جیہ کی شادی جلد از جلد کرنے کی کوشش کی لیکن 1919ء میں سیرپور کا پرنس پرتاپ ہنوز فلسطین میں شکست خوردہ عثمانی خلیفہ پر آخری ضرعیں لگانے میں مصروف تھا۔ طویل مذاکرات اور جیہ کے جینز کے طور پر پرنس پرتاپ کو سالانہ ایک خطیر رقم دینے کے وعدے کے بعد راجہ مان سنگھ نے سیرپور کونسل سے درخواست کی کہ جیہ کی شادی غدار نامے کے ذریعہ.... یعنی پرنس پرتاپ کی تلوار سے کرنے کی اجازت دے دی جائے۔

چنانچہ اجازت دے دی گئی اور یوں ستی ماتا کی ایک اور پیش گوئی پوری ہو گئی۔ جیہ نے سر جھکا اور اسی کے ساتھ ماضی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ باتھنگ پول سے نکلی اور بھینٹ کے کمرے میں چلی گئی جہاں اسے دوشیزہ کی حیثیت سے آخری پوجا کرنی تھی منتروں کا جاپ بیرن نے کیا جبکہ جیہ، ہنومان دیوتا کے سر پر نظریں جمائے ان منتروں کو دہراتی رہی۔ ہنومان جی اس کے تحفظ اور بہتر مستقبل کے ضامن تھے پوجا ختم کر کے جیہ نے گذشتہ ایک سال سے اپنی دمساز و ہمراز بیرن کی طرف دیکھا۔ یہ وہ واحد عورت تھی جس نے ہر قدم پر جیہ کا ساتھ دیا تھا اور اسے تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔

آج رات جیہ تنہائی تھی اس طویل دور سے چھٹکارا پا کر پیا دیس سدھارنے والی تھی۔ رانی مان سنگھ شادی کی رسومات میں جیہ کی ماں اور راجہ مان سنگھ باپ کا کردار ادا کرتے جبکہ بالمیر کا تخت غصب کر لینے والا جان شادی کی رسومات میں اس کی بھائی کی حیثیت سے شرکت کرتا۔

قلعے کے نیچے سے شہنائیوں کی آواز بدستور آ رہی تھی یہ اشارہ تھا کہ دولہا والے آ پہنچے ہیں۔ دلہن کے تحائف پہلے ہی پہنچائے جا چکے تھے۔ سیرپور کی دولت کا پہلی بار سرعام مظاہرہ کیا جا رہا تھا دلہن کے تحائف میں دوسری چیزوں کے علاوہ سیرپور کے مشہور عالم یاقوت، ہاتھی، گھوڑے جن کی لگاموں میں ہیرے جڑے ہوئے تھے مولشی جن کے سینگوں پر موتی پروئے گئے تھے۔ کبھی اور فیشن ایبل رولس رائس کے ساتھ ہاتھی پر ایک نقارہ بھی شامل تھا۔

جیہ نے پرنس پر تپ کی تصویر پر پھول چڑھائے وہ گزشتہ ایک سال سے اس آدمی کی تصویر دیکھتی رہی تھی اور سوچتی رہی تھی کہ جانے وہ کب آکر اسے اس قید سے رہائی دلائے گا اور اب بھی وہ تو نہیں آیا تھا البتہ اسے لینے والے آگئے تھے وہ ایک ایسی دلن تھی جسے اپنے دولہا کے بغیر سسرال روانہ ہونا تھا۔

سیرپور کے نقاروں کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی جلوس قریب آ رہا تھا اور جب جیہ نے جلوس کے آخری ہاتھی کے طلائی ہودج کے ساتھ پرنس پر تپ کی تلوار جھولتے دیکھی تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

ادھر قلعے کی توپوں نے گولے داغ کر بارات کے قلعے میں داخلے کا اعلان کیا اور ادھر خادماؤں نے جیہ کو دلن کے بھاری ملبوسات پہنانے شروع کر دیئے جن پر بھاری ہیرے جواہرات ٹانگے گئے تھے۔

رانی مان سنگھ نے انتہائی بے دردی کے ساتھ جیہ کی کلائیوں میں درجنوں ہاتھی دانت کی چوڑیاں پہنائی تھیں حتیٰ کہ جیہ کے تمام بازو سفید چوڑیوں میں مکمل طور پر چھپ گئے تھے جیہ نے اپنا چہرہ ساٹ رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اپنی آنکھوں میں رانی مان سنگھ کے لئے پیدا ہونے والی نفرت کو چھپا نہیں سکی تھی البتہ جب زنان خانے کی عورتوں نے جیہ کو سنہری نقاب پہنایا تو مارے دکھ کے انہوں نے اپنے رخ پھیر لئے انہیں توقع نہیں تھی کہ اپنے دور میں بالمیر کے سیاہ و سفید کی مالک راج کماری کو یوں ایک تلوار سے بیاہ دیا جائے گا۔

جیہ کو سونے میں لا دیا گیا جس کے فوراً بعد شادی کی رسومات شروع ہو گئیں۔ سیرپور سے آئے ہوئے ایک بزرگ نے پرنس پر تپ کی تلوار ہاتھ میں تھام کر دلہا کی نمائندگی کی جبکہ سیرپور کے مہا پجاری نے بالمیر کے مہا پجاری کے ساتھ مل کر شادی کی رسومات ادا کیں۔

اور پھر جیہ، بیرن کا سارا لے کر چھلکتی آنکھوں کے ساتھ آخری بار بالمیر کے قلعے کی زنانہ راہداریوں سے گزری۔ وہ دونوں مہا پجاریوں کی آوازیں سن رہی تھیں جو اپنے اپنے بادشاہوں کے لئے تعریفی جملے ادا کر رہے تھے وہ اپنے بادشاہوں کا شجرہ پڑھ رہے تھے فاصلے کے باوجود جیہ کو سب کچھ سنائی دے رہا تھا۔ بالمیر کی سلطنت اتنی قدیم تھی کہ تاریخ اس کے آغاز کے بارے میں خاموش تھی، پھر بھی مہا پجاری نے اپنے حکمرانوں کی تین ہزار سالہ تاریخ دہرائی تھی۔

جیہ جب شادی کے منڈپ کے قریب پہنچی تو پجاری، ہندوستان کے اس واحد دریا سے شانتی مانگ رہے تھے جس کا نام کسی انسان کے نام پر رکھا گیا تھا یعنی.... دریائے برہم پترا.... جیہ، بالیر کے صحراؤں کو چھوڑ کر اسی دریائے برہم پترا کے ڈیلٹا میں واقع ایک اجنبی ریاست کو وداع ہو رہی تھی۔

دونوں پجاریوں نے جیہ کو تلوار کے ساتھ بٹھا دیا انہوں نے سرخ رنگ کا کپڑا تلوار کے دسے کے ساتھ باندھا اور اس کا دوسرا سرا جیہ کے نقاب سے باندھ دیا گیا سیرپور کا بزرگ تلوار کے عقب میں اساتوہ ہو گیا جبکہ پجاریوں نے قدیم سنسکرت میں شادی کے منتر اور اشلوک پڑھنے شروع کر دیئے جب چاولوں کی مٹھیاں پھینکی گئیں تو جیہ نے سر جھکا لیا تا کہ چاول اس کی آنکھوں کو نقصان نہ پہنچائیں وہ رو رہی تھی اور اس کے آنسو، شادی کے بھاری بھر کم جوڑے کو بھگو رہے تھے لیکن وہ اس کوشش میں تھی کہ گیلے رخساروں پر ہاتھ نہ پھیرے کیونکہ اس طرح اس کا میک اپ خراب ہو جاتا۔

بالیر کی سات شادی شدہ عورتیں آگے بڑھ آئیں وہ مختلف رسومات ادا کر رہی تھیں جن کا مطلب تھا کہ جیہ کو سہاگنوں کی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا جا رہا ہے اور دیوی جیہ کو دولت سے ہی نہیں عزت اور اولاد سے بھی نوازے۔

سہاگنوں کی رسومات ختم ہوئیں تو سیرپور کے بزرگ نے پرنس پر تپ کی تلوار جیہ کے ہاتھوں پر رکھ دی۔ دو خادماؤں نے جیہ کو اٹھنے میں مدد دی اور پھر آگنی کے پھیرے شروع ہوئے۔ جیہ نے ہاتھوں میں تلوار تھام کر آگنی کے سات پھیرے مکمل کئے اس دوران جیہ ان منتروں کا جاپ کرتی رہی تھی جو پجاری پڑھتے رہے تھے۔

منڈپ سے زمین تک سات سیڑھیاں بنائی گئی تھیں تمام رسومات کی تکمیل کے بعد جیہ کو یہی سات سیڑھیاں اتر کر اپنی رولس رائس پر بیٹھ کر بالیر سے روانہ ہونا تھا۔ ہر سیڑھی کا منتر اور عہد الگ تھا بالیر کا راج گورو یہ منتر پڑھتا اور جیہ دھیمے لہجے میں اس کی تکرار کرتی۔

جیہ نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا اور سرگوشی میں بولی ”اگر میں غلطی پر ہوں تو میں صبح کے ستارے سے التجا کروں گی کہ وہ آئندہ کبھی نہ چمکے“ اس نے سر کو اٹھا کر دیکھا رات تمام ہو چکی تھی ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا لیکن صبح کا ستارہ اب بھی آسمان پر چمک رہا تھا۔

جیہ اگلی سیڑھی پر رکی ”اگر میں غلطی کر رہی ہوں تو میں سورج سے پرارتھنا کروں گی

”وہ آئندہ کبھی آسمان پر اپنی روشنیاں نہ نکھیرے۔“
تیسری سیڑھی پر اس کی آواز قدرے بلند اور غصے سے بھرپور تھی وہ اپنے لمبے پر خود
وہ حیران ہو گئی تھی ”اگر میں غلطی پر ہوں تو چاند سے کہوں گی کہ آئندہ کبھی سورج سے
ماہنی مانگ کر زمین پر اپنی چاندنی نہ نکھیرے۔“

نئے چاند کے بائیں جانب صبح کا ستارہ ہنوز روشن تھا جبکہ مشرقی افق پر لالی دکھائی دینے
لگی تھی سورج طلوع ہونے جا رہا تھا ”اگر میں غلطی پر ہوں تو سیاروں سے کہوں گی کہ وہ
سورج کے گرد گھومنا بند کر دیں۔“

جیہ نے اگلی سیڑھی پر قدم رکھا ”میں دنیا کی ساتوں ماؤں سے التجا کروں گی کہ اگر ان
کی نظر میں میرا یہ عمل غلط ہے تو وہ فوری طور پر مجھے روک دیں۔“
آخری سیڑھی پر قدم رکھنے سے پہلے وہ رکی اور زار و قطار رونے لگی۔
”دیوتا!“ بالمر کے راج گورو نے جیہ کو یاد دلایا جیہ نے بولنا چاہا لیکن اس کی آواز
سکیوں اور ہچکیوں میں دب کر رہ گئی۔

”بولو شہزادی!“ بوڑھے پجاری نے پھر سرگوشی کی ”اگر تم اب خاموش رہیں تو سیرپور
والے اسے اپنے لئے برا شگون تصور کریں گے۔“

جیہ نے ایک طویل سانس لی تاکہ اس کی ہچکیاں رک جائیں ”اے عظیم دیوتا!“ جیہ
نے سکیوں سے ملتی جلتی آواز میں کہا ”اگر تمہارے علم میں کوئی ایسی بات ہے جس کے
اثم مجھے یہ تعلق نہیں جوڑنا چاہئے تھا تو تم مجھے روک دو۔“

اب وہ زمین پر تھی لیکن اس کی شادی مکمل نہیں ہوئی تھی اس نے پرنس پر تپ کی
تکوار کو سختی سے بھینچ لیا اور اپنی ہچکیوں پر قابو پانے کی کوششیں کرنے لگی۔ اب اس کی اپنی
آواز اسے خود اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔

”اے دھرتی، تو ہم سب کی ماما ہے تو گزرے اور آنے والے سے کو جانتی ہے اگر تم
سمجھتی ہو کہ مجھے یہ شادی نہیں کرنی چاہئے تھی تو پھٹ جانا کہ میں تیرے دامن میں پناہ
مائل کر سکوں۔“

تا دیر جیہ اپنی جگہ ساکت کھڑی رہی، شاید اس انتظار میں کہ کوئی ماورائی عمل ظہور پذیر
ہو گا، زمین چٹنے لگی اور وہ اس میں سما جائے گی لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ ایک طرح کی مایوسی
کے عالم میں جیہ نے تکوار زمین پر رکھ دی اور نقاب سر کا کر تکوار کے دستے پر ہاتھ پکڑنے کے
لئے جھک گئی۔ انداز ایسا ہی تھا کہ وہ پرنس پر تپ کے قدموں پر ہاتھ ٹیک رہی ہے، جیسا کہ

مستقبل میں اسے کرنا تھا۔

سیرپور کے لوگوں کو تاریخی حوالوں اور ثبوت کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ سیرپور اٹام تھا کہ کرشن بھگوان کی لڑائی میں جن دو ریاستوں کا نام ملتا تھا ان میں سے ایک تری پورہ اور دوسری سیرپور تھی۔ سیرپور کے رہنے والوں کو یقین تھا کہ ان کی ریاست اتنی ہی پرانی ہے جتنا کہ ان کا مذہب، کوشش کے باوجود سیرپور کی صرف تین ہزار سالہ تاریخ دستیاب ہوئی تھی جسے دریائے برہم پڑا کے کنارے واقع کامنی مندر میں محفوظ کر دیا گیا تھا۔

سیرپور ریاست کوہ ہمالیہ کے دامن میں واقع تھی جبکہ اس کی سرحدیں چین سے لے کر تھیں اس کا قدیم دارالحکومت عظیم دریائے برہم پڑا کے بائیں کنارے پر پھیلا ہوا تھا۔ پور کے باشندے اس عظیم دریا سے ہمیشہ خوفزدہ رہتے تھے کیونکہ کبھی کبھار اس کا پانی سیرپور کی شمالی سرحدوں میں کناروں سے بہہ نکلتا تھا۔ سینکڑوں دیہات اس طوفانی دریا کی شورشِ سری کی نذر ہو جاتے تھے اور دارالحکومت میں دریا کے کنارے انسانی لاشوں سے اٹام کرتے تھے۔

ہر عشرے میں دریا کا طوفان تباہی مچاتا اور دارالحکومت کو تیس تیس دنوں کے لیے لیکن پور کے باشندے ہر بار کھنڈروں پر عظیم الشان عمارتیں تعمیر کر لیتے۔ مگر اس کے باوجود بات بھی سیرپور کے لئے ہی مشہور تھی کہ مہارانی کے پردہ پیلس میں مقیم بعض عورتوں نے آج تک تین مربع میل میں پھیلے ہوئے محل کا بیرونی دروازہ نہیں دیکھا۔

دریائے برہم پڑا میں آنے والے سیلابوں کے باوجود سیرپور زراعت اور معدنی اعتبار سے ایک امیر ترین ریاست تھی۔ چاول یہاں کی سب سے بڑی فصل تھی جسے دریا کے راتے کلکتہ بھیجا جاتا تھا جبکہ معدنیات میں ہیروں کی کانیں، سیرپور کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی تھیں۔ سیرپور کے عوام کا یہ کامل یقین تھا کہ سیرپور پر دیوی کی یہ مہربانیاں صرف کامنی مندر کے باعث ہیں۔

ہر صبح سیرپور کے باسیوں کی ایک بڑی تعداد شیوا بھگوان کی پوجا کے لئے کامنی مندر جاتی، جہاں شیوا اپنی دیوی کو بانہوں میں لئے شاید صدیوں سے کہتا تھا یہ لوگ بھیجن گئے جس میں بتایا جاتا کہ دیوی، اس رقص میں دیوتا کی تیزی کا ساتھ نہ دے پائی تھی۔ شیوا اس تیزی سے رقص کیا کہ اس کی بانہوں میں محو رقص دیوی کے جسم کے چھوٹے ٹکڑے گئے۔ دیوی کا بدن ہزاروں ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر زمین پر گرا یہ۔۔۔ ٹکڑے جہاں جہاں گرے وہاں وہاں دیوی کے مندر بنا دیئے گئے۔

کہا جاتا ہے کہ دیوی کے شکم کا زیریں حصہ سیرپور میں گرا تھا شاید اسی لئے ہر سال، مخصوص دنوں کے لئے دریائے برہم پترا کا صاف اور شفافا پانی سرخ اور گدلا ہو جایا کرتا

جیہ بالمیر سے سیرپور کے تمام راستے اپنے شوہر کی تلوار گھٹنوں پر سنبھالے رہی تھی۔ اس کی رولس رائس کی کھڑکیاں پھولوں کے ہاروں سے اٹی ہوئی تھیں لیکن پھولوں کے پھل میں اتنی جگہ ضرور تھی کہ وہ دارالحکومت کا نظارہ کر سکتی۔

پرانے شہر کی تنگ گلیوں میں اسے مذہب اور رنگوں کا عجیب امتزاج نظر آیا تھا کہیں مسیحی انسان لوگ بیٹھے جوتے مرمت کرنے میں مصروف تھے اور کہیں برطانوی ریزیدنسی کے والے وکیل اپنی دکانیں لگائے بیٹھے تھے۔ کئی جگہوں پر اسے نیم برہنہ قبائلی عورتیں بھی کھلی دی تھیں جو لمبے لمبے سگار فروخت کر رہی تھیں لیکن نئے شہر کی چوڑی اور مصورت شاہراہوں پر جیہ کو یورپی میم صاحبائیں کھلی کاروں میں بیٹھی ساتھ گھوڑوں پر سوار الیز سے خوش گہیوں میں مصروف ملی تھیں۔

سیرپور لاء کالج اور سیرپور یونیورسٹی کے قریب سے گزر کر پھولوں سے لدی پھندی کار ملی پولیس کی طرف بڑھی جو مہاراجہ کی رہائش گاہ اور بادشاہت سیرپور کا انتظامی مرکز تھا۔ جیہ دریائے کنارے پر مای گہیوں کی بہت سے کشتیاں لنگر انداز دکھائی دیں۔ یہ کشتیاں لہا سے محصلیاں اور کیکڑے پکڑتی تھیں جن کے لئے سیرپور، مشرق میں مشہور تھا۔

دریا کے دوسرے کنارے پر باغوں میں گھری ہوئی بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں۔ یہ رہائش گاہیں سیرپور کے دولت مند تاجروں کی تھیں۔ ان باغوں میں بیٹھ کر ہر موسم میں دریا کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔

کار، گیٹ پر استادہ محافظوں کے قریب سے گزر کر اس دیوار کی طرف بڑھی جو پردہ پولس کوٹی پولیس کے اندر واقع مختلف محلات سے جدا کرتی تھی۔

پردہ پولس کی آہنی رینگ پر ایلے سینن خواجہ سرا، جیہ کو مہارانی کے حضور لے جانے کے لئے تیار تھے۔ جیہ ان کے پیچھے پیچھے چلتی بلند و بالا چھتوں والے کمروں سے گزری جن میں بیڈ پانی سے بھرے ہوئے کنستروں کے اوپر بچھائے گئے تھے تاکہ سانپ بستروں پر نہ آسکیں۔ بالآخر اسے سیرپور کی شیردل مہارانی کے دربار روم کے دروازے تک پہنچا دیا گیا۔

بوڑھی ملکہ اتھائی تکلیف کے عالم میں اپنی گدی سے اٹھی اس نے سب سے پہلے جیہ کی نظر اتاری اور پھر اسے گلے سے لگا لیا۔ مہارانی نے جیہ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور بھاری

کنجیاں اس کے ہاتھ پر رکھ دیں۔

”یہ تمہارے شوہر کے محل اور میرے خزانے کی چابیاں ہیں، ہوا“ مہارانی نے آگاہ کیا۔

”جیہ نے مہارانی کو جھک کر سلام کیا۔ وہ قدم بوسی کے لئے آگے بڑھی لیکن نے اس کے دونوں شانے تمام لئے اور اپنے برابر بٹھالیا۔

”بے چارہ دکن“ صرف سات سال کا تھا جب اسے سیرپور کا مہاراجہ بننا پڑا“ مہاراجہ جیہ سے اپنے پوتوں کا تعارف کروانا شروع کیا، ”لیکن اس کے بچپن کے باوجود ریزیڈنٹ سرہنری کونزے کے اصرار پر اسے فوری طور پر تعلیم کے لئے انگلینڈ روانہ کیا پر تپ اس سے بھی چھوٹا تھا مگر اسے بھی ساتھ جانا پڑا۔“

بوڑھی عورت نے نسبتاً ایک سخت قسم کی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر جیہ کو دیکھا لیکن جب بھی لڑکے سیرپور واپس آتے میں محل کی نوجوان بیسواؤں سے کہتی کہ وہ اپنے ماحول اور انداز کے بارے میں آگاہ کریں۔“

جیہ ساکت بیٹھی رہی اور مہارانی اپنی تند آواز میں اسے بتاتی رہی کہ کس طرح و کی ایک نوخیز کلی کو چھٹیوں پر آئے ہوئے شہزادوں کو رچھانے کے لئے ان کی خواب میں بھیجتی رہی۔ شاید اسے یقین تھا کہ اس کے پوتے اپنی انگریزی روحوں کو ان لڑکیوں آغوش میں دفن کر دیں گے۔

آخر کار خامائیں، جیہ کو سنگ مرمر کی چوڑی چٹکی سیڑھیوں کے ذریعے اس کے نئے کو لے چلیں۔ جسے ویلز پیلس کہا جاتا تھا یہ محل دراصل شاہ ایڈورڈ ہفتم کی رہائش گاہ طور پر تعمیر کیا گیا تھا جب اس نے پرنس آف ویلز کی حیثیت سے سیرپور کا دورہ کیا تھا اس کی تعمیر میں وکٹورین ریلوے اسٹائل کا بطور خاص خیال رکھا گیا تھا تاکہ فن تعمیر سے انگریزوں سے ہندوستانیوں کی محبت کا اظہار ہو سکے۔

پرنس پر تپ نے سیرپور پر انگریزوں کی امنٹ چھاپ کے اظہار کے طور پر اپنے کی دیواروں پر جا بجا قد آدم آئینے لگا رکھے تھے جن پر نیم عریاں عورتوں کی تصاویر چھپیں لیکن جب مودب خادموں نے ماربل کے فرش اور یورپین فرنیچر سے آراستہ نجی کے دروازے کھولے تو جیہ کو اپنی خواب گاہ کی بالکونی سے شی پیلس کے عقب میں کاہنی مندر کا بلند و بالا کلس دکھائی دیا تھا۔

اسی شام سیرپور کے حکمران نے شی پیلس کے دربار ہال میں جیہ کا سرکاری استقبال

میرپور کے وزراء نے جیہ کو استقبالیہ تحائف پیش کئے تو مہاراجہ وکٹر اپنی بھالی کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ شاید اسے جیہ کی تنہائی کا احساس ہو رہا تھا البتہ جیہ کو اس کی مسکراہٹ میں ایک عجیب طرح کی نرمی اور نکلان محسوس ہوئی تھی۔

تقریبات کے اختتام پر اس نے اس دن کی یادگار کے طور پر جیہ سے ایک تصویر بنوانے کی فرمائش کی۔ وہ اس کے ساتھ ایک پرائیویٹ اسٹڈی میں گئی جہاں آرام دہ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں جبکہ دیواروں پر ریس جیتنے والے گھوڑوں کی تصاویر آویزاں تھیں۔

”میں پاگل پن کی حد تک فلموں کا دلدادہ ہوں“ مہاراجہ وکٹر نے فونو گرافر کی کیونپی کے عقب میں کھڑے ہو کر جیہ کو آگاہ کیا ”کیا تمہیں بھی سینما پسند ہے، شہزادی؟“

”ہاں، حکم!“ جیہ نے جواب دیا۔ ”ہمارے والد بھی ایک فلم بالمر لائے تھے۔ فلم کرشن بھگوان کے بارے میں تھی ہم نے اسے کئی بار دیکھا تھا۔“

خوبصورت سرخاکی کپڑے کے عقب سے برآمد ہوا۔ سوئی ہوئی آنکھوں میں تعجب کی لکیر تھی ”میرا مطلب اصل فلموں سے ہے“ مہاراجہ وکٹر بولا ”حقیقی فلم اشاروں کے ساتھ“ جیسے میری پکفورڈ، ڈکلس، فیز، بنکس یا کورابارٹ...“ سردوبارہ کپڑے کے عقب میں غائب ہو گیا پھر ایک چمک پیدا ہوئی اور فضا میں دھواں سا بھر گیا۔

اس نے مطمئن انداز میں پلیٹ، کیرے سے نکال لی ”تم پر تپ کے بغیر یقینی طور پر تنہائی محسوس کرو گی، شہزادی“ اس کی آواز میں ہمدردی تھی ”اپنا نقاب ہمیں چھوڑ دو، آؤ میرے پرائیویٹ سینما میں فلم دیکھتے ہیں۔“

”وہ جیہ کو اسکریننگ روم میں لے گیا جو یورپی باشندوں سے کھپا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اپنے سہاگ کے جوڑے میں خود کو مضحکہ خیز اور بے ڈھنگا تصور کرتے ہوئے وہ سکڑی سمٹی ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ وہ ڈر کے مارے اپنے ہاتھوں کو بھی حرکت نہیں دے رہی تھی کیونکہ اس صورت میں شادی کی بھاری چوڑیاں شور مچانا شروع کر دیتیں اس نے گرد و پیش پر نگاہ ڈالی یورپین، مہاراجہ سے یورپ میں ہونے والے پولو میچوں اور پارٹیوں کے بارے میں بات چیت کر رہے تھے۔

ایک میم صاحب جس کے موٹے اسٹرپ اس کے ایوننگ ڈریس میں سے سفید چمڑی میں دھنسنے کی کوشش کر رہے تھے نے جیہ کو باتوں میں لگانا چاہا۔ میم جانے کیا بک بک کر رہی تھی لیکن جیہ کو اس کا ایک لفظ بھی سمجھ میں نہ آیا تھا، البتہ اس نے مسکرا کر میم کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ وہ سب کچھ جانتی ہے۔ ممکن ہے میم کچھ اور بھی کہتی لیکن

اسی وقت روشنیاں گل ہو گئیں اور جیہ نے بھگوان کا شکر ادا کیا۔
 اسکرین پر نقل و حرکت کے ساتھ ساتھ یورپینز کے تبصرے بھی شروع ہو گئے۔
 ”تم کس قدر رومانٹک ہو وکٹر!“ وہ لوگ مہاراجہ کو بے تکلفی سے مخاطب کر رہے
 تھے۔ ”کوئی بھی ان فلموں کو زیادہ نہیں دیکھ سکتا۔“
 ”یہ تو کورا ہارٹ ہے، ہم اسے جانتے ہیں۔“
 ”یہ واقعی دنیا کی سب سے بری اداکارہ ہے۔“

مہاراجہ کو ان تبصروں کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ اپنی نشست پر آگے کو جھکا ہوا بے
 قراری سے کوراکے نشیب و فراز کا جائزہ لے رہا تھا۔ جیہ کو بے اختیار اپنے محل کی وہ
 بیسوائس یاد آگئی تھیں جنہوں نے اسے نسوانی جسم کے اسرار و رموز بتائے تھے۔

جیہ نے خود کو ایک بیوی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک دلہن کی حیثیت سے زندہ رکھنے
 کے لئے اپنی زندگی کے اہم واقعات کو ایک البم میں سجایا تھا جس کے سیاہ صفحات پر کہیں
 کہیں پرنس پر تپ کی بھجوائی ہوئی تصاویر بھی تھیں۔

اس کے شوہر نے اپنی چھوٹی بہن کو متعدد خطوط لکھے تھے بعض خطوط فرانس سے آئے
 تھے جہاں اس نے مہاراجہ بیکانیر کے اے ڈی سی کی حیثیت سے جنگ عظیم کے خاتمے کے
 لئے ہونے والے معاہدہ وریلز پر دستخطوں کی تقریب میں شرکت کی تھی۔ چند نوٹس سوئٹزر
 لینڈ سے لکھے گئے تھے۔ وہاں بھی اس نے مہاراجہ بیکانیر کے اے ڈی سی کی حیثیت سے لیگ
 آف نیشنز کے افتتاحی اجلاس میں شرکت کی تھی۔ جیہ نے ان خطوط میں اپنی شادی کے
 بارے میں کوئی جملہ تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن اسے ناکامی ہوئی۔

اس کے اپنے دن شادی کی تقریبات میں گزر رہے تھے۔ ایک روز اسے سلطنت کے
 وزیر اعظم اور برٹش ریزیڈنٹ کی موجودگی میں چاندی میں تولا گیا۔ وہ آلتی پالتی مار کر لوہے
 کے ایک بڑے کانٹے کے ایک پلڑے میں بیٹھ گئی جبکہ ملازمین نے دوسرے پلڑے میں
 چاندی کے سکے ڈال دیئے۔ یہ سکے بعد ازاں غریبوں میں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیئے
 گئے۔

اسی تقریب میں جیہ کی ملاقات ان دو افراد سے ہوئی تھی جنہوں نے اپنی زندگیاں سیر
 پور کے نام کر دی تھیں اور سیرپور کے لئے خدمات کے اعتراف کے طور پر برطانوی حکومت
 نے انہیں سر کے خطاب سے نوازا تھا۔

ان میں سے ایک سر اکبر تھے، سلطنت سیرپور کے وزیر اعظم۔ وہ سونے کے دستے والی

پھڑی تھامے باوقار انداز میں وہاں موجود تھے۔ اس کے ساتھ سرہنری کوزے تھا جس کا سر گنجا لیکن آنکھوں سے ذہانت ٹپک رہی تھی۔ جیہ کو دونوں بے حد پسند آئے تھے۔ یہی وہ برطانوی ریزیڈنٹ تھا جس نے دو نابالغ بچوں کو سات سمندر پار بھیجنے کا اہم ترین فیصلہ کیا تھا اور وہ اپنے فیصلے پر کبھی شرمندہ نہ تھا۔

چند دن بعد سیر پور کے تعلیم یافتہ طبقے کی چند عورتیں جیہ سے ملنے آئیں۔ جیہ نے ویلز کے پبلش کے سفید ڈرائنگ روم میں ان کا استقبال کیا تھا۔

”آپ جانتی ہوں گی حکم! کامنی مندر کا نام محبت کے دیوتا، کام دیوتا پر رکھا گیا ہے۔“ ان میں سے ایک عورت نے بات شروع کی۔

”اور آپ کے شوہر ہاؤس آف سیر پور کے شہزادے ہیں۔“ دوسری نے لقمہ دیا۔ ”اس اعتبار سے وہ مندر کے ضامن بھی ہیں۔“

سر جھکا کر قالین کو دیکھتی ہوئی جیہ اپنے شوہر کی حکومت کی ان فیشن ایبل خواتین کو دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو گئی۔

”آپ کے حقوق زوجیت ادا کرنا، آپ کے شوہر کی پوجا ہے، حکم!“ ایک عورت نے لب کشائی کی۔

”بہت سے شوہر، پرنس پر تپ کی شجاعت اور جواں مردی کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں، کیونکہ ان کی بیویاں ان سے باغی ہو گئی ہیں۔“

عورتیں اس بات سے قطعی بے خبر تھیں کہ ان کی باتوں نے جیہ کے ذہن میں کیا آگ بھری ہے۔ وہ ہاتھی دانت کے سگریٹ ہولڈروں میں سگریٹ سلگائے، شراب کے گلاس فضا میں لہراتی جیہ کو یہ یقین دلانے کی کوششوں میں مصروف تھیں کہ اس کا شوہر کوئی عام آدمی نہیں۔

جیہ کے دن تو جیسے تیسے گزر جاتے لیکن شامیں ہمیشہ اسی لے کر آتیں۔ وہ اپنے شوہر کے بغیر خود کو ادھورا سمجھنے لگی تھی۔ دن، ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے گئے لیکن پرنس پر تپ واپس نہیں آیا۔ اس عرصے میں مہاراجہ وکٹر ہر ممکن طریقے سے اس کی دل جوئی کرتا رہا۔ وہ اکثر اسے پولو گراؤنڈ بلا لیتا۔ صبح کے وقت جب وہ دونوں گھڑ سواری کے لئے نکلتے تو وہ عموماً اس درد کا ذکر ضرور کرتا جو محبوب کی دوری کے باعث برداشت کرنا پڑتا ہے۔

اس کے دل میں جیہ کے لئے بے پایاں ہمدردی تھی۔ وہ اپنے عوام کے ساتھ بھی نہایت محبت سے پیش آتا تھا۔ اسی لئے جیہ اسے ایک کامیاب حکمران تصور کرتی تھی۔

سیرپور میں جیہ کی آمد کے ایک سال بعد بارشوں اور سیلاب کا موسم ختم ہو گیا اور عوام نے تباہ ہونے والی عمارتیں از سر نو تعمیر کرنی شروع کر دیں۔ بازاروں میں ہجوم بڑھ گیا۔ ان میں سے بیشتر لوگ کامنی مندر میں جلانے کے لئے چراغ خریدنے کے لئے بازار آتے تھے۔

جیہ بھی، مہارانی کے ہمراہ چراغ جلانے کامنی مندر گئی اور بہت سی دعائیں سمیٹ کر لائی۔ لوگ جوق در جوق اپنے ہر دل عزیز شہزادے کی بیوی کی ایک جھلک دیکھنے کو جمع ہو گئے تھے۔

اور پھر حتمی طور پر پرنس پر تپ کی سیرپور واپسی کی اطلاع ملی تو جیہ کی شادی کو دو سال ہو چکے تھے اور اخبارات شاہ برطانیہ کی ان اصلاحات سے بھرے ہوئے تھے جن کا اعلان شادی کے سال کیا گیا تھا۔

کئی ہفتوں تک یہ افواہ زیر گردش رہی کہ نوجوان پرنس آف ویلز، شاہ برطانیہ کے وعدے پر قائم کی جانے والی اسمبلیوں کے افتتاح کے لئے ہندوستان آئے گا، لیکن بعد میں پروگرام کو منسوخ کر دیا گیا کیونکہ برطانویوں نے ہندوستانیوں کو اصل اختیارات نہیں دیئے تھے اور پرنس آف ویلز کے دورے کے موقع پر پر تشدد ہنگاموں کا امکان تھا۔ اس کے بجائے فیصلہ کیا گیا کہ شاہ انکل ڈیوک آف کنٹ اسمبلیوں اور چیمبر آف پر نر کے افتتاح کے لئے ہندوستان کے دورے پر آئے گا۔

جب جیہ کو بتایا گیا کہ اس کے شوہر کی ٹرین سیرپور کی جانب روانہ ہو چکی ہے تو اس نے اپنے شوہر کا خیر مقدم کرنے کے لئے ایک بار پھر اپنے سہاگ کا جوڑا زیب تن کر لیا۔ جب خداموں نے اسے آگاہ کیا کہ سفید ڈرائنگ روم میں کوئی اس کا منتظر ہے تو وہ سنگ مرمر کی سیڑھیوں سے تقریباً بھاگتی ہوئی نیچے اتری لیکن وہاں اس کے شوہر کے بجائے سر اکبر، وزیر اعظم سیرپور اس کا منتظر تھا۔

”پرنس پر تپ کو شئی پیل میں روک لیا گیا ہے، شہزادی!“ وزیر اعظم کی کوڑے برساتی آواز اسے سنائی دی۔ ”وہ کل دوپہر کا کھانا آپ کے ساتھ کھائیں گے۔“ جیہ نے بالوں میں پنپے ہوئے گجرے توڑ دیئے اور ان کے پھولوں کو پیروں تلے چلاتی ہوئی اپنی خواب گاہ میں چلی گئی۔

وسیع و عریض بیڈ پر لیٹ کر اس نے وہ البم کھول لی جس کے ذریعے وہ اپنے شوہر کی غیر حاضری میں اسے پہچاننے اور سمجھنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ وہ ایک تصویر پر ٹھہر گئی۔

پرنس پر تپ ایک ہوائی جہاز کے کاک پٹ سے ہوا میں ہاتھ لہرا رہا تھا۔ ہیلٹ اس کے سر پر تھا جبکہ بھاری گاگڑ ہیلٹ کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ جیہ کو اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں وہ خوشی نظر آئی تھی جو کسی اور تصویر میں نہیں تھی۔ اچانک ہی جیہ کو احساس ہوا کہ پرنس پر تپ اس شادی کو پسند نہیں کرے گا۔

وہ سارا دن اپنی خواب گاہ میں بند رہی اور یہ سوچ سوچ کر روتی رہی کہ پرنس پر تپ نے اپنی پہلی رات اپنی نوبیا بتا کے ساتھ گزارنے کے بجائے پرنس وکٹر اور اس کے مہمانوں کے ہمراہ سٹی پیلس میں گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔ خادماں دستک دے کر اندر داخل ہوئیں تو اس نے سر کیلے میں چھپا لیا تاکہ اس کے آنسو انہیں دکھائی نہ دیں۔ اس نے تمام دن کچھ نہیں کھلایا تھا اور اب بھی خادموں کے لائے ہوئے کھانے کو ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اٹھ کر بالکنی میں آگئی۔ شام کا ملگجاپن تاریکی میں تبدیل ہو رہا تھا۔ سیرپور میں رات جلد اترتی تھی۔ دریا کا دوسرا کنارہ دکھائی نہیں دے رہا تھا، البتہ جا بجا لائینوں کی روشنیاں دکھائی دینے لگی تھیں۔

سٹی پیلس کے دروازوں پر نصب لیپ بھی روشن کر دیئے گئے تھے۔ وزیر اعظم نے اسے بتایا تھا کہ جنگ عظیم کے دوران رائل ائرفورس میں شریک ہونے والا واحد ہندوستانی ایک سکھ پائلٹ اور دو یورپی باشندے بھی شہزادے کے ہمراہ سیرپور آئے تھے۔ سر اکبر نے ان خوبصورت عورتوں کا تذکرہ نہیں کیا تھا جو ان کے ساتھ تھیں، لیکن جیہ جانتی تھی کہ وہ بھی اس وقت سٹی پیلس میں موجود ہیں۔

سٹی پیلس ہمیشہ غیر ملکی مہمانوں سے بھرا رہتا تھا۔ خود جیہ نے بہت سی خوبصورت لڑکیوں کو سٹی پیلس میں قیام پذیر دیکھا تھا۔ وہ ایسے بے وقوف امیر زادوں سے بھی ملی تھی جو سیر و شکار کے لئے سیرپور آئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

مہاراج کے اپارٹمنٹس سے ایک کار کا ہارن سنائی دیا۔ اور کئی مترنم قہقہے فضا میں بکھر گئے۔ جیہ نے غصے کے اظہار کے طور پر اپنے لمبے بالوں کو ایک جھٹکا دیا۔ بغیر دیکھے وہ جان گئی تھی کہ اس کا شوہر سفید چمڑی والی عورتوں میں گھرا اپنی اس بیوی کا مضحکہ اڑا رہا ہو گا، جسے اس نے اب تک دیکھا بھی نہیں تھا۔

جیہ نے وہ رات آنکھوں میں کٹ دی۔ کبھی اسے محسوس ہوتا کہ وہ کائنات کے بستر پر لیٹی ہے اور کبھی یوں لگا کہ وہ اپنے شوہر کی بانہوں میں ہے اور اسکے ہاتھ اپنی بیوی کا بدن سلرا رہے ہیں۔

اسی گوگو میں صبح ہو گئی۔ خادائیں ایک بار پھر اسے دلہن بنانے آگئی تھیں۔ انہوں نے تازہ ہندی سے جیہ کی ہتھیلیاں اور پاؤں رنگیں کر دیئے اور پھر اسے نقاب اوڑھا دی گئی۔ جیہ کی ذاتی خادمہ چاندنی نے سرخ ریشمی کپڑے کا وہ مستطیل ٹکڑا جیہ کے حوالے کر دیا جو دو سال تک پرنس پر تپ کی تصویر کے سامنے بچھا رہا تھا۔ اس کے اندر وہ سونے کا سکہ لپٹا ہوا تھا جسے جیہ نے اپنے شوہر کے پیروں پر رکھا تھا۔

خادائیں اسے سیرپور کے حکمرانوں کی قد آور تصاویر کے قریب سے گزار کر اسے سفید ڈرائنگ روم میں لے گئیں جہاں وہ کل سرائبر سے ملی تھی۔ آتش دان کے اوپر لگے آئینوں میں اسے ڈرائنگ روم کی ہر سفید شے کے درمیان اپنے سرخ رنگ کے کپڑے عجیب سے لگ رہے تھے۔

تب ہی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی اور وہ جلدی سے پلٹ پڑی۔

اپنے نقاب کی اوٹ سے اس نے ایک طویل قامت کو مغربی کپڑوں میں ملبوس ایک ملازم کو ہدایت دیتے دیکھا۔ اس کی رنگت گندمی اور جڑے ابھرے ہوئے تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے سگریٹ سے اٹھنے والے دھوئیں کی وجہ سے نصف بند تھیں۔ دوسرے ہاتھ میں سگریٹ کا پیکٹ جبکہ پیروں میں گھڑ سواری کے جوتے تھے۔ اس کے عقب میں جیہ کو الیشن بھی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ہلکے سے غرایا تو اس نے سگریٹ کا ٹن ہی کتے کو دے مارا اور وہ دھیمے سروں میں غراتا ہوا فرش پر بیٹھ گیا۔

دروازہ بند ہو گیا۔ جیہ نے جب اسے اپنی جانب آتے محسوس کیا تو خون جیسے اس کی کنپٹیوں سے ٹکرانے لگا۔ لیکن وہ کمرے کے وسط میں رک گیا۔ اس نے سگریٹ کی راہ گمرے سبز قالین پر جھاڑی تو کچھ راہ اس کے چپکتے ہوئے بوٹوں پر بھی آگری۔ جب اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تو جیہ کا جی چلا کہ وہ خود اس فاصلے کو مٹا ڈالے۔

پھر اس نے ایسا ہی کیا۔ ڈرائنگ روم اس کی چوڑیوں کی کھنک سے گونج اٹھا۔ جیہ نے ریشمی کپڑے میں لپٹا ہوا طلائی سکہ نکالا اور اپنے پسینے میں نہائے ہوئے بدن کے ساتھ سکہ اپنے شوہر کے قدموں میں رکھنے کے لئے نیچے جھک گئی۔

جیہ نے نقاب کے کونوں سے برہنہ کلائیوں کو حرکت کرتے دیکھا۔ ہاتھ اس کی طرف بڑھے تو اس کی سانس رک گئی۔ وہ کپکپاتے ہوئے یہ سوچ رہی تھی کہ سہاگ کی رسمیں کیا اس ڈرائنگ روم کے قالین پر ادا کی جائیں گی، کیا بیڈ روم.... پولو کے کھلاڑی کی لابی انگلیاں جیہ کی کمر کی جانب بڑھیں اور انہوں نے نقاب تھام لی۔ جو خنی ان مضبوط ہاتھوں نے

جیہ کی نقاب اتار کر زمین پر گرائی، اس کے نتھنے پر فیوم کی تیز خوشبو سے مکھ اٹھے۔ جیہ نے سر اٹھایا تاکہ اس کا دولہا وہ صراحی دار گردن دیکھ سکے جس کے بارے میں اکثر کوکی بائی کہا کرتی تھی کہ بہت خوبصورت ہے۔ پرنس پر تپ نے باقاعدہ چاروں طرف گھوم کر اس کا جائزہ لیا۔ جیہ کو اس کی نگاہیں اپنے بدن میں چبھتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ ایک خوابیدہ آواز نے خاموشی کا پردہ چاک کر دیا۔ ”مجھے ڈر ہے کہ یہ سب نہیں چلے گا، شہزادی۔“ وہ ایک سیکنڈ رک کر دوبارہ گویا ہوا۔ ”تمہیں یہ نہیں کرنا چاہیے!“

”حکم!“

”اپنے ہاتھوں اور پیروں کو صاف کر ڈالو اور ان کر مس ڈیکوریٹرز سے بھی باہر نکلو۔“ اس نے ٹن سے نئی سگریٹ نکالی اور دانتوں میں دبانے سے قبل پیکٹ کو اس سے بچایا۔ ”لنچ تک میں بہتری دیکھنا چاہتا ہوں۔“ اسے مڑتے دیکھ کر دروازے کے قریب بیٹھا ہوا الیشن اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پر تپ کے پیچھے پیچھے وہ بھی ڈرائنگ روم سے باہر نکل گیا تھا۔

لیموں کے پانی سے ہاتھ اور پاؤں صاف کرنے میں جیہ کو تاخیر ہو گئی۔ اسے کئی منٹ پہلے لنچ پر پہنچ جانا چاہئے تھا۔ جب وہ اس ڈرائنگ ہال میں داخل ہوئی جسے پرنس پر تپ کی عدم موجودگی میں استعمال نہیں کیا جاتا تھا تو شیشے کی میز سے گرد پوش ہٹائے جا چکے تھے۔ اور اس کے وسط میں ایک طلائی گلدان میں مور کے خوبصورت پر سجائے جا چکے تھے۔ پرنس پر تپ اپنی مخصوص کرسی پر تھا، جبکہ اس کے عقب میں ایک موٹا تازہ یورپین، استادہ تھا۔ جیہ نے جلدی سے اپنے میک اپ سے عاری چہرے پر نقاب گرائی۔

”نقاب اتار دو شہزادی!“ پر تپ کی خوابیدہ آواز کمرے میں گونجی۔ ”مائیکل میرا ذاتی ملازم ہے۔ براہ کرم اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرو جیسا تم میری دادی کے خواجہ سراؤں کے ساتھ کرتی ہو۔“

جیہ نے جھکتے ہوئے نقاب اتار دی۔ اسے فرانسیسی کے چہرے پر عجیب طرح کے کرب کے آثار نظر آئے تھے۔

”تمہارے کپڑے پہلے سے کہیں زیادہ بہتر ہیں۔“ پر تپ نے ناقدانہ نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔ ”لیکن سیرپور میں ہماری عورتیں ساڑھی پہنتی ہیں۔ براہ کرم ویسا ہی کرو۔۔۔ اور ہاں، تم جانتی ہو کہ چمچے اور کانٹے سے کیسے کھایا جاتا ہے؟“

جیہ نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ مطمئن انداز میں مسکرا دیا۔ اس نے ان طلائی پلیٹوں

کی طرف اشارہ کیا جن میں شراب کے گلاس اور دیگر کٹری رکھی تھی۔

دروازے پر آہٹ ہوئی اور دستانے پہنے ہوئے ملازم سوپ کے پیالے لئے اندر داخل ہوئے۔ جیہ کو شفاف براؤن رنگ کے سوپ میں گوشت کے قتلے دیکھ کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔

”ہمارا تعلق ہندوستان کی قدیم ترین بادشاہت سے ہے شنزادی!“ پرتاپ نے اپنی بیوی کی حیرت کو محسوس کر لیا تھا۔ ”اب تک ہماری حکمرانی کو تین ہزار گیارہ سال بیت چکے ہیں۔ کیا یہ پسند آیا کہ ہم تمہیں گوشت سرو کر رہے ہیں؟“

وہ ملازموں کے باہر جانے تک خاموش رہا اور پھر شیشے کی میز پر آگے جھک گیا۔ ”دوسری جانب“ جب میں نے پہلی بار انگلینڈ کی یونیورسٹی میں گوشت کھانے کی کوشش کی تو بیمار پڑ گیا تھا۔“ وہ اس کے تاثرات پر تہقہ لگائے بغیر نہ رہ سکا۔ ”میں دیکھ رہا ہوں کہ میں نے تمہارے مذہبی جذبات کو بری طرح مجروح کیا ہے شنزادی۔ ذرا سوچو کہ اگر میں آج رات تمہاری خواب گاہ میں آکر اپنے حق زوجیت کا مطالبہ کروں تو کیا تم پلید نہیں ہو جاؤ گی۔ کیا بھیا تک صورت حال ہے؟“

جیہ اپنے چہرے کو شرم سے گلزار ہونے سے روک نہیں سکی تھی۔ پرنس پرتاپ نے تیورریاں چڑھائیں۔ ”لیکن یقین رکھو شنزادی، میں کامنی مندر میں ہستسم کے بغیر تمہیں چھوٹنے کی کوشش بھی نہیں کروں گا۔“

جیہ نے پہلی بار براہ راست نظریں اٹھا کر اپنے شوہر کو دیکھا۔ پرنس پرتاپ کا چہرہ اب بھی سپاٹ تھا۔ ”شادی ایک دوسرے کو سمجھنے کا نام ہے جیہ دیوی، ممکن ہے بچوں کی ضرورت بھی کبھی سر اٹھائے، اس لئے مجھے یقین ہے کہ ہم دونوں اپنا اپنا فرض ادا کریں گے لیکن تب تک....“

ایک ملازم کھانے کے لوازمات لے کر اندر داخل ہوا تو وہ خاموش ہو کر سوپ سے مصروف ہو گیا۔ جیہ اس عرصے میں کلنٹے اور چھری کا نہایت مہارت کے ساتھ استعمال کرنے کی کوششوں میں مصروف تھی۔

”بائی دا وے، تم کون کون سی زبانیں بول سکتی ہو، شنزادی؟“ وہ مسلسل بولے جا رہا تھا۔ اسے جیہ کی بیزاری کی کوئی پروا نہ تھی۔

”فرنج؟“ جیہ خاموش رہی تو وہ خود ہی بول اٹھا۔ اس کی آواز سے بوریت عیاں تھی۔

”اطالوی؟ ہسپانوی؟“

جیہ کے پیٹ میں گرہیں پڑنے لگیں۔ مسز رائے نے کہا تھا کہ اس کی انگریزی بہترین ہے۔ وہ قدیم سنسکرت سمیت چار ہندوستانی زبانیں لکھ اور پڑھ سکتی تھی۔ اپنے شوہر کو حیران کرنے کی غرض سے اس نے سیرپوری زبان بھی سیکھ لی تھی اور اب رولٹی سے اسے بولتی بھی تھی۔ لیکن یہ اجنبی اس کی ان کامیابیوں میں ذرہ برابر دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ اس نے شرم کے مارے گردن جھکائی تو دو موٹے موٹے آنسو ہاتھوں پر آگرے۔

پرنس پر تپ نے ایک گرمی سانس لی۔ ”یہ صرف شہری آداب کا تقاضہ نہیں ہے شہزادی، سیاست کا کھیل ہے۔“ وہ بولا۔ ”اس کے باوجود کہ میرا بھائی مرنے کی حد تک برطانوی بادشاہت کا وفادار ہے، ان کے افسران کا خیال ہے کہ وہ لالہلی ہے اور ریاست کی آمدنی قلمی اداکاروں پر لٹانے میں مصروف ہے۔“

اس نے اپنی لائبی لائبی انگلیاں میز پر رکھے ایک پیالے میں ڈالیں اور ایک چھوٹی سی دریائی مچھلی اٹھا کر سالم نگل گیا۔ جیہ کو اس کے اس فعل سے گھن سی آئی تھی۔

”یہ بد قسمتی نہیں تو اور کیا ہے کہ جب برطانوی راج سیرپور کے مہاراجہ کو ناپسند کر سکتا ہے تو اس کے چھوٹے بھائی کو بھی کر سکتا ہے جسے ہندوستانی اخبارات ویسے ہی ایک غیر ذمے دار پلے بوائے قرار دیتے ہیں۔ بادشاہت نے مجھے ہندوستان میں قیام کرنے کی ہدایت کی ہے۔ اب اگر دوبارہ بیرون ملک جانے کی اجازت دی گئی تو ایک بیوی کا میرے ساتھ جانا ضروری ہو گا۔ اس لئے میں اس شادی پر رضامند ہوا تھا۔ اور اب ہم دونوں میاں بیٹھے ہیں، جیہ دیوی! لیکن تم بیٹر کھا سکتی ہو نہ ساڑھی پہن سکتی ہو۔ تمہیں کوئی زبان بھی نہیں آتی۔ سو تمہارے ذریعے میں بادشاہت کو ذرا بھی متاثر نہیں کر سکتا، جس نے مجھے اس شادی پر مجبور کیا ہے۔“

وہ کرسی گھسیٹ کر اٹھا تو جیہ نے اس کی تقلید کی۔ دونوں مشرقی برآمدے میں آگئے تھے۔ فرانسیسی ملازم نے اپنے آقا کے لئے برائڈی کا ایک بڑا سا جام بنایا تو جیہ نے نفرتی پاندان کھول لیا۔ اسے امید تھی کہ اس کا شوہر کم از کم اس روایتی شے پر اعتراض نہیں کرے گا۔ پرنس پر تپ برائڈی کے گلاس کے اوپر سے اسے پان تیار کرتے دیکھتا رہا لیکن جونہی وہ پان منہ میں رکھنے لگی، وہ بول اٹھا۔

”پرنس آف ویلز اس سال کے آخر میں جب سیرپور آئے گا تو ہماری سرکار میزبان ہو گی۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہزار لاکھ ہائی نیس کسی ایسی عورت کے برابر بیٹھ کر کھانا کھائے گا جس کے دانت پان کی پیک سے رنگے ہوئے ہوں۔“

یہ نے نہایت فرمانبرداری سے گھوری واپس پاندان میں رکھ دی لیکن اسے اپنے غصے پر قابو پانے کے لئے خاصی جدوجہد کرنی پڑی تھی۔

”میں اور وکٹر چیمر آف پر نرنگی افتتاحی تقریب میں شرکت کے لئے دہلی جا رہے ہیں، لیکن تم ہمارے ساتھ نہیں جا سکو گی۔“ اس کے چہرے پر طعنے تھا۔ ”تم ابھی تک ایک نا تراشیدہ ہیرا ہو، شہزادی۔ اگر تم بہت زیادہ محنت کرو تو اگلے سال یعنی پرنس آف ویلز کی آمد تک پیش کئے جانے کے قابل ہو سکتی ہو۔“

جیہ اپنے لہجے کی بغاوت پر قابو نہیں پاسکی تھی۔ ”ہم نے بھی بالمیرہ میں آخری پرنس آف ویلز کو خوش آمدید کہا تھا۔ حکم! صرف وہی نہیں قیصر جرمنی کا بیٹا اور زار روس بھی بالمیرہ کا دورہ کر چکے ہیں۔“

پرنس پر تپ اس کے حوصلے کے پہلے اظہار پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ ”یہ تمہاری پیدائش سے پہلے کی باتیں ہیں شہزادی لیکن تم فکر نہ کرو، میں ایک نہایت قابل احترام ہندوستانی خاتون کو جانتا ہوں جس کا تعلق بمبئی سے ہے۔ وہ تمہیں مغربی آداب اور طور طریقے سکھائے گی۔ جب تک میں اور مہاراجہ وکٹر دہلی میں رہیں گے میں اسے تمہارے ساتھ یہاں رہنے کے لئے بلوا بھیجوں گا۔“

جونہی رولس رائس رکی، کتے تیر کی طرح کار سے نکلے اور ان خادموں کی طرف لپکے جو ویلز پبلس کے پورچ میں جیہ کے عقب میں کھڑی تھیں۔

”چینٹل!“ کار میں سے ایک تھکمانہ لہجہ آواز کی صورت سنائی دیا۔ ”ان بے وقوفوں کو پکڑنا۔“

ایک فرانسیسی لڑکی کار سے نکل کر کتوں کے پیچھے بھاگی جو لان کی طرف نکل گئے تھے۔ جیہ کار کی طرف متوجہ تھی۔ دروازہ کھلنے پر سب سے پہلے اونچی ایڑی کا ایک جوتا نمودار ہوا جس نے ذرا بعد ریشمی اشاکنگ میں خوبصورت ٹانگ نظر آئی۔ اس کے اوپر ایک نازک ہاتھ میں اتنا لمبا سگریٹ ہولڈر تھا کہ جیہ نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ جیہ کی نظریں پھسل کر، ہم کے دوسرے حصوں کا جائزہ لینے لگیں۔ ان میں سے ہر حصہ اپنی مثال آپ تھا۔ یہی لیڈی مودی تھی، جو اب کار سے اتر آئی تھی۔ اس کی دودھیا رنگت سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی۔

اپنے دستانے پہنے ہوئے ہاتھوں میں پارسل تھامے ہوئے لیڈی مودی ٹک ٹک کرتی سنگ مرمر کی سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔

”ڈارلنگ چائلڈ!“ اس کی مخاطب یقینی طور پر جیہ تھی۔ ”میرے ان بد معاش کتوں کو معاف کر دیتا۔ طویل سفر کے بعد یہ اسی طرح پاگل ہو جاتے ہیں۔“ اس نے اپنا ایک دودھیا رخسار جیہ کے گل سے لگا دیا۔ ”کیا بار حسب معمول مشرقی برآمدے میں لگایا گیا ہے؟“

جواب کا انتظار کئے بغیر لیڈی مودی سر جھکائے کھڑی خادماؤں کے قریب سے گزرتی ہوئی ان راہداریوں میں داخل ہو گئی جو سفید ڈارلنگ روم، بلیئر ڈوم اور اسٹڈی سے گزرتی تھیں۔ برآمدے میں پہنچنے کے بعد اس نے خود کو ایک آرام دہ صوفے پر گرا لیا تھا۔

مہین اور شفاف پلکوں نے خاکی آنکھوں کو چھپا لیا۔ ”انٹرنیشنل ڈپارٹمنٹ میں تمہارا پہلا سبق شنزادی! مارٹینی کس طرح کس کرتے ہیں؟“ اس نے ایک میز پر رکھی ہوئی شراب کی مختلف بوتلوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”ایک گلاس میں درماؤتھ انڈیلو اور اسے ہلاؤ۔“ اس نے صوفے پر پہلو بدلا۔ ”اب اسے گلاب کے پھولوں پر پھینک دو۔“ جیہ نے نہایت سعادت مندی کے ساتھ درماؤتھ بالکونی سے نیچے گلاب کی کھاریوں پر پھینک دیا۔ ”اب گلاس کو اس طرح سبز رنگ کی بوتل سے بھرنے گورڈن جن کہتے ہیں۔ اس میں برف کے چند قتلے ڈالو اور سیدھا مجھ تک لے آؤ۔“

لیڈی مودی نے چسکی لی اور مسکرا دی۔ ”اس میں کوئی شک نہیں ڈارلنگ! تم بہترین ساتھی ہو۔“

لیڈی مودی گھونٹ پر گھونٹ لے رہی تھی اور اس کے خوبصورت حلقوم کی رگیں بھول اور پچک رہی تھیں۔ سانس لئے بغیر اس نے گلاس خالی کر دیا۔ ”ایک اور ڈارلنگ!“ جیہ واپس میز تک گئی۔ اس نے ڈرنک تیار کیا لیکن درماؤتھ کو گلاب پر پھینکنا بھول گئی۔

”سبز آنکھیں ڈارلنگ۔“ لیڈی مودی سرشاری سے گنگنائی۔ ”یہ تم نے کہاں سے پائیں؟“ میں نہیں سمجھتی کہ تمہارے خاندان کے خفیہ تعلقات بھی تھے؟“

جیہ نے اپنی مہمان کی گندی ذہنیت پر برا سامنہ بنا لیا۔ ”ہماری والدہ ہر ہائی نیس شاردا دیوی، ایک ہالین شنزادی تھی اور یہ....“

”اپنا غصہ مجھ پر ضائع مت کرو ڈارلنگ!“ لیڈی مودی نے اس کا جملہ پورا نہیں ہونے دیا۔ ”میں تمہاری دوست بننے آئی ہوں، بشرطیکہ تم اس بدذات پر تپ کے ساتھ نباہ کرنے میں سنجیدہ ہو۔“

اس نے اپنے گلاس سے سامنے رکھے اسٹول کی طرف اشارہ لیا تو جیہ نے نشست منبھال لی۔ اس کی نظریں اپنے ہاتھوں پر تھیں جبکہ لیڈی مودی اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

”میری گستاخی کو معاف کرنا ڈارلنگ! لیکن تم بالوں سے بھری ہوئی ہو۔“ لیڈی مودی نے ایک اور لٹھ چلایا۔ ”اور پرتاپ کو اس سے چڑ ہے۔ میں نے اسے اکثر کہتے سنا ہے کہ ان بالوں کی وجہ سے اسے ہندوستانی عورتیں جنگلی ریچھ نظر آتی ہیں جن کے جسموں، سوائے بالوں کے کچھ نہیں ہوتا۔“

جیہ نے اپنے ملائم بازوؤں پر انگلیاں پھیرنی شروع کیں تو ایک قہقہہ لیڈی مودی کے حلق سے آزاد ہو گیا۔ ”ڈارلنگ اگر تمہارے جسم پر بال باقی رہے تو وہ بدذات پرتاپ تمہیں جلد ہی مہارانی کے محل بھجوا دے گا۔۔۔۔۔ نہیں، یہ تمہاری پلکیں خالص ہندوستانی ہیں۔ محبتور کے کھیل میں ایسی رکاوٹیں نہیں اچھی لگتیں۔ میں چنیش سے کہوں گی کہ انہیں نوچ کر مغربی بنا دے اور ہاں میں اس سے تمہارے بال بھی ترشواؤں گی۔“

”وہ ہمارے بال کاٹے گی؟“ جیہ خوفزدہ ہو گئی۔

”اس لئے ڈارلنگ! کہ پرتاپ تمہیں فیشن ایبل دیکھنا چاہتا ہے۔ تمہیں چھوٹے بال رکھنے ہوں گے۔“

جیہ نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا۔ ”لبے بال شادی شدہ عورتوں کی نشانی ہوتے ہیں۔ ہم انہیں نہیں ترشوائیں گے۔ یہ ہمارے شوہر کو بھی بھلے نہیں لگیں گے۔“

لیڈی مودی شاید کچھ کہتی لیکن اسی وقت اس کے کتے اچھلتے کودتے وہاں آ گئے۔ چنیش بھی ان کے ساتھ تھی۔ لیڈی مودی فوراً ادھر مصروف ہو گئی۔

”ڈارلنگ!“ ذرا دیر بعد وہ صوفے سے اٹھ گئی۔ ”اگر ہم کھانا اپنے کمرے میں کھائیں تو تم برا محسوس تو نہیں کرو گی؟ میں اپنا بگڑا ہوا چہرہ پرتاپ کے شیشے کے ڈانگ ٹیبل میں دیکھنے کا حوصلہ نہیں کر پا رہی۔“

وہ کٹ کٹ کرتی باہر کو چل دی اور جیہ اس عجوبے کو دیکھتی رہ گئی۔ کتے اور فرانسیسی ملازمہ بھی اسی کے ساتھ باہر نکل گئے تھے۔

جب جیہ، لیڈی مودی کے سٹنگ روم میں پہنچی تو وہ دروازے پر کھڑی کسی نادیدہ فرانسیسی پرفیوم کی خوشبو سونگھنے میں اس قدر مصروف تھی کہ اسے مہمان کے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی تھی۔ ہر جگہ کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔ آرام کرسیاں، ریشمی، چڑے، کنوَاب اور شیفون کے کپڑوں میں چھپی ہوئی تھیں۔ ٹوپیاں، ہیٹ اور کشمیری شالیں بیڈ روم کے دروازے پر لٹکی ہوئی تھیں۔ ساڑھیاں بیڈ اور قالین پر بکھیر دی گئی تھیں۔ چنیش پرفیوم کی شیشی لئے پورے کمرے میں خوشبو کا اسپرے کر رہی تھی۔ جونہی لیڈی مودی نے جیہ کو

دیکھا فوراً پینٹل کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”اسپرے بند کر دو لڑکی۔“ اس نے جیہ کے چہرے پر ناپسندیدگی دیکھ لی تھی۔ ”شنزادی کو اسپرے شاید اچھا نہیں لگا۔“ پھر وہ جیہ سے مخاطب ہوئی۔ ”برانہ مانیں تو ایک بات کہوں‘ ڈارلنگ۔“ جیہ نے جواب نہیں دیا تو وہ خود ہی بولنے لگی۔ ”میرا مشورہ ہے کہ تم گلاب کا عطر ذرا کم کم استعمال کیا کرو۔ جب میں تم سے گلے ملی تھی تو اس کی خوشبو نے میرا دماغ خراب کر دیا تھا۔ میں جانتی ہوں کہ تم جیسی روایتی لڑکی ان خوشبیوات سے کس قدر محبت کرتی ہو گی۔ لیکن تمہارے شوہر جیسے آدمی پر اس کا اثر الٹ بھی ہو سکتا ہے۔“

اس نے اپنی فرانسیسی خادمہ کو کمرے سے باہر چلے جانے کا اشارہ کیا۔ ”اور اب ڈارلنگ‘ میں قریب سے تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔ براہ کرم‘ لباس سے آزادی حاصل کر۔۔۔۔۔ یہ شیمپین تمہاری شرم ختم کرنے میں معاون ثابت ہو گی۔“

جیہ خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی۔ لیڈی مودی نے اس کے لئے شیمپین کا گلاس بنایا اور پھر خود ہی جیہ کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ پہلے گھونٹ پر جیہ نے برا سامنہ بنایا، لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ گلاس خالی کر گئی۔ لیڈی مودی کا کہنا درست تھا۔ ذرا دیر بعد جب جیہ نے اس کے کہنے پر عمل کیا تو اسے ذرا بھی شرم نہیں آئی۔

”تم تو خوبصورت ہو‘ ڈارلنگ!“ لیڈی مودی نے یوں اس کا جائزہ لیا جیسے اس کے سامنے خریداری کا کوئی جانور ہو۔ ”بھلا پر تپ کیوں شور مچاتا پھر رہا ہے؟“

”کیا ہمارے شوہر ہمیں نفرت انگیز سمجھتے ہیں‘ لیڈی مودی؟“ جیہ کی آواز مارے خوف کے کپکپا رہی تھی۔

لیڈی مودی نے بوتل میں پچی کچی شیمپین اپنے گلاس میں انڈیل لی۔ ”اب جبکہ تمہاری ساری شرم میرے سامنے کرسی پر رکھی ہوئی ہے‘ تم مجھے چسی کہہ کر مخاطب کر سکتی ہو۔ اور سچ تو یہ ہے کہ پرنس پر تپ تمام ہندوستانی عورتوں سے نفرت کرتا ہے۔“

”کیا ہمارے بدن کی رنگت کی وجہ سے؟“ جیہ نے دریافت کیا۔ ”ہمارے بالوں کی وجہ سے؟ کیا سفید فام عورتیں ہم سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہیں؟“

”نہیں ڈارلنگ؟“ لیڈی مودی نے جواب دیا۔ ”کم از کم تمہارے پاس وہ سب کچھ ہے‘ جس کے بارے میں برطانیہ نے پرنس پر تپ کو تربیت دی ہے۔۔۔۔۔ اور اب ذرا اپنا جوڑا کھولو۔ جیہ نے جوڑا کھول کر سر ہلایا اور اس کے لمبے بال کولہوں کے نیچے تک پھیلتے چلے گئے۔

”تم نے شاید مایو کی کتاب مدر انڈیا نہیں پڑھی۔“ لیڈی مودی بولی۔ ”مصنفہ بظاہر پاگل لگتی ہے، لیکن انگریز اس کے لکھے ہوئے ہر لفظ پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتی ہے کہ ہندوستانی عورتوں کی ایک بڑی تعداد مندروں میں دن بھر انسانی جانوں کی قربانیوں یا پجاریوں کے ساتھ ناجائز تعلقات میں مصروف رہتی ہے۔“

جیہ کانپ اٹھی۔ اسے وہ سستی پوجا یاد آگئی جو وہ ہر صبح اپنی والدہ کے ہمراہ مندر میں کیا کرتی تھی۔ ”یہ صاحب لوگ ہمارے بارے میں ایسی رائے رکھتے ہیں؟“ جیہ کی آنکھوں میں حیرت کے سمندر ٹھاٹھیں مار رہے تھے۔ ”ایسی بے عزتی سے تو مرجانا کہیں زیادہ بہتر ہے۔“ ”تم اس لئے حیران ہو رہی ہو، ڈارلنگ! کہ تمہاری پرورش پردے میں ہوئی ہے۔ ریڈیاریڈ کپلنگ نے لکھا ہے کہ ہمالیائی ریاستوں کی بعض شہزادیاں، طوائف بننے کے لئے بیچ ڈالی گئی ہیں، تم خود ہی دیکھ لو، انگریز تم سے کبھی نہیں ملے اور نہ ہی بادشاہت نے تمہاری زندگی پر کسی قسم کا دباؤ ڈالا ہے۔“

”لیکن بادشاہت نے اس شادی کے لئے ہمارے شوہر پر تو دباؤ ڈالا ہے۔“

”یہ کوئی عام سی بات نہیں ہے، ڈارلنگ۔“ لیڈی مودی کا انداز نامحکمہ تھا۔ ”جب سے برطانوی ہندوستان کے اخبارات پر سے سنسر شپ اٹھائی گئی ہے ہر شخص نے اخبارات کے ذریعے کیچڑ اچھانی شروع کر دی ہے۔ ان اخبارات نے پرنسپ اور وکٹر کی شہرت کو بے انتہا نقصان پہنچایا ہے۔ بعض اخبارات نے یہاں تک لکھا ہے کہ وکٹر نے اداکارہ کورا ہارٹ سے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ قدرتی طور پر دائسٹرائے اس شادی کی مخالفت کرے گا اور تجویز دے گا کہ اس صورت میں وکٹر اپنے بھائی کے حق میں دستبردار ہو جائے۔ پرنسپ کو اپنی شہرت بچانے کے لئے تمہاری ضرورت ہے۔“

”ہم نے ان سے شادی تو کر لی ہے، لیڈی مودی! اس سے زیادہ ہم کیا کر سکتے ہیں؟“ ”اب بھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔“ لیڈی مودی نے جواب دیا۔ ”اگر تم اپنے شوہر کو اپنے قدموں پر جھکا نا چاہتی ہو شہزادی تو اس کے رنگ میں رنگ جاؤ۔ تمہیں خود کو ایک ایسی عورت بنانا ہو گا کہ کالے ہی نہیں، گورے بھی جس کی خواہش کریں۔“

چھت کے پٹکے کے مسلسل چلنے سے کمرے میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ اس نے لیڈی مودی کے الفاظ سے اپنے جسم میں سردی کی ایک لہر دوڑتی محسوس کی اور ایک چادر سے اپنا بدن ڈھانپ لیا۔

”کیا ہمیں اپنے شوہر کی توجہ حاصل کرنے کے لئے صاحب لوگ کے سامنے بیسوا کا

کردار کرنا پڑے گا؟“

لیڈی مودی نے دونوں ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لئے۔ ”یہ نہیں لیکن اس سے ملتا جلتا کوئی کام، ڈارلنگ۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”شاید تم نہیں جانتیں کہ پرنسپل طوائفوں اور عیسواؤں سے شدید نفرت کرتا ہے۔ میں نہیں سمجھ پائی کہ مہارانی ان لڑکوں کے پاس طوائفوں کے پرے کے پرے کیوں بھیجا کرتی تھی، لیکن ہم ایک ان پڑھ عورت سے اور توقع بھی کیا کر سکتے ہیں۔“ لیڈی مودی نے آخری جملہ دھیمے لہجے میں کہا تھا۔

جیہ کو بالمیر کے زنانہ سونگ پول میں تیرنے والی لڑکیاں یاد آ گئیں۔ اگر اس کا شوہر ہوتا تو ہندی سے رنگے ہوئے ہاتھ اور ان کے لمبے لمبے بال دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیتا۔ ”کیا ہمارے شوہر ہمیں میم صاحب بنانا چاہتے ہیں؟“ جیہ نے دریافت کیا۔ اسے وہ سولہ سنگھار یاد آ گئے جو بالمیر کی عورتوں نے اسے سکھائے تھے۔

”نہیں، ڈارلنگ، ایسا نہیں.... لیکن مہارانی کوچ بہار، اندرا سے کچھ زیادہ۔ پورا یورپ اس کے قدموں میں تھا اور وہ اسی طرح کی ہندوستانی تھی، جیسا اسے ہونا چاہئے تھا۔“ لیڈی مودی نے سگریٹ نکال کر ہولڈر میں لگا لیا۔

”اندرا نے ایک فراک پہن کر لندن کے رجسٹری آفس میں شادی کی تو اس کے والد مہاراجہ بڑودہ نے اس سے بات چیت ترک کر دی تھی۔“

جیہ ساکت رہ گئی۔ ”تو کیا ہمیں بھی فراک پہننا ہوگی؟“

”بے وقوفی نہیں، ڈارلنگ۔“ لیڈی مودی نے پیار سے اسے ڈانٹا۔ ”اندرا نے یہ اس لئے کیا تھا کہ وہ مہاراجہ گوالیار سے اپنی طے شدہ شادی سے ایک ہفتہ قبل مہاراجہ کوچ بہار کے بھائی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ تم اس اسکیٹنڈل کے بارے میں ذرا تصور تو کرو۔ مہاراجہ گوالیار بہت موٹا تازہ اور ہندوستان کی سب سے اہم بادشاہت کا حکمران تھا۔“

کچھ یاد کر کے لیڈی مودی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”بڑودہ اور گوالیار کی ریاستوں کے درمیان شادی کے اخراجات کا ذرا تصور تو کرو۔ دونوں ہندوستان کی عظیم ترین ریاستیں ہیں برطانوی ہندوستان کے ہر حکمران اور اہم افسر کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ شادی کی تیاریاں ہو چکی تھیں۔ کئی مہمان آ بھی چکے تھے لیکن اندرا نے یہ کہہ کر شادی سے انکار کر دیا کہ مہاراجہ گوالیار کے پہاڑ جیسے جسم کو برداشت نہیں کر سکتی۔ پورے ہندوستان کے پاس ہفتوں اس شادی کے علاوہ کوئی موضوع نہ تھا۔“

جیہ کو یاد آ گیا کہ کس طرح مہاراجہ بڑودہ نے دہلی میں شاہ برطانیہ کی طرف سے رخ

پھیر لیا تھا اور بعد میں اسی مہاراجہ کی بیٹی نے اس کی ناک کٹوا دی۔

”اب وہ کوچ بہار کی مہارانی ہے نا؟“ جیہ نے پوچھا۔

”یہ ایک علیحدہ رومانوی داستان ہے۔“ لیڈی مودی نے اسے بتایا۔ ”آنجہلی مہاراجہ کوچ بہار ایک امریکی اداکارہ کے عشق میں مبتلا تھا۔ جب تخت برطانیہ نے اسے اس شادی کی اجازت نہیں دی تو اس نے پیرس کے رنژ ہوٹل میں زہر آلود شیمپین پی کر خودکشی کر لی۔ اس کے مرنے کے بعد اندرا کاشوہر کوچ بہار کا نیا مہاراجہ بن گیا۔“

لیڈی مودی نے انگلی سے بیڈ روم کی طرف اشارہ کیا۔ ”اب ڈارلنگ! واپس اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں۔“

جیہ فرمانبرداری سے اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

شیفون اور ریٹم کے ڈھیر کو ایک طرف ہٹا کر لیڈی مودی بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ”پر تپ کی ہدایت پر میں تمہارے لئے سینکڑوں ساڑھیاں لائی ہوں، ان میں سے کوئی پسند کر لو۔“

شرم سے سرخ جیہ آگے بڑھی۔ اس نے بخٹا کھر کی ایک ساڑھی پسند کی اور ہاتھ روم میں غائب ہو گئی۔ جب وہ دوبارہ برآمد ہوئی تو لیڈی مودی خوشی کے مارے تالیاں بجانے لگی۔ ”بہترین، شہزادی! بہترین۔“ جیہ نے خود کو آئینے میں دیکھا۔ اس کا خوبصورت اور دھلا پتلا جسم ساڑھی میں کچھ اور نمایاں ہو گیا تھا۔ وہ اپنے آپ سے شرماسی گئی۔

”مہارانی کوچ بہار نے رنگین فرانسیزی شیفون اپنایا تھا لیکن میرے خیال میں تیز اور شوخ رنگ تمہارے لئے مناسب رہیں گے۔“ لیڈی مودی نے رائے دی۔ ”تم اپنی آنکھوں کی مناسبت سے سبز رنگ پہنو۔ اب دستانے اور ہینڈ بیگ۔۔۔۔۔“

”دستانے؟“

”ہاں، ڈارلنگ۔ یہ درباری آداب کے عین مطابق ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب تمہیں پرنس آف ویلز کے سامنے پیش کیا جائے گا۔“

”لیکن ہینڈ بیگ کا کیا کام ہو گا؟“

لیڈی مودی ایک کرسی پر جھک گئی جس پر ہیرے جواہرات سے مزین کئی ہینڈ بیگ بکھرے ہوئے تھے۔ ”تمہارے رومال اور ذاتی اشیاء کے لئے۔“

”خادم ہر وہ چیز اٹھا سکتے ہیں، جس کی ہمیں ضرورت ہو گی۔“ جیہ نے جواب دیا۔

لیڈی مودی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تمہارے ملازمین کلکتہ میں گھوڑ دوڑ کے موقع پر حاضر نہیں ہوں گے اور نہ ہی لندن میں تمہارے ساتھ ہوں گے۔“

”کیا ہمارے شوہر کے ایڈی یہ کام نہیں کر سکیں گے۔“ جیہ نے پوچھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی ٹیوٹر اس پر اتنا اصرار کیوں کر رہی ہے۔

”کوئی بھی ان کی جگہ نہیں لے سکتا، شنراوی۔“ لیڈی مودی نے جواب دیا۔ ”شاہت بے شک روایتوں اور طاقت سے قائم رہتی ہے لیکن سوسائٹی فیشن کے بل بوتے پر ہلتی ہے۔“

لیڈی مودی ی ہدایت میں جیہ اپنی پرانی کینچلی اتارتی چلی گئی۔ لیکن جب لیڈی مودی نے اس کی پتلی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے ٹانگوں کے ردھم پر ہلکورے دینے شروع کئے تو جیہ کو وہ بازی گریاد آگئے جو دو اونچے درختوں کے درمیان رسی باندھ کر اس پر چلا کرتے تھے۔ جیہ کی زندگی خاصی حد تک تبدیل ہو چکی تھی۔ بالمر کے زنان خانے میں مسز رائے اسے اخبارات میں قوم پرست لیڈروں کے کارنامے پڑھ کر سنایا کرتی تھی لیکن اب لیڈی مودی اسے ہندوستانی حکمرانوں کے اسکیڈلز چٹکارے لے لے کر بتانے لگی تھی۔

”یہ حکمران آخر ان اخبارات پر مقدمات کیوں دائر نہیں کرتے؟“ جیہ نے پوچھا۔ ”ہندوستانی بادشاہ خود کو عدالت سے اوپر کی چیز سمجھتے ہیں۔“ لیڈی مودی نے اسے بتایا۔ ”حکمران گواہوں کے کٹھرے میں کھڑے نہیں ہو سکتے.... خیر چھوڑو اسے آؤ پہلے یہ دیکھیں کہ تمہارا رقص کل سے کتنا بہتر ہوا ہے؟“

لیڈی مودی نے ڈانسنگ ریکارڈ لگا دیا اور جیہ نے تھرکنا شروع کر دیا۔ لیکن اس کے رقص کا سلسلہ جلد ہی سراکبر کی آمد سے ادھورا رہ گیا۔ وزیر اعظم، مہاراجہ سیرپور کی ایک تصویر لایا تھا جس میں وہ جمیر آف پرنسز کے افتتاح کے موقع پر ہندوستان کے دیگر بادشاہوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔

”سراکبر ابھی کمرے سے باہر نکلا ہی تھا کہ لیڈی مودی چلا اٹھی۔“ ڈارلنگ! اس کا درزی کون ہے۔ کیا شاندار سوٹ ہے اس کا۔ کیا یہ اپنے کپڑے اب تک حیدر آباد سے سلوا رہا ہے۔ کیا تم جانتی ہو کہ نظام حیدر آباد نے اپنے یورپی کپڑے رکھنے کے لئے ایک میل ٹویل ڈریسنگ روم بنایا تھا۔ جس میں سوٹ اوپر نیچے لانے، لے جانے کے لئے لفٹس بھی لگی ہوئی تھیں؟“

کئی بار لیڈی مودی سیرپور سے گئی اور جب بھی واپس آتی تھی تو کتوں کے ہمراہ کوئی نیا آدمی ضرور ہوتا تھا۔ ویلز ہیلز کی سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر جیہ سگریٹ ہولڈر دلس رائس سے نمودار ہونے کا انتظار کرتی اور اندازے لگاتی کہ اس بار کون اس کے

ساتھ آئے گا۔

وہ ایک روسی جلاوطن عورت کاؤتس سٹاروف کو پہلے ہی وہاں لاپچی تھی جس نے ہم کو نہ صرف فرانسیسی سکھائی بلکہ لیڈی مودی کی عدم موجودگی میں ڈانس ڈائریکٹر کے فرائض بھی انجام دیئے۔ جیہ نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ وہ کسی اجنبی خواہ وہ شہنشاہ ہی کیوں نہ ہو کو اپنے جسم کے گرد بازو حائل کرنے کی اجازت نہیں دے گی۔

کاؤتس سٹاروف کے ساتھ جلد ہی ایک فرانسیسی لڑکی اپنی بھی آ ملی تھی جسے جیہ کی خدمت گزاری کے لئے بلایا گیا تھا۔ وہ جیہ کے ڈریسنگ روم کی دیکھ بھال کرتی اور وکٹر ولام ڈانس ریکارڈ تبدیل کرتی۔ وہ صرف اس وقت ہنسی جب جیہ کو ہاتھ روم کے آئینوں کے سامنے کھڑی ہو کر فرانسیسی بولنے کی مشق کرتے دیکھتی۔

چاندنی نے جب یہ دیکھا کہ ایک غیر ملکی عورت نے اس کی جگہ لے لی ہے تو اس نے بالیئر واپس جانے کے تقاضے شروع کر دیئے لیکن جیہ کی خواہش تھی کہ وہ فی الحال اس کے پاس ہی رہے۔ وہ اسے روکنے میں کامیاب تو ہو گئی لیکن اپنی کے ساتھ اس کا سلوک بہتر نہیں بنا سکی تھی۔

ایک بار لیڈی مودی کلکتہ کی مشہور عام فلوری ٹی شاپ سے ایک پیٹری شیف چرا لائی۔ جب جیہ نے اس کا مقصد دریافت کیا تو لیڈی مودی نے ہوا میں ہاتھ لہرائے۔ ”تمہیں کھانا پکانے کی تربیت دینے کے لئے، ڈارلنگ۔ مجھے اس مقصد کے لئے کوئی فرانسیسی نہیں مل سکا۔ مارکو کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہ ٹینس کھیلنا جانتا ہے ممکن ہے تم اس سے کچھ اور بھی سیکھ لو۔“

پرنس پر تپ جب دہلی سے واپس آیا تو موسم بہار، گرما میں مدغم ہو رہا تھا۔ جیہ جب وائٹ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو اس نے تو صیغی نگاہوں سے اپنی بیوی کو دیکھا جو اپنے متناسب بدن پر ساڑھی لپیٹے اور کندھے پر پرس ڈالے، اونچی ہیل کی سینڈل پہنے سامنے کھڑی تھی۔ جب جیہ نے ڈرنکس بنا کر لیڈی مودی اور پر تپ کے حوالے کئے تو اس نے اپنے شوہر کی آنکھوں میں پسندیدگی کی ایک عجیب سی چمک دیکھی تھی۔ لیکن اس وقت جیہ کے ہاتھوں سے گلاس چھوٹے چھوٹے بچا جب پر تپ نے اس کی بجائے پیسی کو چوم کر مبارکباد پیش کی۔

پرنس پر تپ کو اپنی بیوی کے کرب سے بچانے کے لئے لیڈی مودی فوراً بول اٹھی۔ ”کیا برطانوی ہند کے اخبارات واقعی نظام حیدر آباد کو ٹل زار کے نام سے پکارتے ہیں“

ارلنگ؟

”ہاں۔“ پرنس نے اپنی لائی لائی انگلیاں قدموں میں لیٹے الیشن پر پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ ”جبکہ مہاراجہ الور کو سنگ دل کا خطاب دیا گیا ہے۔“

”لیکن الور اور حیدر آباد تو ان یونیورسٹیوں کی مالی امداد کر رہے ہیں جہاں ہندوستانی قوم پرست تیار ہو رہے ہیں۔“ جیہ بے اختیارانہ بول اٹھی۔ ”بہت سے قوم پرستوں نے ان ریاستوں میں انگریزوں سے پناہ حاصل کی ہے۔ قوم پرست اخبارات اس بارے میں کیوں نہیں لکھتے؟“

اس کے شوہر نے اپنی بیوی کے جارحانہ انداز کو بڑی حیرت سے دیکھا تھا۔ ”اس لئے کہ متعدد حکمرانوں نے اپنے مخالفین کو جیلوں میں ڈال دیا ہے۔“

لیڈی مودی نے قہقہہ لگایا۔ ”یہ صرف ہمیں چھیڑ رہا ہے، ڈارلنگ، ورنہ حکمران اور قوم پرست تو آپس میں گہرے دوست ہیں۔ خاص طور پر۔۔۔“

”مالی ڈیر ہسی!“ پرنس پر تپ نے اسے جملہ پورا نہیں کرنے دیا۔ ”یہ قوم پرست ہر اس الٹی سیدھی بات پر یقین رکھتے ہیں جو برطانوی ہند کے اخبارات ہمارے بارے میں شائع کرتے ہیں۔ متعدد حکمران پہلے ہی انقلاب کی تیاریاں کر رہے ہیں۔“ وہ جیہ کی طرف مڑا۔ ”تمہارے اپنے کزن، مہاراجہ جان نے بالیر کی نصف آبادی کو قید کر دیا ہے اور تمہارے والد کا تعمیر کیا ہوا سائنس کالج بند کر دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ ہاشوکیوں کا گڑھ ہے۔“

”وہ یقیناً پاگل ہو گا۔“ لیڈی مودی بولی۔

”اگر وہ پاگل ہے تو پھر پوری بلو شہت پاگل ہے۔ دہلی میں ہر شخص انقلاب کی باتیں کر رہا ہے۔“ مائیکل نے دروازہ کھولا تو پرنس اٹھ کھڑا ہوا۔ ”وائسرائے نے تمام ہندوستانی حکمرانوں سے کہا ہے کہ وہ مشکوک ہاشوکی ایجنٹوں کو پکڑ کر برطانوی پولیس کے حوالے کر دیں۔“

جب وہ ڈانگنگ روم میں داخل ہوئے تو لیڈی مودی نے پرنس پر تپ کی توجہ پھولوں کے گلدستوں کی جانب دلائی جو جیہ نے اپنے ہاتھوں سے ترتیب دیئے تھے۔ لیڈی مودی اور اس کا شوہر بدستور انقلاب کی باتیں کر رہے تھے جبکہ جیہ یہ دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی کہ پر تپ کو مار کو کے کھانے پسند آئے تھے۔

اچانک پر تپ، جیہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ”بائی وا دے پر نر دہلی میں، میں ایک ایسے میجر کے ساتھ پولو کھیلتا رہا ہوں جو تمہارا دوست ہونے کا دعوے دار ہے۔ وہ کھلاڑی بھی برا

نہیں اور خاص بات یہ ہے کہ ہاشویوں کا بڑا ایکپرٹ ہے، کیونکہ اس نے کئی سال شمل مغربی سرحد پر گزارے ہیں۔“

”حکم!“ جیہ نے پلیٹ سے نظریں اٹھائیں۔

”وہ جنگ افغانستان کا ہیرو تھا، شنزادی، لیکن حال ہی میں اس نے آرمی سے استعفیٰ دے کر پولیٹیکل سروس جوائن کر لی ہے۔ وکٹر نے اسے سیرپور آنے اور ہمارے قوانین کا مطالعہ کرنے کی دعوت دی ہے۔“

جیہ کا دل حلق میں دھڑکنے لگا۔

شراب کا گلاس خالی کر کے اس نے فراہمی ملازم کو تھما دیا۔ میرے خیال میں اس کا والد ٹکا کا بیٹا تھا۔ ”پرتپ بولا۔“ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ میجر جیمز آبرن اب تمہیں پہچان پائے گا۔“

جیہ پھر ہیرہوٹی ہو گئی۔ ڈائننگ ٹیبل میں لگے آئینے میں اس کی اڑی ہوئی رنگت بخوبی دیکھی جاسکتی تھی۔ پرنس پرتپ نے پہلی بار اس سے عام انداز میں بات کی تھی اور وہی بات اسے اواس کر گئی تھی۔ لیکن وہ سچ کہتا تھا، انگریز لڑکا اس بچی کو نہیں پہچان پائے گا جسے وہ بالمر میں جانتا تھا۔

جب اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ پرنس آف ویلز اپنے دورہ ہندوستان کے دوران سیرپور کا دورہ بھی کرے گا تو پرجوش مہاراجہ وکٹر نے تجویز پیش کی کہ اس کی رہائش کے لئے ایک نیا محل تعمیر کیا جائے لیکن سرہنری کوزرے نے اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے پرنس آف ویلز کے دورے کے لئے محل کی تعمیر پر رقم ضائع کی تو وہ برٹش ریزیڈنٹ کے اختیارات استعمال کرتے ہوئے شاہی دورہ منسوخ کر دے گا۔

مایوس حکمران نے جیہ اور پرنس پرتپ سے کہا کہ وہ سٹی پبلس میں منتقل ہو جائیں تا کہ برطانوی تاج کے وارث کو ویلز پبلس میں ٹھہرایا جاسکے جسے اس کے دادا پرنس آف ویلز کے دورہ سیرپور کے موقع پر تعمیر کرایا گیا تھا۔

جیہ میں ڈرامائی تبدیلیاں دیکھنے کے بعد پرنس پرتپ نے اسے سٹی پبلس میں اپنی خواب گاہ میں متصل سوٹ میں ٹھہرنے کی دعوت دی تھی۔ سرور لیڈی مودی نے موسم گرما کے لئے کشمیر روانگی سے قبل جیہ کو نئی رہائش گاہ میں منتقل ہونے میں مدد دی تھی۔

لیڈی مودی کے جانے کے بعد جیہ تنہا رہ گئی۔ وہ اکثر و بیشتر شام کے اوقات میں مہاراجہ وکٹر کے چیمبر میں ہونے والی دعوتیں چھوڑ کر اپنی خواب گاہ میں آ جلیا کرتی تھی

کیونکہ وہ اپنے شوہر کو میموں کے ساتھ ہنستے کھیلتے دیکھ کر حسد میں مبتلا ہو جاتی تھی۔ وہ شی پیلز میں پرنس پر تپ کی ایسی سرگرمیاں محدود کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی اور نہ ہی خود کو پرنس پر تپ کی اپنے کمرے میں واپسی کی آوازیں سننے سے پہلے سونے پر آمادہ کر پائی تھی حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اپنی صبح کی پوجا سے پہلے وہ اپنے شوہر کو دیکھ پائے گی نہ مل پائے گی۔

دن کے وقت پرنس پر تپ اس کے لئے ایک خوبصورت اور ہمدرد ساتھی ہوتا تھا۔ وہ اس ڈرائیو دے میں کھڑی سرخ کار چلانے پر اکساتا اور پرنس آف ویلز کے دورے کے انتظامات میں ہاتھ بٹانے کو کہتا۔

جیہ اکثر اپنے شوہر کے ہمراہ گھوڑوں کے اصطبل دیکھنے کے لئے جاتی۔ ایک بار وہ اسے شی پیلز کے چڑیا گھر میں لے گیا جہاں جیہ نے تین عظیم الجثہ بنگل ٹائیگرز کی دموں کے ساتھ اینٹیں بندھی ہوئی دیکھیں۔ وہ حیران رہ گئی۔

”ٹائیگر کی دم کے ساتھ وزن باندھ کر جنگل میں چھوڑنا ایک پرانا طریقہ کار ہے، شہزادی۔“ اس نے جیہ کی حیرت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ ”اس طریقہ کار سے ہمارے شکاری مسمان کو شکار میں آسانی ہوگی۔“

شہلی دورے کے انتظامات پیلز کے بوٹ یارڈ میں بھی جاری تھے۔ جیہ کھلی کھڑکیوں میں کھڑی ہو کر کافی دیر دریا کے کنارے انتظامات کو دیکھتی رہتی۔

لیکن پرنس پر تپ نے بوٹ یارڈ میں ہونے والی ان کارروائیوں کو قطعی پسند نہیں کیا۔ ”سیر پور نے چین کی طرح ایک بار نیول مشن بھیجا تھا، لیکن یہ ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ اب وکٹر سیر پور کی قدیم دریائی بحریہ، پرنس آف ویلز کو دکھانا چاہتا ہے جو دنیا کی عظیم ترین بحری قوت کا وارث ہے۔ یہ ایک پریشان کن امر ہے۔“

مسلل درخواستوں کے بعد پرنس پر تپ اپنی تجسس بیوی کو شیڈز کی جانب لے جانے پر رضامند ہو گیا تھا۔

”میں ایک بات کے بارے میں تمہیں متنبہ کر دوں، شہزادی یہ مہاراجہ یعنی ہڑپائی نہیں مہاراجہ دھیراج سروکرم جی بلور راج پاندوا، دوست عالم، راج بہار، گرائڈ کمانڈر آف اشار آف انڈیا، ٹائٹ کمانڈر آف دی انڈین ایئر مہاراجہ آف سیر پور جسے ہندوستان کی ملکہ کا منہ بولا بیٹا ہونے کی وجہ سے وکٹر کہا جاتا ہے، اپنی تمام دلچسپیوں کا محور فلموں کو سمجھتا ہے اور اس وقت وہ ہلی وڈ کا مہاراجہ لگتا ہے۔“

لکڑی کے بچھائے ہوئے تختوں پر اونچی ایڑی کے سینڈل بجاتے ہوئے جیہ احتیاط کے ساتھ پرنس پر تپ کے پیچھے پیچھے بوٹ یارڈز میں داخل ہوئی تھی۔ بے شمار بڑھی اور دوسرے کاریگر کشتیوں کی مرمت اور ان کے رنگ روغن میں مصروف تھے۔

پرنس پر تپ نے بیزاری سے ایک جانب اشارہ کیا۔ ”بھگوان جانے ان بے وقوفیوں پر کتنے اخراجات آئیں گے۔ میرے دادا نے برہم پترا پر ایک پل بنوایا اور پرنس آف ویلز نے اس کا افتتاح کیا۔ اب سارا ہندوستان ترقی کے اس کارنامے سے آگاہ ہے۔ ان دنوں بادشاہت، حکمرانوں کو ان کی ریاستوں کے باہر رقم جمع نہیں کرنے دیتی تھی۔ اگر وکٹر رقم ضائع ہی کرنا چاہتا ہے تو بیسیویں صدی کی اس فضول نبوی پر کیوں کر رہا ہے۔ کچھ جواز ہی منگوا لے۔“

ادھر دارالحکومت میں موسم برسات کا خوف شروع ہو گیا اور ادھر ٹینس اور شراب کے دلدادہ انگریزوں سے مہاراجہ وکٹر کے ڈرائنگ روم خالی ہونا شروع ہو گئے۔ اب ان کی جگہ کلکتہ سے آنے والے امریکی اور یہودی بنکاروں نے لے لیا۔ وکٹر ان سے دارالحکومت اور اپنی فرسودہ نبوی کی تعمیر و مرمت کے لئے قرضے حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔ اپنے چھوٹے بھائی کو مطمئن کرنے کی لئے مہاراجہ وکٹر نے تین عدد سوپ وچ کیمل از کرافٹ خریدنے کا فیصلہ بھی کیا تھا تاکہ دنیا کو بتایا جاسکے کہ سیرپور جدید دور میں داخل ہو گیا ہے۔

شہابی دورے کی تواریخ کچھ اور قریب آئیں تو ویلز پیلس اور سٹی پیلس کے درمیان ٹیلی فون لائنیں بچھا دی گئیں۔ محل کے کلرک پرنس آف ویلز کے لئے آنے والی ریلوے کارڈ، سرکاری رولس رائس گاڑیوں کے فلیٹ اور شہابی بگھیوں کو دیکھنے کے لئے لڈ پڑے تھے۔ بوٹ یارڈز میں قدیم کشتیوں کو از سر نو جوڑا جا چکا تھا جبکہ پرنس پر تپ کے ہوائی جہاز لندن سے سیرپور کے لئے روانہ ہو چکے تھے۔ افزائش کے اس عالم کو دیکھ دیکھ کر جیہ حیران ہوتی رہی کہ کیا برطانوی عمل داری کے لئے حرکت میں رہنا زیادہ پسندیدہ عمل ہے۔

باغوں میں گھرے ہوئے تاجروں کے گھروں کے سامنے کی جگہ تین ہوائی جہازوں کی لینڈنگ اسٹریپ کے طور پر ہموار کر دی گئی تھی۔ لوہے کی بڑی بڑی چادروں سے بیگز تعمیر کئے گئے۔ پرنس پر تپ دن بھر انجینئرز جان میک گرگور کے ساتھ مل کر لکڑی کے بڑے بڑے کریت کھلواتا رہتا۔

ان تمام تیاریوں کو دیکھ دیکھ کر سادہ لوح دیہاتی حیران ہوتے رہتے کہ کیا دیوی دیوتا انسانوں کو ان آہنی مٹینوں میں پرواز کرنے کی اجازت دے دیں گے؟

جس دن ہوائی جہازوں کی اسمبلنگ مکمل ہو گئی، دارالحکومت کی ساری آبادی نو تعمیر شدہ فلائنگ اسٹریپ کے گرد جمع ہو گئی تاکہ پرنس پر تپ اور جان میک گریگور کو ان مشینوں کا تجربہ کرتے ہوئے دیکھ سکیں۔ لڑکوں کا ایک گروپ بہتر نظارے کے لئے کھجے پر چڑھ گیا۔ پرنس پر تپ پہلے چننا چلاتا ان کی طرف بڑھا لیکن پھر ہٹتے ہوئے اپنے ہوائی جہاز کی طرف واپس چلا گیا۔ وہ اس وقت بھی ہنس رہا تھا جب اس نے ہوائی جہاز کی نوزل پر لگے آہنی کریک کو گھمانے پر مامور عمل کے ملازمین کی طرف دیکھ کر انگوٹھا اٹھایا۔ انجن جو خفی اشارت ہوئے ہجوم کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ پر جوش لوگ بے اختیار ہوائی جہاز کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

جہاز نے گھاس پر بھاگتے ہوئے رفتار پکڑ لی اور جب یہ فضا میں بلند ہوا تو ہجوم نے ایک بار پھر فلک شکاف نعرے لگائے۔ جیہ نے کلاؤں کے پردوں کو پھٹنے سے بچانے کے لئے بے اختیار کلاؤں پر ہاتھ رکھ لئے۔ اس نے نظریں اٹھا کر اوپر دیکھا۔ جہاز آسمان کی بلندیوں پر محو پرواز تھا۔

دفترا "جان میک گریگور کی آواز اس کے کلاؤں سے ٹکرائی۔" "میں اگلے جہاز کو ٹیسٹ کرنے جا رہا ہوں، شہزادی، کیا آپ پنجر کی حیثیت سے میرے ساتھ پرواز کرنا پسند کریں گی؟"

ہجوم اپنی ریاست کی شہزادی کو انگریز انجینئر کی مدد سے ہوائی جہاز میں سوار ہوتے دیکھتا رہا۔ جیہ کو اس بات کا شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ تیز ہواؤں نے اس کی ساڑھی کو کچھ زیادہ ہی بدن سے چپکا دیا ہے جس کے باعث اس کے بدن کے نشیب و فراز عیاں ہو رہے ہیں۔ اس کے بال ہیلٹ سے نکل نکل جا رہے تھے۔

یہ اس کے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔ فضلوں میں پرواز کرتے ہوئے وہ ایک ہی نگاہ میں پورے شہر اور ارد گرد کے کھیتوں کو دیکھ رہی تھی۔

اس کا ساتھی پائلٹ رر کی ایک ٹیوب میں بول رہا تھا۔ جیہ نے اس کی آواز زیادہ واضح انداز میں سننے کے لئے اپنے ہیلٹ کے فلیپ اٹھا دیئے۔

"کنٹرول سنبھالیں، شہزادی۔" میک گریگور نے اس کے سامنے گلی ایک چوٹی اسٹک کی طرف اشارہ کیا اور جیہ نے اسے کھینچ لیا۔ جہاز اچانک فضا میں اٹھا اور اس کا بدن نشست میں فٹ ہو گیا۔

"اتنی تیزی سے نہیں، شہزادی۔" جیہ شہر رہی، حتیٰ کہ انسٹرکٹر نے جہاز کو دوبارہ

ہموار کر دیا، پھر اس نے دوبارہ کوشش کی۔ جلد ہی وہ جہاز کنٹرول کرنے کی خوشی میں قہقہے لگا رہی تھی۔

جہاز جب فلائنگ اسٹریپ پر اتر کر رکا تو وہ جہاز سے نکل کر پرنس پر تپ کی طرف بھاگی۔ ”میک گریور نے مجھے جہاز کا کنٹرول دے دیا تھا، حکم! کیا آپ نے مجھے پرواز کرتے دیکھا؟“

”ویل ڈن، شنزادی۔“ بور آواز ابھری اور شنزادی گڑبڑا کر اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے فلائنگ ہیلمٹ کو دیکھنے لگی۔

موسم سرما کے آنے تک شہر کی حالت بدلی جا چکی تھی۔ عمارتوں پر نئے سرے سے رنگ و روغن کر دیا گیا تھا جبکہ سڑکیں نئے سرے سے تعمیر کی گئی تھیں۔ جا بجا پلنٹ لگائے گئے تھے جن میں کھلنے والے پھول ایک عجب بہار دکھا رہے تھے۔

لیڈی مودی جب اپنی کار میں ان گلیوں اور سڑکوں سے گزری تو بے حد متاثر ہوئی۔ ”پرنس آف ویلز یہ سب دیکھ کر بہت خوش ہو گا، ڈارلنگ!“ اس نے اپنے مخصوص انداز میں جیہ کو مخاطب کیا۔ ”اتنی جلدی یہ تبدیلیاں غیر معمولی لگ رہی ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ صرف دس سال پہلے ہم تمام لوگ شہی دربار کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے جبکہ اس کے والد کے سر پر ہندوستان کی بلاشبہت کا تاج رکھا گیا تھا اور اب وہ جب ہندوستان آیا ہے تو اسے جھوم کے جھوم نظر آئیں گے جو بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھے برطانوی راج کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔“

لیڈی مودی نے اپنے جوتے اتارے اور جیہ کے بیڈ پر گر گئی۔ ”بہر حال دائسراے اب بھی اس کوشش میں ہے کہ ہزار اکل ہائی نیس کو شہی ماحول فراہم کیا جائے۔ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ ہر سو گز کے فاصلے پر کسٹن بڑی بڑی ٹارچیز لئے کھڑے ہوں گے تاکہ اگر اچانچ آج رات کی تاریکی میں باہر دیکھنا چاہیں تو انہیں مایوسی نہ ہو، کیا خیال ہے، ڈارلنگ، یہ سب ردمانک نہیں؟“

جیہ دل ہی دل میں حساب کرنے لگی کہ پورے برطانوی راج کو ٹارچوں سے روشن کرنے کے لئے کتنے کسٹن درکار ہوں گے؟“

”مشکل یہ ہے۔“ لیڈی مودی نے بات دوبارہ شروع کی۔ ”اب ہندوستانی، انگریز سے نہیں بلکہ جنٹ اور گاندھی کی تعلیمات سے متاثر نظر آتے ہیں۔“ جیہ نے محض سر کو اٹھاتی جنبش دینے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

لیڈی مودی کے تبصروں اور اندازوں سے قطع نظر پرنس پر تپ اپنے انجینئروں کے ساتھ مل کر پرنس آف ویلز کے دورے کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنانے میں مصروف تھا۔
قباہلی سردار اس کی اسٹڈی میں جمع رہتے تھے جہاں وہ ایچ آر ایچ کے شکار کے منتقلات کو
متمی شکل دے رہے تھے۔

لیڈی مودی کو وہ شیر دکھائے گئے جن کی دموں سے بھاری پتھر باندھ دیئے گئے تھے۔
پولو گراؤنڈ پر پرنس پر تپ نے نئی گھاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لیڈی مودی کو بتایا۔
”ڈکی ماؤنٹ بیٹن کو گزشتہ ماہ اس وقت پولو کھیلانی سکھائی گئی، جب گزشتہ ماہ شہی پارٹی
نے جو دھپور کا دورہ کیا تھا اب وہ اس کھیل کے طریقہ کار کو سمجھ گیا ہے۔ میرے خیال میں
ہم اس کے ساتھ ایک نمائشی میچ کھیلیں گے۔“

”قدرتی بات ہے۔“ لیڈی مودی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”تم اور وکٹر اس وقت
ہندوستان کے بہترین پولو کے کھلاڑی ہو۔“

”یہ بہترین اگر گھوڑے سے گر جائے تو سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔“ پرنس پر تپ نے
توہری چڑھائی۔ ”میں تو یہ پرار تھا کر رہا ہوں کہ شہی دورے کے دوران وکٹر اپنے آپ میں
رہے۔ کیا تم نے یہ بات نوٹ نہیں کی کہ وکٹر نے آج کل بہت زیادہ شراب نوشی شروع کر
دی ہے؟ میں اکثر اسے یاد کرانے کی کوشش کرتا ہوں کہ کورا ہارٹ اس کی دیگر فلمی
دوستوں کی طرح ہے لیکن وہ مانتا ہی نہیں۔“

ٹی پیلز میں افواہیں گشت کرنے لگیں کہ مہاراجہ وکٹر شہی دورے کے دوران اپنے
آپ کو کھو دے گا۔ اس کی آنکھیں یوں خون آلود اور دھندلائی دھندلائی رہتی تھیں جیسے
رات کے وقت جب سارا سیرپور سوتا ہے، وہ صرف شراب پیتا ہے۔ جیہ یہ سوچنے پر مجبور
تھی کہ کیا وکٹر اس طرح انگریزوں کی ناپسندیدگی سے فرار حاصل کر رہا ہے؟

شام کے وقت جیہ پردہ پیلز کے بلغم میں بیٹھ کر اپنی بوسیت دور کرنے کی کوشش کرتی
اور لیڈی مودی، مہارانی کے ساتھ پرنس آف ویلز کے مختلف ہندوستانی حکمرانوں کی جانب
سے دیئے جانے والے استقبالیوں کا موازنہ کرتی۔

”میں نے سنا ہے، ماما جی! کہ اودھ پور نے پرنس آف ویلز کے لئے تین سو ہاتھیوں
اور تین سو چیتوں کی لڑائی کا اہتمام کیا ہے؟“

”یہ تو کچھ بھی نہیں۔“ مہارانی نے جواب دیا۔ ”جب اس لڑکے کا باپ پرنس آف
ویلز کی حیثیت سے ہندوستان آیا تو مہاراجہ نیپال نے دس ہزار سپاہیوں، دو ہزار ہاتھیوں اور

تین ہزار گھڑ سواروں کو اس کے ذاتی استعمال کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ اور سیرپور میں پرنس آف ویلز نے ایک دن میں چھ شیروں کا شکار کیا تھا۔

”بیکانیر میں شاہی پارٹی نے ایک دن میں گیارہ ہزار تیز شکار کئے تھے، ماتاجی! انگریز کہتے ہیں کہ بیکانیر کا مہاراجہ ان تیزوں کا بھگوان ہے۔“

”یہ سب تو محض مذاق ہے، ہنسی۔“ مہارانی نے جواب دیا۔ ”لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس لڑکے کا دلوا جب ہندوستان آیا تو انگریزوں نے کئی ہندوستانیوں کو محض اس لئے جان سے مار دیا تھا کہ وہ جوتے پہن کر ان کے کمرے میں داخل ہو گئے تھے۔“

مہارانی نے حقہ گزگڑاتے ہوئے لیڈی مودی کو بتایا کہ اس سے پہلے والے پرنس آف ویلز نے کس طرح حکمرانوں سے اپنی بیویوں کو سستی سے بچانے کا وعدہ لیا تھا۔ ”لیکن یہ سب وقت کا زیاں تھا۔“ مہارانی بولی۔ ”حکمرانوں نے وعدہ کیا تھا، ان کی بیویوں نے تو نہیں کیا تھا۔ جب مہاراجہ نیپال سورگباش ہوا اس کی تین بیویوں نے اس کی جلتی چٹا میں کود کر جان دے دی۔ انہوں نے وکٹوریہ کو لکھا کہ یہ ان کے مقام کا تقاضہ تھا۔“

”یہ 1876ء کی بات ہے، ماتاجی! اب حالات بدل چکے ہیں۔“ لیڈی مودی نے انہیں یاد دلایا۔

مہارانی نے مداخلت پر کوئی توجہ نہیں دی۔ ”میری زندگی برطانوی راج کے لئے میرے شوہر کا ایک تحفہ ہے۔ میں نے سستی نہیں کی اور میں یہ دیکھنے کے لئے زندہ رہ گئی کہ کس طرح میرے پوتوں کو مجھ سے چھین لیا گیا اور انہیں لندن لے جا کر انگریز بنا دیا گیا اور اب وہ صرف انگریز عورتوں کے خواب دیکھتے ہیں۔“

مہارانی اس بات سے بخوبی آگاہ تھی کہ پرنس پر تپ اب بھی اپنی بیوی پر میسوں کو فوقیت دیتا ہے۔ جیہ نے فیصلہ کیا کہ جونہی سیرپور کے شہزادے اور لیڈی مودی دہلی روانہ ہوں گے وہ اپنے ہینڈ بیک، اونچی ہیل کے جوتے اور تمام غیر ملکی چیزیں چھوڑ کر پردہ پیلس نخل ہو جائے گی۔

جیہ کی سرگرمیاں حسب معمولی جاری تھیں۔ جیہ ہر صبح محل کی عورتوں کے درمیان بیٹھ کر باورچی خانے کے لئے سبزیاں تیار کرواتی اور انہیں کھانوں کے لئے ضروری ہدایت جاری کرتی۔

بعض اوقات مہارانی کے دربار میں ایک مہین سا پردہ آویزاں کر دیا جاتا۔ پردہ دار عورتیں اس بات کو یقینی بنانے کی کوششوں میں مصروف ہو جاتیں کہ وزیر اعظم کا پسندیدہ

مشراب تیار رہے۔ اور پھر راہداریوں میں پھیلے ہوئے خواجہ سرا وزیر اعظم کی آمد کا اعلان شروع کر دیتے۔ سر اکبر نمودار ہوتا تو عورتیں اپنے اپنے دروازے بند کر کے نظروں سے لوجھل ہو جاتیں۔

”مہین پر دے“ دونوں طرف سے آہد ہو جاتے۔ مہارانی اور سر اکبر پردے کی آڑ میں ملے اپنا حقہ گزرتاتے اور ریاستی امور پر چٹولہ خیال کرتے رہتے۔ ان کی بات چیت میں طویل وقفے آتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کی سوچ، الفاظ سے کہیں زیادہ کارگر ہو۔ جیہ کو اس وقت تک یقین نہیں آتا تھا کہ وہ پردہ پیلس سے تعلق نہیں رکھتی، جب تک وزیر اعظم اسے سندیسہ نہ بھیج دیتا۔ پردہ دار عورتوں کی ہمدردانہ نگاہوں کے سامنے وہ اپنے بل کھولتی، ناخنوں پر نیل پالش لگاتی اور پسی کے پرفیوم استعمال کرنے کے بجائے کلانی پر چنبیلی کے تازہ پھولوں کا گہرا پس لیتی۔

اس روز بھی جب وہ ڈرائنگ روم میں پہنچی تو وہ مہمانوں سے کچھ کھج بھرا ہوا تھا۔ جیہ آگے بڑھی تو جھوم نے کلائی کی طرح پھٹ کر اسے راستہ دیا۔ وزیر اعظم نے اسے دیکھتے ہی سر جھکا کر تعظیم دی۔

”اپنے اپارٹمنٹ میں واپس چلے، شنراوی۔ مہاراجہ نے درخواست کی ہے کہ آپ شامی دورے کی آخری منظوری میں ان کی مدد کے لئے موجود رہیں۔“

جیہ نے اپنے ہاتھ جھکائے تو چھوٹا سا پرس اس کے بازو سے پھسل کر نیچے جا گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ نیچے جھکتی، ایک بڑے سے ہاتھ نے چھوٹے سے ہینڈ بیگ کو پکڑ لیا۔

”شلاوی واقعی تمہیں راس آئی ہے، شنراوی۔“ جیہ ایک اجنبی سے ہینڈ بیگ واپس لیتے ہوئے شرمائی۔ وہ خاکی یونیفارم میں تھا اور اس کے سینے پر لاتعداد میڈل آویزاں تھے۔ لیکن یہ آواز بہر حال شناسا تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے بہت عرصہ پہلے اس نے یہ آواز کیس سنی تھی۔

بچپن کی یادیں جیہ کی یادداشت میں در آئیں۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر اوپر دیکھا۔ نیلی آنکھوں پر سیاہ بھوہوں نے سلیہ کر رکھا تھا۔۔۔ میجر جیمس آبرن نے انگلیاں ہلائیں اور ہینڈ بیگ دوبارہ فرش پر جا گرا۔ وہ اسے اٹھانے کے چکر میں گر سا گیا۔

جیہ نے اس کے معذرت خواہانہ انداز پر بہ مشکل اپنی مسکراہٹ چھپائی۔ ”کیا تم بہت دنوں سے سیرپور میں ہو جیمس صاحب؟“ اس نے ہولے سے پوچھا۔

”کوئی دو ہفتوں سے۔“ جیمس آبرن نے جواب دیا۔ ”قبائلی علاقوں میں کچھ گڑبڑ ہے، اس سلسلے میں آیا ہوں۔۔۔ میں نے سنا تھا کہ تم حرم میں رہ رہی ہو اس لئے امید نہیں تھی

کہ تم سے ملاقات ہو جائے گی، شنراوی۔ کل میں دہلی جا رہا ہوں تاکہ مہاراجہ پرنس آف ویلز کے ساتھ واپس سیرپور آسکوں۔

”ہم سمجھے تھے، تم باشویکوں کی وجہ سے یہاں آئے ہو؟“ جیہ نے کہا۔ ”ہمیں پتا چلا تھا کہ تم ان معاملات کے خالصے ایکسپرٹ ہو، کیا ہندوستان میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے؟“

جیس نے برطانوی ریزیڈنٹ کا گول مٹول جسم اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ ہر کوئی کہتا ہے کہ ہندوستان کی مشکلات کی وجہ یہی باشویک ہیں۔ حالانکہ اپنی خانہ جنگی اور روس میں قتل کے باعث وہ یہاں کسی انقلاب کے لئے کام کرنے کے قابل نہیں ہیں، شنراوی؟

”مجھے گاندھی کے باشویک ہونے پر بھی کوئی حیرت نہیں ہو گی۔“ سرہنری کوزے کی سرد آنکھوں سے اچانک شعلے نکلنے لگے تھے۔ ”تم اس ہنگامے کو کیا نام دو گے جو اس کے آدمیوں نے پرنس آف ویلز کے بمبئی پہنچنے پر کیا ہے؟ جانتے ہو، انہوں نے یونین جیک بھی نذر آتش کر ڈالا ہے۔“

”غلط، آبرن، غلط۔“ برطانوی ریزیڈنٹ کسی بات کو تسلیم کرنے پر تیار نہ تھا۔ ”وہ آدی اتارکٹ ہے۔ وہ لوگوں میں اشتعال پھیلا رہا ہے اور یہ اشتعال ایک روز پورے ہندوستان کو خون کے سمندر میں تبدیل کر دے گا۔ صرف ہم انگریز ہی ہندوستان کو کنٹرول کر سکتے ہیں۔ ان بے وقوف قوم پرستوں کو یہ بات ضرور سمجھنی چاہئے۔“

بنکونیٹ روم کے دروازے کھلے تو جیس آبرن پریشان ہو کر دوسری طرف متوجہ ہو گیا لیکن برطانوی ریزیڈنٹ نے ابھی اپنی بات ختم نہیں کی تھی۔

”بہر حال مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ مہاراجہ وکٹر نے پرنس آف ویلز کے دورے کے موقع پر تمہیں یہاں طلب کر لیا ہے۔ کم از کم میں ضرور مطمئن ہوں کہ ہزار سال ہائی نیس کی یہاں موجودگی کے موقع پر ایک باشویکی ایکسپرٹ بھی یہاں موجود ہے۔“

جیس آبرن نے جیہ کو سارے کے لئے اپنا ہاتھ پیش کیا۔ یہ لیڈی مودی کی تربیت کا اعجاز تھا کہ جیہ نے مسکراتے ہوئے اپنا ننھا ہاتھ خالی آستین پر رکھ دیا۔

”کیا تم نے شادی کر لی، جیس صاحب؟“ دونوں ایک ساتھ بنکونیٹ ہال میں داخل ہوئے تو جیہ نے پوچھا۔

”میں نے ابھی آرمی چھوڑی ہے، شنراوی۔“ جیس آبرن نے جواب دیا۔ ”میں ایک بیوی کا بوجھ اٹھانے سے پہلے سیرپور جیسی بڑی ریاست کا ریزیڈنٹ بننا چاہتا ہوں۔“

جیہ اس بات سے پریشان تھی کہ جیس آبرن اس کے پہلو میں بیٹھا ہے۔ یہ وہی لہس تھا جس نے سب سے پہلے اس کے نوخیز بدن کو چھوا تھا اور اس میں رونما ہونے والی لہلیوں کا لہس چکا تھا۔ جیہ کو آج بھی وہ اجنبی لیکن مضبوط بازو یاد تھے جو پہلی بار اس کے ہان کے گرد حائل ہوئے تھے۔ بلاشبہ اسی شخص کے لئے جیہ نے پہلی بار اپنے دل کی امرکن کو تیز ہوتے محسوس کیا تھا۔ اسے کوئی پائی کا وہ جملہ بھی یاد تھا کہ اگر جیس ہم میں ہے ہوتا تو جیہ کے لئے اس سے اچھا بر اور کون سا ہو سکتا تھا۔

آج جبکہ وہ جولائی کی دہلیز پار کر آئی تھی، وہ پھر اس کے پہلو میں موجود تھا، لیکن وہ کسی اور کی دھرم پتی تھی۔ ایک ریاست کی باعزت راجکاری تھی۔ وہ اپنے پہلو میں جیس کی مہر کی کے باعث شہی دورے کے بارے میں ہونے والی باتیں نہ سن پائی تھی۔

اس نے جیس کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا لیکن وہ اس انگریز لڑکے میں آنے والی ماری تہذیبوں سے آگاہ تھی۔ دلا پتلا جسم اب ایک وجیہ مرد کے سانچے میں ڈھل چکا تھا۔ ایک مضبوط مرد۔ ظاہر ہے وہ آٹھ سال میدان جنگ میں گزار کر آیا تھا اور اس سخت زندگی نے اس کی کاٹھی کو بدل ڈالا تھا۔

جیہ نے اس کی گرم سانس اپنے بدن پر محسوس کی۔ ”اگر نکا تمہیں اس روپ میں دیکھتا تو اس کا سر فخر سے بلند ہو جاتا شہزادی!“

اس نے ہاتھ بڑھا کر جیہ کی کلائی پکڑ لی۔ ہاتھ کے دباؤ سے چینیلی کے پھول پتیوں میں تقسیم ہو کر نیچے گر پڑے۔ جیہ اس کی حرکت سے خوفزدہ ہو گئی۔ اس نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی درباری یہ سب دیکھ لے۔

یہ خبر سن کر کہ جیس آبرن دہلی روانہ ہو گیا ہے، جیہ کے ذہن پر سے جیسے کوئی بوجھ ہٹ گیا تھا۔ لیڈی مودی اور پرنس پر تپ اسی سہ پہر دار الحکومت پہنچنے والے تھے۔ جیہ سر اکبر کے ہمراہ ان کمروں کے دورے پر گئی جن میں آنے والے شہی مہمانوں نے ٹھہرا تھا۔

سر اکبر نے بعض آدمیوں کو ایک پٹی کی بد سے بھاری فانوس دربار روم کی چھت پر آویزاں کرتے دیکھا تو بے اختیار بھوئیں اچکا دیں۔ ”یہ اخراجات اور جوش میری سمجھ سے باہر ہے۔“ انہوں نے جیہ کو مخاطب کیا۔ ”ہاؤس آف سیر پور، برطانوی تخت سے ہر سال دو ہزار بل پراتا ہے۔“

بل روم میں کلکتہ لائٹ آپریٹک سوسائٹی کا مسٹر سین گپتا، سیر پور آرکسٹرا کو ہدایت دے رہا تھا۔ وزیر اعظم نے موسیقی کے شور سے بچنے کے لئے کلاں پر ہاتھ رکھ لئے۔ ”میں

اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ رقص صرف رقاصائیں کریں اور ہم سب انہیں دیکھیں۔“ اس بار بھی اس کی مخاطب جیہ ہی تھی۔ ”اور آپ ہزاراں ہائی نیس کے ساتھ رقص کی منصوبہ بندی کر رہی ہیں۔ شہزادی؟“

”اگر ہمارے شوہر نے اصرار کیا۔ تو ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں ہو گا۔“ جیہ نے کندھے اچکائے۔

وزیر اعظم اور وہ واپس جیہ کے پارٹمنٹ کی طرف چلے تو سر اکبر کی چھڑی کی نوک فرش پر ایک ردھم میں بج رہی تھی۔ ”میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے راج نیٹی پڑھی ہے“ شہزادی۔ اگر آپ کو کو تلیا یاد ہے تو آپ اس انگریز کے ہاتھ پر بہ آسانی ہاتھ رکھ سکتی ہیں۔ کو تلیا نے میکسم میں کہا ہے کہ اگر آپ کسی کو بازوؤں کی قوت سے شکست نہیں دے سکا تو دوستی سے زیر کر لیں۔“

جیہ شہانہ انداز سے اس کے برابر چل رہی تھی۔ ”ہم نے ایک اور کہوت بھی پڑھی ہے“ سر اکبر! اس نے وزیر اعظم کو مخاطب کیا۔ ”اگر آپ اپنے دشمن کو تلوار سے قتل نہیں کر سکتے تو اپنے بازو اس کے شانوں میں جمائیں کر دو اور اپنے خنجر سے اس کا کام ختم کر دو۔“

”بالکل ایسی ہی بات ہے“ شہزادی!

جیہ نے سر اکبر کی تائید پر مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھ گئی۔

جیہ، خواب گاہ میں پہنچی تو لیڈی مودی اس کی منتظر تھی۔ ”ڈارلنگ!“ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی۔ ”میں جانتی نہیں سکتی کہ ویسٹائن ہل کس قدر دلچسپ ہونے جا رہا ہے۔ کچھ ہمہ وقت کالم کر رہا تھا۔ انگینڈ کی امیر ترین لڑکی لیڈونا اسٹیل“ واٹر لے کے ساتھ تھی۔ ”لیڈی مودی مزے لے لے کر قصہ سن رہی تھی۔ ”ڈکی ہونٹ بیٹن نے ویسٹائن ہل کے عین درمیان میں لیڈونا سے کہا کہ وہ اس سے شادی کر لے۔ پرنس آف ویلز اس شادی کا سب سے اہم مہمان ہے لیکن یہ سب ابھی تک خفیہ ہے۔“

اس نے اپنے جوتے اتار کر ایک طرف پھینکے۔ ”بد قسمتی یہ ہے کہ اسی دن کور ہارٹ کا ٹیلی گرام وکٹر کو موصول ہوا جس میں اس نے لکھا ہے کہ اگر اسے سیرپور کی مہارانی تسلیم کر لیا جائے تو وہ اس سے شادی پر تیار ہے۔“

”لیکن وہ سیرپور کی مہارانی کبھی نہیں بن سکے گی“ جیہ نے اپنے اندیشوں کا

ملکہ کیل۔ ”برطانوی تخت اس کی حیثیت کبھی تسلیم نہیں کرے گا۔“

لیڈی مودی نے اپنی سگریٹ الٹش ٹرے میں کچل دی اس کی نگاہیں براہ راست جیہ پر مرکوز تھیں۔ ”یہ بات ہر کوئی جانتا ہے ڈارلنگ، لیکن وکٹر کا دماغ چل گیا ہے، جو نبی اسے الٹ بیٹن کی منگنی کا پتا چلا وہ سیدھا پرنس آف ویلز کے پاس پہنچا اور اسے بتایا کہ وہ اور اہارٹ سے شادی کرنے جا رہا ہے۔“

جیہ کو لیڈی مودی کے انکشاف سے ایک جھٹکا سا لگا۔ ”اگر ایسا ہوا تو مہاراجہ اپنے تخت سے محروم ہو جائے گا۔“

”زیادہ پر جوش ہونے کی ضرورت نہیں ڈارلنگ۔“ لیڈی مودی کے ہونٹوں پر زو معنی مسکراہٹ تھی۔ ”خوش قسمتی سے پرنس آف ویلز، وکٹر کو اپنا دوست سمجھتا ہے۔ اچھ آر اچھ نے وکٹر کو فرائض کے بارے میں ایک طویل لیکچر دیا اور نصیحت کی کہ ذاتی پسند کو قوی ذمے داریوں پر ترجیح نہ دے، لیکن ہمیں وکٹر پر نظر رکھنی ہو گی۔ اچھ آر اچھ کے دورے کے دوران اگر وہ زیادہ پی گیا تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

پرنس پر تپ دروازے پر نمودار ہوا۔ ”کم آن لیڈیز!“ وہ خوش گوار انداز میں بولا۔ ”ام ڈرائیو پر جا رہے ہیں۔ ہر رائل ہائی نیس، تم سے انتظامات کے بارے میں بات کر سکتے ہیں، شہزادی، بھگوان کے لئے دوسری ریاستوں کی شاہی عورتوں کی طرح خاموش مجسمہ نہ بن جاؤ۔“

جیہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنے شوہر کی بات کا جواب نہیں دیا تھا، لیکن جس انداز میں وہ مسکرائی تھی اس کا مطلب ہی یہ تھا کہ فکر نہ کرو شوہر جی! میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔

جیہ نے دستلے اتارنے کی ابتدا کی ہی تھی کہ لیڈی مودی نے زور زور سے نفی میں سر ہلاتا شروع کر دیا۔ ”انہیں مت اتارنا ڈارلنگ!“

”لیکن ہمیں ان کی ضرورت نہیں، ہنسی!“

لیڈی مودی چلا اٹھی۔ ”مگر تم ان کے بغیر پرنس آف ویلز سے نہیں مل پاؤ گی۔“

”وہ تو ہمارا مہمان ہے ہنسی۔“ جیہ نے کندھے اچکائے اسے اپنی رسومات سے زیادہ ہماری رسومات پسند آئیں گی۔“

”لیکن انگریز سمجھتے ہیں کہ صرف ان کی رسومات ہی سب سے زیادہ اہم ہیں۔ دی قوانین بناتے ہیں بہر حال یہ ان کی بادشاہت ہے۔“

اس سے پہلے کہ جیہ جواب میں کچھ کہتی ایک ایڈی نے دروازے پر نمودار ہو کر تعظیم دی۔ ”ہمیں فوراً ویلز پیلس روانہ ہوتا ہے، شہزادی۔“ اس نے جیہ کو آگاہ کیا۔ ”آقا کی ٹرین پہنچ چکی ہے۔“

ویلز پیلس کو جانے والے تمام راستے کے اختتام پر سنگ مرمر کا ایک چھوڑا تعمیر کیا گیا تھا۔ سنگ مرمر کے چھوڑے تک تمام راستے پر سرخ قالین بچھایا گیا تھا جس کے دونوں جانب سیرپور کے معززین اپنی بیگمات کے ہمراہ موجود تھے جیہ لیڈی مودی کے ہمراہ چھوڑے کی سمت بڑھی تو معززین اور ان کی بیگمات نے سر جھکا کر اسے تعظیم دی۔

ایک بینڈ جدید دھنیں بجا رہا تھا جبکہ سیرپور لانسز کا دستہ مارچ میں مصروف تھا جو نئی توپیں دانے جانے کی آوازیں بلند ہوئیں دستہ اینشن ہو گیا توپیں خاموش ہوئیں تو ہگل کی آواز سنائی دی یہ کانسی مندر میں پجاریوں کا اشارہ تھا تاکہ ایچ آر ایچ کے دورے کو مہاراجہ کے لئے نیک ٹھکون بنایا جاسکے۔

دریا کے پار جہاں تاجروں کے گھر تھے سیرپور کے قوی پرچم لہرا رہے تھے ان کے نیچے دریا میں بارجز، ڈنگیاں، موٹر لائیں اور دوسری کشتیاں یوں ایک دوسرے سے الجھی کھڑی تھیں جیسے مہاراجہ کے جلوس میں صرف انہی کو شرکت کرنی ہے۔

جیہ نے اپنی گود میں رکھے سرکاری پروگرام کا جائزہ لیا ہر پروگرام پچھلے پروگرام کے برعکس تھا جیسے پجاریوں کی پوجا کے فوراً بعد سیرپور انفنٹری کا مارچ پاسٹ تھا۔ جیہ نے اپنی دور بین سے دیکھا تو اسے پرنس آف ویلز، مہاراجہ کے ہمراہ کھلی رولس رائس میں بیٹھا دکھائی دیا وہ نظروں سے اوجھل ہوئے تو اس نے فوراً پروگرام پر نگاہ دوڑائی۔ وہ لوگ ہاتھیوں پر سوار ہو کر پرانے شہر کے دورے پر جا رہے تھے واپسی کشتیوں کے ذریعے ہونی تھی۔

شہی قافلے کو واپسی میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگی تھی شہی بجرے کے ارد گرد بلا مبالغہ سینکڑوں کشتیاں موجود تھیں اور ان پر سوار لوگ عظیم برطانیہ کے ولی عہد کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے تاب تھے۔

”وہ رہا پرنس آف ویلز، وکٹر کے ساتھ سرخ تخت پر بیٹھا ہے۔“ لیڈی مودی نے جیہ کے کان میں سرگوشی کی۔ ”اور ڈکی ماؤنٹ بیٹن، ریزیڈنٹ کے ساتھ بیٹھا ہے۔“

دریا میں موجود کشتیوں کے انجنوں کی آوازیں کسی اور انجن کی آواز میں دب گئیں، جیہ نے اوپر دیکھا، تین ہوائی جہاز دریا کی طرف بڑھ رہے تھے۔

جہازوں کا رخ عین شہی بجرے کی طرف تھا۔ وہ اتنی نیچی پرواز پر تھے کہ جیہ کو ان

کے ہلتے ہوئے پر بھی صاف دکھائی دے رہے تھے ایک از کرافٹ نے فضا میں پرنس آف ویلز کے نشان کا بنا ہوا بینر فضا میں چھوڑا اور اسی وقت پورا ماحول جیسے جاگ اٹھا۔ کشتیوں کے ہارن، ڈرم، قلوٹس اور دیگر آلات موسیقی بیک وقت بجنے لگے جیہ کو لیڈی مودی کی آواز بھی کم کم سنائی دے رہی تھی۔

”ڈارلنگ، تمہیں یہ بات ماننی پڑے گی کہ سیرپور براورز کو شو کرنا آتا ہے، میں شرط لاتی ہوں کہ ایچ آر ایچ نے ایسا پہلے کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔“

قدیم جہازوں کا فلیٹ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ کلن پڑی آواز اب بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ دریا کے کنارے جھومتے ہوئے ہاتھیوں کا قافلہ اب شی پیلز کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لیڈی مودی ایک آدھ ڈرنک لینے کے موڈ میں تھی لیکن معززین نے اپنی نشستوں سے اٹھنا شروع کر دیا تو اسے اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔

پرنس پرنس کا ہوائی جہاز لینڈ کر چکا تھا اور اب وہ جہاز سے نکل کر ایچ آر ایچ کے قافلے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے ہیلٹ کی جگہ پگڑی باندھ لی تھی۔ شاہی بجزا جیٹی کی طرف مڑا تو پرنس پرنس نے ہاتھ ہلایا اور چوتھے پر آکر بیٹھ گیا۔

پرنس آف ویلز نے جونہی سرخ قالین پر قدم رکھے سیرپور لانسرز نے سلامی پیش کی۔ جیہ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ پرنس آف ویلز مہاراجہ کے کسرتی بدن کے سامنے بچہ نظر آ رہا تھا۔ اس کا نیگا سربہ مشکل مہاراجہ کے کندھوں تک آ رہا تھا۔

”میرے ساتھ آؤ شہزادی۔“ جیہ کو اپنے شوہر کی آواز سنائی دی تو وہ اس کے ساتھ جیٹی کی طرف بڑھی جہاں پرنس آف ویلز، سیرپور کے شہسواروں کا معائنہ کر رہا تھا۔

جونہی لانسرز مارچ کرتے ہوئے سامنے سے گزرے۔ جیہ نے پریشانی کے عالم میں اپنے نیگے ہاتھ چہرے کے سامنے باندھ دیئے جب پرنس آف ویلز نے اس روایتی خیر مقدم کا اسی طرح جواب دیا تو اسے بے حد حیرت ہوئی۔

”ڈاکٹر، ایک شہسوار اور ایک پائلٹ کی حیثیت سے تمہاری صلاحیتوں کی تعریف کر رہا تھا، شہزادی!“ اسے پرنس آف ویلز کی آواز سنائی دی۔

”میں نے جہاز میں سفر کیا ہے، سر، لیکن تمہارا اسے اڑا نہیں سکتی۔“ جیہ نے جواب دیا۔ ”کوئی بات نہیں۔“ پرنس آف ویلز مسکرایا۔ ”میں نے سنا ہے کہ تمہارے والد پولو کے ایک شاندار کھلاڑی تھے اگر ہو سکے تو میرے کزن کو اس بارے میں بتانا۔“

ایک طویل قامت نوجوان آگے بڑھا، ماؤنٹ بیٹن کے عقب میں جیہ کو انگریز انٹینڈنٹ،

شنزادے سے بات چیت میں مصروف دکھائی دیئے۔ اسے جیسے آبرن بھی نظر آیا جو برطانوی ریزینٹ کے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑا تھا لیکن جیہ کے پاس فی الوقت اتنی مہلت نہ تھی کہ وہ اس کا بھرپور جائزہ لے سکتی۔

دوپہر کے کھانے اور استقبال کے تقریبات کے اختتام پر شی پلس واپس آتے ہوئے کار میں پرنس پر تپ نے لیڈی مودی کو باقاعدہ مبارک باد پیش کی تھی۔

”شنزادی نے بہت اچھا تاثر چھوڑا ہے،“ پرنس پر تپ کے لہجے میں فکر کی جھلک تھی ”میں نے ماؤنٹ بیٹن کو میٹ کلف سے کہتے سنا کہ یہ کتنی زیادتی ہے کہ شنزادی مردوں کے ساتھ پولو نہیں کھیل سکتی۔“

”ہم انگریزوں کی ساتھ رقص کرنے کے بجائے ان کے ساتھ پولو کھیلنا پسند کریں گے حکم!“

پرنس پر تپ نے قہقہہ لگایا لیکن جیہ کو اپنے شوہر کا یہ انداز ذرا بھی نہیں بھلایا تھا۔ شاید اسے اس قہقہے میں طنز کی آمیزش دکھائی دی تھی۔

”ہم ان میں سے کئی ایک سے اچھی کھلاڑی ہیں حکم!“ جیہ بول اٹھی۔ ”لنچ پر پرنس آف ویلز نے ہمیں بتایا تھا کہ جب ماؤنٹ بیٹن نے جودھ پور میں ٹیم کے ساتھ پولو کھیلا تو پہلے تین چکروں میں ایک بار بھی بال کو نہیں چھو سکا تھا۔“

پرنس پر تپ نے اس کا بازو پکڑا اور زبردستی اس کا چہرہ اپنی طرف موڑ لیا ”میرے دادا نے، میری دادی سے سنی کرنے کا عہد لے کر پرنس کے دادا کو متاثر کیا تھا لیکن اگر تم ہمارے ساتھ پولو کھیلو گی تو کیا برطانوی تاج ہماری ترقی سے مرعوب ہو جائے گا۔“

جیہ نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا۔ ”اس کے بدلے میں حکم! ہمیں بال میں شرکت سے معذور سمجھیں۔“

پرنس پر تپ نے غصے میں اپنا ہاتھ کار کے دروازے پر دے مارا۔ ”اس کا کوئی امکان نہیں۔ تم ہماری نہیں دکنر کی میزبان ہو۔“

”تب ہم رقص نہیں کریں گے۔“ جیہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

پرنس پر تپ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ جیہ کا یہ روپ اس کے لئے نیا تھا۔

پرنس پر تپ نے اسے گھورا تو جیہ کو یوں لگا جیسے کسی جنگلی جانور کی روح اس کے شوہر کے بدن میں حلول کر گئی ہے۔ وہ نہایت تیکھے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ جیہ کو محسوس ہوا کہ اس کے دیکھنے کا یہ انداز ان کے درمیان موجود تعلق کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے گا۔ ”ٹھیک ہے۔“ بلاخر اس نے ایک طویل سانس لی۔ ”ہم سودے بازی کر لیتے ہیں‘ شہزادی۔ تم پولو کھیلو اور میں تمہیں رقص کے لئے مجبور نہیں کروں گا۔“

”لیکن کم از کم تمہارے ساتھ ایک راؤنڈ ہونا ہی چاہئے۔“ لیڈی مودی نے اپنے مخصوص انداز میں سرگوشی کی۔ ”پتا تو چلے کہ تمہاری بیوی کتنا اچھا جانتی ہے۔“

جیہ خاموشی سے دل ہی دل میں ہاتھی کے سردالے گنیش مہاراج کو پکارتی رہی کہ وہ اسے محفوظ رکھے۔ شاہی پارٹی شکار کے لئے باہر گئی ہوئی تھی اور یوں پریکٹس کے لئے اس کے پاس محض تین دن باقی تھے۔

جس روز جیہ پولو کھیلنے کے لئے گھوڑے پر سوار ہوئی تو گرد و پیش کے ماحول پر دھند اور کمر سایہ لگن تھی۔ ذرا دیر پہلے ہی پو پھٹی تھی اس لئے ہالی گھاس کو پانی دینے میں مصروف تھے۔ شاہی پولیٹین کے عین اوپر ایک جانب پرنس آف ویلز اور دوسری جانب مہاراجہ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔

وہ تمام دن پولو کی پریکٹس کرتی رہی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جب وہ آرام کرنے کے لئے اپنے خیمے میں جاتی تو گراؤنڈ کی دیکھ بھال پر مامور عملہ گھاس کی کٹائی اور صفائی ستھرائی میں مصروف ہو جاتا۔ ساتھ ہی ساتھ دوسری تیاریاں بھی جاری تھیں۔ جن میں پنچوں کی مرمت اور شاہی پولیٹین میں قالین بچھایا جانا شامل تھا۔

تیسری صبح جیہ حسب معمول پولو پریکٹس میں مصروف تھی کہ اس نے ایک اور گھڑ سوار کو گراؤنڈ میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ قریب آیا تو جیہ نے یک لخت اسے پہچان لیا۔ وہ جیس آبرن تھا۔ جیس نے ایک سفید بال زمین پر پھینکی اور جیہ کی طرف بڑھا۔

”مبارک ہو، شہزادی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”پرنس آف ویلز نے دو شیر شکار کئے ہیں اور ہاتھیوں کے ہانکے میں شرکت کی۔ اب وہ کل آپ کی پولو دیکھنے کے شدت سے

نہتر ہیں۔“

جیہ آگے آگے تھی اور جیمس عقب میں۔ جب بھی جیہ بال کو سامنے کی طرف سے ضرب لگاتی وہ اسے ضرور ٹوکتا۔ ”بال کو اپنے گھوڑے کی گردن کے نیچے سے ضرب لگائیں“ شنزادی۔ امریکیوں کی طرح۔ اپنے جسم کا وزن بھی چھڑی پر ڈالیں۔“

جیہ ہر بار ہدایات سختی اور ان پر عمل کرتی۔ اس کی شرٹ پسینے سے بھیگ کر جسم سے چپک گئی تھی۔ اس نے اپنے لمبے بال اپنے سر کے اوپر جوڑے کی شکل میں باندھ رکھے تھے لیکن ہر بار اسے جھٹکا لگتا اور اس کے بال کھل کر شانوں پر بکھر آتے۔

جب وہ پولو گراؤنڈ سے واپس آئی تو لیڈی موڈی ایک ٹرے میں جن کی بوتل اور برف کے قتلے لئے اس کی نہتر تھی۔

”بہت اچھے ڈارلنگ۔“ اس نے جیہ کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ ”پردے سے نکل کر سیدھی پولو گراؤنڈ میں۔ وہ بھی پرنس آف ویلز کے سامنے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہیں دیکھ کر بے چارے انگریزوں کو سن اسٹروک ہو جائے۔۔۔ میری پیاری جیہ، تم تو روایتی دیوی بنتی جا رہی ہو۔“

جیہ نے اپنے لمبے بال ماتھے پر لپیٹ لئے اور چاندنی ان میں سے ہیمنہ نچوڑنے لگی۔ پھر وہ ہاتھ روم میں نکھی تو چاندنی اس کے ساتھ تھی۔ وہ شنزادی کو غسل دے رہی تھی۔

”لوگ ایک شنزادی کو انگریزوں کے سامنے ننگے منہ دوڑتے بھاگتے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔“ اس نے جیہ پر پانی ڈالتے ہوئے سوال کیا۔ ”آپ ایک اسکینڈل کھڑا کر دیں گی۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ مہارانی بے وقوفی کے اس کھیل کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں۔۔۔“

چاندنی کا کماچ ہوا۔ مہارانی نے جیہ کو طلب کر لیا۔ جونہی وہ مہارانی کے پاس پہنچی اس نے ہاتھ کے اشارے سے ملازماؤں کو چلے جانے کو کہا۔ وہ جیہ سے تگلے میں بات کرنا چاہتی تھی۔

”تم نے بہت اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے بیٹی۔“ مہارانی کے پہلے جملے کے ساتھ ہی جیہ کے تمام اندیشے دھل گئے۔ ”ہمارے نزدیک یہ بات سب سے زیادہ اہم ہے کہ ہم پرنس آف ویلز کو کس طرح مرعوب کر سکتے ہیں۔ میں بھی کل تمہارا کھیل دیکھوں گی۔ وکٹر پولو نہیں کھیلے گا لیکن چونکہ میں بھی وہاں موجود ہوں گی اس لئے وہ اس امر کی اداکارہ سے عشق کی پیٹیکس بردھانے میں بھی خاصا محتاط رہے گا۔“

مہارانی اچانک خاموش ہو گئی۔ اس نے حقے کی نے منہ سے نکال اور آگے کو جھک

آئی۔ ”تم جوان ہو اور تمہارا تعلق عمر کے اس حصے سے ہے جسے میں سالوں پہلے گزار آئی ہوں۔ مجھے یہ تو بتاؤ کہ ان غیر ملکیتوں کے پاس کیسا جادو ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے میرے ہوتے کی روح کو اس قدر زخمی کر دیا ہے کہ وہ ایک سفید فام طوائف کو ہندوستان کے اس قدم تخت کی ملکہ بنانے پر بھند ہے۔“

جیہ اس لمحے خاموش رہی۔ اس سے فوری طور پر کوئی جواب بن نہ پڑا تھا۔ جب وہ اگلے روز اپنے گھوڑے پر بیٹھی پولو میچ کے آغاز کی منتظر تھی، تب بھی اس کے ذہن میں مہارانی کے الفاظ گونج رہے تھے۔ اس نے سرگھا کر گراؤنڈ کا جائزہ لیا۔

سیرپور کے معززین شہلی پولیٹین سے ملحق اسٹینڈ میں براجمان تھے۔ گراؤنڈ کے ارد گرد ہا قالین بچھائے گئے تھے وہ عوام کے گروہوں میں چھپ گئے تھے۔ محافظ میدان میں آ جانے والے بچوں کو پیچھے دھکیل رہے تھے کیونکہ اندھا دھند بھاگتے گھوڑے، انہیں کچل بھی سکتے تھے۔

سیرپور لانسرز کا ایک دست گراؤنڈ میں داخل ہوا۔ ان کے پیچھے چلنے والی ایک کھلی شہلی بکھی میں مہاراجہ وکٹر سوار تھا۔ جب کہ اس کے ساتھ پرنس آف ویلز بیٹھا تھا۔ دونوں ہاتھ ہلا کر جھوم کے نعروں کا جواب دے رہے تھے۔ پرنس آف ویلز، بکھی سے اترا تو نقارے بجا کر اس کا استقبال کیا گیا۔ مہاراجہ وکٹر نے پرنس کو سیرپور کی روایتی تلوار کا تحفہ پیش کیا تو جھوم نے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔

پرنس پر تپ پولو گراؤنڈ میں اترنے والا پہلا شخص تھا۔ ”آؤ شنزادی۔“ اس نے چلا کر اپنی بیوی کو مخاطب کیا۔ ”ذرا تم سے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔“

نقارے بجانے والوں نے پہلے چکر کے آغاز کا اعلان کیا۔ ماسٹر آف دی ہارس نے اچھلتے کودتے گھوڑوں کے درمیان سفید رنگ کی ایک بال گراؤنڈ پر اچھال دی اور دوسرے ہی لمحے گھڑسواروں نے بال کا تعاقب شروع کر دیا۔

جیہ، تیز رفتاری سے بال کے پیچھے تھی۔ وہ لوگوں کی ان انگلیوں سے بھی آگاہ تھی جو وہ اس کی طرف اٹھا رہے تھے۔ پرنس پر تپ اس کے مخالف کھیل رہا تھا اور گھوڑے کو تیز رفتاری پر مجبور کرنے کے لئے اس کی پسلیوں میں اپنی ایڑیاں چبھوئے بیٹھا تھا۔ بال جوئی اس کے پاس آئی، اس نے موگرے سے ایک زور دار ہٹ لگائی۔ کئی گھڑسواروں نے بال روکنے کی کوشش کی لیکن بال سیدھی گول لائن پار کر گئی۔ سرخ رنگ کے جھنڈے نے گول کنفرم کر دیا۔

بال دوبارہ پھینک دی گئی۔ پرنس پر تپ نے موگرے سے ضرب لگا کر بال جیہ کو دی۔ وہ جس گھوڑے پر سوار تھی اس کا شمار سیرپور اصطبل کے بہترین گھوڑوں میں ہوتا تھا۔ وہ نے گھوڑے کی رفتار تیز کرنے کے لئے ایڑیاں اس کی پسلیوں میں گاڑ دیں۔ گھوڑا گولی کی طرح آگے بڑھا۔ جیس آبرن اور ماؤنٹ بیٹن نے بال کو جیہ کے قبضے میں دیکھا تو آندھی اور طوفان کی طرح اپنے گھوڑے بھاگتے آگے آئے۔

جیہ نے موگرے کو سختی سے پکڑ لیا۔ وہ گھوڑے کی گردن پر جھک گئی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے سرگوشیوں میں اسے مزید تیز بھاگنے پر آمادہ کر رہی ہو۔ بال اس سے صرف چند گز دور تھا لیکن مخالفین کے گھوڑوں کی ٹاپیں وہ اپنے سر پر سن رہی تھیں۔ اس نے باگیں کھینچ کر گھوڑے کو ذرا ساموڑا اور موگرا پوری قوت سے بال پر دے مارا۔ بال اچھل کر گول کی طرف گیا۔

جیس آبرن اچانک سامنے آ گیا۔ جیہ کا گھوڑا پوری رفتار کے ساتھ اس کے گھوڑے سے ٹکرایا اور وہ چلا اٹھا۔ ”یہ فاول ہے“ شنزادی۔ ”اس سے پہلے کہ جیہ کچھ جواب دیتی“ گول کے سامنے سرخ رنگ کا جھنڈا لہرا دیا گیا۔ جیہ گول کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس چکر میں مزید دو بار بال جیہ کے پاس آئی۔ ایک بار اس نے بال اپنے شوہر کی طرف پھینکی۔ اس نے چلا کر شکریہ ادا کیا اور جیس آبرن کے درمیان میں آنے کے باوجود گول کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔

گھوڑے تبدیل کرتے وقت پرنس پر تپ نے اپنی بیوی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے گھوڑے سے اتارا۔

”مبارک ہو شنزادی۔“ اس نے جیہ کے کان میں سرگوشی کی۔ ”کو، مزا آیا۔“

جیہ نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شاہی پولیٹین سے پرنس آف ویلز نے ہاتھوں کے اشارے سے بہترین کھیل پیش کرنے پر جیہ کو مبارکباد دی۔

نقارہ بجا کر کھیل کے اختتام کا اعلان کیا گیا اور سیرپور لانسرز نے پریڈ کے انداز میں میزین شاہی پولیٹین کے عین سامنے لا بچائیں۔ پھر ان میزوں پر ایک بڑی ٹرائی اور آٹھ سلور کپ سجادیئے گئے۔

پرنس آف ویلز، مہاراجہ وکٹر کے ہمراہ گراؤنڈ میں آیا، جہاں جیہ اپنے شوہر کی آڑ میں دوسرے کھلاڑیوں کے ساتھ کھڑی تھی۔

”مبارک ہو شہزادی۔“ پرنس آف ویلز نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ ”تمہارا گول مقابلے کا سب سے بہترین گول تھا۔“

رات کو ضیافت میں اتنے لوگوں نے جیہ کو مبارکباد دی کہ اسے محسوس ہونے لگا کہ موت میں صرف وہ اور پرنس آف ویلز ہی شامل ہیں۔ اسے ان مبارکبادوں سے اس وقت ہلکا ملا جب ضیافتی ہال کے دروازے کھلے اور مسٹر سین گپتا اپنے آرکسٹرا کے ہمراہ نمودار ہوئے۔

پرنس پر تپ اپنی کرسی سے اٹھا اور جیہ کے بالوں پر جھک گیا۔ ”تم اگر رقص نہیں کر سکتی تو وکٹر کے قریب رہو۔ اسے زیادہ پینے مت دینا۔ ایسا نہ ہو کوئی انٹرنیشنل بات کہہ دے۔“

جیہ فرمانبرداری سے وکٹر کے ساتھ کلوچ پر جا بیٹھی۔ سفید فام عورتیں اس کے سامنے کھڑی ہو گئیں جو اپنے عاشقوں اور چاہنے والوں کے ساتھ چمیلیں کرنے میں مصروف تھیں۔ پرنس آف ویلز نے سیرپور کی متعدد خواتین کے ساتھ رقص کیا لیکن ہر بار وہ یہ سوچ کر پریشان ہو جاتا کہ دوران رقص وہ اپنے ہاتھ کہاں رکھے گا۔ جیہ نے بہت سی عورتوں کو اپنی ساڑھیاں لٹا کر کمرنگی کرتے دیکھا تاکہ وہاں انگریز کے ہاتھوں کا لمس محسوس کر سکیں۔

جونہی مہاراجہ وکٹر، پرنس آف ویلز کے پاس جانے کے لئے اپنی نشست سے اٹھا، جیمس برن، جیہ کے سامنے آگیا۔ اس نے جھک کر شہزادی کو تعظیم دی۔

جیہ نے اتنے دنوں میں پہلی بار غور سے اسے دیکھا۔ اس سے پہلے جب وہ اور اس کا بھائی دونوں دوست تھے تو قلعہ بالمیر میں اکثر اس نے جیمس کو آنکھوں میں بسایا تھا۔ اسے رکت کھیلے دیکھا تھا۔ شاہی جھروکے کے نیچے بھاگ دوڑ ہوتی تھی اور دہلی میں شاہی دربار کے معاملے پر بحث ہوتی تھی۔

لیکن دس سال میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ دونوں ہی وہ نہیں رہے تھے۔ جیمس مرد بن چکا تھا اور جیہ لڑکی سے عورت کا روپ دھار چکی تھی۔

اس نے نظریں اٹھا کر دوبارہ جیمس کو دیکھا تو وہ اسی کی طرف نگراں تھا۔ جیہ نے خود کو اس کی آنکھوں کے گہرے سمندر میں ڈوبتا محسوس کیا تو ہڑبڑا کر پلکیں جھکا لیں۔

”ہم نے بالمیر کے بارے میں کوئی بات نہیں کی،“ جیمس صاحب۔ ”جیہ نے توجہ ہٹانے کے لئے بات شروع کی۔“ ”تم آج رات روانہ ہو رہے ہو اور ممکن ہے اس کے بعد ملنے کا کوئی موقع نہ مل سکے۔“

”میں اب پولیٹیکل سروس میں ہوں شہزادی۔“ جیمس نے جواب دیا۔ ”کون جانتا ہے کہ میں ایک دن سیرپور کا برطانوی ریزیڈنٹ بن کر واپس سیرپور آ جاؤں۔“

سین گپتا کی آرکسٹرا نے پرنس آف ویلز کی روائگی کا اعلان کیا تو جیمس آسرن جیسے جھٹکا سالے کر ہوش میں آ گیا۔ وہ جیسے ہی الگ ہٹا پرنس آف ویلز گزرتے ہوئے جیہ کے سامنے رک۔

”ہم نے سیرپور میں شاندار وقت گزارا ہے، شہزادی۔“ اس نے ہنستے ہوئے جیہ سے کہا۔ ”ہم نے تمہارے شوہر سے کہا ہے کہ وہ جب بھی انگلینڈ آئے تمہیں ضرور ساتھ لائے۔“

رولس رائس گاڑیاں ڈرائیوے پر پارک کی جا چکی تھیں۔ باوردی شوفر گاڑیوں کے کھلے دروازوں کے سامنے مستعد کھڑے تھے۔ موٹر سائیکل اسکورٹ کے چاق و چوبند جوان انجن اشارت کرنے سے قبل مہاراجہ کی جانب سے پرنس آف ویلز کو الوداع کئے جانے کے منتظر تھے۔

”تم نے دیکھا یہ کس قدر آسان ہے شہزادی۔“ مہاراجہ اور پرنس ویلز جب ایک دوسرے سے رخصت ہو رہے تھے تو پرنس پر تپ نے اپنی بیوی کے کان میں سرگوشی کی۔ ”محض ایک سال پہلے میرے بیرون ملک سفر پر پابندی عائد کر دی گئی تھی اور اب پرنس آف ویلز مصر ہے کہ میں آؤں اگر تم اب بھی مہندی میں لدی ہوئی پردہ پیلس کی چار دیواری میں چھپی ہو تیں تو یہ دعوت کبھی نہ دی جاتی۔“

کاروں کے دروازے بند ہو گئے اور چیخ چنگھاڑتی موٹر سائیکلیں کاروں کے آگے روانہ ہو گئیں۔

”اب جبکہ تمہیں شاہی منظوری حاصل ہو گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں کلکتہ لے جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

پرنس پر تپ اب بھی اپنی بیوی سے مخاطب تھا۔ ”لیکن اس وقت اگر تم اجازت دو تو میں اپنے طور پر تفریح کر لوں۔“

وزیر اعظم نے جھک کر جیہ کو تعظیم دی۔ ”کیا میں آپ کے اپارٹمنٹ میں آپ سے ملاقات کر سکتا ہوں، شہزادی؟“

جیہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ کلکتہ کے ہاؤز اسٹیشن پر رک گئی۔ جیہ نے بھانت بھانت

کے وینڈروں کو مختلف اشیاء لے کر گاؤں کے پیچھے بھاگتے دیکھا۔ اس نے کلکتہ کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا چنانچہ اسے فوراً پتہ چل گیا کہ وہ اس شہر میں پہنچ گئی ہے جسے برطانوی شہنشاہیت کے دوسرے شہر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

جیہ بڑی مشکل سے راستہ بتاتی لیڈی مودی کے ساتھ اس رش سے نکل کر باہر نکل آئی جہاں سیاہ رنگ کی ایک ڈمبل اس کی منتظر تھی۔ لیڈی مودی نے کار میں بیٹھتے ہی ڈرائیونگ سیٹ کے عقب میں بنے ہوئے ایک چوبی پینل سے مارٹنی کی بوتل نکالی اور اپنے لئے ایک جام بنا لیا۔

ڈمبل آگے بڑھی اور تھوڑی دیر بعد وہ دریائے ہنگلی کا پل پار کر رہے تھے۔ ”ڈرائیونگ!“ لیڈی مودی نے جیہ کو مخاطب کیا۔ ”اس کے سامنے سیرپور کے پل کھلونوں جیسے نہیں لگتے۔“

جیہ نے پل کو دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ واقعی وہ بہت بڑا پل تھا۔ کار ڈبلوزی اسکوئرز پہنچی تو لیڈی مودی کی زبان پھر چلتی شروع ہو گئی۔ ”یہ عظیم برطانوی راج کے دفاتر ہیں۔“ اس نے جیہ کو بتایا۔ ”ہمیں ہندوستان کی تقدیر کے فیصلے ہوتے ہیں، اور یہ راسٹرز بلڈنگ ہے جہاں ہندوستانی کلرک، برطانوی بادشاہت کے خزانے گنتے ہیں۔“

کار ایس پینڈ پر مڑی تو سڑک کے پیچوں پہنچ نصب ایک انگریز کا مجسمہ دکھائی دیا۔ جیہ نے نظریں مجسمے سے ہٹا کر رکشاؤں میں بیٹھی ہوئی کالی بھنگ عورتوں کو دیکھا جنہوں نے مغربی لباس پہن رکھا تھا۔

”یہ اینگلو انڈین لڑکیاں ہیں۔“ لیڈی مودی نے اپنی معلومات جیہ کے کان میں اندیلیں۔ ”ان کے انگریز باپ ملک کے بالائی حصوں میں چائے کے باغات میں کام کرتے ہیں۔ یہ انگریز جب کلکتہ آتے ہیں تو اپنی محرومیوں کی قیمت وصول کرتے ہیں۔ رات کے وقت یہ کرائز اسٹریٹ کے قحبہ خانوں میں جاتے ہیں اور دن کے وقت.....“ لیڈی مودی نے سگریٹ ہولڈر سے سڑک کے کنارے بنی سفید رنگ کی عمارتوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”بنگل کلب یا کلکتہ کلب میں شراب نوشی کرتے ہیں.... یہ دونوں کلکتہ کے ان کئی کلبوں میں سے ایک ہیں، جن پر لکھا ہے کہ کتوں اور ہندوستانیوں کو داخلے کی اجازت نہیں۔“

سڑک پر بنی عمارتوں کے عقب سے ایک بلند و بالا کیتھڈرل کے آثار ظاہر ہونے شروع ہو گئے۔ کیتھڈرل کے عقب میں سنگ مرمر کا ایک گنبد دھوپ میں چمک رہا تھا۔

”وکتوریہ میموریل۔ وکٹر کی منہ بولی ماں وکتوریہ کی یاد میں اسے تعمیر کیا گیا ہے۔ سیرپور کے مہاراجہ نے اس یادگار کے لئے خاصا بڑا عطیہ دیا تھا۔“

”کیا تمہارے خیال میں برطانوی راج نے ہندوستان میں اپنی طاقت کے اظہار سے ہٹ کر بطور محبت بھی کچھ بنایا ہے مادام۔“ جیہ کی آواز میں کٹ تھی۔

لیڈی مودی نے بھی پر تجسس انداز میں جیہ کو گھورا۔ ”کیا دقیانوسی سوال ہے.... لیکن اس کا جواب ہے، نہیں۔“ اس نے ایک پارک کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور یہ ہے ان کی طاقت کا فوارہ۔ فورٹ ولیم۔“

جیہ کو پارک کے ساتھ ایک مضبوط عمارت دکھائی دی۔ جس کے گرد نسبتاً کم اونچی فصیل تھی۔ فصیل پر جا بجا توپیں نصب تھیں۔ جبکہ مرکزی گیٹ کی بلند گھر پر یونین جیک لہرا رہا تھا۔ جیہ کو اس قلعے میں شان و شوکت دکھائی نہ دی تھی یا ممکن ہے وہ اس سے متاثر نہ ہوئی تھی۔

کار فورٹ ولیم کے سامنے سے گزرتے ہوئے پل پارکر کے ریلی پور میں داخل ہوئی اور پھر اس کا رخ کلکتہ زولو جیکل گارڈن کی طرف ہو گیا۔ گارڈن کے بالکل ساتھ گورنمنٹ ہاؤس تھا جہاں کلکتہ کے دورے کے دوران دائرہ قائم کرتا تھا۔

تب ہی ان کی کار سیرپور ہاؤس جانے والی ذیلی سڑک پر مڑی۔ یہ سنگ مرمر سے بنی ہوئی ایک دو منزلہ عمارت تھی جسے چاروں طرف سے بلند و بالا درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ جیہ جونہی سیرپور کے حکمرانوں کی کلکتہ رہائش گاہ کے بلیک ماربل ہال میں داخل ہوئی وہ سمجھی کسی میوزیم میں آگئی ہوں۔ سیڑھیوں کے نیچے سے حنوط کئے ہوئے شیر اور چیتے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے اسے گھور رہے تھے۔ دیواریں شیروں کی کھالوں سے لٹی ہوئی تھیں اور ان کے بچوں بیچ ملکہ وکتوریہ، شاہ جارج اور ملکہ میری کی تصاویر آویزاں تھیں۔

جیہ نے اس چیز یا گھر کو دیکھ کر برا سامنہ بنایا تو لیڈی مودی کھل کھلا کر ہنس دی۔ ”یہ سب برطانویوں کو وکٹر کی وفاداری کا یقین دلانے اور جنگ میں اس کی بہادری کا رعب جھانڈنے کے لئے ہے اور اب اپنی پوجا پاٹ میں بالکل ہی غرق نہ ہو جانا۔ یاد رکھنا ہم چائے کے لئے فلوریز میں مدعو ہیں۔“

جیہ کا اپارٹمنٹ اوپر تھا۔ سفید اور سنہرے رنگ سے بنا ہوا۔ ایک خوبصورت اپارٹمنٹ۔ جس کی کھڑکیوں سے آنے والی روشنی سے نیچے والے ہال کا اثر زائل ہو گیا تھا۔ فلوریز ٹی روم پہنچ کر جیہ کو اندازہ ہوا کہ فلوریز کے مالکان نے لیڈی مودی کو اب تک

نہیں کیا کیونکہ وہی جیہ کو ٹینس سکھانے کے لئے ان کے پیٹرنی شیفت، مارکو کو چرا لے گئی تھی۔ لیڈی مودی ان کی طرف ہاتھ لہراتی ہوئی میزوں کے درمیان گزرتی چلی گئی۔ بارہ ایک کونے کی میز پر رک گئی۔ اس نے پہلے جیہ کو کرسی دئی اور پھر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

ویٹر فوراً آرڈر کے لئے پہنچا۔ جب تک چائے آئی، لیڈی مودی ہال میں بیٹھے ہوئے صوفے سے زائد افراد کو غائبانہ طور پر جیہ سے متعارف کروا چکی تھی۔

”تمہارے دائیں جانب انیٹا ڈنگاڈو ہے۔“ لیڈی مودی کے سگریٹ ہولڈر کے اشارے پر جیہ نے سرخ بالوں والی ایک خوبصورت، گوری چٹ، دہلی تپتی عورت کو دیکھا جو پیٹرنی ٹرائل کا جائزہ لے رہی تھی۔ ”یہ اپنی مہارانی ہے۔“ لیڈی مودی بول رہی تھی۔ ”مہاراجہ پور تلہ سے شادی کرنے سے پہلے یہ کلبوں میں رقص کیا کرتی تھی۔“

جیہ نے دیکھا کہ اپنی رقصہ جو اب پور تلہ کی مہارانی تھی، نے ساڑھی پہن رکھی تھی۔ ”اس نے کچھ ہی عرصہ قبل کپڑوں سے بے نیاز اپنا ایک قد آدم پور ٹریٹ بنوایا ہے جو اب جگہ لٹکایا گیا ہے جہاں محل میں آنے جانے والی پور تلہ کی ساری رعایا کی نگاہیں اس کے جلوں سے فیض یاب ہوتی ہیں۔“

”کیا بکواس ہے۔“ جیہ بے اختیار کہہ اٹھی۔ ”بھلا ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟“ ”یہ سچ ہے۔“ لیڈی مودی اپنے کئے پر ڈٹی ہوئی تھی۔ ”جب بھی مشرق، مغرب سے ناہے، ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ برطانوی راج خود اصرار کرتا ہے کہ ہندوستانی حکمران ہر ملکی عورتوں سے شادیاں کریں لیکن ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ ان کی اولادیں تخت و تاج کی وارث نہیں بن سکتیں۔ چائے پو اور غور کرو کہ مہارانی بننے سے پہلے اس اپنی قاصدہ کے دوستوں نے اس کا کیا حشر کیا ہو گا؟“

جیہ چائے کی چسکیاں لیتی ہوئی اپنی عورت پر غور کرتی رہی لیکن وہ لیڈی مودی کی بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکی تھی۔

”یہ لڑکی رقص کے بعد پھولوں کے گنڈولے میں بیٹھ کر تماشا بینوں پر پھول پھنکھارتی تھی۔“ لیڈی مودی نے جیہ کی معلومات میں اضافہ کیا۔ ”بس مہاراجہ جیند، اس کی ماوا پر مرنا اور آج یہ اس کی مہارانی ہے۔۔۔ اور ادھر دیکھو۔ ان تین آر مینیائی لڑکیوں سے کوئی ایک نیپال کی مہارانی ہو سکتی ہے۔“

جیہ نے بائیں جانب دیکھا۔ سفید شیٹوں کے لہلوں میں لپٹی ہوئی تین خوبصورت

لڑکیاں باتوں میں مصروف تھیں۔

”مہاراجہ نیپال نے ان تینوں کو اپنے بستر کی زینت بنانے کی کوشش کی تھی۔ اس کی توجہ کے باعث ان کے شوہروں نے ان سے قطع تعلق کر لیا اور مہاراجہ نے درمیان میں بیٹھی ہوئی لڑکی کو اس کے حسن کے اعتراف اور خراج کے طور پر یا قوت سے بھری ہوئی ایک ٹوکری تھنے میں بھیجی۔“

لیڈی مودی بولتی رہی اور جیہ سنتی رہی۔ وہاں موجود ہر سفید چڑی والی لڑکی یا مہارانی تھی یا مہارانی بننے جا رہی تھی۔ اب وہ سمجھی کہ مہاراجہ وکٹر اور پرنس پر تپ بھاگ بھاگ کر کلکتہ کیوں آتے تھے۔

سیرپور ہاؤس پہنچنے پر مصاحسین نے جیہ کو آگاہ کیا کہ مسز رائے اس کے لپارٹمنٹ میں منتظر ہیں۔

جیہ نے سنگ مرمر کی سیڑھیاں تقریباً بھاگتے ہوئے طے کی تھیں۔ اسے اپنی پرانی ٹیڈ کے آنے کی بے حد خوشی ہوئی تھی۔

سوئی ساڑھی میں ملبوس مسز رائے نے پہلے جیہ کو جھک کر تعظیم دی اور پھر اپنے بازوؤں میں چھپا لیا۔ جیہ کو یوں محسوس ہوا جیسے بیٹے دن لوٹ آئے ہوں۔

مسز رائے ایک قدم پیچھے ہٹی اور اپنے چٹھے کے عقب سے تاویر اپنی سابق شاگردہ کا جائزہ لیتی رہی۔ تب اس نے پاندان نکالا اور وہ چیزیں منتخب کیں جنہیں جیہ پسند کیا کرتی تھی۔ اس نے پان بنا کر جیہ کو پیش کیا۔

جیہ نے سر کو نفی میں جنبش دی۔ ”ہمارے شوہر نے ہمیں پان چبانے سے منع کر دیا ہے۔ ہمارے دانت اس سے سرخ ہو جاتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ ہم دیہاتی لگتے ہیں۔“

مسز رائے کی آنکھوں میں شناسا غصے کی جھلک اٹھ آئی۔ ”سفید دانت آپ کی جلد کا سفید نہیں کر سکتے، شنزادی۔“ وہ تیز آواز میں بولی۔ ”فرانسیسی پرفیوم کی بوتلیں اٹھیلنے یا یورپی عورتوں کی طرح اپنی بھوؤں کے بل نوچنے سے بھی کچھ نہیں ہو گا۔ برطانویوں نے آپ کے شوہر کو خود سے نفرت کرنا سکھا دیا ہے۔ اس کی طرح بننے کی کوشش مت کریں شنزادی۔ ورنہ آپ اپنی پہچان بھی کھو دیں گی۔ کیونکہ جو۔۔۔۔۔“

جیہ نے آنکھیں گھمائیں۔ ”ہم ان کی طرح نہیں بننا چاہتے۔ مسز رائے۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ وہ ہمیں اپنی بیوی سمجھیں۔“

”میں آپ کو متنبہ کر رہی ہوں، شنزادی۔ اگر آپ کی سوچ یہی رہی تو ایک دن آپ

کو اپنے حقوق کے لئے لڑنا پڑے گا۔“

جیہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ مسز رائے کی قوم پرستانہ سوچ میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ مسز رائے نے لیڈی مودی کو دروازے سے اندر آتے دیکھا تو دونوں عورتوں نے رقبت کے ایک عجیب سے جذبے کے تحت ایک دوسرے کا جائزہ لیا۔ جیہ نے باری باری دونوں کو دیکھا اور اس نے اندازہ کر لیا کہ دونوں کے درمیان سرد جنگ شروع ہو چکی ہے۔ اور ہوا بھی یہی۔

اگر ایک شام ہمیں جواہرات میں لدی پھندی لیڈی مودی اسے اینگلو انڈین لڑکی اسی مورے کا رقص دکھانے لے جاتی جس نے کلکتہ میں تملکہ چا رکھا تھا تو اگلی شام سوتی ساڑھے میں ملبوس مسز رائے، جیہ کو انڈین تھیٹر لے جاتی جہاں اسٹیج ہونے والے ڈراموں کے آرٹسٹ آزادی کے حق میں منسکرت میں لمبی لمبی تقریریں کرتے۔ اگر جیہ نے گزشتہ روز، نیو مارکیٹ میں فرانسیسی شیفون کی خریداری میں گزارا ہوتا تو مسز رائے اسے کلکتہ کے مضافاتی علاقے میں ان گندے اسکولوں میں لے جاتی جہاں لڑکے پڑھائی کے بعد ہاتھ کی کھڈیوں پر لٹھا اور کھدر بٹتے تھے۔

اگر مسز رائے، جیہ کو کھانے کے لئے کسی مقامی ریستورانٹ میں لے جاتی تو لیڈی مودی پر فرض عائد ہو جاتا کہ وہ جیہ کو لازمی طور پر چائنا ٹاؤن لے جائے اور چائپ اسٹکس کے ساتھ کھلائے۔

رفتہ رفتہ جیہ کو یہ احساس ہوتا گیا کہ وہ دو شہروں میں رہ رہی ہے اور یہ دونوں شہر پر قبضہ کلبوں اور برطانوی راج کے عظیم الشان دفاتر نے ایک دوسرے سے الگ کر رکھے ہیں۔

ہر شام سیرپور ہاؤس واپس آتے ہوئے وہ فورٹ ولیم کی غیر متاثر کن دیواروں کو دیکھتی اور سوچتی کہ انگریز اس چھوٹے سے قلعے سے اس یونین جیک کے نیچے بیٹھ کر کس طرح عظیم الشان ہندوستان پر حکومت کر رہا ہے۔

مسز رائے اور لیڈی مودی کے درمیان سینڈویچ بنی، جیہ کو بالآخر اطلاع ملی کہ مداراج وکٹر اور پرنس پر تپ، ڈربی میں حصہ لینے کے لئے سیرپور سے کلکتہ روانہ ہو چکے ہیں۔ گھوڑوں کی ریس میں کلکتہ کی ڈربی کو ایک نہایت اہم مقام حاصل تھا۔ ڈربی کا سیزن شروع ہوتے ہی کلکتہ، مختلف ریاستوں کے شہزادوں سے کچا کھج بھر جاتا۔ ہندوستان کے بہترین اسٹبلوں کے گھوڑے دوڑ میں شرکت کے لئے کلکتہ لائے جاتے۔ ان میں آغا خان،

بیکانیر، راج، پپلا، گوالیار، میسور، کوچ بہار۔ ڈنگرا اور دیگر ریاستوں کے مہاراجاؤں کے اصطبل کے گھوڑے شامل ہوتے تھے۔

وائسرائے، کرمس گزارنے کے لئے وہاں سے کلکتہ آچکا تھا اور اس وقت گورنمنٹ ہاؤس میں قیام پذیر تھا جو سیرپور ہاؤس کے بالکل قریب تھا۔ جیہ کو علم تھا کہ کرمس کے سلسلے میں ہر رات وائسرائے کی رہائش گاہ پر پارٹیاں منعقد ہوتی تھیں۔

بالآخر سیرپور برادرز، کلکتہ پہنچ گئے لیکن جیہ کو وہ کبھی کبھی ہی دکھائی دیتے۔ صبح ہی صبح وہ رائل کلکتہ ٹرف کلب چلے جاتے۔ سیرپور کے گھوڑوں پر مامور ٹیز اور جاکی ان کے ساتھ ہوتے۔ راتوں کو وہ شراب کے نشے میں ایسے دھت واپس آتے کہ ملازم انہیں بیڑھیاں چڑھاتے۔

یہ لیڈی مودی ہی تھی جس نے جیہ کو بتایا کہ پرنس پر تپ کم از کم درجن بار اسکی مورے کا رقص دیکھنے گلوب تھیٹر جا چکا ہے۔ ”میں سمجھتی ہوں کہ پر تپ اور کشمیر کا ہری سنگھ، لڑکی کو جیتنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔“

جیہ کے منہ میں کڑوا کیپول ٹوٹ گیا لیکن اس نے اپنا رد عمل مودی سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی تھی۔

اچانک لیڈی مودی اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ ”وقت دیکھو، ڈارلنگ! چھوٹا، فہرو میں بیٹھا سوچ رہا ہو گا کہ ہمیں کیا ہو گیا ہے؟“

کار میں لیڈی مودی نے اسے بتایا کہ فہرو، ایشیا میں سب سے پرانا ریسٹورنٹ ہے اور یہ اسی وقت بنا تھا جب سوز کینال تعمیر ہوئی تھی۔

”یہ ہمارا میکسم ہے ڈارلنگ۔ شگھائی کے لانگ بار کے بعد فہرو کا دینی ٹن بار ہے۔ دنیا کا طویل ترین بار ہے۔“

لیڈی مودی یہاں کی بھی ایک پرانی گاہک تھی۔ سیڑھیوں پر بے تحاشا افراد نے لیڈی مودی کا استقبال کیا جبکہ جیہ بے وقوفوں کی طرح ایک کونے میں کھٹی یہ سب دیکھتی رہی۔

”ہماری بے خوف شنواؤں کیسی ہے؟“ چھوٹے ڈنگرا نے میز کے عقب میں رکھی کرسی سے بے مشکل اٹھ کر جیہ کا استقبال کیا اور جیہ وہ دن یاد کر کے مسکرا دی جب اس نے بالمر کی پردہ دار خواتین کے ساتھ مہاراجہ جے سنگھ کے دربار میں اسے پہلی بار دیکھا تھا۔

”مجھے تمہارے پولو ٹیم کے بارے میں سن کر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔“ چھوٹا ڈنگرا کہہ رہا تھا۔ ”پر تپ ہمیشہ سے اپنی عورتوں سے غیر معمولی کام کروانے کا ماہر ہے۔“ چھوٹا ڈنگرا

دوبارہ کرسی میں فٹ ہو گیا جبکہ لیڈی مووی انہیں تنہا چھوڑ کر دوستوں کے گروپ میں غائب ہو گئی۔

جیہ کچھ دیر خاموش بیٹھی ہونٹ کاٹتی رہی۔ چھوٹے کو سامنے دیکھ کر اسے ماضی یاد آ گیا تھا۔ بالآخر اس کے ہونٹ وا ہوئے۔ ”ہماری والدہ کیسی ہیں، حکم!“

جیہ کی توقع کے برعکس چھوٹے کے چہرے پر عزت و احترام کے جذبات اٹھ آئے۔ ”میرے والد نے کچھ اراضی ان کی خدمت میں پیش کر دی تھی۔ انہوں نے اپنے زیورات فروخت کر کے اس رقم سے ایک اسکول۔ ایک شفاخانہ اور ضرورت مندوں کے لئے ایک آشرم تعمیر کر لیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انہیں ڈنگرا میں ایک دیوی کا رتبہ حاصل ہے۔ ہم انہیں سستی مانتا کہتے ہیں۔“

جیہ کو سانپ والی سستی مانتا یاد آ گئی۔ جس نے پہلے ہی اس کی اپنی زندگی اور اس کی ماں کے بارے میں بہت سی پیش گوئیاں کر دی تھیں۔

بار میں کسی کی آمد سے ڈنگرا کا سلسلہ کلام منقطع ہو گیا۔ جیہ نے پلٹ کر دیکھا۔ گلوب تھپڑ کی رقصہ اتسی مورے دروازے میں موجود بڑے بڑے شریف زادوں کو دھکم پیل کرتے دیکھا تاکہ لمبی لمبی ٹانگوں والی اس ڈانسر کے قریب جا سکیں، جس نے گلابی رنگ کی ایک میکسی زیب تن کر رکھی تھی۔ اتسی مورے نے سر پر ایک ہیٹ پہن رکھا تھا جبکہ بڑی بڑی آنکھیں ایک مہین نقاب میں پوشیدہ تھیں۔ اس کا مغرورانہ انداز بتا رہا تھا کہ وہ اپنے لئے مردوں کی دیوانگی سے بخوبی آگاہ ہے۔

چھوٹا میز پر آگے جھکا۔ ”تم جانتی ہو شہزادی کہ تمہارے بعض کلفذات میرے پاس محفوظ ہیں۔ مجھے امید ہے کہ پر تپ نے تمہاری شادی سے بہت کچھ بنا لیا ہو گا۔ مجھے یاد دلانے دو کہ وہ تمہارے جینز کی مد میں اب بھی بالمیر سے ایک بڑی رقم ہر سال حاصل کرتا ہے۔ تم کسی بھی صورت میں اسے اپنے نجی سرمائے کے بارے میں نہیں بتاؤ گی۔ ورنہ وہ اس دولت کو بھی کسی عورت پر لٹا دے گا۔ اور پھر تمہارے مالی معاملات برٹش پولیٹیکل آفس کی خفیہ فائلوں میں کہیں دفن ہو جائیں گے۔“

”کیا برطانویوں نے سیرپور پر بھی کوئی خفیہ فائل بنا رکھی ہے، حکم؟“ جیہ نے چونک کر پوچھا۔ اسے حیرت تھی کہ کیا برطانوی راج اس بارے میں جانتا ہے کہ پرنس پر تپ اپنی راتیں اس کے ہمراہ نہیں گزارتا۔

”کیوں نہیں؟“ چھوٹے نے اس کے بدترین خدشات کی تصدیق کی۔ ”حکومتیں اسی

طرح چلتی ہیں۔ ہم ان لوگوں کو خریدتے ہیں اور وہ ہمارے لوگوں کو خریدتے ہیں۔ ہر کسی کے بارے میں باخبر رہتا ہے۔۔۔ اور جہاں تک سیرپور برادرز کا سوال ہے۔ ان کے بارے میں تو بچہ بچہ جانتا ہے۔“

لیڈی مودی ریسٹورنٹ کے دروازے میں کھڑی ان کی طرف ہاتھ لہرا رہی تھی۔ چھوٹا ڈنگرا جیہ کو ایک دوسرے کمرے میں لے گیا اس بلند و بالا کمرے کی دیواروں پر چودہ فٹ طویل شیشے نصب تھے۔ سفید کپڑوں میں ملبوس آرکسٹرا ڈانس کی دھن بجا رہا تھا۔ جیہ نے بت سے انگریزوں اور ہندوستانیوں کو بانسوں میں بانس ڈالے رقص کرتے دیکھا تو اسے یقین نہیں آیا کہ محض تین سو گز کے فاصلے پر موجود برطانوی کلبوں پر لکھا ہوا ہے کہ کتوں اور ہندوستانیوں کو داخلے کی اجازت نہیں۔

”کئی لوگوں کی نگاہیں تم پر مرکوز ہیں، ڈارلنگ۔“ لیڈی مودی نے اسے بتایا۔ ”یقیناً وہ پرنس آف ویلز کے دورہ سیرپور کے بارے میں بات چیت کر رہے ہوں گے۔“ جیہ نے متوحش نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا تو لیڈی مودی نے قریبی میز پر بیٹھی ہوئی دو بنگالی لڑکیوں کی طرف جیہ کی توجہ مبذول کروائی۔

”چیراپ ڈارلنگ۔“ اس نے جیہ کو تسلی دی۔ ”تم ہندوستان کی واحد بہادر اور باہمی عورت نہیں ہو۔ ان لڑکیوں کو دیکھ رہی ہو نا؟ چھوٹی لڑکی عورتوں کی پولو ٹیم کے ساتھ پبلک کے سامنے پولو کھیلتی ہے اور وہ دوسری جو اس کے سامنے بیٹھی ہے، ہندوستان کی پہلی عورت یا مرد ہے جس نے ہوائی جہاز میں سفر کیا ہے۔“

جیہ نے آئینے کی دیواروں والے اس ریسٹورنٹ کا جائزہ لیا۔ مہاراجہ کپور تھلا اپنی اپنی رقصہ مہارانی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ایک دوسری میز پر مہاراجہ آف جنڈ اپنی بھوری بلی کو مینو دکھا رہا تھا۔ جیہ کی نگاہ دروازے کی طرف اٹھی۔ ایک نوجوان گلوب تھیٹر کی رقصہ کے ساتھ اندر داخل ہو رہا تھا۔

لیڈی مودی چھوٹے ڈنگرا کی طرف جھکی۔ ”اسی مورے کو دیکھو۔ کشمیر کے دلی عہد سے عشق لڑا رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کشمیر کی مہارانی بننے کے خواب دیکھ رہی ہے۔۔۔۔۔ بے چارہ پر تپ۔۔۔۔۔ یہ کامیاب ہو گئی تو اس کا کیا بنے گا؟“

جیہ نے آنکھیں جھکا کر پالش زدہ ناخن سے نیبل کلاتھ کو کھرچنا شروع کر دیا۔ فی الحال غصہ اسی طرح اتارا جاسکتا تھا۔

سیرپور ہاؤس میں جیہ کی ڈریسنگ ٹیبل پر ایک لفافہ اس کا منتظر تھا جس پر مسز رائے کی

تحریر میں جیہ کا نام لکھا ہوا تھا۔ جیہ نے لفافہ کھولا تو اسے اخباری تراشے کے ساتھ لپٹ لٹتے نظر آیا۔

”میری پیاری شہزادی۔ یہ خط گزشتہ روز بمبئی کرائیکل میں شائع ہوا ہے۔ میرے خیال میں یہ آپ کی دلچسپی کا باعث ہو گا۔“
 جیہ نے تراشا پڑھنا شروع کیا۔
 ہندوستانی عورتوں کا مقام۔

ایک داستان الم، ایک دکھاری کی زبانی۔

بظاہر یہ بڑا عجیب سا لگے گا کہ میری کلاس اور میرے رتبے کی کوئی عورت عام لوگوں کی مدد کی طالب ہے۔۔۔۔۔ اور وہ بھی ایک اخبار کے ذریعے لیکن انسانی محسوسات اور صبر کی اہم ہر حال ایک حد متعین ہے۔

میرا تعلق شاہی خاندان سے ہے لیکن اس کے باوجود شاید آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ کئی نسلوں سے ہم ناقابل بیان اور ناقابل یقین غلطیوں کا خیا زہ بھگت رہی ہیں۔ ہماری مای بوڑھیوں نے نہایت ذلت سے کھٹے ہوئے ماحول میں زندگیاں گزاری ہیں۔ انہوں نے اس بات کی اجازت دی کہ ان سے کتوں جیسا سلوک کیا جائے۔ ہماری مائیں چیخنی چلائیں لہن جب درد کی شدت بڑھی تو انہوں نے موت کو گلے لگا لیا لیکن نئی نسل نے احتجاج کی رم اپنائی ہے۔

ہم بھلا احتجاج کیوں نہ کریں؟ ہم بھی آخر انسان ہیں اور خواب دیکھنے کا حق رکھتے ہیں۔

میرے رتبے کے لوگوں کی شادیاں اس وقت کر دی جاتی ہیں جب وہ نوجوان بلکہ نوخیز ہوتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ جب ہمیں بعض اجنبیوں کی گودوں میں ڈال دیا جائے گا تو اہل ان شادیوں کا انجام کیا ہو گا؟ لیکن جب میں کچھ بڑی ہوئی تو مجھے پتا چلا کہ جس شہزادے سے میری شادی ہوئی ہے اس کا تعلق ایک بڑے گھر سے ہے۔

ایک روز مجھے خبر ملی کہ میرے شہزادے کے بعض دوسری عورتوں سے بھی تعلقات ہیں جن کے ساتھ وہ ہفتوں گزارتا ہے۔ میں مارے شرم کے زمین میں گر گئی۔ مجھ میں مت نہیں تھی کہ میں اپنی ملازماؤں کا سامنا کر سکوں۔ جب شہزادہ لوٹ کر میرے پاس آیا تو وحشی بن گیا۔ اس نے جو کچھ مجھے بتایا اور کرنے کو کہا۔ وہ میرے لئے ناقابل یقین تھا۔

بھگوان تنہا ہی جانتا ہے کہ ہمارے ہندوستانی شہزادوں کو کیا ہو گیا ہے؟ ان میں سے بیشتر

سفید چڑیوں کے پیچھے کیوں دوڑتے ہیں؟ انہیں اپنے نام و نسب، خاندان، تخت اور مڑا
آبرو کا پاس کیوں نہیں؟“

کتنی شرم کی بات ہے کہ ان میں سے کئی صرف اس لئے یورپ جاتے ہیں کہ بلا ملک
ٹوک عیاشی کر سکیں۔ وہ اس عیاشی کے لئے اپنی حکمرانی کے تقاضوں اور فرائض کو پس
ڈال دیتے ہیں۔ شہزادے تو برطانوی راج کے سامنے اپنی شکایتیں پیش کر دیتے ہیں، ہم
ہماری شکایتیں کون سنے گا؟“

ہمارے ساتھ جانوروں کی طرح سلوک کیا جاتا ہے۔ ہمیں غلام سمجھا جاتا ہے۔ ہمارا
صرف اپنے آقاؤں کی جائز اور ناجائز خواہشیں پوری کرنا رہ گیا ہے۔ ہم اپنے آقاؤں
ہاتھوں میں کھلونا ہیں۔ وہ چاہیں تو ہمیں کپڑے پہنا دیں اور چاہیں تو سربازار کپڑے پھال
ہمیں عریاں کر دیں۔

ہر ہر قدم پر میری توہین کی جا رہی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ محل میں عزت نفس نام کا
کوئی چیز نہیں ہوتی۔

میں باقاعدہ اور مستقل بنیادوں پر اپنا مقام چاہتی ہوں اور ان بے زبانوں کے لئے
چاہتی ہوں جن کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیا جا رہا ہے۔

تم سیاسی طو پر بالغ مرد! اپنے حقوق کی جنگ تو لڑ رہے ہو..... لیکن کیا اپنی ہندوستان
بہنوں کی غم و اندوہ میں ڈوبی پکار نہیں سنو گے؟

ہمارے کوئی حقوق نہیں ہیں!
میں اپنے حقوق چاہتی ہوں۔

جیہ نے اپنے پالش زدہ ناخنوں کو دیکھا۔ اس خط میں اسے اپنی کمائی اور اپنا پر تو دکھائی
تھا۔ اس کی نظریں دوبارہ تراشے پر جم گئیں۔

ایڈیٹر کانوت۔
پڑھنے والے یہ بات ذہن میں رکھیں کہ یہ ایک مہارانی کا خط ہے، جس کا شوہر ایک

اعلیٰ نسب کا شہزادہ ہے۔
"میں آپ کو قوم پرست رہنماؤں سے ملوانا چاہتی ہوں۔ جو سمجی کرانیکل میں خط لکھ

والی شہزادی جیسی عورتوں کی مدد کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ خاص طور پر میں آپ
کو ہندوستان کے عظیم شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کے پاس لے جانا چاہتی ہوں، کیا آپ اس

بارے میں جانتی ہیں؟“

مسز رائے کے سوال میں وہی بے صبرا پن تھا جو شہزادی جیہ کی کم سنی کے وقت ہوا تھا۔ جب جیہ نے انکار میں سر ہلایا تو مسز رائے نے تیوریاں چڑھالیں۔

لیکن ٹیکور واحد ہندوستانی ہے جس نے ادب میں نوبل پرائز حاصل کیا ہے، شہزادی ہٹلر کا خطاب یافتہ بھی ہے۔ پنجاب میں قتل عام کے بعد اس نے اپنا خطاب کر دیا ہے۔ اب اس نے ایک یونیورسٹی قائم کی ہے جہاں ہندوستانی اپنا قومی ورثہ بھروسے کے بغیر تعلیم حاصل کر سکیں گے۔ بالکل وہی خواب جو آپ کے والد نے سائنس کی صورت میں دیکھا تھا اور جسے مہاراجہ جان نے بند کر دیا ہے۔ ”مسز رائے نے ایک کے لئے توقف کیا۔ پھر بولی۔ ”آپ بھی اپنا قومی ورثہ بھولتی جا رہی ہیں، شہزادی!“

مسز رائے کے لیکچروں سے پریشان ہو کر جیہ نے کلکتہ کے مضافات میں مسٹر اور مسز کے گارڈن ہاؤس میں چائے کی دعوت اور ایک میوزیکل ایونگ میں شرکت کی دعوت مان کر لی۔

کپڑے پہنتے ہوئے جیہ کو اپنے جیول کیس کی تہ میں رکھا ہوا وہ ہیرا نظر آ گیا جو کئی پہلے ارون رائے نے اسے دیا تھا۔ جیہ نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اسے اپنی گردن میں لیا۔ اسے یاد آیا کہ تحفہ لیتے وقت اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ کسی خفیہ راز کے حامل ہو۔

جیہ ڈرائیور کے ہمراہ کلکتہ کے مضافاتی علاقے میں واقع مسٹر اور مسز رائے کے گارڈن پہنچی تو دونوں میاں بیوی نے نہایت تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا۔

مسز رائے اسے ایک کوریڈور میں لے گئی جس کے اطراف لکڑی کی بڑی بڑی الماریاں تھیں۔ ان کے اندر فیلٹ ہیٹ۔ چھتریاں اور تھری پیس سوٹ لٹک رہے تھے۔

”یہاں ہمارے شوہر یورپی کپڑے اتارتے ہیں۔“ مسز رائے نے جیہ کی استغماہی نگاہوں کو جواب میں کہا۔ ”برطانوی ہند میں ہندوؤں کو اپنا قومی لباس پہن کر برطانوی دفاتر میں آنے کی اجازت نہیں اور ہماری بڑی بوڑھی عورتیں، مردوں کو اس وقت تک گھر کے اندر آنے دیتیں جب تک وہ غلامی کا یہ یونیفارم اتار نہیں دیتے۔“

جیہ کو چپ لگ گئی۔ وہ فرانسیسی شیفون پہن کر ان دقیانوسی عورتوں سے ملنے آئی

راہداری لان تک آئی تھی، جس میں بہت سے لوگ کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ مردوں کوٹیاں پہن رکھی تھیں جبکہ عورتیں سوتی ساڑھیوں میں تھیں۔

”ٹیگور“ ایک سفید ریش آدمی باڑھ سے نکل کر ان کی طرف بڑھا تو مسز رائے نے جیب کے کلن میں سرگوشی کی۔

کسی نے اس کا ہاٹ لے کر پکارا تو شاعر نے ہاتھ لہرا کر جواب دیا اور پھر جیب کی طرف مڑا۔

”یہ موتی لعل نہو ہے۔“ مسز رائے نے تعارف کروایا۔ ”یہ پکا یورپی تھا لیکن گاندھی نے اسے ہندوستانی بنا دیا ہے۔ اس نے اپنے راسک کے سوٹ اور فرانسیسی شرٹس آگ کی نذر کر دی ہیں۔ آپ اس بارے میں کیا کہتی ہیں، شنزادی؟“

جیب نے غیر ارادی طور پر اپنی شیٹوں کی ساڑھی کو اپنے بدن کے گرد کس لیا۔ سفید ریش شاعر نے شنزادی کی حرکت دیکھی تو زیر لب مسکرا دیا۔ ”نہیں شنزادی“ وہ ہولے سے بولا۔ ”میں آگ واگ پر یقین نہیں رکھتا۔ آج ہم اپنے ریشمی کپڑے آگ کی نذر کر رہے ہیں۔ کل ہم اپنی کتابیں یا ممکن ہے انسانیت آگ میں جلا کر راکھ کر ڈالیں۔ جلدی ہمیشہ خوف سے جنم لیتی ہے لہذا نو آبادیاتی لوگوں کو خوف سے نجات پانی چاہئے۔۔۔ اور ہاں کیا آپ ہندوستانی ٹائٹ اینگل سے ملی ہیں۔۔۔ سروجنی بانیڈو؟ وہ ایک بے خوف عورت ہے۔“

شاعر جیب کو چمکدار ریشمی ساڑھی پہنے ہوئے ایک عورت کے پاس لے گیا جو چند مردوں اور ایک انگریز عورت میں گہری قمقمے لگا رہی تھی۔ عورت موٹی سی تھی۔ مسز بانیڈو نے جیب کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ جیب کی خوبصورتی کا جائزہ لے رہی تھی۔ کھڑی ناک والے ایک شخص نے خود کو سپرو کی حیثیت سے متعارف کروایا تھا۔ ”میں کئی سال پہلے پٹیالہ میں آپ کے والد سے ملا تھا، شنزادی۔ ہمارے اور حکمرانوں کے درمیان پہلا خفیہ اجلاس۔ جس میں برطانویوں کو ہندوستان سے نکالنے کے طریقوں پر تبادلہ خیال کیا گیا تھا۔“

جیب اس انگریز عورت کی موجودگی سے کسی حد تک خائف تھی۔ اس لئے اس نے قراردادوں پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ جو بقول سپرو کے خفیہ اجلاس میں طے پائی تھیں۔ مسز بانیڈو نے جیب کے چہرے پر بے چینی دیکھی تو مسکرا دی۔ ”خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں، شنزادی۔ اپنی بساंत قوم پرست تحریک کا ایک ستون ہے۔“

”ایک انگریز اور قوم پرست؟“ جیب نے حیرت سے پوچھا۔

”آپ یقیناً جانتی ہوں گی شنزادی کہ ہندوستان میں قوم پرست تحریک کا آغاز ہی

انگریزوں نے کیا تھا۔“ مسز ہائیڈو نے اسے بتایا۔ ”نظریات کی کوئی قوم نہیں ہوتی، شہزادی۔ اپنی بساٹ کا تعلق ان انگریز لوگوں سے ہے جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ہندوستان پر ہندوستانوں کو حکومت کرنی چاہئے۔ پھر بھلا ہم انگریزوں سے نفرت کس طرح کر سکتے ہیں؟ ہم صرف خود کو آزاد کروانا چاہتے ہیں۔ خود پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ کینیڈا اور آسٹریلیا کی طرح۔“

پھر وہ ہنس دی۔ ”لیکن یہ شام سیاست پر بحث سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔ آئیے میوزک روم میں بیٹھ کر شام کا راگ سنتے ہیں۔ مسز بساٹ ہمارے درمیان بیٹھیں گی اور ہمیں ایک رات کے لئے برطانوی ناانصافیوں کو بھولنے میں مدد دیں گی۔“

تمام لوگ بلا تخصیص قاتلین پر بیٹھ کر راگ درباری سننے لگے۔ مسز ہائیڈو کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر مسرت اور خوشی چھلکی پڑ رہی تھی جبکہ ٹیگور، انگریز عورت کی طرف دیکھ دیکھ کر زیر لب مسکرا رہا تھا۔

جیہ کچھ دیر راگ درباری سنتی رہی پھر اٹھ کے باہر آگئی۔ شام کے دھندلکے میں اسے وہ شہزادی یاد آگئی تھی جس نے اپنے ساتھ ہونے والے سلوک کی رام کمانی بمبئی کرانیکل میں شائع کروادی تھی۔

جانے کب تک وہ سوچوں کے بحنور میں غوطے کھاتی رہی۔ حتیٰ کہ اس دھندلکے میں اسے ایک طویل قامت شخص اپنی جانب آتا دکھائی دیا۔ جیہ پلکیں جھپکے بغیر اسے دیکھتی رہی جس نے ایک ڈھیلی ڈھالی شال اپنے کندھوں پر ڈال رکھی تھی۔ آنے والے نے اپنا ہاتھ جیہ کے شانے پر رکھا تو اس نے بغیر کسی مزاحمت کے اس دباؤ کو قبول کر لیا۔

”آپ یہاں کیوں ہیں، شہزادی؟ کیا آپ کو موسیقی پسند نہیں آئی؟۔۔۔۔۔ اوہ۔۔۔۔۔ آپ نے تو میرا دیا ہوا تحفہ بھی اپنی گردن میں آویزاں کر رکھا ہے۔“

ارون رائے کی شریر آواز سن کر جیہ کا ہاتھ بے اختیار ہیرے تک چلا گیا۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ یہ اس کے بچپن کی یاد گار ہے۔ اور بچپن ہی مستقبل کی بنیاد ہوتا ہے۔

”اب تو آپ ایک شادی شدہ عورت ہیں پھر ایک لڑکی کی طرح کیوں شرابہا رہی ہیں۔ شہزادی؟“ ارون رائے نے جیہ کی گلابی رنگت دیکھ کر سوال کیا۔ اس کا انداز سنجیدگی میں بدل گیا تھا۔ ”آپ ٹھیک تو ہیں نا؟ آپ کا شوہر شفیق اور مہربان تو ہے نا؟“

کلکتہ میں جیہ کے قیام کی خوشی صابن کی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ وہ خوف زدہ ہو گئی کہ اگر اس نے ارون رائے کو اپنا بدن چھونے کی اجازت دے دی تو وہ پھٹ پڑے گی۔

جب وہ بچی تھی تو اسے داشتاؤں کے بارے میں یہ جان کر بے حد حیرت ہوتی تھی کہ وہ ایک رات کے بعد دوسری رات اس مرد کے آنے کا انتظار کرتی ہیں جس نے کبھی نہیں آتا۔ اب اس کی اپنی حیثیت بھی داشتاؤں جیسی تھی۔ ہر رات وہ یوں تیار ہوتی تھی جیسے یہ اس کی سہاگ رات ہو لیکن اس کا شوہر اس کے پاس آنے کے بجائے اسی مورے جیسی عورتوں کی بانہوں میں اپنے لئے مرتیں ڈھونڈتا تھا۔

جیہ اٹے قدموں ہٹ کر ایک ستون سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ ارون رائے نے آگے بڑھ کر درمیانی فاصلہ کم کیا اور جیہ کے بدن کو اپنی ڈھیلی ڈھالی شال میں چھپا لیا۔ جیہ کپکپا اٹھی۔ وہ ایک ایسی ہرنی کی مانند تھی جو اچانک ہی کسی شکاری کے جال میں آ پھنسی ہو۔

”میں نے پوچھا تھا، آپ کے شوہر شفیق اور مہربان تو ہیں نا، شنزادی؟“

اس بار جیہ اپنی آنکھوں میں آنے والے آنسو نہیں روک سکی۔ لیکن اس نے بڑی مشکل سے اپنی اس خواہش پر قابو پایا کہ وہ خود کو اس شال میں گم کر دے اور ارون رائے کو بتائے کہ کس طرح وہ ہر شب تیار ہو کر محبت کئے جانے کی بگڑ رہتی ہے اور کس طرح ہر رات اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

ارون مسکرایا۔ اگلے ہی لمحے وہ جھکا اور اس نے ہونٹ جیہ کے ہونٹوں سے پوسٹ ہو گئے۔ جیہ ششدر رہ گئی۔ ستون کے ساتھ کھڑی وہ بھی ستون بن گئی تھی میوزک روم سے آنے والی ستار کی آواز اچانک ہی تیز ہو گئی تھی۔

بہت دیر بعد ارون رائے جب جوتے اتار کر دوبارہ میوزک روم میں داخل ہوا تو جیہ بدستور ستون سے لگی کھڑی تھی۔

جیہ طلائی کام والی سرخ ریشتی ساڑھی میں لپٹی ہوئی کلکتہ ڈربا دیکھنے پہنچی تو پرنس پر تپ پیڑھیوں کے نیچے ملکہ میری کے سنگ مرمر کے سر پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ رائل کلکتہ ٹرف کے باہر کاروں کا ایک ہجوم تھا۔ عام لوگوں کی کوشش تھی کہ وہ گیٹ توڑ کر اندر داخل ہو جائیں، لیکن کلب کے محافظ لاشی اٹھائے ہوئے انہیں آگے بڑھنے سے روک رہے تھے۔

پرنس پر تپ نے رسمی انداز میں مسکرا کر بیوی کا خیر مقدم کیا اور اسے ہجوم میں سے لے کر آگے بڑھا۔ مضبوط کاٹھی کے ایک بوڑھے نے جو ہیروں کے کئی ہار گلے میں پنے ہوا تھا، دور سے ہاتھ ہلا کر انہیں متوجہ کیا تو پرنس پر تپ، جیہ کی طرف جھکا۔

”معاف کرنا، شنزادی۔ یہ مہاراجہ بیکانیر ہیں۔ میں ان سے ملنے جا رہا ہوں۔ امریکہ اور

یورپ کے دورے کے دوران میں ان کا اے ڈی تھا۔“
اور پھر پرنس پر تپ اور مہاراجہ بیکانیر ایک فرانسیسی جاکے سے اسی زبان میں گفتگو کرتے
برہہ گئے۔ موضوع گفتگو سیر پور کے گھوڑے تھے۔ جیہ کو تنہا دیکھ کر لیڈی مودی اس کے
پاس آگئی۔

”ڈارلنگ، تمہیں دیکھ کر تو آج بہت سے لوگ دم توڑ دیں گے۔“ وہ حسب معمول
چمکی۔ ”سنرے اور سرخ کا کیا خوبصورت جوڑ ہے؟“

”ہمارے شوہر کی خواہش تھی کہ ہم آج سیر پور کے مخصوص رنگ زیب تن کریں۔“
”لیکن ڈارلنگ۔ تم جاکے تو نہیں۔ عورتیں تو صرف شیڈ استعمال کرتی ہیں۔ اس جوڑ کو
میں نہیں سمجھی۔۔۔ ممکن ہے یہ بھی کوئی پرانی رسم ہی رہی ہو۔“

”تمہارے لئے ایک اور خبر ہے،“ جیہ نے لیڈی مودی کو مخاطب کیا۔ ”ڈوبلی
کے بعد مہاراجہ وکٹرنے چیمبر آف پرنس کی سربراہی کرنے والے تینوں حکمرانوں کو سیر پور
ہاؤس میں کھانا کھانے کی دعوت دی ہے۔ بیکانیر، الور اور پٹیالہ۔“

لیڈی مودی پلکیں جھپکاتا بھول گئی۔ ”اوہ زبردست“ اس نے تبصرہ کیا۔ ”بیکانیر والی بات
تو بہت زبردست ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ پر تپ کے ساتھ وہی اندر گیا ہے۔ جنگ عظیم
کے خاتمے پر معاہدہ وریلز پر دستخط کرنے اور اقوام متحدہ کے افتتاح میں اسی نے ہندوستان
کی نمائندگی کی تھی۔۔۔ اور جہاں تک الور کی بات ہے تو انگریز اور مسلمان ہندو لیڈر اسے
ہندوستان کا ایک ذہین اور باصلاحیت راجہ سمجھتے ہیں لیکن میرے خیال میں وہ پاگل ہو گیا
ہے۔ اس کے خیال میں رام کرشن نے اس کے روپ میں دوبارہ جنم لیا ہے۔“

لیڈی مودی نے شرارتی انداز میں اپنی ایک بھوری آنکھ دبائی۔ ”لیکن وہ جسے تم دیکھنا
پسند کرو گی، مہاراجہ پٹیالہ ہے۔“ اس نے جیہ کی کلائی میں انگلی چھوئی۔ ”کبھی یہ احساس نہ
ہونے دینا کہ مہاراجہ پٹیالہ تمہیں اچھا لگا ہے ورنہ وہ ویسے ہی تمہیں اغوا کروالے گا جیسے
اس نے وائسرائے کی بیٹی کو اغوا کروایا ہے۔“

جیہ نے بے یقینی سے پلکیں جھپکائیں لیکن لیڈی مودی اپنی بات پر مصر رہی۔ ”یہ
بالکل درست ہے، ڈارلنگ۔ مہاراجہ پٹیالہ نے وائسرائے کی بیٹی کو اغوا کیا اور ایک رات
اپنے بستر کی زینت بنائے رکھا۔ یہ یقینی بات ہے کہ اس نے لڑکی کو چھوا تک نہیں لیکن یہ تو
دیکھو کہ کیا شاندار اسکینڈل ہے اور پھر اسکینڈلوں سے بھرپور کرکٹ میچوں کی تو پوچھو مت۔
مہاراجہ پٹیالہ برطانوی راج کے چند بہترین کرکٹرز میں سے ایک ہے۔ تصور تو کرو وہ کرکٹ

کے سفید یونیفارم میں کتنا شاندار لگتا ہو گا۔ چھ فٹ سات انچ کا ایک دیو جس نے ہیروں سے لدی پھندی ٹوپی پہنی ہو اور ہاتھ میں بیٹ پکڑ رکھا ہو۔ وہ انگریزوں کا بہترین دوست ہے۔“

”لیکن مہاراجہ پیالہ تو جمیبر آف پر نر کی ایک سرور آوردہ شخصیت ہے۔ ہمارے والد نے بہت سال پہلے ان خفیہ کانفرنسوں میں شرکت کی تھی جن کا اہتمام پیالہ نے قوم پرستوں کے ساتھ کیا تھا۔“

”ہاں، ڈارلنگ، اس کے رویے سے تمہیں محسوس ہو جائے گا کہ وہ برطانوی بلاشاہت سے خوفزدہ نہیں لیکن محتاط رہتا۔ اس کے حرم میں پانچ سو سے زیادہ عورتیں موجود ہیں۔ اس کے ساتھ، اس کے پاس دنیا کی بہترین تصویروں کا انتخاب بھی ہے۔“

جیہ، لیڈی مودی کے ہمراہ سیر پور باکس میں جا بیٹھی۔ حکمرانوں کی نشستوں سے ذرا نیچے برطانوی بلاشاہت کے افسران کی نشستیں تھیں۔

جیہ نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ ممبرز انکلوژر سے پرے اینگلو انڈین مرد جنہوں نے چمکدار سوٹ پہن رکھے تھے۔ رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس عورتوں کو ریس کارڈ دکھا رہے تھے۔ ایک ملازم نے نقرئی آکس بکٹ لیڈی مودی کے پہلو میں لا کر رکھ دی۔ جس میں شہین کی بوتل اور برف کے قلعے موجود تھے۔ جیہ نے اس کے کندھوں کے اوپر سے اینگلو انڈین لڑکیوں کے ایک گروپ کو دیکھا جو ممبرز انکلوژر میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف ہاتھ ہلاتے اور قہقہے اچھالتے ہوئے ریس کورس کی باڑھ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جیہ کو بار کے قریب دو تین انگریز عورتیں بھی دکھائی دی تھیں۔

”یہ ان کی ہفتہ وار تفریح ہے، ڈارلنگ“ لیڈی مودی ہر بات کے بارے میں جیہ کو بتانا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ ”اس قسم کی لڑکیاں اپنے انگریز گاہکوں کو ان کی بیویوں کے سامنے رجھا کر لطف اندوز ہوتی ہیں لیکن میں انہیں کوئی الزام نہیں دیتی۔ وہ اپنی علوت سے مجبور ہیں۔“

جیہ نے پریشان ہو کر لیڈی مودی کا بازو تھام لیا۔ اس کی نگاہ لان کی طرف اٹھ گئی تھی جہاں پرنس پر تپ چند نوجوان انگریز لڑکیوں کے ساتھ کھڑا قہقہے اچھال رہا تھا۔

”یہ صرف مچھلیاں پکڑنے والے کانٹے ہیں، ڈارلنگ“ لیڈی مودی نے بھی ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”یہ وہ ہیں جو لندن ییزن میں اپنے لئے شوہر تلاش نہیں کر سکیں۔ یہ موسم سرما میں کلکتہ آتی ہیں تاکہ چائے کے ہانات کے کسی مالک یا کسی اچھے انگریز خاندان کے چشم و

چراغ، کسی آرمی آفیسر کو پھانس سکیں۔ بے چاریاں جو اپنے جسموں اور چروں کی کراہت کو چھپانے کے لئے میک اپ کا سہارا لیتی ہیں۔۔۔ اور ذرا ادھر دیکھنا، نیچے۔“

لیڈی مودی نے ایک نوجوان اور حسین عورت کی طرف اشارہ کیا جو باکسر کی طرف آ رہی تھی۔ اس نے شیفون کا ایک مہین لباس پہن رکھا تھا۔ اس کی ہر حرکت کے ساتھ اس کے بدن کا ایک ایک انگ مہین لباس میں سے نمایاں ہو رہا تھا۔

”یہ مہارانی کوچ بہار ہے۔“ لیڈی مودی نے جیہ کو بتایا۔ ”حسن و شہب کا مرقع اور وہ نوجوان قتلہ جو شادی سے پہلے کسی اور یعنی کوچ بہار کے مہاراجہ کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔“

جیہ نے پلٹ کر اس حسین فتنے کو دیکھا۔ کسی نے مہارانی نام لے کر اسے پکارا اور اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ بڑی بڑی آنکھیں آواز دینے والے کو تلاش کر رہی تھیں۔ پھر جیہ نے تنگ سا دہانہ انگریزی حرف او کی صورت کھلتے دیکھا۔ یقیناً اس نے آواز دینے والے کو پہچان لیا تھا۔ پھر وہ پلٹی اور بہت سے لوگ اس کے سامنے آ گئے۔ وہ نگاہوں سے لو جمل ہو گئی۔

مہاراجہ وکٹر باکس میں داخل ہوا اور جیہ کے برابر بیٹھ گیا۔ ”سیرپور کے مخصوص رنگ تو تم پر بہت فٹ رہے ہیں، شنزوی۔“ اس نے بھلبلی کے لباس پر تبصرہ کیا۔ ”میں اکثر سوچتا ہوں کہ ہم میں سے صرف تم یہ بات جانتی ہو کہ تم کون ہو؟“

”لیکن آپ تو مہاراجہ ہیں، حکم۔۔۔ سیرپور کے مالک!“

مہاراجہ وکٹر نے نظر بھر کر اپنی بھلبلی کو دیکھا تو جیہ کو اس کی آنکھوں میں چھپی اداسی ہی اداسی نظر آئی تھی۔ ”صرف پیدائشی حق کے اعتبار سے۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔ ”اور کچھ انگریزوں کے سوچنے کا انداز ہے۔ ورنہ میں خود کو راجہ یا مہاراجہ تصور نہیں کرتا۔ میں تو ایک اداکار ہوں اور اداکاروں کو اداکاروں کے ساتھ شادی کی اجازت ملتی چاہئے۔“

ڈبلی کے لئے گھوڑے کورس میں داخل ہو رہے تھے اور اب انہیں اشار تنگ گیٹ کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ ریس کورس کے عقب سے وکٹوریہ میموریل کا دودھیا گنبد صاف دکھائی دے رہا تھا۔

پھر جیہ کو وائس ریگل لائنز کا ایک دستہ ذرق برق وردیوں میں ملبوس ریس کورس میں داخل ہوتا دکھائی دیا۔ ہجوم ایک کھلی تکی میں سوار ریس کورس میں داخل ہوا تھا۔

وائس رائے کی تکی ایک جگہ رکی اور پھر وہ آہستہ روی سے سرخ قالین پر قدم جاتا

آگے بڑھا۔ وہ ایک لمحے کے لئے ایک عظیم الجثہ آدمی اور اس کی بیوی کے قریب رکا۔
 ”آغا خان‘ ڈارلنگ۔“ لیڈی مودی نے سرگوشی کی۔ ”اس کی یورپی بیوی کے بطن کا
 پیدا ہونے والے بچے اس کا خطاب استعمال کر سکیں گے لیکن میں نہیں سمجھتی کہ برطانوی
 بادشاہت میں آغا خان کو کوئی خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس کا اپنا کوئی ملک نہیں ہے۔“
 سگریٹ ہولڈر ایک دوسری جانب اٹھ گیا۔ لمبے کوٹ اور ہیٹ میں ملبوس ایک مضمحل
 جیہ کو دکھائی دیا۔

”یہ ہے نظام حیدر آباد کا بیٹا۔ خبر ہے کہ یہ عثمانی خلیفہ کی بیٹی سے شادی کرنے جا رہا
 ہے لیکن وہ بے چارہ عثمانی خلیفہ جنگ ہار کر جنوبی فرانس میں جا بیٹھا ہے اور ساری توجہ اس
 آغا خان کو حاصل ہو گئی ہے۔“

فاصلے پر ایک توپ گرجی اور جھوم نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ گھوڑوں نے تیز رفتار
 سے دوڑنا شروع کر دیا۔ جیہ نے دور بین اٹھا کر آنکھوں سے لگا لی۔

آغا خان‘ مہاراجہ راج پٹلا اور مہاراجہ گوالیار کے گھوڑے برابر بھاگ رہے تھے۔
 انہوں نے پہلی ٹرن بھی ایک ساتھ ہی مکمل کی تھی۔ جیہ کو آگے بھاگنے والوں کے پیچ
 مخصوص سرخ اور سنہرا رنگ دکھائی دیا۔ فرانسیسی جاکی‘ مہاراجہ کی ہدایات کے عین مطابق
 گھوڑے کو تیز دوڑانے کے لئے چابک کے بجائے ہاتھوں کی ہتھیلیاں استعمال کر رہا تھا۔
 آخری پوسٹ سے نصف فرلانگ پہلے جیہ نے سیرپور کے گھوڑے کو لائن سے نکلنے دیکھا۔
 اس نے سانس روک لی اور دل ہی دل میں پرارتھنا کرنے لگی کہ دیوی‘ گھوڑے کو اتنی
 طاقت دے دے کہ وہ جیت جائے اور پرتاپ کو یقین ہو جائے کہ اس کی بیوی سیرپور
 خاندان کے لئے خوش قسمت ہے۔

آخری پوسٹ سے محض چند گز پہلے سیرپور کا گھوڑا‘ دوسرے گھوڑے سے آگے نکل
 میں کامیاب ہو گیا اور پورا میدان نعرہ ہائے تحسین سے گونج اٹھا۔

لوگوں کا جھوم سیرپور برادرز کو مبارکباد دینے کے لئے باکس میں گھس آیا۔ ”آ
 شنزادی“ پرنس پرتاپ آہستہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”وکر کی خواہش ہے کہ تم ہماری سربراہی
 کرو۔ تمہارا سیرپور کلر پھینا بقول اس کے ہمارے لئے خوش بختی ثابت ہوا ہے۔“

فرانسیسی جاکی گھوڑے کو رنگ سے باہر لے آیا اور مہاراجہ وکر نے گھوڑے کی باگ
 جیہ کو تھما دی۔ جیہ باگ پکڑ کر آگے آگے چل دی۔ ہوا سے اس کے لمبے بال اڑ رہے
 تھے۔

”تم ہماری شہرت کے لئے خاصی خوش قسمت ثابت ہوئی ہو شہزادی۔“ پرنس پر تاپ نے بالوں کے اوپر سے سرگوشی کی۔

ٹرف کلب ریستورنٹ میں سیرپور کا اسٹاف ان کی میز پر پہلے ہی شیمپین سجا چکا تھا۔ لیڈی مودی بھاگتی ہوئی بیڑھیاں چڑھی۔ اس کا رخ جیہ کی طرف تھا ”ڈارلنگ، کوچ ہمار کی مہارانی اندرا کا کہنا ہے کہ اس نے آج تک تم سے زیادہ خوبصورت چیز نہیں دیکھی۔ ذرا سوچو پر تاپ، اگر جیہ تمہارے بھکاوے میں آکر اپنے یہ لمبے بال ترشوا دیتی تو کیا ہوتا؟“ پرنس پر تاپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

لیکن اس وقت اس کاموڈ خوشگوار ہو گیا جب اور بہت سے لوگ ان کی میز پر جمع ہو گئے اور سرگوشیوں میں اسے اس کی بیوی کی خوبصورتی پر مبارکباد دینے لگے۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ جیہ کے بازو پر رکھ دیا جیسے اسے اپنی بیوی سے بے حد محبت رہی ہو۔ اس کی حرکتوں سے جیہ سوچ رہی تھی کہ شاید اب وہ منافقانہ طرز عمل ختم ہو جائے جس کی وجہ سے ان کی شادی انجام کے قریب تھی۔

یہ امید اس وقت کچھ اور قوی ہو گئی جب گھوڑے کی نیلائی کے وقت اس نے اپنا ایک ہاتھ نہایت پیار سے جیہ کے شانے پر رکھ دیا۔ امید تب یقین میں بدل گئی جب پر تاپ نے اسے بولی لگانے کو کہا لیکن جیہ نے جب اس کا شکریہ ادا کیا تو اس نے اپنے شوہر کی نگاہوں میں مسکراہٹ اترتے دیکھی۔ کوئی جیہ کے عقب میں موجود تھا جسے دیکھ کر پر تاپ کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

جیہ نے شانے پر سے پیچھے دیکھا۔ گلوب ٹھیٹر کی اینگلو انڈین رقاصہ، پرنس پر تاپ کے اس ہاتھ کو سہلا رہی تھی جو اب بھی جیہ کے شانے پر موجود تھا۔ جیہ کا جی چاہا کہ وہ پر تاپ کا ہاتھ جھٹک دے لیکن اس نے دانتوں پر دانت جما کر بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا تھا۔ چاندنی نے ہاتھ تیار کر دیا تھا۔ جیہ یوں اہتمام سے نہائی جیسے وہ پر تاپ کے رویے سے پیدا ہونے والے تازہ ترین رویے کو دھو رہی ہو کہ بالآخر اس نے جیہ کو اپنی بیوی کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔

غسل کے بعد اس نے مسز رائے کا بھیجا ہوا اخباری تراشا نکالا اور بے نام شہزادی کا کھلا خط پڑھنے لگی۔ تب اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ جو اس پر بیٹا تھا۔

جیہ سے شادی سے قبل اس کے شوہر کی طرف سے جہیز میں بھاری نقد رقوم کا مطالبہ۔ پہلی ملاقات پر اس کی توہین۔ وہ ساری کوششیں اور خود کو تبدیل کرنے کی جدوجہد

جو جیہ نے محض اس امید پر کی تھی کہ اس طرح وہ اپنے شوہر کو جیت لے گی لیکن اس کا شوہر دوسری عورتوں کو اس پر ترجیح دیتا رہا۔

سراکبر نے ایک بار اس سے کہا تھا۔ ”پولو کی چھڑی کبھی کبھی ایک خنجر کی طرح کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ آپ نے راج نیٹی پڑھی ہے۔ شہزادی، لیکن پرنس پر تپ نے نہیں۔ اس طرح کا علم، ایک بیوی کو اس کے شوہر سے طاقتور بنا دیتا ہے، حکم... شرط یہ ہے کہ وہ اسے استعمال کرنا جانتی ہو۔“

سیرپور کے وزیر اعظم نے اس طاقت کا حوالہ دیا تھا جو جیہ کو حاصل تھی لیکن اس وقت وہ نہیں سمجھ سکی تھی کہ سراکبر اسے یاد دلانا چاہ رہا ہے کہ اس کی روایتی شادی درحقیقت طاقت کا ایک اتحاد اور اتصال تھی۔ اس نے قسم کھائی کہ کسی نہ کسی طرح وہ اپنے شوہر سے اس تذلیل کا بدلہ ضرور لے گی۔

تب وہ مطمئن سی دربار روم میں داخل ہو گئی تاکہ مہاراجہ دکن کے شاہی مہمانوں کا خیر مقدم کر سکے۔

ایک لمبا تڑنگا آدمی شاہانہ چال چلتا ہوا دربار روم میں داخل ہوا۔ اس کی پگڑی پر کرشن بھگوان کی صورتی لگی ہوئی تھی۔ جیہ اسے تعظیم دینے کو جھکی تو اسے مہاراجہ الور کے ہاتھوں پر سفید دستانے دکھائی دیئے۔ اس کے عقب میں ایک موٹا تازہ سکھ تھا۔ جو بہ مشکل دروازے سے گھس کر اندر آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ اے ڈی اس سکھ کے خطبات پڑھتا جیہ جان چکی تھی کہ یہی مہاراجہ پٹیلہ ہے۔ ان دونوں کے بعد آنے والا مہمان بیکانیر کا مہاراجہ گنگا سنگھ تھا۔

جیہ نے جھک کر دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے معاہدہ ورسیلز میں ہندوستان کی نمائندگی کرنے والے راجپوت بادشاہ کے پاؤں چھوئے تو اسے پرنس پر تپ، کشمیر کے ولی عہد راج کمار ہری سنگھ سے گلے ملتا دکھائی دیا۔ چھوٹا ڈنگرا ان کے ساتھ تھا۔

استقبالیہ رسومات ادا کرتے ہی جیہ برآمدے کی طرف کھسک گئی۔ فرانسیسی کھڑکیوں میں سے اسے حکمران مہمان صاف دکھائی دے رہے تھے جو کلکتہ ڈربی جینتے والے کی تعریف و توصیف میں مصروف تھے۔

مہاراجہ دکن نے جھک کر ان کا شکریہ ادا کیا۔ ”ڈربی جینتا بے شک ایک اعزاز ہے لیکن اس سے بڑھ کر اعزاز کی بات یہ ہے کہ جمیر آف پر نزم میں شاہی ہندوستان کے ترجمان اس وقت میرے مہمان ہیں۔“

”میں حیران ہوں کہ یہ جمیئر کب تک چلے گا۔“ سکھ مہاراجہ نے مہاراجہ الور کی پٹری
 اور فن بنگوان کی موتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”برطانوی راج کو غصہ دلا کر ہمارا
 مصلحت کیا ہو گا۔ کیا یہ بہتر ہے کہ شہنشاہ برطانیہ سے ملتے وقت ہاتھوں پر دستانے پہن کر
 اس کی توہین کی جائے۔“

”اور کیا دائس رائے کی بیٹی کو اغوا کرنا دانشمندی تھا۔“ مہاراجہ الور نے اپنے تئیں بدلہ
 لے لیا۔

سکھ مہاراجہ نے ایک بلند آہنگ قلعہ لگایا تو اس کا جسم یوں ہلا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔
 مہاراجہ الور نے ہاتھوں سے دستانے اتار دیئے۔ ”بہر حال اس سے فرق بھی کیا پڑتا
 ہے؟ دونوں کو ہی چھو نہیں گیا۔ شاہ جارج جانتا ہے کہ مجھے اسے چھونے میں کیا قناعت
 ملائی تھی۔ جب بنگھم پیلس میں اس نے میرا استقبال کیا تو اس نے چڑے سے بنا ہوا تمام
 (لنچر کمرے سے ہوا دیا تھا کیونکہ وہ گنوتا کے بارے میں ہندو دھرم کے خیالات بخوبی جانتا
 ہے۔“

مہاراجہ بیکانیر نے اپنی لمبی اور صحت مند انگلیوں سے بڑی بڑی سفید مونچھوں کو تلو دیا۔
 ”برطانوی چھوئے جانے کے قاتل ہیں یا نہیں یہ غیر ضروری بات ہے۔ متعلقہ بات یہ ہے
 کہ برطانوی بادشاہت بہر حال طاقت و قوت کی حامل ہے۔ دستانے اور اغوا ہونے والی لڑکیاں
 اسے بدل نہیں سکتیں۔“

مہاراجہ الور نے اپنا رخ بیکانیر کی طرف کیا۔ ”یہ تو پتا چلے گا کہ برطانویوں کی طرف
 سے ہماری سرحدوں کے اختتام تک ہمیں اور کتنے توہین آمیز اقدامات کا سامنا کرنا ہو گا؟ میں
 تو یہ سمجھتا ہوں کہ جمیئر آف پر نر صرف اور صرف ہماری خاموشی کی ایک قیمت ہے۔“
 حکمران اپنے غصے کا اظہار کر رہے تھے لیکن جیہ جانتی تھی کہ وہ سب لاچار اور بے بس
 ہیں۔ اگر اس کی عزت نفس ایک شوہر کے پاس گروی تھی تو ان حکمرانوں کی عزت نفس
 ایک بادشاہت کے پاس گروی تھی۔

”یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم برطانوی بادشاہت کی اس قیمت کو اپنے ہتھیار میں تبدیل کر
 لیں تاکہ اپنے مفادات کا تحفظ کر سکیں۔“ مہاراجہ بیکانیر نے جواب دیا۔ ”اس کے لئے ہمیں
 قوم پرستوں سے تعلقات بڑھانے ہوں گے۔ آخر ہم ہندوستانی ہیں، انگریز نہیں۔“

”ہم نہیں ہیں، حکم بلکہ ہم حکمران ہیں۔ بادشاہ ہیں۔ ہم عام ہندوستانی نہیں ہیں۔ ہم
 برطانوی بادشاہت پر انحصار ترک کر کے اپنی امیدوں کا سہارا ان قوم پرستوں کو نہیں بنا

سکتے۔ جن کے اخبار آئے دن ہماری پگڑیاں اچھالتے رہتے ہیں۔ انہیں اس بات کا خیال نہیں ہے کہ ہم نے اپنے تحت و تاج خطرے میں ڈال کر ان کی ہماری اخلاقی اور ملی ہے۔“

مہاراجہ وکٹر نے مہاراجہ الور کی باتوں کا طلسم توڑ دیا تھا۔ ”اور اگر ہم جمیر آف میں اپنا دفاع بھی کرتے ہیں تو ہندوستان ہماری پکار نہیں سن سکے گا۔ کیونکہ راج کا ام ہے کہ ہم اپنے احساسات اور شکایتیں خود تک محدود رکھیں۔“

دروازے کھلے۔ سنگ مرمر کی راہداری میں کچھ لوگ کھڑے دکھائی دیے۔ مہاراجہ وکٹر کو مخاطب کیا تھا۔ ”میں نے چند قوم پرست لیڈروں سے یہاں آنے کو کہا تھا وکٹر، میرے خیال تمہیں ان کی باتیں دلچسپ محسوس ہوں گی۔“

وکٹر نے اثبات میں سر ہلا دیا لیکن صاف دکھائی دے رہا تھا کہ تائیدی جنبش مجبوراً تحت ہے۔

جب وہ لوگ قریب آئے تو جیہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ ان سے مسز رائے پر مل چکی تھی۔ ٹیگور اور سپرو سب سے آگے تھے۔ ان کے پیچھے ارون رائے تھا جسے حسب معمول اپنے کندھوں پر ڈھیلی ڈھالی شل ڈال رکھی تھی۔

جیہ کا بدن سنسناتا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ فوراً تاریکی میں رینگ گئی۔ اپنے ہونٹوں پر ارون رائے کے ہونٹوں کا لمس یاد آ گیا تھا۔

مہاراجہ الور ان کی طرف بڑھا۔ ”ہم نے سنا ہے کہ آپ لوگ ایک ایسی قرارداد کرنے جا رہے ہو جس سے ہندوستانی رجواڑوں میں انقلاب کی راہ ہموار ہو جائے گی؟“

ذہین وکیل، سپرو نے سب سے پہلے مہاراجہ الور کے غصے کے سامنے ٹھہرنے کا کیا۔ ”سات سال پہلے جب پٹیلہ میں ہماری خفیہ ملاقات ہوئی تھی تو ہم نے آپ لوگوں متنبہ کر دیا تھا کہ ہماری جدوجہد کسی برطانوی راج سے آزادی نہیں، بلکہ ہر قسم کی غلامی نجات کے لئے ہے۔ ہم نے آپ لوگوں سے کہا تھا کہ اپنی ریاستوں میں نمائندہ حکم قائم کریں۔ آپ لوگوں کے ذاتی اخراجات کو محدود کیا جانا چاہئے۔ آپ لوگوں کے عوام اب اپنے بنیادی حقوق مانگنے شروع کر دیئے ہیں اور آپ لوگ انہیں جیلوں میں ڈال رہے ہیں یا ان کی جائیدادیں غصب کر رہے ہیں۔“

”کیا آپ لوگوں کے خیال میں قوم پرستوں کو ہماری نسبت لوگوں پر زیادہ کنٹرول دیا

”ماراجہ پٹیالہ بولا۔ ”تمہارے پر امن جلوس حملے کرتے ہیں اور کئی بار ان جلوسوں کو لوگوں کو جان سے مار دیا ہے جن لوگوں نے بمبئی میں پرنس آف ویلز کا پینکٹ نہیں لگایا یہی تمہاری سیاست ہے؟“

اس بار ٹیگور آگے بڑھا۔ اسے اپنے ہی ہم مذہب لوگوں کو ہموار کرنے کا فرض ادا کرنا تھا۔ ”آئیے یور ہائی نیس۔ اگر ہماری اسمبلیاں اور آپ کے چیمبر آف پر نر میں اتحاد اشتراک ہو جائے تو ہم برطانوی بادشاہت کو توپ کے دہانے پر باندھ سکتے ہیں۔ ایک بار سے لڑنے کے بجائے آئیے ہم مل کر ایک ایسا اتحاد ایک ایسی فیڈریشن تشکیل دیں کی مدد سے ہم برطانوی بادشاہت سے جان چھڑالیں۔“

ماراجہ بیکانیر نے تو مصیفی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ”ہم بھی تو یہی کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں لیکن برطانوی بادشاہت نے جن ریاستوں، پاڈوں اور رجواڑوں کو تسلیم کیا ہے ان کو لٹاؤ پانچ سو سے بھی زیادہ ہے۔ ان میں سے چند ایک اب بھی دسویں صدی میں زندہ اور وہ کسی بھی قسم کی اصلاحات کی حوصلہ شکنی کریں گے۔ آپ لوگ صبر سے کام لیں۔ مذہبات کو قابو میں رکھیں۔ ہم بھی خود پر قابو پانے کی کوشش کریں گے۔“

ماراجہ بیکانیر کی بھاری بھر کم موٹھوں کے نیچے ہونٹ مسکرا دیے۔ ٹیگور نے فوری طور پر اس مسکراہٹ کا نوٹس لیا تھا۔ ”دو چیزیں ہمیں نقصان پہنچا سکتی ہیں، یور ہائی نیس۔ ہمارا ہمارے نظریات اس لئے ہمیں پہلے اپنے دلوں کو وسیع کر کے ان دنیائوں کی چیزوں کو جان چھڑانی ہو گی۔“

کئی مہاراجہ چونک پڑے۔ یہ براہ راست دھرم پر حملہ تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی جواب دے۔ لمحہ کمرے کے دروازے کھلے اور سیرپور کے ملازمین فرشی سلام کے لئے جھک گئے۔ اتیار تھا۔ حکمرانوں نے ابتدا کی اور قوم پرستوں نے ان کی تقلید۔

جونہی حکمران اور قوم پرست دروازے کے عقب میں غائب ہوئے پرنس پر تپ، کشمیر اگر ا کے ولی عہد راج کماروں کی طرف مڑا۔ ”اس بات چیت کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ بات دولت کی ہے اگر تمہارے پاس دولت ہے تو تم برطانوی بادشاہت اور قوم پرستوں کو خوش رکھ سکتے ہو۔“

ہری سنگھ نے پر تپ سے متفق ہونے کے اظہار کے طور پر اس کے کندھے پر چپٹا کی ”اور کئی لالچی لیکن خوبصورت عورتوں کو بیک وقت مطمئن کر سکتے ہو، کیوں؟“

برآمدے میں کھڑی جیہ کانپ اٹھی۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ پر تپ نے گلوب تھیٹر کی اینگلو

انڈین رقبہ پر بے دریغ دولت لٹائی ہے۔

شی پلس میں وزیر اعظم اور برطانوی ریزیڈنٹ، مہاراجہ کے ٹھہرتے تاکہ نئے سال ۱ بجٹ اسے پیش کیا جاسکے۔

بجٹ میں انکشاف ہوا تھا کہ پرنس آف ویلز کے دورے سے سیرپور کے بجٹ پر برا اثر پڑا تھا۔ لہذا پرنس اور سرہنری کوزے اس بات پر متفق تھے کہ پرنس پرنس کا بیرون ملک جانے کے لئے رقوم دستیاب نہیں۔ چنانچہ غصے میں بھرا ہوا پرنس پرنس، مہاراجہ وکٹر کو تھاپا روپ کے سفر پر روانہ ہوتے دیکھتا رہا۔

وزیر اعظم کی طرف سے خزانہ خالی ہونے کی خبریں بار بار سن کر پرنس پرنس اکثر دھڑکلتے بھاگ جاتا۔ اس موقع پر اکثر جیہ سوچتی کہ وہ چھوٹے ڈنگرا کے انتہا کو نظر انداز کرنا ہوئے اپنی ذاتی دولت کے بارے میں شوہر کو بتا دے لیکن اس کے ہمدردانہ جذبات اس وقت ماند پڑ گئے جب اسے پتا چلا کہ اس کا شوہر گلوب ٹیمپری رقبہ اسٹی مورے کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا پھر رہا ہے۔

آئندہ سال جیہ کو مشکل سے ہی پرنس پرنس کی صورت دکھائی دی۔ اس نے پورا موسم اسٹی مورے کی بانسوں میں شملہ میں گزار دیا تھا۔

موسم سرا میں کلکتہ کے بینکوں میں پرنس پرنس کی دولت ختم ہو گئی اور وہ سیرا، لوٹ آیا۔ اس نے آتے ہی جیہ کو سفر کے لئے تیاریاں کرنے کا حکم دیا۔

”یہ الو کے پٹھے بیتا چاہتے ہیں کہ میں سوداگروں کی طرح اپنے بہرے جواہرات فروخت کرنا شروع کر دوں۔“ اس نے جیہ کو آگاہ کیا۔ ”ظاہر ہے یہ نہیں ہو سکتا اس لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم اس پرانے بالمیر جائیں اور پرنس جان سے کہیں کہ تمہارے جینز کی مد میں پیٹلی ادائیگی کر دے۔“

جیہ نے کوئی احتجاج نہیں کیا لیکن رولس رائس کی عقبی نشست پر دراز صحرائی راستہ عبور کرتے ہوئے اس نے یہ ضرور سوچا کہ کیا دشت مرگ کی عتوبتوں سے گھبرایا ہوا بالمیر اس کے شوہر کے ان مطالبات کو پورا کر سکے گا؟

سفر انہی سوچوں میں گزرا۔ جیہ ناامید تھی لیکن پرنس پرنس کے چہرے پر امید ا سرخی تھی۔

گاڑی علاقے میں داخل ہو کر زبان خانے کے سامنے پہنچی تو جیہ کو منقش جالیوں، عقب میں بیرون اور پردہ پلس کی دیگر خواتین نظر آئیں۔ جیہ نے ان کے سوالوں کے جواب

ہی خندہ پیشانی سے دیئے۔ اس سے ان کا وہ خوف اور شرمندگی کم ہو گئی جو بالمیر کے آفری دنوں میں جیہ کو ایک قیدی کی حیثیت سے زنان خانے میں محصور رکھنے پر وہ محسوس کر رہی تھی۔ جیہ کو ان سے کوئی شکایت نہ تھی کیونکہ بالمیر سے رخصتی کے بعد خود جیہ بھی انہی مجبوریوں کی قیدی بن گئی تھی جن مجبوریوں کی پردہ پیلس کی خواتین قیدی تھیں۔

بالمیر مہارانیوں کے مندر میں جیہ، دیوی کے سامنے پوجا کے لئے جھکی تو زنان خانے کی عورتوں نے اس کی بلائیں لیں اور رانی مان سنگھ نے مٹھائیوں سے اس کا منہ میٹھا کر دیا۔ جیہ نے نظریں اٹھا کر رانی کو دیکھا اور وہ وقت بھولنے کی کوشش کرنے لگی جب بالمیر سے رخصتی کے وقت رانی نے انتہائی بے دردی سے ہاتھی دانت کی چوڑیاں جیہ کی کلائیوں میں پہنائی تھیں۔

پوجا ختم ہوتے ہی جیہ نے رانی مان سنگھ کو بتایا کہ وہ کوکی بائی سے ملاقات کے لئے واشتالوں کے کوارٹرز میں جا رہی ہے۔

”اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا“ شہزادی۔“ رانی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ مہاراجہ کی توہین ہے۔“

جیہ نے پلٹ کر نہیں دیکھا وہ خاموشی سے آگے بڑھتی رہی۔ زنان خانے کی تمام خواتین تتر بتر ہو گئیں صرف چاندنی اپنی مالکن کے پیچھے چل رہی تھی۔

”کبھی کبھار آپ اپنی والدہ کی طرح بن جاتی ہو“ شہزادی۔“ چاندنی کی آواز عقب سے سنائی دی۔ نچلے قلعے کی دیوار کے پاس سے گزرتے ہوئے گودام سے جیہ کو گندم اور دوسری غلے کی خوشبو آئی تو اسے بے اختیار مہارانی یاد آگئی۔

وہ کچھ آگے بڑھی تو جرم کا دیکھا بھلا دروازہ کھول دیا گیا۔ سفید بالوں والی بہت سی عورتوں نے اس کا استقبال کیا اور آخر کار کوکی بائی کے شہسا ہاتھ اس کے چہرے کے لئے پیالہ بن گئے۔

جیہ نے ادھر ادھر دیکھا۔ حرم کی حالت بے حد خراب تھی۔ کئی جگہ سے سیمنٹ اکھڑ گیا تھا اور چھت پر مکڑیوں نے جالے تن دیئے تھے۔

”مہاراجہ جان نے واشتالوں کو چھٹی دے دی ہے۔“ کوکی بائی نے جیہ کو بتایا۔ ”اس نے انہیں زیورات اور دیگر سامان واپس کر کے گھر چلے جانے کا حکم دیا۔ بعض عورتیں تو اس طرح گھر واپس گئی ہیں جیسے قلعے کے دنوں میں کسی یتیم بچی کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے۔“ کوکی بائی کی کپکپاتی آواز ویران ایوانوں میں گونج رہی تھی۔ ”انہوں نے ٹھہرنے کے

لئے منت ساجت کی لیکن مہاراجہ نے انہیں نکال باہر کیا۔ اب وہ بازار میں جا بیٹھی ہیں اور بادشاہ کی عورتیں ہر شرابی کے ساتھ سونے پر مجبور ہیں۔“

کوکی بائی، جیہ کو ایک پتھریلی کوٹھری میں لے گئی جہاں کونے میں لکڑی کا ایک تخت بچھا ہوا تھا۔

”یہ میرا کمرہ ہے۔“ کوکی بائی نے کہا تو جیہ زنان خانے میں کوکی بائی کا عالی شان کمرہ یاد کر کے سبک اٹھی۔ کوکی بائی آگے بیٹھ کر لکڑی کے تخت پر بیٹھ گئی۔ ”راج گورو کی مہربانی ہے کہ اس نے مہاراجہ جان کو لوگوں کے غم و غصے سے ڈرا کر اس بات پر راضی کر لیا کہ بوڑھی داشتاؤں کو یہیں رہنے دیا جائے۔ لیکن ہم اب بے مصرف بوڑھیاں ہیں جنہیں اپنی موت کے سوا کسی کا انتظار نہیں۔“

جیہ آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے گرد و پیش کا جائزہ لیتی رہی۔ اچانک کوکی بائی کو ایک خیال سا آیا کہ اتنی دیر سے وہ اپنی ہی باتیں کئے جا رہی ہے۔ اس نے جیہ سے کچھ نہیں پوچھا۔

”تم اپنے شوہر کے ساتھ خوش تو ہو؟“ کوکی بائی نے پوچھا تو جیہ نے سنی ان سنی کر دی۔ کوکی بائی دوبارہ اس سے مخاطب ہوئی ”وہ تمہارے بدن سے کھلتا تو ہو گا؟“

اس بار جیہ خاموش نہ رہ سکی۔ ”اس نے آج تک مجھے چھوا بھی نہیں ہے۔“ وہ سر جھکا کر بولی۔

اب کوکی بائی کی خاموشی کی باری تھی۔ تب جیہ چلا اٹھی۔ ”میری بات کا مطلب سمجھتی ہو نا؟ وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ آج تک وہ میرے قریب نہیں آیا۔“

گزشتہ پانچ سال کی محرومیاں، ذلت اور توہین اس کے اندر جاگ اٹھی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

کوکی بائی نے پرسکون ہونے تک کچھ نہیں کہا۔ شاید وہ بھی چاہتی تھی کہ جیہ اپنے دل کی بھڑاس نکال لے۔ ”تمہارا شوہر تمہارے پاس آئے گا“ شہزادی“ بلاخر کوکی بائی کے بوڑھے ہونٹوں میں حرکت ہوئی۔ ”تم اس کے بیٹے کو جنم دو گی تمہاری جنم پتری میں یہی لکھا ہے۔“ اس نے جیہ کے لمبے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ ”ممکن ہے اس کے بعد میں بھی تم سے نہ مل سکوں۔ اس لئے میری یہ بات یاد رکھنا۔“

جیہ، کوکی بائی سے لپٹ گئی۔ ”ایسا نہ کہو آپ پھر مجھے دیکھو گی، ملو گی ضرور ملو گی۔“

کوکی بائی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”دیوتاؤں کی آشا مجھے دکھائی دے رہی ہے لیکن جب

لہارے حوصلے جواب دے جائیں تو صرف اتنا یاد رکھنا کہ تمہاری رگوں میں بالمیر کے شیر کا لون دوڑ رہا ہے۔ اب جاؤ میں نہیں چاہتی کہ رانی مان سنگھ اپنی توہین کا انتقام زمین خانے سے لیتا شروع کر دے۔“

جیہ نے پلٹ کر کوکی بائی کو دیکھا اور اشک زدہ آنکھیں لئے باہر نکل آئی۔ اپنے شوہر کے بے جا مطالبات سے خوفزدہ جیہ نے سارا دن تنہا قلعے میں گھوم پھر کر گزار دیا۔ مہاتوں نے خندہ پیشانی سے اس کا خیر مقدم کیا اور جب اس نے موتی کو گئے کھلائے تو اس نے پیار سے جیہ کو اپنی سوئٹ میں لپیٹ لیا۔ جب موتی نے اسے اپنی سوئٹ میں امن سے بلند کیا تو اسے نکا کا چوہی کرکٹ پویلین نظر آیا۔ وہ جوں کا توں موجود تھا۔ اس کے عقب میں گول مینار دکھائی دے رہا تھا۔

وہ بڑے مندر کے سامنے پہنچی تو راج گورو نے اس کا استقبال کیا۔ وہ اسے اندرونی مندر میں لے گیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں ایک بار وہ نکا کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی اور آٹھ گواہیں دونوں نے تمام رکھی تھیں۔ اسے میجر ویر سنگھ دکھائی دیا جو زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔

”ہم نے سنا ہے، آپ پولو کی کھلاڑی ہو گئی ہو، شہزادی۔“ اس نے دھیمی آواز میں بیہ کو مخاطب کیا۔ ”مجھے امید ہے کہ آپ نے اپنے شوہر کے سامنے مجھے بے عزت نہ کیا ہو“

جیہ کی آنکھیں بات بات پر ڈبڈبا رہی تھیں۔ وہ طویل عرصے بعد یادوں کے جھروکے میں واپس آئی تھی۔ یہاں کی ایک ایک دیوار اور ایک ایک اینٹ سے اس کی یادیں ہلکی پڑ رہی تھیں۔

اس نے زمین پر نظریں گاڑ دیں۔ ”آپ نہیں سمجھتے، میجر صاحب وہ ایک مشکل صورت حال تھی۔ وہ ایک....“

”راج نیٹی، شہزادی؟“ راج گورو نے تیز سرگوشی کی۔ جیہ نے حیرت سے آنکھیں مپکائیں۔ ”سیرپور کے وزیر اعظم نے بھی یہی تجویز دی تھی۔“

”اس وقت ہمارے ذہنوں میں راج نیٹی کی طاقت ہی جاگزیں ہے۔ کیا آپ جانتی ہیں کہ دلہن کی حیثیت سے آپ کی رخصتی کے چند دن کے اندر ہی میجر ویر سنگھ کو بالمیر لائسنسز کی کمان سے علیحدہ کر دیا گیا تھا، خود میری بھی مسلسل نگرانی ہوتی ہے؟“

”مگر یہ تو ناممکن ہے۔“ جیہ نے احتجاج کیا۔ ”آپ تو بالمیر کے مہاراجاؤں کے استاد

ہیں۔ آپ بالمیر میں سب سے زیادہ اختیارات کے حامل ہیں۔“

”آپ اپنا پہلا سبق بھول گئیں۔ شہزادی زمین پر سب سے زیادہ بااختیار پر جا ہے، اس کے بعد راجہ، پانچ دیہات کی پر جا راجہ کا حکم ٹھکرا سکتی ہے لیکن یہ اس وقت تھا جب راجہ اختیارات کے لئے اپنی پر جا کی طرف دیکھتا تھا۔ برطانوی بادشاہت کی طرف نہیں۔“

مبجرویر سنگھ نے اپنی مونچھوں کو تلو دیا۔ ”آپ کو یاد نہیں کہ آپ کے والد نے دیہات کے نمبرداروں کا ایک دربار منعقد کیا تھا اور ان سے کہا تھا کہ وہ وفاتر معتمدی کے لئے اپنے نمائندے بھیجیں؟ اب یہ سیکرٹریٹ کو نسلیں ختم کر دی گئی ہیں۔ آپ کے والد کا کلا بند کر دیا گیا ہے۔ بالمیر کے اخبارات پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ مہاراجہ جان عوام کا استحصال کر رہا ہے۔ احتجاج کی آوازوں کو جیل بھیج دیا جاتا ہے یا ان کی جائداد ضبط کر لی جاتی ہے۔“

”مہاراجہ دھرم کی رو سے اپنی ذمہ داریاں بھول گیا ہے۔“ راج گورو نے بات آگے بڑھائی۔ ”چنانچہ پر جا دھرم کی حفاظت کے لئے آگے آگئی ہے۔ وہ اب اپنی خدمت خود کر رہے ہیں۔“

مبجرویر سنگھ نے راج گورو کی بات کالی۔ ”پورے ہندوستان میں استحصال زدہ لوگ پیپلز کونسلیں بنا رہے ہیں اور راج گورو ریاست بالمیر میں پیپلز کونسل کے لیڈر ہیں۔“

”یہ پیپلز کونسلیں بادشاہت کے چاروں اصول پورے کر رہی ہیں۔“ راج گورو بولا۔

ذرا بتاؤ تو شہزادی۔ کیا آپ کو اب تک یہ اصول یاد ہیں؟“

”سام، دان، ڈنڈ، بعید۔“

مبجرویر سنگھ اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ہم نے شہزادی کو بہت دیر سے روک رکھا ہے۔ مہاراجہ کی ضیافت کسی بھی وقت شروع ہو جائے گی اور شہزادی کی غیر حاضری محسوس کی جائے گی۔“

جیہ نے راج گورو کے پیر چھوئے اور مبجرویر سنگھ کے پیچھے پیچھے باہر نکل گئی۔ مبجرویر جیہ کو گھوڑے پر سوار ہونے میں مدد دی تھی۔ ”ٹکا کا دوست، وہ انگریز لڑکا جب کبھی بالمیر آتا ہے رات کا کھانا میرے ساتھ گھر پر کھاتا ہے۔“ مبجرویر چلتے چلتے اسے بتایا۔

”کیا جیس آبرن ایک اچھا آفیسر ہے، مبجرویر صاحب؟“

مبجرویر سنگھ مسکرایا۔ ”وہ ایک شاندار شہسوار اور بہترین انسان ہے۔ اگر اس کے سر پر پگڑی اور ہاتھ میں تلوار ہو تو راجپوت لگتا ہے۔“

”پردہ دار عورتوں کا بھی یہی کہنا تھا“ میجر صاحب۔“ جیہ نے جواب دیا۔ ”بس وہ آنکھوں سے مار کھا گیا تھا۔“

بالمیر قلعہ کے دوسرے حصے میں لوگ شام کی ضیافت کے لئے اپنی نشستیں سنبھال چکے تھے۔ جیہ، پرنس پر تاپ کے پہلو میں بیٹھی تو اس نے تیوریاں چڑھا کر اپنی بیوی کو دیکھا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

”معاہدہ طے پا گیا“ شہزادی۔“ اس نے سرگوشی کی۔ ”آئندہ موسم گرما میں ہم لندن میں ہوں گے۔“

زنان خانے کی بیرونی دیواروں پر نئے گیس لیپ روشن تھے، لیکن دیواروں پر نئی روغنی تصاویر نہیں تھیں جن سے جیہ کو پانچ سال پہلے یہاں سے رخصت ہونے کے بعد سے اب تک ریاست میں کسی تبدیل یا ترقی کا احساس ہوتا۔ اس کی خواہش تھی کہ اب وہ کبھی قلعے میں نہ آئے۔ وہ اپنے بچپن کی نشانیوں کی تباہی دیکھنے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی اور نہ ہی یہ دیکھ سکتی تھی کہ اس کے والد کے دور کے قابل اعتماد لوگ عوام کو حکمران کے خلاف بھڑکائیں۔

کھانے کے بعد موسیقی کی محفل سجائی گئی لیکن جیہ باوجود کوشش کے خود کو موسیقی کی طرف راغب نہیں کر سکی تھی۔

جوں جوں لندن روانگی کے دن قریب آتے رہے، جیہ پر ایک عجیب طرح کا خوف طاری ہوتا گیا۔ کوئی ایسی قوت تھی جو اسے آگاہ کر رہی تھی کہ اس دورے کے نتائج تباہ کن برآمد ہوں گے۔ اس نے ان پر آگندہ خیالات سے بچنے کے لئے برت رکھنے شروع کر دیئے اور پوجا پاٹ میں مزید مستعدی اور تیزی لے آئی۔

لیڈی مودی نے جب برت رکھنے والی جیہ کو بہت دنوں کے بعد دیکھا تو چونک اٹھی۔ ”ڈارلنگ، مجھے تو کسی نے تمہاری بیماری کے بارے میں ٹیلی گرام نہیں دیا۔“ اس کا اشارہ جیہ کی گرتی ہوئی صحت کی جانب تھا۔ ”کیا تم ماں بننے والی ہو؟“

جیہ پھپھکے سے انداز میں مسکرا دی۔ تاہم اس نے لیڈی مودی کے دونوں اندازوں کی تردید کی اور اسے بتایا کہ فی الوقت اس کی صحت شاندار ہے۔

”مگر ڈارلنگ، تم اتنی خوفزدہ دکھائی کیوں دے رہی ہو؟“ لیڈی مودی نے جیہ کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ ”مگر یہ ایسا ریگزی بیشن میں شرکت کے لئے ہر کوئی لندن جا رہا ہے۔ کہیں تم اس وجہ سے تو پریشان نہیں کہ تمہیں اپنی خوبصورتی کا معیار برقرار رکھنے

میں وقت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔“

جیہ کے ماتھے پر ناگواری کی لکیریں ابھر آئیں۔ ”پارٹیاں خوبصورتی۔ تاثرات..... ان بے ہودہ باتوں کی فکر آپ کو ہے یا ہمارے شوہر کو۔ ہمیں ان کی پروا نہیں ہوتی، پس!“

لیڈی مودی نے ہولڈر میں نیا سگریٹ لگایا اور اسے سلگا کر دھوئیں کا مرغولہ کمرے کی محدود فضا میں اگل دیا۔ ”یہ بات تو میں شرط لگا کر کہہ سکتی ہوں کہ تمہیں شاہ جارج اور ملکہ میری کے سامنے پیش ہونے کے سلسلے میں کسی خاص اہتمام کے بارے میں نظر انداز کیا گیا ہے۔“

جیہ خاموش رہی۔ اس کی نظر میں یہ بے وقوفی کی باتوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ لیڈی مودی نے جب جیہ کو خاموش اور ساکت بیٹھے دیکھا تو اسے لے کر الماریوں کے قریب چلی گئی اور پھر اسی کے اشارے پر جیہ نے الماریوں سے ساڑھیاں نکال نکال کر انہیں زمین پر ڈھیر کرنا شروع کر دیا لیکن لیڈی مودی انہیں مسترد کرتی چلی گئی۔ اسے کوئی لباس پسند نہ آیا تھا۔

آخر کار لیڈی مودی کی نظروں کو سنہرے اور سبز دھاگے سے بنا ہوا انٹو کا ایک لباس پسند آ ہی گیا۔

”سیرپور کے زر و جواہر کے ساتھ یہ مناسب رہے گا۔ اب تم یہ بتاؤ کہ دستانے کس رنگ کے پہنوں گی؟“

جیہ نے پریشان نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ بولی۔ ”دربار میں پیش ہوتے وقت تو تمہیں لازمی طور پر دستانے پہننے ہوں گے۔ ڈارلنگ۔ میں چاہوں گی کہ کاؤتس شرف تمہیں درباری آداب کے بارے میں تربیت دے۔ میں یہ بھی سوچ رہی ہوں کہ تمہارے لندن پہنچنے سے پہلے ہی مسٹر کرٹیز کو تمہارے لئے خصوصی لباس کی تیاری کا آرڈر دے دیا جائے۔“

”کیا ضروری ہے کہ ہم تاج۔ زیورات اور شہانہ لباس ہی زیب تن کریں؟“ جیہ کا انداز باغیانہ تھا۔ ”آخر قبائلی لوگ جب جانوروں کی کھال پہن کر ہمارے دربار میں پیش ہوتے ہیں تو ہم انہیں بے انتہا عزت و احترام دیتے ہیں۔“

”اوہ ڈارلنگ“ لیڈی مودی کو ہنسی کا ایسا دورہ پڑا کہ وہ ساڑھیوں کے ڈھیر پر ہی اوندھی ہو کر گر گئی۔ ”میں تصور نہیں کر سکتی کہ شاہ جارج اور ملکہ میری کا“ تمہیں شیر کی کھال میں ملبوس دیکھ کر کیا حال ہو گا۔ بے ہوش تو وہ ضرور ہو جائیں گے۔“

کچھ دیر بعد لیڈی مودی چلی گئی لیکن خوشبودار کانڈوں پر جیہ کے لئے بہت سی ہدایات تحریر کر کے چھوڑ گئی۔

چاندنی کمرے میں داخل ہوئی تو تیاریاں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ”کیا کنواریوں کے لئے یہ مسئلہ پریشان کن نہیں ہے، حکم؟“ اس نے ساڑھیوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔
 ”چاندنی!“ جیہ کے لمبے میں سرزنش تھی۔ ”آئندہ یہ لفظ کبھی استعمال نہ کرنا۔ ہم نہیں چاہتے کہ لندن میں کوئی شخص تمہارے اس لفظ کو سمجھنے میں کامیاب ہو جائے۔“

چاندنی کے حلق سے ایک ہلکی سی چیخ آزاد ہو گئی اور اس نے نقاب سے اپنا چہرہ ڈھک لیا۔ ”میں آپ سے بنتی کرتی ہوں کہ مجھے اپنے ساتھ لندن نہ لے جائیں۔“ وہ ایک دم روہانسی ہو گئی۔ ”انگریز مجھے نپاک کر دیں گے۔ انگریز کے چھونے سے اگر مہاراجہ نپاک ہو جاتے ہیں تو میں اور میری کیا حیثیت؟ میں ایک غریب سی نوکرانی اس بے شرم فضا میں کیسے بچ پاؤں گی، حکم؟“

لیکن چاندنی آخر کار جیہ کے ساتھ لندن جانے پر رضامند ہو گئی کیونکہ گنگا کے مقدس پانی کی وافر مقدار بھی لندن لے جانی جا رہی تھی۔ اپنی نے موٹے گتوں میں ڈانس ریکارڈ پیک کر دیئے تھے تاکہ جیہ بحری جہاز پر بھی رقص کی پریکٹس کرتی رہے۔ جبکہ چاندنی نے بد نظروں سے بچنے کے لئے اپنی کلائی کے گرد ایک دھاگہ باندھ لیا تھا۔ اسی طرح کے انتظامات کے بعد جیہ اور اس کا ساز و سامان بمبئی لے جانے کی لئے ٹرین پر سوار کر دیا گیا تھا۔

جہاز بمبئی سے بس روانہ ہونے ہی والا تھا۔ چاندنی اور دیگر ملازمین جیہ اور پرنسپل کا سامان ان کے کیب میں پہنچا چکے تھے اور اب مزید احکامات کے منتظر تھے۔

سفید وردیوں میں ملبوس بحریہ کا ایک بینڈ الوداعی دھن بجا رہا تھا جبکہ جیہ ریٹنگ پر جھکی اپنے پالش زدہ ناخنوں کو آہنی پائپ پر بجاتے ہوئے میوزک کا ساتھ دے رہی تھی۔

اچانک اس کی نظر کچھ فاصلے پر کھڑی ایک پست قامت عورت پر پڑی۔ وہ ریٹنگ پر جھکی ہوئی تھی اور اس کی نوگز طویل مرہٹہ ساڑھی ہوا سے بے قابو ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے عقب میں کئی بچاری کھڑے تھے۔

پرنس پرنسپل نے پست قامت کو پانی میں پھول پھینکتے دیکھا تو ہنکارا بھرے بغیر نہ رہ سکا۔ ”یہ بروودہ کی شیر دل ملکہ ہے۔“ اس نے اپنی بیوی کو بتایا۔ ”ایک کریک شات اور ہندوستان میں ملکہ میری کی عزیز ترین دوست۔ اس وقت یہ اپنی پوجا میں مصروف ہے۔ مجھے

امید ہے کہ کیپٹن اس کی وجہ سے لنگر اٹھانے میں ایک گھنٹے کی تاخیر کر دے گا۔
جیہ نے مہارانی بروودہ کو دیکھ کر سر کو اثباتی جنبش دی لیکن منہ سے کچھ نہیں بولی۔
”اے بھگوان“ پرتاپ نے دوسری سمت دیکھا۔ ”اور یہ ہے بیگم بھوپالی۔“
جیہ نے دیکھا، ایک موٹی تازی عورت جہاز کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ بہت سے
مہاسب اس کے پیچھے تھے۔

”اور یہ ہری سنگھ آف کشمیر تو نہیں؟“ پرنس پرتاپ کی نگاہوں نے کچھ اور ڈھونڈ لیا
تھا۔ ”کیا اتفاق ہے؟ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ وہ اسی جہاز پر سفر کر رہا ہے۔ چلو اس کی
موجودگی سے سفر کی بوریست کچھ تو کم ہوگی۔“

سفر کے پہلے نصف حصے کے دوران تو جیہ کو یوں لگا جیسے وہ واپس پردے میں چلی گئی
ہو۔ کم از کم وہ مردوں سے اسی انداز میں دور رہی تھی۔ پوجا کے لئے بیٹھی ہوئی جیہ کو صبح
سورے دوسرے کینوں سے بھی ایسی ہی آوازیں آئیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ دیگر ہم
سفر عورتیں بھی اس کی طرح پوجا پاٹ میں مصروف ہیں۔

بالائی ڈیک کی ایک جانب پردہ تان دیا گیا تھا۔ شاہی خواتین اپنے اپنے نقاب سے بے
پردہ اس حصے میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتیں۔ ان کے مرد ملازم بجا آوری کے لئے ان کے
پہلو میں ہوتے اور وہ دور نیلگوں سمندر میں کچھ تلاش کرتی رہتیں۔ جیہ اکثر گھنٹوں پر سر
رکھے ان عورتوں کی لندن اور پھر واپس ہندوستان آ کر مصروفیات کے منصوبے سنتی رہتی۔

کبھی کبھار ان پردوں میں ہلچل ہوتی اور ملازم دوڑ کر پردے تک جاتے۔ پھر وہ پیغام
لائے کہ کوئی حکمران چاہتا ہے کہ اس کی دھرم پتی اس سے آٹے۔ چند ایک موقعوں پر جیہ
کو بھی بلایا گیا تاکہ وہ اپنے شوہر کو انگریزوں کے ساتھ ڈیک ٹینس کھیلتے دیکھ سکے۔ رات کو
یہ عورتیں پردے ڈالے اپنی اپنی میزوں پر کھانا کھا رہی ہوتیں اور ان کے شوہر انگریز عورتوں
کے ساتھ کچھ اڑا رہے ہوتے یا ڈانس فلور پر ان کے ہمراہ رقص میں مصروف ہوتے۔
صرف بروودہ کی شیردل مہارانی ایک ایسی عورت تھی جو ہر کام مخصوص وقت پر کرتی
تھی۔ ہر عورت کو علم ہوتا تھا کہ مہارانی کب اپنے شوہر کے ساتھ بیٹھ کر سرکاری فائلوں کا
کام نمٹائے گی اور کب اس کے ساتھ ڈیک پر چہل قدمی کرے گی۔

”میں نے تمہارے شوہر کو ملکہ میری کے دربار میں دیکھا تھا۔ شنراوی۔“ ایک روز
مہارانی بروودہ نے کتاب سے نظریں اٹھا کر جیہ کو مخاطب کیا۔ ”جب ملکہ نے بروودہ کے دلی
عہد کے بارے میں پوچھا تو میرے بیٹوں نے اپنی پانچ سالہ بہن کو آگے کر دیا۔ پرتاپ نے

اس بات پر ایک بلند آہنگ ققمہ لگایا تھا لیکن خوش قسمتی سے ملکہ نے اس کا قطعی برا نہیں کیا۔

ایک ہالیائی ریاست کے مہاراجہ کو بیاہی جانے والی دو سگی بہنیں بھی یہ گفتگو سن رہی تھیں۔ چھوٹی مہارانی نے اپنی چمک دار نیلی آنکھیں اوپر اٹھائیں۔

”بادشاہ اپنے ملازمین اور مصاحبین کی طرح کبھی ناراض نہیں ہوتا، حکم!“ اس نے مہارانی بربودہ کی تائید کی۔ ”یہی دیکھو میری اور میری بہن کی شادی ایک ہی شخص سے ہوئی ہے۔ ہمارا والد نشے میں تھا اور جب ہمارے شوہر نے اس سے ایک بیٹی کا ہاتھ مانگا تو میرے والد نے کہا، ایک کیوں؟ دونوں لے لو۔ متنی کے وقت ہم بہت کم سن تھیں لیکن انگریز المروں نے ہمیں یوں احساس دلایا جیسے ہم نے کوئی غلط کام کیا ہے، البتہ صرف شاہ جارج اور ملکہ میری نے اس کا کوئی برا نہیں منایا۔“

دوسری بہن نے کرسی آگے کھسکائی۔ ”اور پھر... لندن میں.... بکچم پیلس میں ایک اس کے دوران.... شاہ نے مجھے اپنے ساتھ رقص کرنے کی دعوت دی حکم! میں نے انصاف کی کہ ہمارا دھرم شوہر کے سوا کسی غیر مرز کو چھونے کی اجازت نہیں دیتا۔ شاہ میری بات سن کر بالکل ناراض نہیں ہوا بلکہ اس نے میری حوصلہ افزائی کی تھی۔“

چھوٹی مہارانی نے بڑی کی قطع کلامی کی۔ ”بس ہمارے شوہر ہی ہماری حوصلہ افزائی پس کرتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ یورپ میں ہم لپ اسٹک لگائیں اور چروں پر نقاب لٹھیں۔“

بیکم بھوپالی سمندر کا نظارہ کر رہی تھی۔ شاہی چھتری اس کے سر پر تھی۔ وہ مہارانیوں کی طرف مڑی تو باقی عورتیں، حتیٰ کہ حکمرانوں کی بیویاں بھی اس کے احترام میں خاموش ہو گئیں۔

”میرے نزدیک نقاب ایک مفید اور سودمند ہتھیار ہے۔“ وہاں موجود تمام عورتوں نے ایک حکمران عورت کی بات نہایت خاموشی اور احترام سے سنی۔ ”یہ درست ہے کہ میری اوی نے تاج پوشی کے وقت اپنا نقاب اتار پھینکا تھا تاکہ عوام اپنی حکمران کا چہرہ دیکھ سکیں۔ لوں نے جنگ آزادی کے دوران محصور انگریز خاندانوں کو رہائی دلانے کی کارروائی کے دوران بھی اپنا چہرہ بے نقاب رکھا تھا۔ ان دنوں میں محسوس کرتی ہوں کہ نقاب مجھے اجنبیوں سے ایک ضروری فاصلہ قائم رکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔“

تمام خواتین نے اپنے سروں کو تائیدی جنبش دی۔ وہ سب کی سب اس امر سے آگاہ

تھیں کہ اجنبیوں سے بیگم بھوپالی کی مراد برطانوی راج کے انگریز افسران ہیں۔

بحری جہاز جب مارسیلز پہنچا تو شاہی افراد خشکی پر اترنے لگے۔ انہوں نے پوچھتا کے لئے اپنے جسموں پر گنگا کا مقدس پانی چھڑکا تھا لیکن بیگم بھوپالی کے مصاحب نے اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں سے مزین اور منقش ریشمی کپڑے میں لپٹا ہوا قرآن پاک سر سے بلند کر لیا کہ اس کی حکمران اس کے سائے میں خشکی پر قدم رکھ سکے۔

ڈاکس کے ساتھ پرنس پر تپ کے دورے کے لئے سیاہ رنگ کی ریتاٹ کاریں منظر تھیں۔ کاریں تیز رفتاری سے سڑکوں پر سے گزرتی ہوئی ریلوے اسٹیشن کے باہر جا رکیں۔ جیہ کار سے نکلی تو اس نے اپنی دیگر ملازموں کے ساتھ ساتھ فرانسیسی ملازمہ اپنی کو بھی حواس باختہ بچوں کی مانند نقاب میں لپٹے دیکھا۔

کئی گھنٹے بعد ٹرین ایک لائن والے چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی تو پرنس پر تپ اپنی بیوی کے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔

”صرف وہ چیزیں لے لو جن کی تمہیں پوجا کے دوران ضرورت ہو سکتی ہے۔“ اس نے جیہ کو ہدایت کی۔

جیہ نے ایسا ہی کیا اور پھر اپنی کے ہمراہ پلیٹ فارم پر اتر آئی۔

سیاہ رنگ کی ایک اور کار جلد ہی انہیں لے کر سرسبز و شاداب علاقے کی جانب روانہ ہو گئی جہاں نسبتاً پختہ سڑک ختم ہو گئی اور ایک پتھریلا راستہ دکھائی دیا جو کھائی میں اتر رہا تھا۔ کار اب اسی راستے پر آگے بڑھ رہی تھی۔ بچکولے گلنے سے جیہ بار بار آگے کو جھک آتی تھی۔ اسے ڈر بھی لگ رہا تھا، چنانچہ اس نے بے اختیارانہ اپنے شوہر کا شانہ تھام لیا۔ پر تپ نے کھا جانے والی نگاہوں سے پلٹ کر اسے دیکھا تو وہ پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”اسے تباہ شدہ علاقہ کہتے ہیں۔“ پر تپ نے جیہ کو بتایا۔ ”جنگ کے دوران یہاں مشینی دستوں کی حقیقی لڑائی ہوئی تھی۔ ان بھاری بھرکم اور تباہ کن ٹینکوں کے سامنے ہمارے گھوڑے کھلونے کی طرح لگتے تھے۔“

گاڑی رک گئی۔ ایک سطح جگہ پر سنگ مرمر سے ایک یادگار بنی ہوئی تھی۔ پر تپ یادگار کی جانب گیا تو بیہ اس کے پیچھے تھی۔ یادگار پر کامنی مندر کی دیوی کی شکل کا ایک پتھر سے نصب تھا۔ سنگ مرمر پر جنگ میں کام آنے والے سیرپور لانسرز کے نام اور رینک درج تھے۔

”جنگ کی بمباری میں بالیر کے آٹھ گھڑسوار ہلاک ہوئے تھے۔ شہزادی۔“ پرنس

تپ نے اپنی بیوی کو بتایا۔ ”تمہارے کزن نے ان کی یاد میں کچھ تعمیر نہیں کروایا لیکن اگر چاہو تو اس کی پوجا کر سکتی ہو۔“

جیہ نے دیوی کے بت کی مانگ میں سیندور لگایا۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے سرخ ڈور اڑا کر سنگ مرمر میں کچھ کھدے ہوئے ناموں کے حروف پر ڈال دیا تو جیہ کو اپنی خون و دانگی یاد آگئی جب وہ نکا کے ماتھے پر اپنے خون سے نشان لگانے جا رہی تھی۔

سورج پہاڑی کے عقب میں غروب ہونے جا رہا تھا۔ پرنس پر تپ نے اچانک جیہ کو بانسوں میں گھسیٹ لیا۔

”یہ حقیقتاً ایک منہج خانہ تھا شنزادی۔“ اس نے اپنی بیوی کو بتایا۔ ”یہ مرگٹ اور ستان دور تک پھیلے ہوئے تھے لیکن ہم میں سے بہت سوں کو، بشمول میرے اور نکا کے زندگی میں پہلی بار مردانگی دکھانے کا موقع ملا تھا۔ بغیر عزت کے زندگی گزارنا کوئی گلوکار تجربہ نہیں ہے۔ شنزادی۔“

”ہاں“ جیہ نے اس کی تائید کی۔ ”ایک ناپسندیدہ بیوی اس تجربے میں آپ کے ساتھ حکم!“

کندھوں پر انگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ جیہ نے بے اختیار اپنے ہونٹ کٹ ڈالے۔ اس میں خاموش رہتی۔ وہ سوچنے لگی۔ اس کے شوہر کے ہونٹوں پر ظالمانہ مسکراہٹ اتر رہی تھی۔ ”ہم نے اپنا فرض پورا کیا۔ آؤ زندگی کی طرف واپس چلیں۔“

پیرس میز یوں لگا جیسے پرنس پر تپ اپنی بیوی سے زیادہ سے زیادہ فاصلے پر رہنا چاہتا تھا۔ جیہ رنڈ ہوٹل کے سوٹ میں تنہا بیٹھی رہتی اور پرنس پر تپ دوستوں کے ساتھ آوارہ می کرتا رہا۔ کبھی کبھار وہ پرہجوم ہوٹلوں کی میزوں پر خاموش بیٹھی رہتی اور پرنس پر تپ مہمانوں کے ساتھ گپیں ہانکتا رہتا۔

پرنس پر تپ، جیہ کو میسج ریٹورنٹ لے گیا تو ان کی ملاقات مہارانی کوچ بہار سے ہوئی۔ دونوں کو دیکھ کر وہ بیہوش طرح ان کی طرف آئی تھی۔

”آخر میں نے سیاہ کنوپی سے ملاقات کر ہی لی۔“ اس کا اشارہ جیہ کی طرف تھا۔ ”تم ہم سے کیوں چھپا رہے تھے؟“ وہ جیہ کی طرف مڑی۔ ”میں نے کلکتہ ڈربی کے پر تپ پر تھیں دیکھا تھا۔ میری جان!“

”میں دراصل ملکہ میری کی منظوری کا منتظر تھا۔“ پرنس پر تپ نے بات بنائی۔ اس نے نی کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ ”بائی داوے! اندر!۔۔۔ یہ غریب، مسکین کون ہے؟“

مہارانی اندرا کی میز پر ایک پستہ قامت ہندوستانی، سوٹ پہنے بیٹھا تھا۔ وہ مجھول، تکلیف دہ نگاہوں سے وائن ویترو کو دیکھ رہا تھا۔ مہارانی نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور اس بے چارے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ ویترو بے شک اس کا شراب کا گلاس بھر دے۔

”یہ میرا باورچی ہے، ڈارلنگ“ مہارانی مسکراتی ”میں اسے فرانسیسی شراب اور کھانوں کی تربیت کے لئے یہاں لائی ہوں اب بھلا یہ خود شراب نہیں پیئے گا تو میرے لئے کیا خاک بنائے گا؟“

مہارانی نے ذو معنی انداز میں آنکھ دہائی تو جیہ کی ہنسی نکل گئی وہ مہارانی کی تربیت کا مطلب اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔

”اوہ!“ مہارانی نے جیہ کا ہاتھ تھپتھپایا۔ ”بالآخر سیاہ کنول کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ ہی گئی۔“ ”اخبار کہتے ہیں کہ سیاہ کنول کبھی نہیں مسکراتا لیکن تمہاری مسکراہٹ تو دل بھانے والی ہے، پیاری شہزادی!“

وہ پرنس پر تپ کی طرف مڑی ”میرے خیال میں تو تم کشمیر کے ہری سنگھ کے ساتھ ہی فرانس آئے ہو نا؟ اب وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟“

”کیا مطلب، اندرا؟“

”برا ماننے کی ضرورت نہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ ایک فرانسیسی شادی شدہ عورت کے ساتھ ملوث رہا ہے اور اب وہ جوڑا اسے بلیک میل کر رہا ہے۔“

پرنس پر تپ نے شانے اچکائے۔ ”بلیک میل کا معاملہ اگر اطمینان بخش طور پر طے نہ ہوا تو برطانوی یقینی طور پر کشمیر کو مجبور کریں گے کہ وہ نیا دلی عہد تلاش کرے۔“

مہارانی نے ہاتھ اٹھا کر اپنی زلفیں سنواریں تو اس کا برسلیٹ کھٹکنا اٹھا۔ ”یہی تو ہے انگریزوں کا انصاف“ اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔ ”صرف پرنس آف ویلز کو ہی شادی شدہ عورتوں سے عشق لڑانے کی اجازت ہے لیکن اگر ہندوستانی ریاستوں کے ولی عہد ایسا کریں تو انہیں تخت سے محروم ہونے کی دھمکی مل جاتی ہے۔“

رودبار انگلستان عبور کرتے ہوئے جیہ کو جہاز کے ڈیک پر کھڑے، وہ کتابیں یاد آ گئیں جو ’نکا‘ لندن سے منگوایا کرتا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے یہ کل کی بات ہو۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اب نہ وہ کتابیں رہی تھیں اور نہ انہیں منگوائے والا زندہ تھا۔

لیڈز ۱۰۰۰ بی نے لندن میں ان کا استقبال کیا اور جب وہ کار میں بیٹھ کر بیٹی سے روانہ

احسب معمول لیڈی مودی کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی تھی۔

”م لندن کے بارے میں کیا توقع لئے بیٹھی ہو، ڈارلنگ“ لیڈی مودی اپنے مخصوص امیں بولی۔ ”جنگ ختم ہوئے پانچ سال گزر چکے ہیں۔ نصف سے زیادہ کارخانے اور کارخانے ہو چکی ہیں اور ملازمتیں ناپید ہیں۔ ہر شخص خوف زدہ ہے کہ اگر صورت حال بہتر ہو تو کیونٹ غلبہ حاصل کر لیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ انتخابات میں سوشلسٹ پارٹی کو حاصل ہوئی ہے..... اور ڈارلنگ بہت ہی غیر معمولی قسم کے لوگ سوشلسٹ ہو گئے۔ لارڈ کرزن کی بیٹی۔ کاؤٹس آف داروک۔ نصف سے زائد برطانوی نئی نسل کیونکہ ان طلال میں یہ ایک فیشن ایبل چیز ہے۔ حتیٰ کی ہندوستان کا آخری وائسرائے بھی سوشلسٹ پارٹی کا رکن ہے اور اسی کینٹ کا ممبر ہے۔ یہ بھی سن لو کہ اس کی بیوی یعنی لیڈی تھمس فورڈ تھمس دربار میں پیش کر رہی ہے۔ اب بتاؤ تم وہ تمام چیزیں لائی ہو جس لئے میں نے تمہیں کہا تھا۔“

جس روز جیہ کو شاہی دربار میں پیش ہونا تھا لیڈی مودی ایک فرانسیسی بیئر ڈریسر کے آئی تھی۔ لیڈی مودی کی ہدایات کے عین مطابق بیئر ڈریسر نے جیہ کے بالوں کے نچلے کو سرخ کر دیا تھا۔ اور پھر ضروری تراش خراش کے بعد بالوں میں بیئر ڈال کر انہیں لکھا گیا اور طلائی برادہ بالوں کے اوپر اور مانگ میں چھڑک دیا گیا جیہ کو اپنا سر ہلانے میں تکلیف کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

”تھوڑا سا برداشت کرو ڈارلنگ۔“ لیڈی مودی نے اسے تسلی دی۔ ”دربار کے بعد اپ اور وکٹر تھمس کلیرج لے جائیں گے جہاں سارے برطانیہ کا پریس تمہارا منتظر ہو گا۔“

”م شاید نہیں جانتیں کہ پریس ہمیشہ بے داغ چیزیں پسند کرتا ہے۔“

تیار ہو کر جیہ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی تو اپنے عکس سے خود ہی شرمائی۔ اسلونی جیہ پر کھلتے ہوئے رنگ کی ریشمی ساڑھی۔ کالے اور سرخ بال اور بالوں میں ابرادہ بے حد خوب صورت لگ رہا تھا۔ ناک میں ہیرے کی نتھنی تھی۔ جبکہ اس کی سبز میں چاہے جانے کی آرزو مند تھیں۔

اس نے اپنے دستاں اٹھائے اور وکٹر اور پرتاپ کے پاس آنے کے لئے بیڑھیوں کی بڑھی۔ سیرپور برادرز کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئی۔ ریاست کے سنہرے کام والے لباس میں بے حد خوبصورت اور طویل قامت دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی پگڑیوں کے عین وسط اہرے جگمگا رہے تھے۔ پرنس پرتاپ کے ہاتھوں میں وہی تلوار تھی جو جیہ نے اپنی شادی

پر تھام رکھی تھی۔

ہماراجہ دکنٹر نے جھک کر حسن کی اس دیوی کو تعظیم دی۔ ”تم بہت دلکش لگ رہی ہو۔ شہزادی“ اس نے تبصرہ کیا۔ ”لیکن یہ دستانے کچھ درست نہیں۔ انہیں چھوڑ دو۔“
 ”پہی کے مطابق۔ ہمیں یہ لازمی پہننے ہیں حکم!“ جیہ نے جواب دیا۔ ”اور ہم پہلا ہیں کہ تعظیماً“ جھکتے وقت ہمارے پاؤں ساڑھی میں الجھ جائیں گے۔“
 ہماراجہ دکنٹر کے چہرے پر شش و پنج کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ”میرے خیال میں تم انہیں جھک کر تعظیم نہیں دو گی۔“

”تب پھر ہمیں کیا کرنا ہو گا؟“ جیہ گھبرا گئی۔ اسے خطرہ محسوس ہونے لگا کہ پروٹوکول سے ہماراجہ دکنٹر کی بغاوت اس کے لئے مسائل نہ کھڑے کر دے۔

”تم سیرپور کی شہزادیوں اور راج کماریوں کا رویہ اپناؤ گی، شہزادی۔“ ہماراجہ دکنٹر کا لمٹھکانہ تھا۔ ”ہماری روایتی خیر مقدمی رسمیں تمہیں یاد ہوں گی۔ تم وہی کرو گی جو تم نے ہائرس آف ویلز کی سیرپور آمد کے موقع پر کیا تھا۔ میں حیران ہوں کہ تم نے اس سے ہمارے کچھ اور سوچا بھی کیسے۔ کیا تم تصور کر سکتی ہو کہ میری داوی کسی کے سامنے سر جھکاؤ گی۔“

جیہ خاموش ہو گئی البتہ اسے خوشی ہوئی تھی کہ اس کا شوہر نہ سہی کم از کم جیٹھار کی عزت و ناموس اور مقام کے بارے میں ایسی سوچ رکھتا ہے۔ اپنی داوی سے تشبیہ دہانے سے جیہ کے دل میں ہماراجہ دکنٹر کے بارے میں اگر کوئی شک تھا تو وہ بھی دور ہو گیا تھا۔
 بکنگھم پیلس کے باہر لوگ گردہ در گردہ جمع تھے۔ جوں ہی وہ کار میں کسی شناسا چہرے کی دیکھتے تالیاں بجا کر استقبال کرتے۔ اچانک کوئی چلایا۔ ”پولو کے کھلاڑی!“ سیرپور کی رولس رائس سامنے سے گزر رہی تھی۔ اس کے بونٹ پر ہماراجہ دکنٹر کا پرچم لہرا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کار بکنگھم پیلس میں داخل ہو گئی۔

جیہ نے پلٹ کر لہراتی ہوئی ٹوپوں اور چھتریوں کی طرف دیکھا۔ ”یہ بھلا ہمیں کیسے جانتے ہیں، حکم؟“ اس کے لبے میں حیرت تھی۔

”اخبارات، مائی ڈیئر۔ ممکن ہے انہوں نے کبھی پولو نہ دیکھی ہو لیکن وہ ہماری سرگرمیوں سے پوری طرح آگاہ ہیں۔“

گاڑی اس راستے پر آگئی جہاں شاہ جارج نجی طور پر ہندوستانی حکمرانوں کا استقبال کر رہا تھا۔ دونوں بھائی اتر گئے اور رولس رائس آگے بڑھ گئی۔ جیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے

مہسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اتنی بڑی بادشاہت میں بالکل تنہا رہ گئی ہو۔
کار تھوڑی دور جانے کے بعد ایک اور دروازے پر رک گئی تو جیہ کی جان میں جان آ
۲۔ دروازے کے سامنے بنی سیڑھیوں سے ایک ہندوستانی عورت ساڑھی سنبھالتی نیچے اتر
لا تھی۔

دربار میں پیش ہونے والی تمام شاہی عورتیں ایک بغلی چیمبر میں منتظر تھیں۔ لیڈی
اس فورڈ نے جیہ کا تعارف ڈچز آف ڈیون شائر اور مسٹرلس آف روبس سے کرایا۔ وہ
ان ہندوستانی عورت جس نے محل میں جیہ کو خوش آمدید کہا تھا اس کے دستانے تہہ کر
ہنڈیک میں رکھ رہی تھی۔

دونوں آپس میں کچھ دیر باتیں کرتی رہیں لیکن جلد ہی ملکہ اور بادشاہ کی آمد کے اعلان
یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ جیہ لیڈی چیمس فورڈ کے ہمراہ تھرون روم کی طرف بڑھی۔ اس
ہاتھ پسینے سے بھگے جا رہے تھے جنہیں وہ بار بار اپنی ساڑھی سے مسل رہی تھی۔

ڈائرس پر بادشاہ کھڑا تھا۔ بھاری داڑھی والا ایک پست قامت شخص۔ جیہ نے بچپن سے
کا نام سنا تھا لیکن اس وقت وہ جیہ کو کوئی غمگین کتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی بیوی ملکہ
اس کے برابر تھی اس نے نفرتی رنگت کا گاؤن زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کے بالوں اور
ان اور کلائیوں کے گرد ہیرے چمک رہے تھے۔ پرنس آف ویلز اور اس کے چھوٹے
شاہ اور ملکہ کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ ان کے عقب میں جیہ کو ڈائرس پر مہاراجہ
اور الور اور پٹیلہ کے مہاراجہ کھڑے دکھائی دیے تھے۔

لیڈی چیمس فورڈ نے ایک کارڈ، نفرتی طشتری میں ڈال دیا جو ایک ملازم کے ہاتھوں میں
طشتری درباری لباس پہنے ہوئے مختلف ملازموں سے ہوتی ہوئی ڈائرس کے نیچے کھڑے
چیمبرلین تک پہنچ گئی جس نے کارڈ اٹھایا اور جیہ کا نام اور اس کے خطابات بہ آواز بلند
رہائے۔

اپنی طرف نگراں آنکھوں کے جلو میں سے جیہ، لیڈی چیمس فورڈ کے عقب میں چلتی
دعریض دربار ہال کے آخری سرے کی طرف بڑھی جہاں ہندوستان کا بادشاہ موجود تھا۔
جیہ نے ہندوستان کی روایات کے عین مطابق ہاتھ جوڑ کر اور سر جھکا کر بادشاہ کو پرنام
اس کے اداس چہرے پر مسکراہٹ اتر آئی لیکن ملکہ نے جیہ کے بالوں اور ساڑھی کو
در بطور خاص دیکھا تھا پورے دربار ہال میں خاموشی تھی۔ جیہ جانتی تھی کہ اس وقت
ہال میں موجود ہر شخص نے اپنی سانس روک رکھی ہوگی تب ملکہ مسکرا دی اور پرنس

آف ویلز نے سر کو اثنائی جنبش دی۔ بادشاہ کے حضور حاضری مکمل ہو گئی تھی۔

جیہ ایک بار پھر ہجوم کے درمیان سے گزری۔ وہ اپنی کرسی پر گر کر شاید بے ہوش مئی ہوتی اگر فوراً ہی اس کی نگاہ عقب میں کھڑے پرنس پر تپ پر نہ پڑ گئی ہوتی۔ کوئی تین گھنٹے تک لارڈ چیمبرلین مختلف نام اور خطابات پکارتا رہا اور شاہی خواتین ایک طویل قطار بادشاہ کے حضور حاضری کے فرض سے سبکدوش ہوتی رہی۔

آخر کار شاہ جارج اور ملکہ میری ڈائس کے عقب میں ایک دروازے میں غائب گئے۔ ہندوستانی حکمرانوں نے ان کی تقلید کی تھی جو نئی شاہی جوڑا دربار روم سے گیا ایک آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہر کسی نے تین گھنٹے کی خاموشی کا ایک ساتھ بولنا شروع کر دیا ہو۔

بہت سے لوگ جیہ کی خوبصورتی کے بارے میں رائے زنی کر رہے تھے وہ ان تہا سے پریشان ہو کر اپنے شوہر کے قریب ہو گئی۔

”میرے خیال میں مہاراجہ الور نے شاہ جارج سے مصافحہ کرنے سے قبل اپنے دھما اتار لئے ہوں گے۔“ پرنس پر تپ نے ڈائنگ ہال میں جاتے ہوئے جھک کر جیہ کے ا میں سرگوشی کی۔ ”آخر وہ چیمبر آف پرنسز کے تین ترجمانوں میں سے ایک ہے اور تم دعا کرو کہ پرنس آف ویلز نے بلوشہ کو یہ نہ بتایا ہو کہ وکٹر اداکارہ کورا ہارٹ سے ڈ کرنے کا خواہش مند ہے۔“

ڈائنگ ہال میں دیگر مہمان، سنٹ نیبل کے گرد چکر لگا رہے تھے لیکن جیہ نے پلیٹ میں ڈالا اور ایک کونے میں کھڑی ہو گئی تاکہ سکون سے کھانا کھا سکے۔

کھانے کے دوران اور اس کے بعد بھی جیہ کچھ بور بور سی رہی۔ لیکن جب مہا وکٹر شاہ جارج اور ملکہ میری کے ہمراہ ڈنر سے فارغ ہو کر ان تک پہنچا تو اس کی بورس حد تک کم ہو گئی۔ وہ بے حد خوش تھا کم از کم جیہ نے اس سے قبل اسے اتنا خوش دیکھا تھا۔

”ملکہ میری تم سے بے حد متاثر نظر آ رہی تھی، جیہ دیوی“ اس نے سرگوشی کے ا میں اپنی بھانج کو آگاہ کیا۔ ”ہز ہائی نیس مہاراجہ الور کا کہنا ہے کہ راج کمار جیہ دیوی ہندوستانی عورت کے تاثر کو عظمت بخشی ہے۔“

جیہ نے مسکرا کر اپنے جیٹھ کا شکریہ ادا کیا۔ ”کیا مہاراجہ الور نے شاہ سے مصافحہ ا ہوئے اپنے دستانے اتار لئے تھے، حکم؟“ اس نے دریافت کیا۔

مہاراجہ وکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کم از کم الور والوں سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ گوشت خوروں کی اس طرح توہین کریں۔“

کلیرج ہوٹل کے باہر جیہ کو کئی فلیش گنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ رپورٹروں نے اسے گھیر لیا۔ وہ اس سے دربار ہال میں ہونے والی تقریب کے بارے میں تاثرات پوچھ رہے تھے۔ جیہ ساگی سے جواب دے رہی تھی اور ان کے ہاتھ تیزی سے اپنی اپنی نوٹ بکس پر کچھ لکھنے میں مصروف ہو گئے۔

پرنس پر تپ اس کی مدد کو پہنچا اور کسی قدر ناراضگی سے اسے ہوٹل کے ریوالونگ ڈورز سے اندر لے گیا۔

اندر مہاراجہ وکٹر ایک خوبصورت لڑکی پر گرا پڑ رہا تھا جس نے بہت زیادہ کھلے گلے کا ایک ریٹیٹی ڈریس پہنا ہوا تھا۔ وہ بھی بری طرح وکٹر سے لپٹی ہوئی تھی۔ جیہ کو اس کا چہرہ جانا پہچانا لگا لیکن فوری طور پر نہیں پہچان سکی کہ یہ وہی کورا ہارٹ ہے جس کی فلم اس نے دیوبیکل پردہ سیمیں پر شئی پیل میں دیکھی تھی۔

مہاراجہ وکٹر نے کورا ہارٹ کا تعارف کرایا اور ایک ننھے منے سے نرم و ملائم ہاتھ نے جیہ کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے مسکرا کر جیہ کی خیریت بھی دریافت کی تھی۔ جلد ہی دوسرے لوگ بھی ان سے آٹے اور پھر تپسین کا دور شروع ہو گیا۔ کچھ دیر تو محفل شراب اور میز تک ہی محدود رہی لیکن پھر اچانک ہی کورا ہارٹ نے رقص کی فرمائش کر دی تو تمام افراد آنا فانا باہر کاروں میں آ بیٹھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ ڈانس کے لئے پورے لندن میں امیسی کلب سے زیادہ بہتر کوئی جگہ نہیں۔

امیسی کلب میں بھری ہوئی میز کے گرد ایک اور کرسی لگائی گئی۔ ہری سنگھ آف بشمیر۔ پرنس پر تپ اور لیڈی مودی کے درمیان پھنس کر بیٹھ گیا۔ جبکہ مہاراجہ وکٹر اپنیاختہ کو لے کر چھوٹے سے ڈانس فلور کی طرف چل دیا۔

پرنس آف ویلز پہلے ہی وہاں ایک شادی شدہ عورت کے ساتھ محو رقص تھا۔ ہری سنگھ نے یہ صورت حال دیکھی تو قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکا۔

”بالآخر ہم ہندوستانیوں نے ایک چیز کی تصدیق کر لی ہے۔“ وہ بہ آواز بلند بولا۔ ”میرے وکیل میرا حوالہ مسٹر اے کی حیثیت سے دے رہے ہیں لیکن جس طرح میرا فرانسیسی وڈا مجھے بلیک میل کر رہا ہے۔ اسی طرح مسز ڈیڈلی وارڈ کا شوہر پرنس آف ویلز کو بلیک میل کرنا شروع کر دے تو پرنس صرف مسٹر بی رہ جائے گا۔“

کورا ہارٹ، نیل گریو اسکوائر پر سیرپور ہاؤس میں منتقل ہوئی تو بالمیر کے ملازموں کا غصے سے برا حال تھا۔ ہر روز وہ دروازے پر سیرپور کے ملازموں کا استقبال کرتے جن کے ہاتھوں میں امریکی لڑکی کی شاپنگ کے بڑے بڑے پیکٹ ہوتے۔

مہاراجہ وکٹر تو گویا کورا ہارٹ کے پلو سے بندھ گیا تھا۔ ریس کلب ہوتا یا پولو میچ۔ وہ ہمیشہ اس کے پہلو میں ہوتا اور اس کی بے حیائی اور بے شرمی سے بھرپور فرمائشیں پوری کرنا رہتا۔ جو ہمیشہ ٹائٹ کلبوں کے ڈانس فلوورز پر سرعام بغل گیر ہونے یا بوس و کنار سے متعلق ہوتیں۔

پرنس پر تپ کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ کورا ہارٹ کو قطعی مخاطب نہ کرے۔ اسی طرح مہاراجہ وکٹر کے دوست بھی کورا ہارٹ کو یوں نظر انداز کرتے تھے جیسے اس امریکی اداکارہ کا وجود ہی نہ ہو البتہ جیہ نے اسے بہت سی باتیں بتائی تھیں۔

جب پرنس پر تپ کو پتا چلا کہ وکٹر نے کورا ہارٹ کو دیوالی کی تقریبات پر مدعو کیا ہے تو وہ پھٹ پڑا اور آندھی و طوفان کی طرح جیہ کے کمرے میں داخل ہوا۔

”تم پاگل ہو گئی ہو جو اس لڑکی کو یہ احساس دلا رہی ہو کہ وہ اپنے گھر پر ہے؟“ وہ جیہ پر ہی برس پڑا۔ ”وکٹر نے پہلے ہی اسے قیمتی ترین جیولری اور فرکوٹ سے لے کر ریس گھوڑے تک ہر شے خرید کر دی ہے اور اب وہ اسے فرانس میں ایک ولا خرید کر دینے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ وہ الو کی بچی بھی عجیب بے وقوف عورت ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مہاراجہ سیرپور ہوتا ہائی ووڈ فلم اشارے سے کہیں زیادہ گلیمرس ہے۔“

”آپ کچھ زیادہ ہی پریشان ہیں، حکم!“

”میں زہر میں بجھے ان تیروں کا تمہاری نسبت کہیں زیادہ تجربہ رکھتا ہوں، شہزادی۔“ پرنس پر تپ اب بھی غصے میں بیچ و تاب کھا رہا تھا۔ ”اس عورت کو کاہنی مندر کے بارے میں بتاؤ۔ اسے بتاؤ کہ ہماری قبائلی اور مذہبی رسومات کیا ہیں۔ وضاحت کر دو کہ اسے سیرپور کے حوالے سے کبھی بھی برطانوی دربار میں پیش نہیں کیا جائے گا۔ اور نہ ہی اس کے دوغلے بچوں کو سیرپور کے تخت کا وارث قرار دیا جائے گا۔ بھگوان کے لئے اسے سچ بتا دو۔ اس سے پہلے کہ میرا بھائی اپنا تخت کھو دے۔ اس سفید فام سے کہہ دو کہ لوٹ جائے۔“

لیکن دیوالی کی تقریبات کے دوران جیہ اپنے اندر کبھی بھی ایسا حوصلہ پیدا نہ کر سکی کہ اس مہم کو شروع کر سکے جس کا مطالبہ پرنس پر تپ نے کیا تھا۔ جیہ نے پہلی بار مہاراجہ وکٹر کو اس قدر خوش دیکھا تھا اور یہ اسی کی خواہش تھی کہ اس کی سرکردگی میں سیرپور کی پولو

لیم فتوحات پر فتوحات حاصل کر رہی تھی۔ ٹیم کے کھلاڑی ہر فتح کے بعد کورا ہارٹ کے نام کا جام تجویز کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہی عورت، مہاراجہ وکٹر کو موت کے منہ سے واپس لائی ہے۔

جوئے خانے میں کورا ہارٹ، مہاراجہ وکٹر کی نشست کے عقب میں اپنے جسم کے اوپری حصے کا بوجھ اس کے کندھوں پر ڈال کر کھڑی ہو جاتی اور وہ جیتنا شروع کر دیتا جیہ کو، کورا ہارٹ کی شکل میں مہاراجہ وکٹر کے لئے خوش بختی اور خوش قسمتی ہی دکھائی دی تھی لیکن پر تاپ یہ ماننے کو تیار نہ تھا۔

جیہ کو ان جوئے خانوں میں ہندوستان کے بہت سے مہاراجہ اور مہارائیاں اپنی قسمت داؤ پر لگاتے دکھائی دیئے تھے۔ ان میں مہارانی کوچ بہار اور مہاراجہ گوندل سرفہرست تھے۔ پھر اسے چھوٹا ڈنگرا بھی دکھائی دیا۔ ”میں یورپ سے روانگی سے قبل بعض کانگدات پر تمہارے دستخط چاہتا ہوں، شہزادی۔“ اس نے نہایت رازدارانہ انداز میں جیہ کو بتایا۔

ایک بھاری بھر کم ہاتھ نے اس کے بازو کو اپنی گرفت میں لے لیا اور اسے ٹیس پر لے آیا۔ دونوں نے ایک میز سنبھالی تو ویٹر ایک بوتل کمپین اور کچھ سینڈ وچ لے آیا۔ چھوٹا ڈنگرا دیکھتے ہی دیکھتے کئی سینڈ وچ کھا گیا تھا۔

”یہاں بیٹھ کر کسی کو اندازہ نہیں کہ صورت حال کس قدر سنگین ہوتی جا رہی ہے۔“ چھوٹے ڈنگرا کا اشارہ لندن میں مہاراجاؤں کی خرمستیوں کی جانب تھا۔ ”جن بادشاہوں نے جنگ عظیم لڑی تھی وہ جا چکے ہیں۔ مسلحینی جیسے لیڈروں کو عروج حاصل ہو رہا ہے۔ ان کے پیروکاروں نے سپاہیوں کے لباس پہننا شروع کر دیئے ہیں اور خود کو ایک نئی جنگ کے لئے تیار کرنے کے حکم کا آغاز کر دیا ہے۔ میں تمہاری ہولڈنگز اور کچھ سرمائے کو اسلحہ سازی کی صنعت میں انویسٹ کرنا چاہتا ہوں۔“

جیہ نے شد و مد کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے جنگ کی تباہ کاریاں آگئی تھیں۔

چھوٹا ڈنگرا اسے قائل کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔ ”وکٹر اپنا سب کچھ اس امریکی عورت پر لانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھ رہا جب کہ سیر پور کا خزانہ اب خالی ہونے والا ہے۔ اس صورت حال میں بہت جلد تمہاری نجی دولت، تمہارے شوہر کی ریاست کو بچانے کا واحد مارا بن جائے گی۔“

چھوٹے ڈنگرا نے کچھ ایسی خوفناک تصویر کھینچی کہ آخر کار جیہ کو اس سے اتفاق کرنا

پردہ۔ صرف یہی نہیں، بلکہ اگلے چند ہفتوں میں اس نے کورا ہارٹ کو سیرپور اور اس کی مالی حالت کے بارے میں کئی بریفنگ دیں۔ خوبصورت امریکی لڑکی آنکھوں میں دہشت اور خوف سیٹھے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ جب اسے پتا چلا کہ سیرپور کی مہارانی بننے کے باوجود وہ کبھی بھی اس حیثیت میں شاہ جارج اور ملکہ میری کے حضور پیش نہیں ہو سکے گی۔ کورا ہارٹ نے مہاراجہ وکٹر سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ پولو میچوں کے دوران اس نے وکٹر کے بجائے ایک ٹینکس کی حوصلہ افزائی شروع کر دی جو اپنی پولو ٹیم امریکہ سے لے کر آیا تھا۔ کورا ہارٹ نے مہاراجہ وکٹر کے گھر میں رہائش پذیر ہونے کے باوجود اسی ٹینکس سے شادی کے فیصلے کا اعلان کر دیا۔ جیہ سیڑھیوں پر کھڑی خاموشی سے ان قیمتی ترین تحائف کو ٹینکس کی طرف سے بھیجی گئی گاڑی پر لوڈ ہوتے دیکھتی رہی جو کچھ ہی دن پہلے مہاراجہ وکٹر نے کورا ہارٹ کو دیئے تھے۔ جیہ کا دل رو رہا تھا لیکن اس کے لب خاموش تھے۔

اگلے ہی روز مہاراجہ وکٹر نے اعلان کر دیا کہ وہ کچھ دن کے لئے بیارٹز جا رہا ہے تاکہ آرام کر سکے۔ پرنس پر تپ مبارک باد دینے کے لئے اپنی بیوی کو ایک طرف لے گیا۔ ”ویل ڈن، شنراوی۔“ اس نے جیہ کے گال تھپتھپائے۔ ”میں نے تمہاری بہمنی واپسی کے انتظامات کر دیئے ہیں تم لیڈی مودی کے ساتھ وہیں ٹھہرنا میں کچھ دنوں میں وکٹر کے ٹوٹے ہوئے دل کو ہلانے کی کوشش کروں گا۔ اس کے بارے میں کوئی فکر نہ کرنا۔ وہ بیارٹز میں اپنے زخم خود ہی چلت کر ٹھیک ہو جائے گا اور پھر واپس لندن لوٹ آئے گا۔“

اپنے شوہر کی خواہشات کی تعمیل کرنے والی جیہ، سیرپور کے حکمران سے روالگی کی اجازت لینے جا پہنچی۔ بارش کے باوجود مہاراجہ ساحل پر چل قدمی کر رہا تھا۔ اس نے جیہ کا پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ خیر مقدم کیا اور پھر دونوں پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے ساحل پر آ گئے۔

”یہ دیکھو“ مہاراجہ نے جیہ کو سمندر کی طرف متوجہ کیا۔ ”سمندر کا رنگ ہنری کوزے کی آنکھوں جیسا ہے نا؟“ وہ خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے مختاط نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ ”میں اپنی دادی اور بھائی سے ہمیشہ خوفزدہ رہا ہوں۔ میری پوری زندگی پر انہی دونوں کا کنٹرول رہا ہے لیکن اب میں ان کی بجا آوری سے تھک گیا ہوں میں ان سب سے چھٹکارا چاہتا ہوں، شنراوی۔ تم ہندوستان لوٹ جاؤ۔ جب بھی ممکن ہوا میں تم سے آملوں گا۔“

جیہ بہمنی پہنچی تو اسے اڑتی اڑتی خبر ملی کہ فرانسیسی جوڑے کی طرف سے ہری سنگھ

آف کشمیر کو بلیک میل کئے جانے کی رپورٹس اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔ تفصیلات کا علم نہیں ہو سکا تھا البتہ یہ پتا ضرور چلا تھا کہ مسٹر اے نے برطانوی بادشاہت کی تاریخ میں بلیک میلنگ کی مد میں سب سے زیادہ رقم ادا کی ہے۔ اخبارات کے اداروں میں ہندوستانی ریاستوں کی فوری تطمیر اور اصلاح کے لئے مطالبات کئے جا رہے تھے۔

صورت حال اس وقت بے حد سنگین ہو گئی جب لیڈی مودی کے جنگلے سے ملحق باغ میں ایک رقصہ کی لاش پائی گئی اور مہاراجہ اندور کو اس کے قتل کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔

”لیکن یہ خاصی حیرت انگیز صورت حال ہے، ڈارلنگ۔“ لیڈی مودی نے رائے ظاہر کی۔ ”قتل آدھی رات کو ہوا ہے۔ یعنی شاہد صرف ایک انگریز افسر ہے جس کا کہنا ہے کہ میں نے قاتل کو یہ کہتے سنا ہے کہ وہ مہاراجہ اندور کا تنخواہ دار ہے کیا تم نے اس سے پہلے ایسا جاہلانہ الزام سنا ہے؟ لطف کی بات یہ ہے کہ محض بیس سال پہلے بھی اس مہاراجہ کے والد کو ایک انگریز کے قتل کے جرم میں تخت سے محروم کر دیا گیا تھا۔ ہندوستان کو کیا ہو رہا ہے؟ مجھے تو ہر شخص پاگل اور ہر چیز اجنبی لگ رہی ہے۔“

مسٹر اے کو بلیک میل کی جانے والی خبروں کی جگہ اخبارات میں مہاراجہ اندور کے بارے میں خبریں شائع ہونے لگیں۔ جیہ صبح کے وقت اخبارات پڑھتے ہوئے خوفزدہ سی رہتی۔ اس کے ذہن میں یہی بات جاگزیں تھی کہ کسی بھی روز اخبارات میں ان تحائف کی تفصیل شائع ہو جائے گی جو مہاراجہ وکٹری نے امریکی اداکارہ کورا ہارٹ کو خرید کر دیئے ہیں۔ جیہ کا خوف اس وقت دو چند ہو گیا جب واٹسراے نے مہاراجہ اندور کی درخواست رد کر دی کہ جیوری میں اس کے ہم وطنوں کو شامل کیا جائے۔ جیوری نے مہاراجہ اندور کو اس کے تخت سے محروم کر دیا تھا۔

دو ہفتے بعد اخبارات ان برطانوی الزامات سے بھرے پڑے تھے کہ مہاراجہ پٹیالہ اور مہاراجہ نامجہ ایک رقصہ پر آپس میں لڑ پڑے ہیں اور ممکن ہے کہ ان دونوں کو بھی اپنے تخت سے محروم ہونا پڑے۔

”یہ زیادتی ہے، ڈارلنگ“ ہمیشہ کی طرح لیڈی مودی تبصرے کرنے میں سب سے آگے تھی۔ ”مہاراجہ پٹیالہ اپنے لئے جس قدر چاہے رقصائیں خرید سکتا ہے۔“

جیہ کے سامنے بھاری بھر کم سکھ حکمران کا جٹ لہرا گیا۔ وہ بے اختیار سوچنے لگی کہ مہاراجہ پٹیالہ کے سامنے بھلا مہاراجہ وکٹری کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔

اس نے اپنی پوجا پاٹ کا وقت بدھا دیا۔ وہ بھگوان سے پرا رتھنا کرتی کہ وہ اس کے جیٹھ

کو ہر قسم کی آفت سے محفوظ رکھے لیکن جب ایک روز لیڈی مودی نے پہلی بار اس کی پوجا میں مداخلت کی تو جیہ کا ماتھا ٹھنکا۔ جیہ کو اس کے ہاتھوں میں ایک ٹیلی گرام دیا دکھائی دیا تو اس کے دل کی دھڑکن رک گئی۔ ہاتھ پیروں ٹھنڈے ہو گئے جیسے ان میں زندگی کی کوئی رمت باقی نہ رہی ہو۔

”وائسرائے نے یقیناً مہاراجہ وکٹر کو یورپ سے واپس ہندوستان طلب کر لیا ہو گا۔ پس؟“ جیہ نے اپنے بدترین اندیشوں کا گلا گھونٹتے ہوئے ڈرتے ڈرتے دریافت کیا۔

”اوہ! ڈارلنگ، آئی ایم سو سوری۔“ لیڈی مودی نے جیہ کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ ”وکٹر سورگباشی ہو گیا ہے۔ وہ مر گیا ہے۔ پر تپ چاہتا ہے کہ تم اس وقت تک کلکتہ میں رکو جب تک وہ خودکشی کی وجوہات کو قوم پرست اخبارات سے پوشیدہ رکھنے میں کامیاب نہیں ہو جاتا۔“

لیڈی مودی کے کندھے پر سر رکھ کر جیہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ وہ اس کے لئے ایک نہایت مہربان اور شفیق جیٹھ تھا۔ اس نے جیہ اور پر تپ کے درمیان سرد مہری محسوس کر کے جیہ سے اپنا رویہ نہایت ہی دوستانہ بنا لیا تھا لیکن اب ان دونوں کے درمیان خلیج پائنے کا خواہش مند خود اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔

”ہم سیرپور کی سرحدوں میں داخل ہو رہے ہیں۔“ چوٹی دروازے سے پرنس پر تپ کی آواز ابھری۔

جیہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے تیز رفتار ٹرین کی کھڑکیوں سے باہر جھانکا۔ جا بجا دیہات میں روشن لائٹوں سے رات کی تاریکی مجروح ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

پرنس پر تپ ہاتھ روم سے باہر نکل آیا۔ اس نے اپنی کمر کے گرد ایک ریشمی دھوتی باندھ رکھی تھی۔ ذرا ہی دیر میں جیہ بھی غسل سے فارغ ہو کر تیاری کے مراحل طے کر چکی تھی۔

ٹرین جب ایک جھپٹکے سے اپنی منزل پر رکی۔ تب تک دن نکل چکا تھا۔ توپوں کی آواز سے اسٹیشن دہل گیا۔ مہاراجہ کے باڈی گارڈ دستے نے تلواریں چرے کے سامنے کر کے آنے والوں کو سلامی پیش کی۔ ان کے عقب میں سیرپور لائبرز کا دستہ تھا جو اپنے گھوڑوں کو بے قابو ہجوم سے بچانے کی کوششوں میں تھا۔

کوپے کا دروازہ کھول دیا گیا۔ باڈی گارڈ دستہ کچھ اور آگے بڑھ آیا۔ ایک اے ڈی لپک کر جیہ کے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔

”جلدی آئیں، حکم!“ اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔ ”شاہراہوں پر ہجوم ہونے سے قبل آپ کو ہر حال میں کامنی مندر پہنچنا ہے۔“

اے ڈی نے اپنے طاقتور ہاتھوں سے ہجوم کے بچوں بچ راستہ بنانا شروع کیا اور جیہ اس کے پیچھے چلتی ہوئی اسٹیشن کے باہر کھڑی رولس رائس میں جا بیٹھی۔ کار فوراً ہی اسے لے کر کامنی مندر کی طرف روانہ ہو گئی۔

مہین پر دوں کے عقب میں شیردل مہارانی اپنی مصاحب خواتین کے ہمراہ تاج پوشی کی رسم دیکھنے کے لئے موجود تھی۔ بوڑھی عورت نے اشارے سے جیہ کو ایک کونے میں موجود مستطیل سی جگہ دکھائی جو سرخ ریشی کپڑے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ جیہ نے مہارانی کی سرگوشی سنی۔ ”سیرپور گدی۔“

سیرپور کے موجودہ تخت کو سیرپور کی اصل گدی کے صرف ایک حصے سے تیار کیا گیا تھا جبکہ گدی کے باقی اجزاء شیشی پیل کے خزانے میں محفوظ تھے۔ مہارانی کے الفاظ سن کر جیہ کا جسم کپکپا اٹھا۔ وہ جانتی تھی کہ سیرپور کی گدی اتنی قدیم اور مقدس ہے کہ سیرپور کا حکمران اپنی پوری زندگی میں صرف ایک بار اس وقت گدی پر بیٹھتا تھا جب پہلی بار اس کا نام ان دیوتاؤں کے ساتھ لیا جاتا جو اس کے آباؤ اجداد تھے اور جنہوں نے خود کرشن بھگوان کے ساتھ جنگیں لڑی تھیں اور کامیابیاں حاصل کی تھیں۔

راج گورو مندر میں داخل ہوا۔ ٹھیک اسی لمحے نقاروں پر چوٹ پڑی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ ریاست سیرپور کا نیا حکمران اپنی گدی پر بیٹھنے جا رہا ہے لہذا تمام عوام پر اس کی اطاعت فرض ہو گئی تھی۔ نقارے کے ذریعے یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ تاج پوشی کی رسومات شروع ہو گئی ہیں۔

پرنس پرتپ، راج گورو کی طرف بڑھا۔ جیہ کو صرف ایک لمحے کے لئے اس کی پشت پر پولو بیچ میں چوٹ کا ایک پرانا نشان دکھائی دیا پھر اس کی برہنہ کمر پجاریوں کے درمیان غائب ہو گئی۔

راج گورو نے سیرپور کے حکمرانوں کا نسب نامہ پڑھنا شروع کر دیا۔ سیرپور کے ابتدائی بادشاہوں کو صرف ایک خطاب سے یاد کیا جاتا تھا۔ ’با عصمت مہاراجہ‘ انصاف پرور مہاراجہ‘ بلادر مہاراجہ‘ مٹی راجہ پھر اس کے بعد انہیں سات دیوتاؤں کے پوشا اور نشیب و فراز کا آقا کہا جانے لگا۔ موجودہ خطابات زیادہ طویل تھے لیکن مہاراجہ و کٹر کو صرف گرائڈ کمانڈر آف دی اشار آف انڈیا اور نائٹ کمانڈر آف دی انڈین ایمپائر کہا جاتا تھا۔

راج گورو نے باری باری سیرپور کی حکمرانی کے نشانات بلند کرنے شروع کئے۔ اس نے سیرپور کی قومی تلوار ہاتھ میں اٹھالی۔

”یہ تلوار طاقت و قوت کی نشانی اور انصاف کا اشارہ ہے لیکن دھرم کے بغیر انصاف نہیں ہو سکتا اور کسی بادشاہ کا دھرم عوام کی خدمت کے سوا کچھ نہیں۔“

راج گورو نے کچھ اتنی تیزی سے تلوار سے اپنے انگوٹھے پر زخم لگایا کہ جیہ دیکھ ہی نہ پائی تھی۔ اس نے خون آلود انگوٹھے سے پرتاپ کے ماتھے پر یکے بعد دیگرے تین لکیریں بنائیں جب راج گورو نے مہاراجہ سیرپور کی حیثیت سے پرنس پرتاپ کے نام کا اعلان کیا تو خون بدستور اس کے انگوٹھے سے بہہ کر فرش پر گر رہا تھا۔

اور پھر مندر کی محدود فضا نعروں سے گونج اٹھی۔ نئے مہاراجہ نے سیرپور کی گدی سنبھالی تو اس کے خطابات پکارے جانے لگے۔

”مہاراجہ دھیرج پرتاپ سنگھ جی..... دوست عالم..... راج پہار.....“

نقارے زور اور شور سے بجتے لگے اور پھر ان میں توپوں کی سلامی کی آواز بھی شامل ہو گئی۔ جیہ نے فوراً اپنی پیشانی مندر کے فرش پر ٹیک دی وہ بھگوان سے پرارتھنا کر رہی تھی کہ اب اس کا شوہر اسے چھو لے۔ اسے لڑکی سے عورت بنا دے تاکہ بادشاہت کا قدیم سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے۔

اگلا پورا مہینہ لوگ ریاست کے کونے کونے سے نئے مہاراجہ کے حضور نذر گزارنے کے لئے آتے رہے۔ مہاراجہ پرتاپ ان کے لائے ہوئے طلائی سکوں کو چھو کر خزانے میں پھینکتا اور یوں آنے والوں کی وفاداری کا امتحان مکمل ہو جاتا۔

جیہ کی اس عرصے میں اپنی مصروفیات تھیں اس لئے وہ اپنے شوہر کو کم کم ہی دیکھ پاتی تھی۔ شام ہوتے ہی سیرپور کی عورتوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ شئی پیل میں در آتے اور جیہ کے سامنے اپنی وفاداریوں کا اظہار کرتے۔ فوقیت ان قبائلی عورتوں کو دی جاتی تھی جو کئی روز کا سفر طے کر کے نئی مہارانی کے دیدار کے لئے آتی تھیں۔

اپنی مصروفیات میں گھرا اور ان سے کسی قدر پریشان مہاراجہ پرتاپ جب بلاوے پر اپنی بیوی سے ملنے گیا تو ہیروں کے اس نیکلس کے بارے میں قطعی بھول گیا تھا جو وہ جیہ کو تحفے میں دینے کے لئے خرید کر لے گیا تھا۔ جیہ جانتی تھی کہ ہندوستان کا وائسرائے اس تقریب کی صدارت کا خواہش مند ہے جو برطانوی بادشاہت، رسمی طور پر نئے مہاراجہ کو اختیارات تفویض کرنے کے لئے منعقد کرنا چاہتی تھی۔

جیہ کو علم تھا کہ وائسرائے کا دورہ سیرپور یہاں کے رہنے والوں کے لئے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ اس دورے سے برطانوی راج سے سیرپور کی غیر متزلزل وفاداریوں کا اظہار بھی ہوتا تھا۔ وائسرائے کی خواہش کا علم ہونے پر ہندوستان کے متعدد حکمرانوں نے اس تقریب میں شرکت کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ چیمبر آف پر نر کے سربراہ، پیٹالہ، بیکانیر اور الور کے مہاراجہ چاہتے تھے کہ اس تقریب سے فائدہ اٹھا کر وائسرائے پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ شادی ہندوستان کے چیمبر آف پر نر میں کئے گئے مطالبوں کو پورا کرے۔

تقریبات کے مہینے میں صرف ایک ناخوش گوار واقعہ رونما ہوا تھا۔ ”ہمارے اخبارات پر سے سنسرشپ کی پابندیاں ختم کر دی جائیں۔ حکم!“ قلم کاروں کے ایک گروپ نے دربار ہال میں چلا چلا کر مطالبہ کیا تھا۔ درباریوں سے کچا کچھ بھرے ہال میں ان کی آواز ہم کے دھماکے کی طرح سنائی دی تھی۔

”اپنے عوام کو بیسیویں صدی میں جینے کا حق بخش دیں حکم!“ ایک اور آواز ابھری۔ ”پولیس کو روکیں کہ وہ برطانوی ہندوستان میں قوم پرستوں سے ہمارے رابطوں کو مانٹر نہ کرے۔“ ایک دوسرا مطالبہ سامنے آیا۔

مہاراجہ نے قلم کاروں کو یہ کہہ کر یقین دلایا اور ان کے جذبات سرد کئے کہ ان کے جذبات کو دبانے کا سلسلہ بند کر دیا جائے گا۔ اگلے روز مہاراجہ اپنی مہارانی کے ہمراہ سیرپور کی شمالی سرحدوں کی جانب روانہ ہو گیا تاکہ اپنے قبائلی اتحادیوں سے مذاکرات کر سکے۔

پرنس پر تپ کا دورہ کوئی پندرہ روز جاری رہا۔ اس دوران کاروں پر سفر کیا گیا۔ دریاؤں کو کشتیوں کے ذریعے عبور کیا گیا اور سیرپور کے پہاڑی جنگلوں کو ہاتھیوں پر پار کیا گیا۔

ہر روز مزید قبائل مہاراجہ کے جلو میں آ ملتے۔ بعض اوقات یہ قبائلی شکار کے لئے نکل جاتے۔ رات کے وقت وہ عجیب و غریب رسمیں انجام دیتے۔ ان وحشیانہ رسموں کو دیکھ کر جیہ جی جان سے کانپ جاتی۔

اس دورے کا کوئی اور فائدہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ جیہ کے لئے یہ دورہ یادگار بن گیا تھا اس لئے کہ اس کے شوہر نے اسے نہ چھوٹنے کی قسم توڑ دی تھی لیکن جیہ کو یہ شکایت تھی کہ پر تپ نے وحشیوں کی طرح استعمال کیا تھا۔

شادی اور سہاگ رات کے بارے میں اس نے بہت کچھ سن رکھا تھا اس نے دوبار اپنے الدین کو ایک دوسرے کو چھوٹے دیکھا تھا لیکن جہاں تک اسے یاد پڑتا تھا انہوں نے پھولوں کی طرح ایک دوسرے کو چھوا تھا۔ اپنے شوہر کے پسینے میں بھیگی ہوئی جیہ بہت دیر

تک یہ سوچتی رہی کہ آخر پرتپ اس کے دماغ میں اٹھنے والی خاموش چیخوں کو کیوں نہیں سن پاتا۔

جب اس کا شوہر وحشیوں کی طرح اس کے بدن کو نوچ کھسٹ رہا ہوتا تو بے اختیار اسے دوسرے مرد اور ان کا نرم رویہ یاد آ جاتا۔ وہ اکثر و بیشتر جیسے آبرن کے بازو اپنے بدن کی گرد محسوس کرتی اور اپنے ہونٹوں پر ارون رائے کے ہونٹوں کا ذائقہ محسوس کرتی۔ ایسے موقعوں پر بس صرف ایک لمحے کے لئے اس کا تپا ہوا جسم اپنے شوہر کے بازوؤں میں ڈھیلا پڑ جاتا۔

رفتہ رفتہ جیہ پر ایک اور بھیانک انکشاف ہوا۔ جوں جوں پرتپ برطانویوں کو اپنی وفاداریوں کا احساس دلا رہا تھا توں توں وہ اپنی بیوی سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ جیہ سے اس کی نفرت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ حالانکہ مہاراجہ کی نجی زندگی میں بیوی کو اس پر فوقیت حاصل تھی، خود کو نظر انداز کئے جانے کا اور اک جوہی جیہ کو ہوا اس نے خود کو وائسرائے کے دورے کی تیاریوں سے علیحدہ رکھنا شروع کر دیا۔

ہندوستانی حکمرانوں کی آمد سے بیرونی دنیا سے جیہ کا رابطہ تقریباً منقطع ہو کر رہ گیا تھا۔ ویلز پیلس کے برآمدے میں بیٹھ کر مہمان مہارانیوں برطانوی بادشاہت کے ان اقدامات پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتیں جو وہ ہندو حکمرانوں کو ان کے تخت و تاج سے محروم کر دینے کے لئے غیر قانونی طور پر کر رہے تھے۔

”انگریز ہمارے اور برطانوی ہندوستان کے مابین خلیج وسیع سے وسیع تر کر رہے ہیں تا کہ اپنی بادشاہت کو قائم رکھ سکیں۔“ ایک مہارانی رائے ظاہر کرتی۔ ”وہ جانتے ہیں کہ اگر برطانوی ہندوستان اور شاہی ہندوستان متحد ہو گئے تو انہیں ایک منٹ میں ہندوستان سے نکال باہر کریں گے۔“

”سوچنے کی بات یہ ہے کہ قوم پرست اخبارات میں حکمرانوں کے خلاف اخلاق سے گرا ہوا پروپیگنڈہ اگر برطانوی بادشاہت کی خفیہ فائلوں سے نہیں آتا تو پھر کہاں سے آتا ہے؟ کوئی دوسری مہارانی بھویں اچکا کر سوال کرتی۔

”دیکھ لینا“ جلد ہی ہندوستان کے طاقت ور حکمرانوں کو مختلف الزامات کے تحت تاج و تخت سے محروم کر دیا جائے گا۔“

ایک بوڑھی مہارانی نے پان کا بیڑا تیار کر کے منہ میں رکھا اور نفرت آمیز نگاہوں سے خلا میں گھورا۔ ”برطانوی اپنی معصومیت ظاہر کر رہے ہیں لیکن یہ یہودی وائسرائے“ جس نے

اندور کا تخت چھین لیا ہے اور اب پٹیلہ کے پیچھے ہے۔۔۔۔۔ یہ لارڈ ریڈنگ جسے یہ سوچ کر ہل بھلا گیا تھا کہ وہ ایک عام انگریز کے بجائے مشرقی معاشرے کو زیادہ بہتر انداز میں سمجھتا ہے۔۔۔۔۔ وہ اپنے مذموم ارادوں کی جنگ لڑ رہا ہے اور اس میں کامیابی کے لئے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کر رہا ہے۔“

ایک راجپوت ریاست کی نوجوان مہارانی نے اپنی چمکتی ہوئی نگاہیں جھکا لیں۔ ”کیا آپ لوگ جانتے ہیں کہ اندور کا تخت چھینے جانے کی اصل وجوہات کیا ہیں؟“

مہارانیوں نے پان چبانا بند کر دیا اور وہ سب کی سب اس نوجوان مہارانی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”ذاتی انتقام“ نوجوان مہارانی نے مجلس مہارانیوں کو آگاہ کیا۔ ”مہاراجہ اندور سے اس کا تخت اس لئے چھینا گیا کہ جب وائسرائے نے اپنی بیوی کے ہمراہ ریاست اندور کا دورہ کیا تو مہاراجہ نے وائسرائے کو بتایا۔ میرے معاہدوں اور مجبوریوں نے مجھے برطانوی تاج و تخت کا فکرم بنا دیا ہے لیکن وائسرائے کی بیوی چونکہ ایک دوسری انگریز عورت ہے لہذا اس بات کی توقع نہ رکھو کہ میری بیوی، اپنی ریاست کی حکمران ملکہ، کسی انگریز عورت کی کار کا دروازہ کھول کر اسے خوش آمدید کہے۔“

مہارانیوں کے ہونٹوں سے بے اختیار کلمہ ہائے تحسین آزاد ہو گئے۔ نوجوان مہارانی نے اپنی ساتھی خواتین کو کہانی سے متاثر ہوتے ہوئے دیکھا تو اپنا بیان جاری رکھا۔ ”رہ گیا پٹیلہ اور ناہمہ تو اس کا مسئلہ یہ ہے کہ انگریز، امرتسر کے قتل عام کے باعث اب بھی پنجاب سے خائف ہیں۔ ان دونوں مہاراجاؤں سے کہا گیا تھا کہ وہ سکھوں اور انگریزوں کے درمیان اتفاق رائے اور معاہدے کی کوشش کریں لیکن اب انگریز سکھوں اور پنجاب میں ان دونوں حکمرانوں کے بڑھے ہوئے اثر و نفوذ سے خائف ہیں اور۔۔۔۔۔“

ملازم مشروبات لے کر اندر داخل ہوئے تو مہارانیوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

جیہ کو اچانک یاد آ گیا کہ سرائیکبر، اسٹڈی میں اس کے لئے ایک نوٹ چھوڑ گیا ہے جس میں وائسرائے کے دورہ سیرپور کے سلسلے میں تمام ہدایات درج ہیں تاکہ وائسرائے کے درے کا انتظام کرنے والے افسران انتظامات میں کوئی نقص نہ نکال سکیں۔

ملازمین نے مہارانیوں کو سر جھکا کر تعظیم دی اور برآمدے سے نکل گئے۔

”ہاں، میں بتا رہی تھی۔۔۔۔۔“ نوجوان مہارانی نے اپنا بیان وہیں سے شروع کیا جہاں ادھورا بھوڑا تھا۔ ”۔۔۔۔۔ اس بات کے پیش نظر برطانوی بادشاہت کا کہنا ہے کہ پٹیلہ اور ناہمہ کے

مہاراجہ ایک ایسی رقصہ کی وجہ سے جنگ شروع کرنے جا رہے ہیں، جس کی آنکھیں نمل اور بال سرخی مائل بھورے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر جنگ شروع ہوئی تو دونوں ریاستوں کے عوام کو ناقابل تلافی نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لئے وہ ان دونوں کو تخت سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔“

”برطانیہ‘ ہمیں ہماری وفاداریوں کا صلہ دے رہا ہے۔“ ایک دوسری مہارانی نے غصے سے کہا۔ ”تو کیا پٹیلہ کا تخت چھین کر وہ پنجاب میں امن قائم کر لے گا؟“

جیہ کو لیڈی مودی کی سنائی ہوئی کہانیاں یاد آ گئیں کہ مہاراجہ پٹیلہ کے حرم میں پانچ خوبصورت عورتیں موجود ہیں۔ اس سکھ دیو قامت نے انگریزوں کو جلانے کے لئے ایک کرکٹ میچ فراک پن کر کھیلا تھا۔ جیہ سوچ رہی تھی کہ کیا وائسرائے کی بیٹی کو اغوا کر لے والا مہاراجہ اتنا کمزور ہے کہ کوئی اس کا تخت چھین لے۔

ایک مہارانی نے شاید اس کی سوچ پڑھ لی تھی۔ وہ فوراً بول اٹھی۔ ”برطانوی کبھی مہاراجہ پٹیلہ کو اس کے تخت سے محروم نہیں کر سکتے۔ پٹیلہ نے وائسرائے کو چیلنج کیا تھا کہ آؤ دیکھ لو کہ پٹیلہ کے عوام کس کے لئے آواز اٹھاتے ہیں۔ اپنے حکمران کے لئے یا کسی انگریز کے لئے اگر میرے لوگ مجھ سے تنگ ہیں تو میں رضاکارانہ طور پر تخت چھوڑ دیتا ہوں اور سکھوں کے مقدس گولڈن ٹمپل کی طرف پیدل روانہ ہو جاتا ہوں لیکن میں ابھی امرتسر کی طرف پچاس میل کا فاصلہ بھی طے نہیں کر پاؤں گا کہ تمہیں انقلاب اور انتقام کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وائسرائے صاحب!“

مہارانی جیہ اور سیرپور کے مہاراجہ کی دادی رولس رائس میں کاہنی مندر سے ریلوے اسٹیشن جا رہی تھیں ”لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے وائسرائے کو شہنشاہ سے زیادہ اختیارات حاصل ہیں۔“ شیردل مہارانی نے اپنی بہو کو مخاطب کیا۔

جیہ محض سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ رولس رائس کی کھڑکی میں سے شہر کی شاہراہوں کا نظارہ کر رہی تھی، جہاں دور دور تک سر ہی سر دکھائی دے رہے تھے۔ شہر کو خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ جیہ کو اس بات کا اعتراف تھا کہ سجاوٹ میں اتنی محنت پرنس آف ویلز کے دورے کے موقع پر بھی نہیں کی گئی تھی۔

ریلوے ٹریفک اور اسٹیشن کے ارد گرد بھی لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد ریاست کے تاریخ میں پہلی بار وائسرائے ہند کی سفید ٹرین کی سیرپور آمد کی منتظر تھی۔

پلیٹ فارم کے وسط میں جہاں سفید ٹرین کو رکتا تھا، ایک سرخ قالین بچھایا گیا تھا۔

کالین کے بائیں جانب ایک کنوپی کے نیچے ہندوستانی حکمران بیٹھے تھے جن کی انگلیوں اور لباس کے ہیرے جواہرات صبح کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ ان کے سامنے سیرپور دربار کے دربار ریزیڈنٹ سرہنری کونزے اور اس کے افسران کی نشستیں تھیں۔

ہماراجہ خود کالین کے آخری سرے پر ایک نفرتی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی ریشمی ہڈی پر ایک بہت بڑا ہیرا چمک رہا تھا جبکہ اس کے گلے میں نایاب اور چمکدار موتیوں کی ایک مالا تھی۔ اس کی ہیلٹ سے سیرپور کی تلوار لٹک رہی تھی۔

انجن کے ایک لمبے دسل نے وائسرائے آف انڈیا کی سفید ٹرین کی آمد کا اعلان کیا۔ یہ نے آواز سنتے ہی اپنے پروٹوکول نوٹس کو زیادہ سختی سے اپنی مٹھی میں بھینچ لیا۔

ٹرین رکی تو سب سے پہلے وائسرائے کے ہاؤس ہولڈ گارڈز نے پلیٹ فارم پر قدم رکھا۔ انہوں نے پہلے حفاظتی انتظامات سنبھالے اور پھر وائسرائے اور لیڈی ریڈنگ کے کمپارٹمنٹ کے سامنے عمیلیں سیڑھی بچھا دی تاکہ دونوں مہمان آسانی سے سیرپور کی سرزمین پر قدم رکھ سکیں۔

مہمان ہمارانیوں نے جلدی جلدی اپنی مصروفیات کے نوٹس پر نظریں دوڑائیں اور پھر سفید ٹرین کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ وائسرائے کے ہمراہ چھپاسی افسران اور ذاتی اسٹاف کا اقلہ سیرپور آیا تھا۔ وائسرائے درحقیقت دنیا کے سب سے بلند ترین گولف کورس میں اپنا مندیدہ ترین کھیل یعنی گولف کھیلنے کے لئے شیلانگ جا رہا تھا اور صرف سات گھنٹوں کے لئے سیرپور میں رکا تھا۔ اتنے کم وقت رکنے کے باوجود اتنے زیادہ اسٹاف کی تک سمجھ میں نہ آئی تھی۔

”وہ اپنے آپ کو بہت بڑی توپ چیز سمجھنے لگا ہے۔“ کسی ہمارانی نے جیہ کے کلن کے اس سرگوشی کی۔ ”حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کا وائسرائے بننے سے پہلے اسے کبھی ٹھوڑے پر بیٹھنا بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ یاد رہے کہ یہ اعزاز حاصل کرتے وقت اس لدھے کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی۔“

وائس ریگل کیرج کے دروازے پر کائن سوٹ پہنے ہوئے ایک طویل قامت شخصیت دوڑا رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وائسرائے اپنے سر پر ہیٹ رکھتا، جیہ نے اس کی چھوٹی پیشانی پر لمبی ناک کے اوپر سیاہ آنکھیں دیکھ لی تھیں۔

جونہی اس نے سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ سیرپور کی توپوں نے اسے اکتیس توپوں کی سلامی فنی شروع کر دی۔ ہماراجہ اپنی نفرتی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں حکمران جب ایک

دوسرے کی طرف بڑھے تو سیرپور کی توپیں مسلسل گرج رہی تھیں۔ ان کے دھماکوں ے ریلوے اسٹیشن کی عمارت بری طرح کانپ رہی تھی۔

جونہی سلامی ختم ہوئی اسکول کے بچوں نے برطانوی بادشاہت کا ترانہ پڑھنا شروع کر دیا۔ ان کے عقب میں سبزیونفارم میں لمبوس سیرپور کا شاہی بینڈ مسور کن دھن فضا میں بکھیر رہا تھا۔

شاہی خواتین کے سامنے سے پردہ ہٹا دیا گیا اب سارا منظر جیہ کی نگاہوں کے سامنے تھا۔

فرانس اور میسو ٹیمیا میں جنگی فرائض انجام دینے والے سیرپور لانسرز کا ایک دستہ سلامی کے لئے وائسرائے کی طرف بڑھا تو ایک سیاہ فام ملازمہ جیہ کے کان پر جھک آئی۔ جبکہ سیرپور کا وزیر اعظم کار میں جیہ کا منتظر تھا۔

”یہ ذہن میں رکھئے گا حکم! کہ لیڈی ریڈنگ ایک عام عورت کی حیثیت سے ہندوستان آئی تھی۔“ جیہ کار میں بیٹھی تو وزیر اعظم نے اپنی مہارانی کو بتایا۔ ”یہ حقیقت ہے کہ مہاراجہ بیکانیر نے کل رات ہی مجھے بتایا ہے کہ وہ پتھر بھی چھری کانٹے سے کھانا پسند کرتی ہے۔ بد قسمتی یہ ہے کہ ہندوستان کی چمک دمک نے اسے ملکہ وکٹوریہ سے زیادہ شاہی عورت بنا دیا ہے۔ وہ یہ سن کر بے حد ناخوش اور اداس ہے کہ اس کا شوہر آئندہ ماہ والپس انگلینڈ جا رہا ہے۔ وہ کم از کم مزید پانچ سال کے لئے وائسیرین کی حیثیت سے ہندوستان میں مقیم رہنا چاہتی ہے۔“

جیہ نے ایک بار پھر اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کانڈات پر نگاہ دوڑائی تو سر اکبر اس کی پریشانی پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ ”گن سیلوٹ، قوی ترانے، تواریخ سے اقتباس اور یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہے گا جب تک انگریز سیرپور کے موجودہ حکمران کو مہاراجہ کی حیثیت سے قبول نہیں کر لیتا۔“

جیہ نے سر ہلا کر سر اکبر کی تائید کی۔ کار اب سٹی پبلس کے اس گیٹ تک پہنچ چکی رہی تھی جہاں سے مہاراجہ کے ہاتھی کو سٹی پبلس میں داخل ہونا تھا۔

”کیا ہم ڈائننگ روم کا ایک چکر اور لگالیں تاکہ لٹچ کے لئے کئے جانے والے انتظامات مکمل ہو سکیں؟“

سر اکبر نے اس کی تائید کی اور وہ کھڑکی میں سے محل کے وسیع و عریض صحن کی طرف نا متوجہ ہو گئی جہاں ہودہ بردار ہاتھیوں کی ایک طویل قطار موجود تھی۔ اسے ایک ہجوم دکھائی دے

ہا جنہوں نے اپنے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار تھام رکھے تھے۔

وزیر اعظم سیرپور نے اپنی مہارانی کی طرف دیکھا تو اسے اس کے چہرے پر تردد دکھائی دیا۔ ”آپ فکر نہ کریں حکم!“ اس نے جیہ کو تسلی دی۔ ”مہاراجہ نے آج صبح خود انتظامات کا جائزہ لیا تھا۔ اب مائیکل خود ہی انہیں آخری شکل دے دے گا۔ لیڈی ریڈنگ بری طرح ایڈیٹوں کی دلدادہ عورت ہے۔ شملہ میں اس کی پارٹیاں ایک روایت کا درجہ رکھتی ہیں اس لئے مہاراجہ نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ کوئی ایسی ویسی غلطی بھی نہ ہونے پائے جسے لیڈی ریڈنگ لندن واپسی پر بطور لطیفہ ہی کسی کو سنائے۔“

جیہ بدستور خاموش تھی۔ نئے مہاراجہ کو اس کی تاج پوشی پر مبارک باد دینے کے لئے گیا تھا۔ بھر سے خطوط اور ٹیلی گرام سیرپور کے مرکزی آفس پہنچ رہے تھے۔ اسے ان میں سے کچھ بھی دکھایا نہیں گیا تھا اور اب اس کے فرانسیسی باورچی کو انتظامات کا نگران بنا دیا گیا تھا۔ نئی سیرپور کی نئی مہارانی اس قابل نہ تھی کہ اسے کوئی اہم ذمہ داری سونپی جاتی۔

جیہ، دربار ہال کے پورٹیکو میں کھڑی اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوششوں میں مصروف تھی کیونکہ یونین جیک لگی ایک رولس رائس کار، وائسرائے کی بیوی کے لئے سٹی پبلز کے لیٹ میں داخل ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے مشرقی برآمدے میں ایک مہمان مہارانی نے جیہ کو گویا نصیحت کی تھی۔

”لیڈی ریڈنگ سے حتی المقدور محتاط رہنا“ حکم! میرے شوہر کے سکریٹری مسٹر فورسٹر نے ڈیوس میں ہمارے لئے خدمات انجام دیتے ہوئے، اے ایس ایچ ٹو انڈیا کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تھی جسے سمندر پار ہاتھوں ہاتھ لیا گیا لیکن واسیرین کو یہ بالکل پسند نہیں آئی۔ اس کا کہنا ہے کہ اس سے برطانویوں کا امیج خراب ہوا ہے جبکہ وائسرائے نے بقرہ کیا ہے۔ ہندوستانی حکمرانوں نے غلط یورپی افراد کو اپنے گرد جمع کر رکھا ہے۔“

جیہ آہستگی سے سیڑھیاں اترنے لگی تاکہ کار کے آنے تک وہ بھی نیچے پہنچ جائے۔ کار کی اور واسیرین باہر نکلی۔ اس اوپر عمر عورت کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے بھی جیہ کو ایسا محسوس نہیں ہوا کہ اس عورت نے اپنی ذاتی اتالی کی خاطر حکمرانوں کو تخت سے محروم کرنے کی مچلا رکھی ہے جن میں مہاراجہ اندور سرفہرست تھا۔

لیڈی ریڈنگ نے مصافحے کے لئے دایاں ہاتھ آگے بڑھایا تو جیہ نے جلدی سے اسے مچلا لیا اور پھر وہ اسے ساتھ لئے سنگ مرمر کی سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔ لیڈی ریڈنگ کی بدن اکڑی ہوئی تھی گو جیہ مسلسل اس سے باتیں کئے جا رہی تھی لیکن اس نے بہ مشکل

ہی کوئی جواب دیا تھا۔

جیہ اور لیڈی ریڈنگ اس وقت دربار ہال میں تھیں جب گن فار نے مہاراجہ کے ہاتھی پہنچنے کا اعلان کیا۔ جیہ کو خوشی تھی کہ اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے واسیرینا ہتھے سے اکھڑتی یا کوئی ناگواری محسوس کرتی۔ وہ اسے صحن میں لے آئی جہاں دوسری مہارانیوں بھی موجود تھیں۔

پہلے مہاراجہ کے شہسوار ہڈی گاڑڈ محل کے وسیع احاطے میں داخل ہوئے۔ وہاں موجود لوگوں نے ان کے عقب میں گولڈن گیٹ سے اندر آنے والے ہاتھی پر پھولوں کی برسات کر دی۔

ہاتھیوں سے اتار کر دونوں معزز افراد سرخ گدیوں کی طرف بڑھے جو وائسرائے آف انڈیا کے کریٹ گلی کرسی کے پہلو میں لگائے گئے تھے۔ وائسرائے جب واسیرین اور دیگر یورپی عورتوں کے قریب سے گزرا تو وہ اس کی تعظیم کے لئے جھک گئیں۔

”یور ہائی نیس“ دی مہاراجہ آف سیرپور۔“ وائسرائے کے خوبصورت انگریزی لب و لہجے نے احاطے میں موجود حاضرین کو خاموش کرا دیا۔ ”سیرپور ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے آپ کی تقرری کا شاندار موقع آچکا ہے۔ میرے لئے یہ ایک اعزاز ہے کہ میں شہنشاہ ہندوستان اور برطانوی بادشاہت کی حکومت کے نمائندے کے طور پر آپ کو، آپ کے آہل اجداد کی قدیم گدی پر رونق افروز کروں اور یہ نوید دوں کہ اکتیس توپوں کی سلامی کے اعزاز کے ساتھ آپ کا مرتبہ ریاست کے فرسٹ کلاس مہاراجہ کا ہو گا۔“

وائسرائے نے ایک طویل تقریر کی جس میں نصیحتوں کے ساتھ ساتھ مہاراجہ کی ان خدمات کا اعتراف بھی تھا جو اس نے برطانوی راج کے لئے انجام دی تھیں۔

جیہ، وائسرائے کی تقریر بھی سن رہی تھی اور یہ بھی سوچ رہی تھی کہ کیا وائسرائے کو اپنے دورے پر اٹھنے والے اخراجات نظر نہیں آتے؟ کیا وہ نہیں جانتا کہ ایک ہندوستانی ریاست اپنی آمدنی کا سب سے زیادہ حصہ برطانوی حمایت کے حصول پر خرچ کرتی ہے؟ اسے یہ بھی یقین تھا کہ وائسرائے اور اس کی بیوی وہ زیورات اور تحائف لینے سے قطعی انکار نہیں کریں گے جو انہیں چھپاسی مصاحبین و ملازمین کے ہمراہ سفید ٹرین میں شیلانگ کے گولف کورسز کو ان کی روانگی سے قبل دیئے جائیں گے۔

تقریر کے بعد مہاراجہ ہندوستان کے وائسرائے کی معیت میں اپنی گدی تک پہنچا۔ صحن میں موجود ہجوم نے خوشی کے مارے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ واسیرین نے شور پر برا

کامنہ بنایا اور دستانے والے ہاتھوں سے اپنے کانوں کو ڈھانپ لیا۔ مہمان رانیوں نے اس کی اس حرکت پر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا اور ذو معنی انداز میں مسکرا رہی۔

ادھر مہاراجہ کے گدی پر بیٹھنے کے بعد برطانوی ریزیڈنٹ نے ریاست کی مہر اور سیرپور کے خزانے کی چابیاں نئے حکمران کے حوالے کر دیں جو مہاراجہ وکٹر کی موت کے بعد سے برطانوی ریزیڈنٹ میں رکھا گیا تھا۔

مہاراجہ پر تپ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر اس نے تقریر شروع کر دی۔ جب اس نے وائسرائے اور لیڈی ریڈنگ کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا تو واسیرین بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلنے لگی۔ جیہ اسے گھور رہی تھی لیکن جب اس نے اپنے شوہر کی آواز میں مسرت کا عنصر پایا تو اس نے بھی اپنی نگاہوں کا انداز بدل لیا۔

”یہ عظیم برطانیہ ہی تھا جس نے میرے دادا کو سیرپور میں ریلوے لائن بچھانے کی اجازت دی تھی اور ہم اسی ریلوے لائن کے ذریعے برطانوی ہندوستان سے منسلک ہیں۔ مہاراجہ پر تپ کہہ رہا تھا۔ ”پھر میرے آنجھانی بھائی نے ہوائی جہازوں کا ایک فلیٹ خریدا اس کو پرنس آف ویلز نے بے حد سراہا اور اب میرا ارادہ ہے کہ میں سیرپور میں نئے ہوائی اڈے تعمیر کروں گا تاکہ کاروبار ترقی کرے اور سیرپور کے دور دراز کے علاقے دارالحکومت سے منسلک ہو جائیں۔ یہ ایک ایسا خواب ہو گا جو شاید کسی نے آج تک دیکھنے کی جرات میں کی ہوگی۔“

جیہ کی نگاہیں وزیر اعظم کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ سر اکبر نے ابھی سے اپنے نئے حکمران کے وعدوں پر اٹھنے والے اخراجات کا تخمینہ لگانا شروع کر دیا ہو گا۔ لیکن وائسرائے اپنے دورے کے انتظامات پر بے حد خوش تھا اور لُج کے دوران اس نے اس شاندار استقبال پر جیہ کا بہ طور خاص شکریہ ادا کیا تھا۔

آخر میں مہمان مہاراجہ اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے وہ نئے مہاراجہ کے لئے یک تمناؤں کا جام تجویز کر رہے تھے۔ جیہ کو یہ دیکھ کر بے حد حیرت ہوئی کہ مہاراجہ پیالہ بنا جام بلند کئے وائسرائے کے عین سامنے کھڑا تھا۔

”یور ایکسی لینسی۔“ مہاراجہ پیالہ کی بلند آواز سب نے سنی تھی۔ ”آج ہم نے یہاں یک شاندار تقریب میں ایک ہندوستانی حکمران کو اپنے آباؤ اجداد کی گدی پر بیٹھتے دیکھا ہے۔ برے خیال میں ایک ہندوستانی مہاراجہ یا بادشاہ اب آزادانہ حکومت کرنے کو فراموش کر چکا

ہے۔ خوشی کے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ ہماری ریاستوں کا الحاق برطانیہ عظمیٰ سے ہوا ہے برطانوی ہندوستان سے نہیں۔“

”لیکن صورت حال یہ ہے کہ برطانوی ہندوستان کے افسران ہمارے اندرونی ریائی معاملات میں مداخلت کرتے ہیں اور جب اعتراض کیا جاتا ہے تو وہ دھمکیوں پر اتر آتے ہیں۔ میں آپ کو یہ بھی یاد دلاؤں گا کہ چیمبر آف پر نر، آزاد بادشاہوں کی ایک تنظیم ہے اور کسی بھی طرح دیگر بین الاقوامی تنظیمیں سے مختلف نہیں اور اس لحاظ سے وہ برطانوی ہندوستان کے افسران کے احکامات کی پابند نہیں۔ سال میں ایک آدھ بار کا معاملہ دوسرا ہے لیکن ہماری تقاریب کا فیصلہ اور ان کا کنٹرول برطانوی افسران کے ہاتھوں میں ہے۔ ہمیں اس بات کی اجازت بھی نہیں ہے کہ کسی مشترکہ مقصد کے لئے ہم دوسرے ہندوستانیوں سے رابطے یا مشورے کر سکیں۔ چیمبر آف پر نر کی خبریں پریس کو جاری نہیں کی جاتیں۔ ان تمام اقدامات کے باعث ہمارا مقام اور شہرت داغ دار ہو رہی ہے۔“

”ہم، یعنی ہندوستان کے حکمران مہاراجہ جنگ عظیم کے علاوہ زمانہ امن میں بھی برطانیہ عظمیٰ کے سب سے بڑے خیر خواہ ہیں۔ اس وقت میز پر کوئی ایسا حکمران موجود نہیں جس نے برطانوی میدان جنگ میں اپنے سپاہیوں کی قربانی نہ دی ہو۔ آپ سے درخواست ہے کہ براہ کرم ہمیں ہمارا قانونی اور آئینی حق دیا جائے تاکہ ہم زیادہ دل جمعی کے ساتھ برطانیہ عظمیٰ کے لئے کام کر سکیں۔“

مہاراجہ پٹیالہ کی تقریر کے دوران وائسرائے کے چہرے پر کسی قسم کی حیرت نمودار نہیں ہوئی تھی۔ اس نے شراب کا وہ گلاس اب بھی ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا جو اس نے مہاراجہ پٹیالہ کے جواب میں بلند کیا تھا۔

”یور ہائی نیس“ وہ نہایت تحمل سے بولا تھا۔ ”ہندوستان کے سینئر حکمرانوں کی موجودگی میں، میں اپنے خیالات کو دہرانا پسند کروں گا جن کا اظہار میں نے نظام حیدر آباد سے ملاقات کے دوران کیا تھا۔۔۔۔۔ ان کا تعلق ہندوستانی ریاستوں اور برطانوی راج کے درمیان تعلقات کا ہے۔“

”ہندوستان میں سب سے زیادہ اہمیت برطانوی تاج کے استحکام کو حاصل ہے۔ اس لئے ہندوستان کا کوئی بھی حکمران برابری کی بنیاد پر برطانوی حکومت سے مذاکرات کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔“

”ہماری برتری کا دارو مدار ریاستوں سے معاہدوں پر نہیں بلکہ ان کی آزاد حیثیتوں پر

ہندوستانی حکمران محض بیچ و تاب کھا کر رہ گئے تھے کیونکہ لارڈ ریڈنگ کے الفاظ نے
 ہندوستان اور تاج برطانیہ کے درمیان بنیادی معاہدے کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔
 لٹچ کے بعد واسیرین نے اس نئے باغ میں پہلا پودا لگایا جسے اس کے نام سے موسوم کیا
 جانے والا تھا۔ یعنی لیڈی ریڈنگ پارک، جیہ نے مہمان مہارانیوں کو دیکھا وہ اپنے ہاتھوں کی
 لالچ لائے ہوئے وائسرائے کو برا بھلا کہہ رہی تھیں لیکن یہ بھی ان کی خوش قسمتی تھی کہ
 لیڈی ریڈنگ کو یہ احساس نہیں ہو سکا تھا کہ ہندوستانی حکمرانوں کے اعتماد کو دھوکہ دینے پر
 وائسرائے کو کس انداز میں برا بھلا کہا جا رہا ہے۔

”اگر ہمارے معاہدے بے مصرف ہیں تو پھر وائسرائے کسی بھی وقت ہمارے تخت
 سے اٹھ کر سکتا ہے کیونکہ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے ہندوستان کی بھلائی اور
 ان دنوں کے لئے کر رہا ہے۔“ ایک مہارانی نے غصے سے کہا۔

”انگریز تو ساہوکاروں اور سود خوروں سے بھی بدتر ہیں۔ انہوں نے ہماری ہر شے ہم
 سے ہتھیالی ہے اور اب بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ان کے مقروض ہیں۔“

جیہ کا خیال تھا کہ شاید وائسرائے کے دورہ سیر پور سے اس کی حیثیت بھی تبدیل ہو
 جائے گی لیکن جونہی وائسرائے سیر پور سے روانہ ہوئے وہ اپنے شوہر کے لئے ایک بار پھر
 بے مصرف ہو گئی۔ وہ ہر اس عمل کی تنقید کرتا تھا جس سے میاں بیوی کے درمیان محبت
 ان چڑھ سکتی تھی یا اس کا اظہار ہو سکتا تھا۔

مگر اس کے باوجود جیہ ہر صبح پوجا پاٹ میں اپنے شوہر کی سلامتی اور ترقی کی دعائیں
 پڑھتی اور ان راتوں کو بھولنے کی کوشش کرتی جن راتوں میں پرنس پر تپ اپنی بیوی کو دشمن
 علاقہ سمجھ کر پوری قوت سے اس پر حملہ آور ہوا تھا۔

اسے وہ طویل سال بھی یاد تھے جو اس نے ان راتوں کے انتظار میں گزارے تھے۔
 اسے اعتراف تھا کہ اس طویل انتظار کا اسے کوئی اچھا بدلہ نہ ملا تھا۔

جیہ اس امر سے بھی بخوبی آگاہ تھی کہ مہاراجہ پر تپ ایک خاص مقصد کے تحت اس
 قریب آیا ہے۔ ورنہ جب تک وہ ریاست کا حکمران نہیں بنا تھا اس نے کبھی پلٹ کر
 اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

مگر اب صورت حال مختلف تھی، مہاراجہ پر تپ کو اب اپنے ولی عہد راجکار کی
 ریت تھی اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے وہ جیہ کے قریب آیا تھا۔ قبائلی علاقے کے

دورے کے دوران اس وحشیانہ فعل کی ابتدا ہوئی اور پھر محل میں بھی اسے بار بار دہرایا گیا۔ جیہ کئی روز تک اپنے شوہر کے ظلم و ستم سہتی رہی اور پھر جب محل کے ڈاکٹروں نے تصدیق کر دی کہ جیہ مایہ بننے والی ہے تو وہ ایک بار پھر اپنے شوہر کی شکل دیکھنے کو ترس گئی۔ مہاراجہ پر تپ نے اس کے بیڈ روم میں آنا چھوڑ دیا۔ مگر اب جیہ کو خود اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ پردہ پیلس میں منتقل ہو گئی تاکہ خود کو مہاراجہ پر تپ سے دور رکھ سکے۔

پاکستانی
ڈاٹ کام

اپریل میں مہارانی جیہ دیوی نے ایک لڑکے کو جنم دیا۔ سیرپور کی شیر دل مہارانی نے جب پسینے میں بھیگے ہوئے لمبے بال جیہ کے چہرے پر سے ہٹائے تو جیہ نے اطمینان کا ایک طویل سانس لیا۔ بلاخر اس نے سیرپور سے اپنا تعلق قائم کر لیا تھا۔ وہ سیرپور ریاست کا جانشین پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور یوں وہ لڑی ٹوٹنے نہیں پائی تھی جو صدیوں سے صحیح سلامت چلی آرہی تھی۔

مہاراجہ پرنپ یورپ کے سفر سے لوٹا تھا۔ اس لئے جانشین پیدا ہونے کی تمام تر تقریبات شیر دل مہارانی نے بہا کیں۔ صبح صادق اور غروب کے وقت توپوں سے گولے دانے گئے۔ مندروں کی گھنٹیاں بجائی گئیں۔ یہ اعلان تھا کہ سیرپور کا ولی عہد اس دنیا میں جنم لے چکا ہے۔ قیدی رہا کئے گئے۔ بادشاہت کے عوام میں نئے کپڑے تقسیم کئے گئے۔ سٹی پبلک کے وسیع و عریض صحن میں کئی بڑے بڑے خیمے نصب کر دیئے گئے تھے جن میں دن میں دو دفعہ غریاء کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔

شوہر کی واپسی پر جیہ بھی سٹی پبلک لوٹ آئی۔ اس نے ولی عہد کو اپنی چھاتیوں سے لپٹا رکھا تھا اور نہایت فخریہ انداز سے اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ وہ اس وقت اپنی ہی دنیا میں مگن تھی۔ اس لئے اس نے مہاراجہ کی وہ معذرت بھی نہیں سنی تھی جو اس نے ولی عہد کی پیدائش کے وقت یہاں موجود نہ ہونے پر بیوی سے کی تھی۔

لیکن جب مہاراجہ جیہ کی طرف جھکا تو اس نے رخ بدل لیا اور مہاراجہ کے ہونٹ صرف اس کے گلاں کو چھو سکے۔ عین اسی لمحے ولی عہد نے شور مچانا شروع کر دیا۔ جیہ مسکرائی۔ اس نے بچے کو دودھ پلانے کے لئے اپنی ساڑھی نیچے سرکا دی۔

”رکھو!“ مہاراجہ اچانک ہی تیز آواز میں گویا ہوا۔

جیہ نے سینے سے لپٹے ہوئے بچے سے نگاہ ہٹائی اور حیرت سے اپنے شوہر کو دیکھنے لگی۔ ”سیرپور کی مہارائیاں، دائیوں کو ملازم رکھتی ہیں۔“ مہاراجہ کا لہجہ بدستور سخت تھا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ میری بیوی دہاتی عورتوں کی طرح اپنے بچے کو دودھ پلائے۔“

”حکم!“ جیہ کے چہرے پر خوف اٹھ آیا۔ اس نے بے بس نگاہوں سے اپنے شوہر کو

دیکھا۔ مہاراجہ پر تپ نے اسے کبھی بیوی کا مقام نہیں دیا تھا اور آج وہ اس سے ماں کا حق بھی چھین رہا تھا۔ اس نے جلد ہی نگاہیں جھکا لیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ مہاراجہ ان نگاہوں میں اپنے لئے نفرت کو ٹھانھیں مارتے دیکھے جن نگاہوں نے ہمیشہ اس کی سلامتی کی آس و امید کو اپنی پتلیوں میں جگہ دی تھی۔

اسے چپ لگ گئی یا اس نے خود کو بے حس بنالیا۔ وہ دربار ہال میں اپنے شوہر کے پہلو میں بیٹھ کر درباری امور نمٹاتی پھر اکبر کی تیار کردہ مہمانوں کی وہ فرشتیں دیکھتی جو بچے کی پیدائش کی تقریبات میں شرکت کے لئے آنے والے تھے جبکہ دایا، مہارانی کی رہائش گاہ پر ریاست کے ولی عہد کو دودھ پلا رہی ہوتی۔

مہاراجہ یونہی اپنی قوت و طاقت کا مظاہرہ کرتا رہتا اور جیہ خاموشی کے ساتھ اس کے ظلم و ستم سہی رہتی، لیکن جب چھوٹا ڈنگرا، سیر پور پہنچا تو اس کے شوہر کے اس رویے میں قدرے تبدیلی آگئی۔

”تمہاری والدہ نواسے کی پیدائش پر بے حد خوش ہیں۔“ چھوٹے ڈنگرا نے سونے کے سکوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی بچے کے سر کے گرد گھمائی اور چاندنی کو تھادی۔ ”جب میرے والد کا دیہانت ہو رہا تھا تو انہوں نے تمہاری والدہ سے کہا تھا کہ وہ ریاست کی بہتری کے لئے پراگھٹا کریں اور اب جبکہ میں اپنی ریاست کا حاکم ہوں ان کی موجودگی میرے لئے باعث تقویت ہے۔“ اس نے اپنے عظیم مٹے کو ایک کرسی میں گویا فٹ کیا۔ ”لیکن میں نہیں سمجھتا کہ انگریزوں کو پر تپ کو لندن میں کھیلنے کو دتے دیکھ کر تقویت ملتی ہوگی کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ پر تپ کی رعایا مسائل سے دوچار ہے۔“

”کیا برطانیہ میں بھی قحط پڑ گیا ہے! حکم؟“ جیہ نے حیرت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

”ملازمتوں کا قحط، شہزادی“ چھوٹے ڈنگرا نے جواب دیا۔ ”جنگ سے بچ جانے والے لوگ اپنے بال بچوں کو نہیں پال رہے کیونکہ انہیں کام دستیاب نہیں۔ پچھلے مہینے انہوں نے لندن کی طرف احتجاجی مارچ کیا۔ وہ نوکریاں چاہتے تھے لیکن انہیں گولیاں ملیں اگر صورت حال بہتر نہ ہوئی تو بہت ممکن ہے کہ برطانیہ کو کسی انقلاب کا سامنا کرنا پڑے۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر بچے کا ننھا منا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ”جب کبھی تمہیں پر تپ کے ساتھ تنہائی ملے تو اسے سمجھانا کہ وہ قوم پرستوں کے ساتھ بہتر روابط استوار رکھے کیونکہ اگر برطانیہ کی عمارت منہدم ہوئی تو ہمارا مستقبل صرف قوم پرستوں سے تعلق میں پوشیدہ ہو گا۔“

”ہم مجبور ہیں، حکم!“ جیہ نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔ ”اس وقت ہمارے شوہر کو صرف اپنی خوشی عزیز ہے۔ یقین کریں کہ اپنے بیٹے کو بھی وہ ثانوی حیثیت دیتے ہیں۔“

چھوٹے ڈنگرا نے ہنکارا بھرا جس سے اس کی ناراضگی کا اظہار ہوتا تھا۔ ”پر تپ ایک دلچسپ اور خوبصورت آدمی ہے لیکن سیرپور کے دوسرے حکمرانوں کی طرح وہ بھی حقیقت پسند نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ شہزادی کے پچھلے ماہ پیپلز کونسلوں نے بمبئی میں ایک ریفارمس آرگنائزیشن بنائی ہے جس کا مقصد ہندوستانی ریاستوں میں انقلاب کی راہ ہموار کرنا ہے۔“

جیہ نے متا کے جذبے سے سرشار ہو کر بچے کو سینے سے بھینچ لیا۔ وہ جانتی تھی کہ سیرپور کے حکمرانوں کی قوت براہ راست برطانوی تخت سے وابستہ ہے اور اس قوت کو کمزور پڑنے میں بھی کئی سال درکار ہوں گے۔“

ایک ہاؤس ہولڈ گارڈ نے بالادب بالملاحظہ کی صدا لگا کر مہاراجہ کی آمد کا اعلان کیا۔ ڈنگرا پر تپ کے استقبال کے لئے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ہم تمہارے بیٹے کی پیدائش کی خوشی میں برابر کے شریک ہیں، پر تپ۔“

”ایک خوشی کی خبر اور ہے، چھوٹے۔“ پر تپ نے گرم جوشی کے ساتھ اس سے مصافحہ کیا۔ ”میرے ریزیڈنٹ نے بتایا ہے کہ وہ اگلے سال گھر واپس جا رہا ہے۔“

”یہ مذاق کا موقع نہیں، پر تپ۔“ ڈنگرا نے ناصحانہ انداز اختیار کیا۔ ”نئی اصلاحی تحریک یا ریفارمس موومنٹ ہمارے مستقبل کے لئے بھیانک خطرہ ہے اور اب برطانوی تخت ہماری ریاستوں میں انگریزی افسروں کے بجائے ہندوستانی افسران تعینات کر رہا ہے۔ ان میں سے بعض ہندوستانی افسران ہم سے اتنی نفرت کرتے ہیں کہ انگریزوں نے تصور میں بھی نہیں کی ہوگی۔ کم از کم سرہنری ایک ایسا شخص ہے جسے تم اچھی طرح جانتے ہو ممکن ہے اس کا جانشین کوئی بہت خبیث آدمی ہو۔“

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، چھوٹے۔“ پر تپ نے ڈنگرا کی سنجیدہ بات ہنسی میں اڑائی۔ ”سر اکبر کے پاس ان جانشینوں کی مکمل فہرست موجود ہے اور تم شاید نہیں جانتے کہ یہ فہرست ہمارے جاسوسوں نے برطانوی ریزیڈنٹ سے چرائی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کوئی ایسا آدمی تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے گا جو واقعی سیرپور کا ہمدرد ہو گا۔۔۔ چھوٹو ان باتوں کو۔ آؤ میں تمہیں وہ دو نئے جہاز دکھاؤں جو کچھ ہی عرصہ قبل انگلستان سے آئے ہیں۔ انہیں اس وقت بیگلرز میں کھولا جا رہا ہے۔“

اکتوبر میں بچے کا نام رکھنے کی تقریب اسی احاطے میں ہوئی جہاں وائسرائے نے پر تپ

کو مہاراج کے اختیارات تفویض کئے تھے۔ بے قرار پر جا ایک بار پھر اس احاطے کی دیوار پر چڑھی بیٹھی پجاری کو دلی عہد کے لئے پوجا کرتے دیکھ رہی تھی۔

راج گورو، بچے کو اٹھا کر جلتی ہوئی آگ کے پاس لے آیا۔ اس کے ننھے منے ہاتھوں میں چاول رکھ دیئے گئے۔ جب معصوم بچے نے اپنی مٹھیاں کھولیں اور چاول جلتی ہوئی آگ میں جا گرے تو لوگوں نے نعروں اور تالیوں سے آسمان سر پر اٹھالیا۔ دریائے گنگا کا پوتر پانی بچے کے جسم پر چھڑکا گیا اور سیندور سے اس کے ماتھے پر نشان لگایا گیا۔ راج گورو نے بلند آواز سے منتظر لوگوں کو بتایا کہ سیرپور کا ولی عہد ارجن کے نام سے پکارا جائے گا۔

حیرت انگیز طور پر ننھا ولی عہد اس پوری تقریب کے دوران بے حد خوش رہا تھا۔ وہ ایک مرتبہ بھی نہیں رویا تھا بلکہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آگ کے بلند ہوتے ہوئے شعلوں کو دیکھتا رہا تھا۔ بچے کی دلچسپی دیکھ کر جیہ کو بے اختیار یاد آیا تھا کہ ولی عہد کا نام اس عظیم بادشاہ کے نام پر رکھا گیا تھا جس کا رتھ کرشن بھگوان کھینچتا تھا۔

دو دن بعد لیڈی مودی، ویلز پلس پنچھی۔ اس نے اتنے بڈل اٹھا رکھے تھے کہ وہ خود ان کے عقب میں چھپ سی گئی تھی۔ وہ جیہ سے ملنے کے لئے بے تابی سے آگے بڑھی اور تمام پیکٹ سنگ مرمر کے فرش پر ڈھیر ہو گئے۔

”اوہ شٹ!“ وہ کراہ اٹھی۔ ”میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ وہ تحفہ جسے میں ساری دنیا سے چھپا کر یہاں لے آئی تھی پیش کرنے سے محض چند ثانیے قبل کرچی کرچی ہو جائے گا۔“

جیہ نے محبت سے لیڈی مودی کو بانہوں میں بھر لیا۔ ”ہمیں کسی تحفے کی ضرورت نہیں ہے، پیسی۔“

لیڈی مودی جھٹکے سے پیچھے ہٹی۔ اس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات تھے۔ ”یہ تمہارے لئے نہیں تھا، ڈارلنگ! یہ تمہارے بیٹے کے لئے تھا۔ یہ ایک پلنک بہپر تھا۔ سنہری کام والے گلاس۔ ایک بہت ہی زبردست کاک ٹیل شیکر۔ مونوگرام دالی پلیٹیں۔ کٹری۔ ڈنر سیٹ اور....“

”اے بھگوان“ جیہ نے دخل اندازی کی۔ ”وہ صرف چھ ماہ کا ہے۔ پیسی۔ پلنک بہپر بھلا اس کے کس کام کا؟“

لیڈی مودی کوئی جواب دیتی لیکن اس کے کتوں نے شور مچانا شروع کر دیا اور وہ ان کی جانب متوجہ ہو گئی۔ ”یہ مجھے نواب آف پرنسپل گڑھ کی شادی پر بھی بے حد پریشان کریں

گے۔ ”لیڈی مودی نے پہلی بات بھول کر جیب کو آگاہ کیا۔

جیب نے مارٹنی کے دو گلاس بنائے۔ اس نے ایک گلاس لیڈی مودی کو تھما دیا اور
 ”مرا اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ ”لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ نواب اپنے آٹھ سوکتوں میں ان
 لیمن کتوں کے شور کا کوئی نوٹس لے گا۔“ وہ مسکرائی۔ ”لیکن، ’پسی‘ اس دفعہ نواب نے کسی
 لوب لڑکی سے شادی کی ٹھنی ہے؟“

”یہی تو اصل پوائنٹ ہے، ڈارلنگ!“ لیڈی مودی نے اپنے گلاس سے ایک بھرپور چسکی
 لی۔ ”وہ کسی لڑکی سے شادی نہیں کر رہا۔ بلکہ اپنے محبوب ترین کتے کی شادی....“
 جیب نے مارٹنی کا جو گھونٹ بھرا وہ اس کے حلق میں ہی اٹک گیا تھا۔ ”پرتپ گڑھ کا
 حکمران ایک کتے سے شادی کرنے جا.....“

”اوہ ڈارلنگ!“ لیڈی مودی نے برا سامنہ بتایا۔ ”کیا بے وقوفی کی باتیں کر رہی ہو، تم
 بھی۔ نواب کی پسندیدہ ترین کتیا ایک کتے سے بیاہی جا رہی ہے۔“ بھوری آنکھیں جوش سے
 چمک اٹھیں۔ ”تم نے اپنا دعوت نامہ نہیں دیکھا، لوگ تو اس کی شادی کو موسم کا سب سے
 بہترین پروگرام قرار دے رہے ہیں۔“
 ”ہم نہیں سمجھ پائے کہ تم کیا باتیں کر رہی ہو، ’پسی‘؟“

جیب نے ناک سکوڑی۔ ”ہمیں کتوں کی شادیوں کے دعوت ناموں سے کوئی دلچسپی
 نہیں۔“

”میں جانتی ہوں۔“ لیڈی مودی نے ایک طویل سانس لی۔ ”اس بزدل نے یہ خبر جان
 بوجھ کر تم سے چھپائی ہو گی۔ میں بھی تمہیں نہیں بتا سکتی کہ ہم لوگوں نے یہ گرمیاں لندن
 میں کیسے گزاری ہیں۔ لندن میں عام ہڑتال تھی اور یونیفارم پہنے ہوئے لوگ بس ایک ہی
 جانب مارچ کر رہے تھے۔ ہمیں تمہاری بے حد یاد آئی کہ تم بھی یہ منظر دیکھ لیتیں، لیکن تم
 ماں بننے والی تھیں۔“

لیڈی مودی نے ایک بار پھر اپنے کتوں کو دیکھا لیکن وہ جیب کی طرف متوجہ تھے۔ جیب
 نے بھی ان بے زبان لیکن وفادار جانوروں کی توجہ محسوس کر لی تھی۔

”ویسے یہ ہو گی بے حد عظیم الشان شادی، ڈارلنگ۔“ لیڈی مودی، موضوع ایک بار
 پھر نواب کی کتیا کی شادی کی جانب موڑ لائی تھی۔ ”تمہیں شاید جان کر حیرت ہو کہ شادی پر
 وائسرائے کو بھی بلایا گیا ہے۔ لوگ اس کی شرکت یا عدم شرکت پر تبصرے کرنے میں
 مصروف ہیں۔ تم جانتی ہو کہ یورپین جانوروں سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔“

”ہمیں کوئی حیرت نہیں ہوئی۔“ جیہ نے دانت کچکچائے۔ ”ممکن ہے کہ نواب کو اپنا تخت بچانے کی یہی صورت دکھائی دی ہو کیونکہ اندور اور ناہبہ کے تخت چھینے جانے کا واقعہ ابھی چھ ماہ بھی پرانا نہیں ہوا اور وہ.....“

”اپنے پیشرو کے برعکس نیا وائسرائے لارڈ اردن ایک شریف النفس انسان ہے۔“ لیڈی مودی نے وکالت کی۔ ”اب میری بات غور سے سنو، ڈارلنگ۔“ اس نے جیہ کا شانہ تھپتھپایا۔ ”دلن کا نام روشن آراء ہے.... یعنی نواب کی آنکھوں کی روشنی۔ یہ ہر دل عزیز کتیا، ریشمی بستر پر سوتی ہے اور ہیرے جڑے پیالوں میں کھاتی ہے۔ یہ جس کتے سے بیاہی جا رہی ہے اس کا نام بولی ہے.... کیوں؟ ہے نا ایک مردانہ نام؟“

جیہ کو کتوں کے ذکر سے وحشت ہو رہی تھی۔ اس نے بھویں اچکائیں، لیکن شاید لیڈی مودی اس ذکر میں خاص رغبت محسوس کر رہی تھی۔

”میں تو یہ چاہتی ہوں کہ میرا کوئی کتا پر تپ گڑھ میں مرے۔“ اس نے موضوع نہیں بدلا۔ ”میں نے سن رکھا ہے اگر پر تپ گڑھ کا کوئی شاہی کتا مر جائے تو اسے پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ دفن کیا جاتا ہے اور اس کے جنازے کا باقاعدہ جلوس نکالا جاتا ہے۔“

جیہ اپنے شوہر کی منتیں ہی کرتی رہ گئی کہ وہ ایک کتیا کی شادی میں شرکت کر کے اپنے عزت و وقار کو داؤ پر نہ لگائے لیکن مہاراجہ پر تپ سنگھ کی یہ خواہش تھی کہ اس کی بیوی بھی اس شادی میں اس کے ہمراہ پر تپ گڑھ جائے۔

چھوٹے ڈنگرا اور سراکبر نے بھرپور کوشش کی تھی کہ پر تپ اس شادی میں شرکت کا فیصلہ تبدیل کر دے۔

”دو برطانوی کمیشن ان دنوں ہندوستان کا دورہ کر رہے ہیں۔“ انہوں نے پر تپ کو آگاہ کیا۔ ”یہ بٹر کمیشن، برطانوی تخت کے ساتھ ہمارے روابط کا جائزہ لے رہا ہے، جبکہ سائن کمیشن ہند کو داخلی خود مختاری دینے کے امکانات کا جائزہ لینے میں مصروف ہے۔“

چھوٹا ڈنگرا کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہا تھا۔ ”دوسرے حکمران بٹر کمیشن کی خوشنودی میں مصروف ہیں تاکہ اصلاحی تحریک سے جان چھڑانے کے لئے برطانویوں سے زیادہ سے زیادہ تعاون حاصل کیا جائے اور تم پر تپ.... تم نے اس موقع کو ایک کتیا سے شادی کے لئے منتخب کیا ہے۔“

مہاراجہ پر تپ نے کن انکھیوں سے لیڈی مودی کو دیکھا جس کے ہونٹوں پر دہلی دہلی مسکراہٹ تھی۔ وزیر اعظم کے چہرے پر ناپسندیدگی کے تاثرات تھے۔

”یہ ضروری ہے حکم کہ شہنشاہ ہندوستان اس وقت تاج برطانیہ اور قوم پرست، دونوں کے ساتھ بہتر اور متوازن تعلقات استوار رکھے۔ پرتاپ گڑھ میں آپ کی موجودگی کی رپورٹ سرہنری کے توسط سے لازمی طور پر برطانوی سرکار کو مل جائے گی۔“

مہاراجہ پرتاپ نے وزیر اعظم کے الفاظ پر کوئی توجہ نہیں دی۔ ”میری ذمہ داریوں نے مجھے ریاست کے دلی عہد سے نوازا ہے سو برطانوی تخت نے میری منظوری دے دی ہے۔“ اس کے لہجے میں فخر سے زیادہ غرور اور تکبر جھلک رہا تھا۔ ”ممکن ہے کسی نے وکٹر کی حکمرانی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہو، لیکن خاطر جمع رکھو کہ سرہنری کو زری مجھے تباہ نہیں کر سکے گا۔ بالی داوے، تم لوگ یہ بھی سن لو کہ آسرن، سرہنری کو زری کا جانشین ہو گا۔“

مہاراجہ پرتاپ نے لیڈی مودی کی انگلیاں اپنے ہونٹوں سے لگالیں۔ ”خوش قسمتی سے نکا کے دوست جیمس آسرن نے پرنس آف ویلز کے دورے کے دوران سرہنری کو بے حد متاثر کیا تھا۔ اس لئے میں نے سر اکبر سے کہا ہے کہ وہ اس نوجوان کو یہاں بلانے کی کوششیں کریں۔ کم از کم وہ پولو تو اچھی کھیلتا ہے اور تم پولو کپ دینے سے محبت کرتی ہو۔۔۔ میں سچ کہہ رہا ہوں نا پس؟“ اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

ٹرین ریاست پرتاپ گڑھ کی سرحد پر واقع چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی تو سیرپور کے ایشن کتوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ وہ پوری قوت سے کھڑکی کی آہنی سلاخوں سے ٹکرا رہے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ وہ یہ سلاخیں توڑ کر باہر نکل جائیں۔ جیہ نے پہلے تو خشمگین نگاہوں سے انہیں گھورا لیکن پھر ایک طویل سانس لے کر باہر دیکھنے لگی۔ ان کتوں نے ہندوستان کے ایک سرے سے بحیرہ عرب کے کنارے واقع دوسرے سرے تک پہنچنے کے لئے دو ہزار میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔ اس طویل سفر کے بعد ان کا آکٹنا ایک لازمی امر تھا۔

مہاراجہ پرتاپ نے پلیٹ فارم پر بچے سرخ قالین پر قدم رکھا تو سیرپور کے قومی ترانے کی دھن بجائی گئی لیکن کتوں کے بھونکنے کے شور میں میوزک دب کر رہ گیا تھا۔ جس وقت بیہ پلیٹ فارم پر اتری، مہاراجہ اس وقت گارڈ آف آنر کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس کی نگاہیں ریلوے ریٹنگ پر جم کر رہ گئی تھیں جہاں سینکڑوں کی تعداد میں کتے بندھے ہوئے تھے۔

”یہ دولہا کی پارٹی کے ہیں۔“ مہاراجہ پرتاپ نے کار میں سوار ہوتے ہوئے اپنی بیوی کو آگاہ کیا۔ ”یہ سب کے سب ہمارے ساتھ دارالحکومت جائیں گے۔“

وہ لوگ ونڈ پیلس پہنچے تو سمندر کی مرطوب اور ٹھنڈی ہوائ نے ان کا استقبال کیا۔ پرتپ گڑھ کا وزیر اعظم انہیں خیر مقدم کہنے کو موجود تھا۔ کتے چھلانگ لگا کر کار سے اترے اور وزیر اعظم کے گرد جمع ہو گئے جیہ نے اس کی نگاہوں میں بھی کتوں کے لئے دلچسپی کے آثار دیکھے تھے۔

”دارالحکومت کے لئے ٹرین کی روانگی سے قبل آپ لباس تبدیل کر لیں، یور ہائی نیس۔“ وزیر اعظم نے نہایت مودب لہجے میں مہاراجہ کو مخاطب کیا۔ ”دیگر حکمران پہلے ہی ناشتے پر ہیں۔“

شہزادوں اور راج کماروں کا ایک گروپ ونڈ پیلس کے برآمدے میں بیٹھا تھا۔ جیہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو چیمبر آف پر نزل کے اجلاسوں میں شرکت کے لئے سو خنروں سے کام لیتے تھے حالانکہ جانتے تھے کہ چیمبر آف پر نزل ان کی ریاستوں اور بادشاہتوں کے مستقبل کا محافظ ہے لیکن اس وقت وہ نہایت بے فکری اور آرام سے ایک کتیا کی شادی میں شرکت کے لئے ہندوستان کے دوسرے کونے میں بیٹھے دھسکی اور سوڈے سے جی بہلا رہے تھے۔

لیڈی مودی، جیہ کو سیڑھیوں سے اوپر لے گئی۔ ”مجھے لباس تبدیل کرنے کے لئے تمہاری خادماؤں کی ضرورت پڑے گی، ڈارلنگ۔“ چلتے چلتے لیڈی مودی نے جیہ کو آگاہ کیا۔ اس نے بیزاری سے اپنے چھوٹے چھوٹے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ ”میرے خیال میں مجھے خود ہی اپنے بال گھنگریالے بنالینے چاہئے تھے۔“

”تم ہندوستانی ہو۔ پس۔“ جیہ نے اسے یاد دلایا۔ ”تمہیں پرتپ گڑھ جیسی قدامت پرست ریاست میں میموں جیسے کپڑے زیب تن کرنا اچھا نہیں لگے گا۔“

”قدامت پرست؟“ لیڈی مودی نے بے یقینی سے پلکیں جھپکائیں۔ ”تم کیا بات کر رہی ہو ڈارلنگ؟ جانتی ہو کہ بقول تمہارے اس قدامت پرست ریاست کا نواب اپنی کتیا کی شادی کرنے جا رہا ہے۔ تم اس دھوکے میں نہ رہنا۔ تقریب میں فوٹوگرافرز کی ایک بڑی تعداد موجود ہوگی۔ اپنے زیورات پہننا نہ بھولنا۔“

جیہ خوفزدہ تھی کہ نوزائیدہ اصلاحی تحریک ایک کتیا کی شادی میں اس کے شوہر کی موجودگی کو جانے کیا رنگ دے۔ اس نے بے دلی سے ایک آرٹ ساڑھی پہن لی تھی۔ اس کی ملازمائیں لیڈی مودی کے واویلے سے بے حد پریشان تھیں۔

”میرا روج کہاں ہے؟ میرے بال کس قدر بھیا نک دکھائی دے رہے ہیں؟ میں فوری

رہا رہی جا رہی ہوں۔“

آخر کار لیڈی مودی تیار ہو گئی۔ ایک بڑا سا پرس اس کے شانے پر لہرا رہا تھا۔ مسلمان حکمران محل کی لابی میں جمع تھے۔ وہ قیمتی لباسوں میں ملبوس خوش گہیوں میں مصروف تھے۔ سورج غروب ہونے کو آیا تو محل کے دروازے کھول دیئے گئے۔ پورچ میں نئی ترین کاروں کا ایک قافلہ روانگی کے لئے تیار تھا۔

ریلوے اسٹیشن پر بھی روانگی کی تیاریاں جاری تھیں کتوں کو ان کے متعلقہ کپار شمنس میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ سیرپور الیٹنز کو بھی لیڈی مودی کے کتوں کے ساتھ ان کے ڈبے میں پہنچا دیا گیا تھا۔

”وہ دیکھو۔“ لیڈی مودی نے جیہ کی توجہ ایک جانب مبذول کروائی۔ ”وہ رہا دولہا!“ سرخ رنگ کا ایک کتا زمین پر بیٹھا تھا۔ کئی ملازم اس کے ارد گرد موجود تھے۔ اس کے اردوں پیروں میں طلائی پازیب پہنائی گئی تھی۔ اس کی گردن میں ہیرے جواہرات سے مرصع ایک بھاری ہار تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ملازموں نے دولہا میاں کو عروسی ڈبے میں پہنچا دیا جو دلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ لوگ ڈبے پر جیسے ٹوٹ پڑے۔ وہ دولہا کی ایک جھلک دیکھنے کو بے اترتے لیکن دولہا کے محافظ انہیں دور ہٹانے میں مصروف تھے۔

کپاونڈ میں موجود نفرتی بکٹ، شپین کی ٹھنڈی بوتلوں سے لہالب بھرے ہوئے تھے۔ ماراجہ پر تپ اور لیڈی مودی نے ایک کھڑکی کے قریب نشست سنبھالی۔ انہوں نے شپین لاسوں میں انڈیلی اور گلاس ایک دوسرے سے ٹکرا کر ہونٹوں سے لگا لئے۔

دیگر حکمران بھی اسی ڈبے میں موجود تھے۔ رش اتا تھا کہ جب ٹرین چلی تو وہ ایک دوسرے میں گویا پیوست سے ہو گئے تھے۔ جھٹکا لگنے سے کتوں نے بھی شور مچانا شروع کر دیا۔

ٹرین جب پر تپ گرڈ کے دارالحکومت پہنچی تو رات ہو چکی تھی کھڑکی کے سامنے بیٹھے حکمران نے اعلان کیا کہ اسے پلیٹ فارم پر ایک بھاری بھرکم استقبالی کمیٹی دکھائی دے رہی ہے۔ دیگر حکمرانوں نے ہنکارے بھرے اور وہ اپنے اپنے لہلہے درست کرنے لگے۔ ماراجہ پر تپ نے تجویز پیش کی کہ وہ حفظ مراتب کے لحاظ سے تیاری کریں تاکہ ڈبے سے اترنے میں افراطی کا مظاہرہ نہ ہونے پائے۔

”کیا خوبصورت خیال ہے، حکم!“ ایک حکمران نے ہنستے ہوئے رائے زنی کی۔

”لیکن یہ کون یاد رکھے گا کہ کتنی توپیوں کی سلائی ملتی ہے۔“ ایک دوسرے نے

دریافت کیا۔

”وائسرائے کو بلاؤں۔“ ایک آواز سنائی دی۔ ”وہ بہتر جانتا ہے کہ کس کا پروٹوکول کیا ہے؟“

چھوٹا سا ڈبا قہقہوں سے گونج اٹھا۔

وہاں جمع ہونے والے حکمرانوں میں پرنس پر تپ سب سے سینئر تھا اس لئے وہ سب سے پہلے نیچے اترا۔ نواب آف پر تپ گڑھ نے آگے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کیا۔ پر تپ گڑھ کی پوری کابینہ اپنے حکمران کے ہمراہ تھی۔ ان کے عقب میں چمکتے دھلے لباسوں میں مہماندار موجود تھے۔ توپوں کی سلامی دی جا رہی تھی۔ ہر حکمران کے کتے اس کے ہمراہ تھے نواب کے ساتھی ان کتوں کو زر و جواہر میں تول رہے تھے۔ ہر حکمران کو گارڈ آف آزر پیش کیا گیا تھا۔ گارڈ کے معائنے میں مہمان کتے بھی اپنے مالکوں کے ہمراہ تھے۔ جونہی کوئی حکمران پلیٹ فارم پر پہنچے سرخ قالین پر قدم رکھتا اس کی ریاست کا قومی ترانہ بجایا جاتا۔ گو بینڈ کی آواز خاصی تیز تھی لیکن کتوں کا شور بھی اس قدر تھا کہ یہ آواز مدھم محسوس ہو رہی تھی۔ لیڈی مودی اسی باعث حلق کے بل چلائی تھی۔ ”غور سے دیکھنا ڈارلنگ!“ اس نے جیہ کو مخاطب کیا تھا۔ ”تمہارا نواب قدامت پرست ہے، یا نہیں؟“

دولہا میاں کو نیچے اتارا گیا تو کتوں نے بھونک بھونک کر اس کا استقبال کیا۔ پلیٹ فارم پر موجود حکمران حیرت سے آنکھیں پھاڑے نواب کو دیکھ رہے تھے جو طلائی سکے دولہا کے سر پر سے نچھاور کر رہا تھا۔ کتا بھونک رہا تھا اور فرار ہونے کی راہ تلاش کر رہا تھا لیکن نواب نے اسے کھینچ کر قریب کر لیا۔ دولہا ہاؤس ہولڈ گارڈ کے معائنے کے لئے تشریف لے جا رہا تھا۔ گارڈز نے سلامی دی۔ دولہا میاں ایڑیوں اور رانگوں کے بٹ بچنے کی آوازوں سے اس قدر پریشان ہوا کہ اس نے ٹانگ اٹھائی اور اپنا ریٹھی عروسی جوڑا گیل کر دیا۔ نواب نے اپنی کتیا کے ہونے والے شور کی اس بد تمیزی کا قطعی برا نہیں مانا اور اسے بدستور سپاہیوں کی قطاروں کے درمیان گھسیٹتا رہا۔ تمام حکمران نہایت سعادت مندی سے اس کے پیچھے چل رہے تھے پر تپ گڑھ کا قومی بینڈ ایک جنگی دھن بجا رہا تھا جبکہ وہاں کے کتے اپنے محافظوں کے ہمراہ جلوس کے پیچھے پیچھے تھے۔

کیمرامن پلیٹ فارم پر قطاریں بنائے کھڑے تھے۔ اسٹیشن پر فاسفورس فلیش گنیں چمک رہی تھیں۔ لیڈی مودی کو فلیش گنوں کی چکاچوند میں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا پھر

اں وہ فوٹوگرافروں کی طرف منہ کئے بدستور مسکرا رہی تھی۔ اخبار نویسوں نے اس شاہی اہلی کی طرف دوڑ لگا دی تھی جس میں نواب کو سوار ہونا تھا۔

نواب کے ساتھ دولہا میاں بھی طلائی ہوئے کے نرم و ملائم گدیوں پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے سر پر ایک محافظ خصوصی طور پر مسلط تھا جو اسے گدیوں پر بیٹھنے پر مجبور کئے ہوئے تھا۔ اب ہودے میں سے سر نکالے اپنے مہمانوں کو ہاتھیوں پر سوار ہوتے دیکھ رہا تھا۔

جیہ نے لیڈی مودی کو اس ہودے میں گھسیٹا تھا جس کے گرد پردہ نصب تھا۔ لیڈی اسی نے پہلے متحس نگاہوں سے چاروں طرف کا جائزہ لیا پھر گدیوں پر ڈھیر ہو گئی۔ ”مالی گاڈ، ڈارلنگ!“ لیڈی نے ناک سکوڑی۔ ”یہ لوگ کبھی ان چیزوں کی صفائی نہیں کرتے کیا؟“

اس نے اپنے ہینڈ بیگ سے اپنا فلاسک نکال کر منہ سے لگا لیا۔ ٹھیک اسی وقت زمین پر پٹا ہوا ہاتھی اٹھ کھڑا ہوا اور فلاسک میں بھری ہوئی شراب اس کے کلاہر اسکرٹ پر آ ری۔ خود لیڈی مودی بری طرح ہودے کی آہنی چادر سے ٹکرائی۔

”لعلت ہو نواب کے منحوس کتوں پر۔“ اس کے منہ سے مغلظات کا ایک طوفان اٹل ل۔ ”اس نے ہمیں کار میں کیوں نہیں بھجوا یا؟ یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے، ایک لطیفے کے سوا کچھ نہیں لیکن شاید تمہیں علم نہ ہو کہ اس نواب نے اپنی ریاست میں کتوں کے لئے جدید ہسپتال تعمیر کروائے ہیں لیکن اپنی عوام کے لئے ایک بھی نہیں؟ میرا بس چلے تو میں سے کتوں کی ریاست کا بادشاہ بنا دوں۔ وہ صرف اس امر میں دلچسپی رکھتا ہے کہ اس کے لہ سو جانوروں کو گرمیوں میں سرد اور سردیوں میں گرم جگہوں پر رکھا جائے۔ ان جانوروں ، اپنے ملازمین ہیں جو طلائی اور نفرتی پلیٹوں میں انہیں کھانا پیش کرتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ انسان..... یعنی اشرف المخلوقات..... اس سے محروم ہے۔“

باہر سے گلے بجانے کی آوازیں سنائی دیں تو لیڈی مودی خاموش ہو گئی درنہ وہ اور بہت کچھ کہنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ بے قرار لیڈی نے ہودے کا پردہ ہٹایا اور گلاب کی تلی پتیاں اس کے ہاتھوں پر آگریں۔

”اوہ ڈارلنگ!“ لیڈی مودی کسی پل چین سے نہ بیٹھ رہی تھی۔ ”رقاصائیں۔ دیکھو کیسے دیوانہ وار رقص کر رہی ہیں۔ لگتا ہے کہ پورا پرتپ گڑھ اپنے نواب کے اس بے شوق پر خوش ہو رہا ہے۔ وہ واقعی نواب سے محبت کرتے ہیں۔“

کئی پٹاٹے ہاتھی کے عین سامنے پھٹے تو وہ ان سے بچنے کے لئے اچانک ایک سمت مڑا۔

اوپر ہودے میں بیٹھی ہوئی لیڈی مودی ایک بار پھر گدیوں پر گر گئی لیکن اس بار اس کا فلاسک بند تھا چنانچہ اس کے کپڑے مزید خراب ہونے سے بچ گئے۔
ہاتھیوں کی طویل قطاریں محل میں داخل ہوئیں تو تیز روشنیوں سے ہودے کی اندر دھڑکا ہوا بھی جگمگا اٹھی۔ مہمان حکمران ہاتھیوں سے اترنے لگے۔ ان کا رخ دربار ہل کی طرف تھا جہاں شادی کی رسومات انجام پانی تھیں۔

خواجہ سرا، جیہ اور لیڈی مودی کو حرم میں لے گئے جس کی جلی دار دیواروں سے روشنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔ جیہ بڑے غور سے اس عظیم الشان عمارت کا جائزہ لے رہی تھی۔ دولہا کے باراتیوں کے بھونکنے کی آوازیں یہاں تک سنائی دے رہی تھیں۔
اب دولہا بھی دربار ہل میں داخل ہو رہا تھا۔ فوٹوگرافر اس کی تصویریں بنانے کے لئے ایک دوسرے پر گرے جا رہے تھے۔ ایک درباری وزیر متوحش دولہا پر قابو پانے کی کوششیں کر رہا تھا جو اپنی زنجیر تڑوا کر بھاگ جانے پر مصر تھا۔

روشن آراء اور بولی کی شادی مکمل شادی اعزاز کے ساتھ انجام پائی۔ روشن آراء شہزادیوں کے لباس میں ہیرے جواہرات سے لدی پھندی کھڑی تھی جبکہ اس کا دولہا بدستور بھیگے ہوئے پاچھے میں تھا۔ ایک وزیر نے اس جیز اور دولت کی فہرست پڑھ کر دولہا کو سنایا جو دلہن اپنے ہمراہ لے جا رہی تھی۔ جب فہرست مکمل ہو گئی تو وہ دولہا کی طرف جھکا۔ اس نے دولہا کو یاد دلایا کہ اگر اس نے شادی ختم کرنے کی کوشش کی تو جیز کی ایک ایک چیز دلہن کو واپس کر دی جائے گی۔ دولہا میاں نے دم ہلا کر گویا اس شرط سے متفق ہونے کا اعلان کیا۔

تقریب کے اختتام پر مہمان حکمرانوں نے دولہا، دلہن پر طلائی سکے پھجھور کئے جبکہ ان کے ملازمین تحائف سے بھرے ہوئے ٹوکے لے آئے۔ نواب زر و جواہر کے بکس دیکھ کر خوشی سے پھولا نہیں سا رہا تھا۔

دربار ہل کے دروازے کھول دیئے گئے اور بے چین لوگ اندر در آئے۔ نواب اپنے تخت پر بیٹھا آنے والوں کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا جو دلہن اور دولہا پر خالص سونا پھجھور کر رہے تھے۔

جب بارات میں شامل کتوں کو کھانے کے لئے لے جایا گیا تو ان کے بھونکنے کی آوازوں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ کلن پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ نواب اپنے تخت سے اٹھا تو دولہا اور دلہن کو بھی عروسی ڈنر کے لئے لے جایا گیا۔

دو سو مہمانوں کے لئے ایک بہت بڑی میز سجائی گئی تھی جس پر انواع و اقسام کے کھانے ڈھیر کئے گئے تھے۔ ڈنر ہال کے عین وسط میں رقاصائیں، کتوں کا دل بہلا رہی تھیں۔

نواب ایک طلائی کرسی پر براجمان تھا۔ دولہا اس کے دائیں اور دلہن بائیں جانب براجمان تھی۔ دونوں اپنی پچھلی ٹانگوں پر استادہ تھے۔ دلہن اپنے نقاب کی اوٹ سے اپنے مالک کو دیکھ رہی تھی۔ نقاب کا ایک سرا اس کے بائیں کھن سے نیچے سرک آیا تھا۔ وہ کن اکھیوں سے اپنے دولہا کو بھی گھور رہی تھی۔ جونہی روشن آراء سرہلائی اس کی نقاب سرک جاتی۔ نواب فوراً ہاتھ بڑھا کر نقاب درست کر دیتا۔ جیسے بیٹی کی بے پردگی سے خوف زدہ ہو۔ کیلے رہی پاجامے میں ملبوس دولہا میاں ان ساری خرافات سے بے نیاز اپنے سامنے رکھی تھلی سے کھانے میں مصروف تھا۔ اس نے ایک بار بھی اپنی دلہن کی طرف دیکھا نہ رقص کرتی ہوئی لڑکیوں میں کوئی دلچسپی لی۔ اس تمام وقت میں صرف ایک بار اس نے سر اٹھایا اور بھونک کر اپنا احتجاج رجسٹر کروایا جب ایک ملازم ڈنر ہال میں داخل ہوا اور تعظیم کے لئے مہاراجہ پر تپ کی کرسی کے سامنے جھک گیا۔

حکمران ڈنر ہال سے رخصت ہونے شروع ہوئے تو مہاراجہ پر تپ نے ایک ٹیلی گرام جیہ کو تھما دیا۔ ملازم یہی ٹیلی گرام لے کر کمرے میں آیا تھا۔ لیڈی مودی، جیہ کے شانے پر سے ٹیلی گرام کے مندرجات پڑھنے میں مصروف تھی۔

”قوم پرستوں نے درج ذیل قرار داد کے ذریعے اصلاحی تحریک کی حمایت کی ہے۔ یہ کانگریس، ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں پر زور دیتی ہے کہ وہ اپنی رعایا کو شہریت کے بنیادی حقوق فراہم کئے جانے کی قانونی ضمانت دیں۔ رعایا کو الحاقی تقریر، تحریر کی آزادی ہونی چاہئے۔ پولیس پر کوئی پابندی نہ ہو اور جان و مال کے تحفظ کو یقینی بنا دیا جائے۔ یہ کانگریس تمام ہندوستانی ریاستوں کے عوام کو یقین دلاتی ہے کہ وہ اپنے حقوق کے حصول کے لئے جو بھی پرامن تحریک شروع کریں گے اس کی بھرپور حمایت کی جائے گی اور حقوق کا استحصال کرنے والی حکومت کے لئے ہر ممکن مخالفانہ اقدامات کئے جائیں گے۔ آپ سے درخواست ہے کہ فوری طور پر دہلی پنچیس تاکہ ہمارے تاج و تخت کو جو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ اس سے نمٹا جاسکے۔ پٹیا، بیکانیر، الور۔“

لیڈی مودی کے حلق سے اطمینان کی ایک طویل سانس خارج ہو گئی۔ ”تھینک گاڈ۔“ اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہ تھی۔ ”اچھا ہوا کہ واٹس رائے نے اس شادی میں

شرکت کی دعوت قبول نہیں کی، ڈارلنگ۔ اس کی یہاں موجودگی قوم پرستوں کے اعتراضات کے دروازے کھول دیتی۔“

”جب تک جنگ کے لئے دولت یہاں سے کشید نہیں کر لی گئی، یہ شرتاج محل کے سنگ مرمر کی طرح جگمگایا کرتا تھا۔“ کار نے برطانوی ہندوستان کے نئے دارالحکومت کی پوڑی چمکی سڑکوں پر سفر کا آغاز کیا تو مہاراجہ پر تپ کی آواز سنائی دی۔ ”لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ انگریز ہمارے ٹیکسوں کا خوب استعمال کر رہا ہے اور سنگ مرمر کے بغیر بھی اس شہر کو نہایت اعلیٰ پیمانے پر تعمیر کر رہا ہے۔“

جیہ نے کار کے شیشوں سے باہر جھانکا، لیکن اسے شہر میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئی۔ اس کے خیال میں انگریز نے یہ شہر تعمیر نہیں کیا تھا بلکہ بہ زور قوت ہندوستان پر مسلط کیا تھا اور اس کے لئے ہندوستان کا خون نچوڑا تھا۔

نئی دہلی کا کلکتہ سے کوئی جوڑ نہ تھا۔ جیہ کو یہاں کلکتہ کی سی کوئی عظمت دکھائی نہ دی تھی۔ اسے فروری کی سردی کے باوجود ان مزدوروں کے جسم پسینے میں تر دکھائی دے رہے تھے جو برطانوی شاہی دفاتر اور دیگر عمارتوں کی تعمیر میں بری طرح جتے ہوئے تھے۔

ایک اوور لوڈ ٹرک ان کے قریب سے گزرا۔ ٹرک کا سکھ ڈرائیور کھڑکی سے منہ نکالے ان دیہاتی عورتوں کو برا بھلا کہہ رہا تھا جن کے ننگے دھڑنگ اور گنوار بچے اچانک فٹ پاتھ سے سڑک پر آگئے تھے اور اسے اپنے باپ کی جاگیر سمجھ کر مزے سے چہل قدمی کر رہے تھے۔

سفید ٹوپیاں پہنے اور سیاہ جھنڈے اٹھائے ہوئے ایک گروپ سڑک پر آتا دکھائی دیا۔ ٹرک کے بریک جھٹکے۔ بے صبرا ڈرائیور نیچے کود آیا۔ وہ ان مظاہرین کو برا بھلا کہہ رہا تھا جو ٹریفک میں خلل ڈالنے کا باعث بنے تھے۔

جیہ کی توجہ نہ تو ٹرک کی طرف تھی اور نہ ہی وہ مظاہرین کی جانب متوجہ تھی بلکہ وہ تو ان بینروں کو پڑھ رہی تھی جو مظاہرین نے اٹھا رکھے تھے۔

ہندوستان کو آزاد مملکت کا درجہ دو۔

ہندوستان کے لئے اپنی حکومت

سائن کمیشن واپس جاؤ۔

”قوم پرستوں کو توقع ہے کہ سائن کمیشن انہیں مذاکرات کی دعوت دے گا تاکہ وہ مل کر فیصلہ کر سکیں کہ برطانوی ہندوستان آزادی کے قتل ہے یا نہیں۔“ سر اکبر نے تبصرہ

کیلہ وہ کار کی اگلی نشست پر براجمان تھا۔ ”لیکن برطانوی راج نے صرف انگریزوں کو متعین کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور ہندوستانی حکمرانوں نے ایک برطانوی وکیل کا انتخاب کیا ہے تاکہ بلٹرکیشن کے سامنے وہ ان کا کیس پیش کرے۔ ان کے خیال میں سرلیزلے اسکاٹ کی آواز کسی بھی ہندو حکمران کی آواز سے زیادہ اثر انگیز اور طاقتور ثابت ہو گی۔“

شوفر نے کار کو انتہائی احتیاط کے ساتھ مظاہرین کے قریب سے نکالا اور اسے ایک گلی میں موڑ لیا جس میں ہندوستانی حکمرانوں کے محلات دکھائی دے رہے تھے۔ حیدر آباد ہاؤس۔ بچے پور ہاؤس، الور ہاؤس۔ کشمیر ہاؤس۔ بیکانیر ہاؤس اور پٹیاہ ہاؤس پر ان کے ریاستی پرچم لہرا رہے تھے جن کا مطلب تھا کہ ان ریاستوں کے مہاراجہ دہلی میں موجود ہیں۔

مہاراجہ پر تپ نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”میرے ساتھی شہزادے اصلاحی تحریک کی حمایت میں قوم پرستوں کے خلاف متحد ہو گئے ہیں۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ انہوں نے کبھی جمیبر آف پرنسز کے سلسلے میں بھی ایسی دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہو۔“

”انہیں اب ایسا کرنا ہو گا، حکم!“ اس بار بھی سر اکبر نے ہی زبان کھولی تھی۔ ”اس وقت اصلاحی تحریک والے تن تنہا ہندو ریاستوں کو بانٹنے کی باتیں کر رہے ہیں لیکن اگر وہ قوم پرستوں کے ساتھ مل کر ایک آواز بن گئے تو وہ پورے برصغیر کی تحریک بن جائیں گے اور برطانوی تخت کے لئے ان کے مطالبوں کو نظر انداز کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جائے گا۔“

کار سیرپور ہاؤس کے گیٹ میں داخل ہو گئی۔ تین منزلہ عمارت کے برآمدے میں ایک جھوم تھا جو درخواستیں دینے کے لئے اپنے حکمران کا منتظر تھا۔

سیرپور کے اخبارات کے ایڈیٹرز جھوم میں سے راستہ بتاتے ہوئے آگے بڑھے۔

”حکم! کیا آپ نے خبریں سنی ہیں؟“ ایک ایڈیٹر نے مہاراجہ کو مخاطب کیا۔ ”سائین کیشن کو بمبئی میں سیاہ جھنڈوں اور ہنگاموں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ برطانوی رہائش گاہیں نذر آتش کر دی گئی ہیں۔ پولیس نے مظاہرین پر گولی چلا دی۔ متعدد مارے گئے اور کئی زخمی ہیں۔“

”بھلا ان گوروں کو اپنی ہی رنگت کے لوگوں کو یہ دیکھنے کے لئے یہاں بھیجنے کی کیا ضرورت تھی کہ ہم حکومت کے قاتل ہوئے ہیں یا نہیں؟“ ایک نوجوان اخبار نویس نے بلند آواز میں کہا۔ اس کا تعلق بھی سیرپور سے ہی تھا۔ ”کیا ہم ایسے قیدی ہیں جنہیں آزادی کا حق حاصل کرنے کے لئے کسی فیصلے کا انتظار ہے؟“

”آپ دیکھ رہی ہیں تاکہ ہندوستان کیسے بدل رہا ہے! حکم؟“ سر اکبر نے جیہ کا دروازہ کھولتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”ہمارے اخبار نویسوں کی نظر میں یہ بے عزتی کی بات نہیں کہ ان کا حکمران بلٹرمکیشن کے سامنے پیش ہو کر ان حقوق کے حصول کی جنگ لڑے جو ہمارا پیدائشی حق ہیں۔ وہ اپنے آپ کو صرف اور صرف ہندوستانی سمجھتے ہیں جن کی سائن کمیشن کے سفید چمڑی والوں نے توہین کی ہے۔ اب مہاراجہ کو اصلاحی تحریک کے لئے بعض رعایتوں کا اعلان کرنا ہی ہو گا کیونکہ قوم پرست ان کی حمایت کر رہے ہیں۔“

مالی پھولوں کے ہار لئے جیہ کے گرد جمع ہو گئے۔ ان کے کندھوں پر سے جیہ نے مہاراجہ بیکانیر کے پرائیویٹ سیکرٹری کو اپنے شوہر کے پیچھے پیچھے برآمدے میں جاتے دیکھا۔ وزیر اعظم، مہاراجہ کے پیچھے بھاگا جیسے اسے خطرہ ہو کہ کہیں وہ چیمبر آف پر نر کو کوئی انٹ شنٹ پیغام نہ بھجوا دے۔ جیہ نے جب پرائیویٹ سیکرٹری کے انداز میں ہنگامی نوعیت محسوس کی تو اس نے بھی اپنے قدموں کی رفتار بڑھا دی۔

”قوم پرستوں کی اعلیٰ قیادت نے پہلی بار شاہی ہندوستان سے برسرعام مذاکرات کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔“ سیکرٹری مہاراجہ کو بتا رہا تھا۔ ”چیمبر آف پر نر کی کمیٹی، یعنی بیکانیر، اور اور پٹیالہ کے مہاراجہ جلد از جلد آپ سے ملاقات کے خواہش مند ہیں، حکم! ان کے خیال میں ہمیں اصلاحی تحریک سے پہلے قوم پرستوں کے سر پر ہاتھ رکھنے کی ضرورت ہے۔“ ”تب تو ہمارے خیال میں جتنی جلد ممکن ہو ملاقات ہونی چاہئے۔ تم مہاراجاؤں کو بتاؤ کہ میں ہر وقت ملاقات کے لئے دستیاب ہوں۔“ مہاراجہ پر تپ کے چہرے پر بوریت کے تاثرات تھے، چنانچہ وہ مزید کچھ کہے بغیر جیہ کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔

دیواروں پر سیرپور کے حکمرانوں کے پورٹریٹ آویزاں تھے، جبکہ ان کے نیچے شیشے کی بڑی سی الماریوں میں پولو ٹرافیاں بھی ہوئی تھیں۔ آتش دان کے اوپر پوری دیوار پر مہاراجہ وکٹر کی تصویریں تھیں۔ وہ اپنی پسندیدہ پونی کے پہلو میں کھڑا تھا۔ مہاراجہ پر تپ نے وہی اور سوڈے کا ایک گلاس بنایا اور ٹوسٹ کے لئے تصویر کی جانب بلند کر دیا۔

”ہمیں پر تپ گڑھ میں اکٹھے ہونا چاہئے تھا، وکٹر!“ اس نے نرم لہجے میں بھائی کی تصویر کو مخاطب کیا۔ ”برطانوی راج میں کتا کتے کو کھاتا ہے لیکن پر تپ گڑھ میں کتے آپر میں شادیاں رچاتے ہیں، ہے نا دلچسپ بات؟“

کھلے دروازے سے جیہ نے چاندنی کو سیڑھیاں اترتے دیکھا۔ شہزادہ ارجن اس کی گود میں تھا۔ بچے کے شور و غوغا اور اٹھکھیلیوں سے سنگ مرمر کا پورا ہال گونج رہا تھا۔ چھوٹی 5

ایک کلائی بار بار ہوا میں لہرا رہی تھی جس میں نظر اتارنے کے لئے ایک سیاہ دھاگا بندھا ہوا تھا۔ جیہ اپنا شانہ کرو و فر اور رکھ رکھاؤ بھول کر سیڑھیوں کی طرف دوڑ کھڑی ہوئی۔

جیہ نے بچے کو گود میں اٹھا لیا اور اسے پوجا کے کمرے میں لے گئی تاکہ دیوی کے پرنوں میں طلائی سکے اور پھول نچھاور کر سکے۔ بچے نے گلے میں پڑے ہوئے ہار کو پکڑ لیا۔ ”اما“ بچے نے اپنی توتلی زبان میں کہا اور جیہ کے جیسے دل کی دھڑکن ختم گئی۔ اس کے تحت جگر نے پہلی مرتبہ اسے مخاطب کیا تھا۔

جیہ نے جھک کر طلائی سکے اٹھائے تاکہ انہیں پوجا کے کمرے کے دروازے پر موجود علاموں میں بانٹ سکے۔ بچے نے ایک چمکتا دکھتا سکہ اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

چاندنی نے منہ منی ہتھیلی کھولنے کی کوشش کی۔ ”گنگا، جمن!“ یہ مجھے دے دیں۔ آپ بہت اچھے بچے ہو، ”گنگا، جمن۔“

بچہ قلعاری مار کر ہنس دیا۔ وہ اپنی بند مٹھیاں زور زور سے جیہ کے جسم پر مارنے لگا۔ جیہ اپنے بیٹے کو خوش و خرم دیکھ کر پھولی نہیں سارہی تھی۔

”ہم اپنے ننھے حکمران کو گنگا جمن کہہ کر مخاطب کرتے ہیں، حکم!“ چاندنی نے جیہ کو بتایا۔ ”ذرا دیکھیں ان کی آنکھیں گنگا اور جمن کے مقدس پانیوں کی طرح کس طرح رنگ بدلتی ہیں۔“

جیہ نے بیٹے کی آنکھوں میں جھانکا۔ شہزادے ارجن کی آنکھوں میں اسے کئی رنگ دکھائی دیئے۔ سورج کی روشنی میں اس کی آنکھیں بھوری دکھائی دیتی تھیں۔ کبھی کبھار باپ کی آنکھوں کی مناسبت سے ان میں سیاہی جھلکتی تھی اور کبھی وہاں اس کی اپنی آنکھوں کی سبزی دکھائی دیتی تھی۔

جیہ نے بیٹے کو سینے سے لپٹا لیا۔ اپنے کمرے میں وہ دیر تک اس سے کھپتی رہی۔ اور پھر اس نے بچے کے شور و غوغا میں سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹ سنی۔ اس نے جلدی سے اسے چاندنی کو تھمایا اور خود ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی۔

مشغول حکمرانوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ پیالہ کے حکمران کے قوی الجشہ بدن نے اس کے شوہر کو چھپا لیا تھا۔ ”قوم پرستوں نے کہا کہ اگر ہم ان سے الحاق کر لیں اور ان کی بعض اصلاحات سے متفق ہو جائیں تو وہ اصلاحی تحریک کی حمایت ترک کر دیں گے۔“ مہاراجہ نے اس کے شوہر کو آگاہ کیا۔ ”برطانوی تخت نے قوم پرستوں سے وعدہ کیا ہے کہ اگر وہ شاہی ہندوستان اور برطانوی ہندوستان کے درمیان ایک فیڈریشن قائم کر لیتے

ہیں تو انہیں خود مختاری دے دی جائے گی۔“

ہماراج بیکانیر نے اپنی سفید مونچھوں کو تاؤ دیا۔ ”ہم اس سے قبل ایسی طاقتور پوزیشن پر کبھی نہیں رہے اگر چاہیں تو ہم اس دعوت کو مسترد کر سکتے ہیں۔“

”کیا تم سمجھتے ہو کہ اس فیڈریشن کا کیا مقصد ہو گا؟“ وہ ہماراج الور تھا۔ جیہ کو یاد آگیا کہ اس نے آخری بار ہماراج الور کو بنگم پیل کے ڈانس پر کھڑے دیکھا تھا جب جیہ کو شاہ برطانیہ کے حضور پیش کیا گیا تھا، مگر آج ہماراج الور کے سر پر اس کا مخصوص تاج نہیں تھا۔ ”ہماری ریاستوں میں کوئی برطانوی ریزیڈنٹ ہماری جاسوسی نہیں کر رہا۔ معاہدوں کی خلاف ورزی نہیں ہو رہی۔ ایسی بھی کوئی بات نہیں کہ مقامی اشیاء پر برطانوی اشیاء کو ترجیح دی جا رہی ہو۔ ہم یعنی ہندوستانی ریاستوں کے قانونی وارث اور بادشاہ اس بات پر بھی تیار ہیں کہ کسی سیاسی پارٹی کی تشکیل کریں اور ہر قوم پرست لیڈر کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلیں۔“

ہماراج پر تپ نے ہماراج الور کے جذباتی پن کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا۔ ”ایک سیاسی پارٹی، یور ہائی نیس؟ یہ تو ٹریڈ یونین کا ایک آسٹن نام ہے۔ کیا آپ ہندوستانی باشندوں کے آقاؤں یعنی بادشاہوں سے یہ کہنے میں سنجیدہ ہیں کہ وہ کونکے کی کانوں کے مزدوروں کا کردار ادا کریں؟“

”اگر ہم اپنے مقاصد حاصل کر لیتے ہیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ٹریڈ یونین ہو یا سیاسی پارٹی“ ہماراج بیکانیر نے تیز آواز میں سوال کیا۔ ”اس وقت ہمارے سامنے ایک ہی مقصد ہے، اور وہ ہے اصلاحی تحریک کا خاتمہ۔ ہم نے چیمبر آف پر نر میں آزاد ضمانت کا فیصلہ کیا تھا۔ آزاد عدلیہ قائم کی تھی۔ اپنے ذاتی اخراجات اور قومی خزانے کے درمیان ایک حد قائم کر دی تھی۔ اس طرح کی چند اور تبدیلیوں کے بغیر قوم پرست کبھی اصلاحیوں پر گرفت کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔“

جیہ کے عقب میں ایک ملازم نے سرگوشی کی کہ ایک مہارانی سیرپور کے ولی عہد سے ملاقات کی منتظر ہیں۔

جیہ بے دلی سے مہارانی سے ملنے چل دی۔ وہ جانتی تھی کہ اب ان ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلے گا اور یہ پہلی ملاقات تھی۔

پھر ہوا بھی یہی۔ ہر ملاقات لگے بندھے انداز میں ہوتی۔ خدائیں ملاقاتی مہارانیوں کو پیش کرنے کے لئے پرنس ارجن کو گود میں اٹھا کر لاتیں۔ مہارانیاں کھیلتے کودتے اور قلعاریاں

مارتے بچے کے لئے منتر پڑھتیں۔ اس کے برج کے متعلق دریافت کرتیں اور یہ پتا کرتیں کہ پرنس کی پیدائش کے وقت زمین کس سیارے کے اثر میں تھی۔ جیہ جانتی تھی کہ یہ مائیں اپنی شیر خوار بچیوں اور سیرپور کے مستقبل کے مہاراجہ کے درمیان کسی تعلق کی منصوبہ بندی کر رہی ہیں۔

خادمائیں جھک کر کورنش بجالاتیں اور بچے کو باہر لے جاتیں مہمان خواتین کی چائے اور لوازمات سے خاطر تواضع کی جاتی۔ ہر مہارانی دوسری باتوں کے علاوہ اصلاحی تحریک کے خلاف مہاراجہ پر تپ کے کمر کس لینے کی بابت جیہ سے سوال و جواب ضرور کرتی۔

جیہ اس سلسلے میں بے یقینی کا شکار تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا شوہر قوی اہمیت کے کسی معاملے کو سنجیدگی سے لے رہا ہے یا نہیں کیونکہ وہ اپنا سارا سارا دن فلائنگ کلب میں گزار دیتا اور اپنے جہاز پر دہلی کے گرد چکر لگاتا رہتا۔

مہاراجہ پر تپ نے پرنس ارجن کی پہلی سالگرہ کے موقع پر منعقد کی جانے والی پوجا میں ذرا سی دیر کے لئے شرکت کی۔ آیا تو وہ تمام وقت موجود رہنے کے لئے تھا لیکن جب اس نے اپنی اپنی کاروں سے مختلف ریاستوں کی مہارانیوں اور ان کے بچوں کو خادمہوں کے ہمراہ اترتا دیکھا تو وہ تقریب سے چلا گیا۔

ملازمین، مہمانوں میں برف کا شروت تقسیم کر رہے تھے اور جیہ کے کان ایک مہارانی پر تھے جو دوسری سے مخاطب تھیں۔

”ہمارے ملک میں ہمیشہ سے برطانوی ریزیڈنٹ متعین رہا ہے، لیکن پچھلے سال بادشاہ کی طرف سے ایک ہندوستانی افسر بھیجا گیا ہے۔ یہ بھارتی ریزیڈنٹ میرے شوہر کی حکومت کے بارے میں ہر قسم کی چھان کرتا پھرتا ہے۔ حتیٰ کہ اس نے فائلیں تک دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے جن سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ اس نے میرے شوہر سے یہ بھی پوچھا ہے کہ وہ اپنی بیویوں پر کتنا خرچ کرتا ہے؟“

جیہ نے ایک طویل سانس لیا۔ اس کے دماغ پر ایک دھند چھانے لگی تھی۔ اس کا شوہر ایک بے مصرف ایئر لائن پر پانی کی طرح روپیہ بہا رہا تھا۔ اس ایئر لائن کا کم از کم سیرپور کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا اگر سیرپور میں بھی کوئی ہندوستانی ریزیڈنٹ آگیا تو اس کے لئے اسے مطمئن کرنا ناممکن ہو گا۔ برطانوی بادشاہت کی بات اور تھی۔ ان سے تو یہ کہا گیا تھا کہ ریاست کا حکمران ترقی پسند ہے۔

کئی ماہ تک سر اکبر اس بات پر زور دیتا رہا کہ سیرپور کے لئے کوئی ایسا نیا ریزیڈنٹ ہونا

چاہئے جس کا رویہ ان کے لئے ہمدردانہ اور دوستانہ ہو۔ ہر بار جونہی سر اکبر اسٹڈی سے مل جاتا مہاراجہ پر تپ فائل اٹھا کر ایک طرف رکھ دیتا۔
دن پر دن گزرتے رہے لیکن مہاراجہ نے ریزیڈنٹ کے معاملے کو فائل نہ کر سکا۔ سر اکبر نے فیصلہ کیا کہ وہ اس معاملے پر کسی حتمی فیصلے کے لئے میجر آبرن کو سیر پور ہاؤس آنے کی دعوت دے ڈالے۔

جب ایک ملازم نے جیہ کو تعظیم دی تو اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ ”میجر آبرن تشریف لا چکے ہیں، حکم!“ اس نے اپنی مہارانی کو بتایا۔ ”میں نے فلائنگ کلب فون کیا تھا لیکن ہز ہائی نیس اپنے جہاز میں پرواز کر چکے تھے اور کلب والے نہیں جانتے تھے کہ وہ پروا سے کب لوٹیں گے۔“

میجر آبرن، آتش دان کے سامنے کھڑا مہاراجہ وکٹر کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ ملازم نے اسے مہارانی کی آمد سے آگاہ کیا تو وہ چونک کر مڑا اور اپنا ایک ہاتھ دراز کر کے جیہ کی طرف بڑھا۔

”میں مہاراجہ وکٹر کی پونی کی تعریف کر رہا تھا۔“ میجر نے خوش دلی سے اسے بتایا۔ ”سیر پور برادرز کی پسند ہمیشہ سے لاجواب رہی ہے میں اس کا معترف ہوں۔“
انگریز میجر نے جیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو کپکپاہٹ کی ایک انجانی سی لہر اس کے بدن میں سرایت کر گئی۔ جیہ نے گہرا کر نظریں جھکا لیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بچپن کی طرح آج بھی آبرن اس کے جذبات پڑھ لے۔

”ہمارے شوہر غیر متوقع طور پر موجود نہیں ہیں، جیمس صاحب۔“ اس نے دھیمے لہے میں آبرن کو مخاطب کیا۔ ”انہوں نے ہمیں کہا تھا کہ ہم آپ سے معذرت کر لیں۔“
آپ سے بعد میں ملاقات کر لیں گے۔“

”میرے خیال میں یہ ناممکن ہے، شہزادی۔“ جیمس آبرن نے جواب دیا۔ ”میں کل بمبئی روانہ ہو رہا ہوں۔ مجھے شاہی ہندوستان کے سوال پر بٹلر کمیشن کے اجلاس میں شرکت کرنا ہے۔“

”ہمارے شوہر کی خواہش ہے کہ آپ سیر پور میں سر ہنری کونری کے جانشین کی حیثیت سے برطانوی ریزیڈنٹ کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔“

”یہ میرے اختیار میں نہیں، شہزادی۔“ جیمس آبرن حتمی لہجہ میں بولا۔ ”دہلی میں موجود پولیٹیکل آفیسر ایسے فیصلوں کے معاملے میں باختیار ہے اور جب سے لارڈ اردا

وائسرائے ہو کر آیا ہے پولٹیکل آفیسر اس قسم کی معاملات میں خاصی احتیاط سے کام لے رہا ہے۔“

”ہم جانتے ہیں کہ اہم تقریروں کے سلسلے میں ہمیشہ احتیاط سے کام لیا جاتا ہے۔“ آبرن کھڑکی کی طرف بڑھا۔ ”انہیں لینا بھی چاہئے۔“ اس کا انداز خود گلای کا سا تھا۔ ”بہر حال ہم ایک غیر ملک میں برطانوی تاج و تخت کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ بد قسمتی سے ہندوستانی ریاستوں میں تمام برطانوی سفیر، انگریز ہیں اور وہ تب تک اپنی ذمہ داریاں انجام دیتے ہیں جب تک کسی اسکینڈل کے باعث انہیں ان کی جگہ سے ہٹا نہیں دیا جاتا۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی ذہن میں رکھیں شہزادی، کہ حکمران کی کسی کوتاہی کو ریزیڈنٹ کی کوتاہی تصور کیا جاتا ہے۔ انڈین سول سروس کے افسران کی تربیت نہایت اعلیٰ پیمانے پر کی گئی ہے اور انہیں دنیا کے بہترین انتظامی افسران تسلیم کیا جاتا ہے لیکن وہ لوگ جو ہندوستانی ریاستوں میں برطانوی تاج و تخت کی نمائندگی کرتے ہیں انہوں نے انتظامی یا جمہوری امور کے بارے میں کوئی تربیت حاصل نہیں کی۔ جبکہ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ انہیں حکمران کے برابر اختیارات دیئے جائیں، بلکہ بعض صورتوں میں تو وہ حکمرانوں سے بھی زیادہ اختیارات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جبکہ ایسا ممکن نہیں ہے۔“

جیہ کو اس کی آواز میں تھر تھراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ خود بھی اندر سے کانپ رہی تھی، جیسے اسے ڈر ہو کہ یہ انگریز میجر اس کے بدن میں چھپے بچ پڑھ لے گا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ آبرن کی آنکھوں میں جھانک کر یہ بچ تلاش کرے۔

”جیمبر آف پرنسز کی کمیٹی میں شامل حکمران اگر اپنی اپنی عمل داریوں میں وہ اصلاحات رائج کر لیں، جن کا مطالبہ کیا جا رہا ہے تو باآسانی ایک فیڈریشن تشکیل دی جاسکتی ہے۔“ ”یوں محسوس ہو رہا ہے، جیس صاحب جیسے آپ فیڈریشن کے حامی ہوں۔“ جیہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

”آف کورس، شہزادی۔“ جیس آبرن نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”لارڈ ارون، یعنی ہندوستان کے موجودہ وائسرائے سمیت وہ تمام لوگ جو اس عظیم ملک سے محبت کرتے ہیں، فیڈریشن کے حامی ہیں لیکن بد قسمتی کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں جاہلوں کی کمی نہیں۔ شاہی ہندوستان میں بھی کئی جاہل انگریز موجود ہیں ان کے خیال میں فیڈریشن کا مطلب اختیارات کا خاتمہ ہے ممکن ہے کہ وہ حکمرانوں کو اصلاحات کی مزاحمت کا مشورہ دیں اور ان اصلاحات کے بغیر فیڈریشن کچھ نہیں۔“

اچانک ہی جیہ کو احساس ہوا کہ اس انگریز کو سیرپور میں ہونا چاہئے۔ شاید وہ اپنے بچپن کو ایک بار پھر آواز دینا چاہتی تھی لیکن جب وہ بولی تو اس نے اپنی آواز کو قطعی غیر جذباتی رکھنے کی کوشش کی تھی۔

”جیس صاحب! اگر پولیٹیکل آفیسر نے آپ کو متعین کر دیا تو آپ سیرپور آنا پسند کریں گے؟“

آسرن نے اپنا ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا اور جیہ کو یوں لگا جیسے وہ اس کے لمس سے پکھلنے لگی ہو۔ ”آپ کو یہ پوچھنے کی بھلا کیا ضرورت تھی، شہزادی؟“ اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ ”آپ جانتی ہیں کہ میں ضرور آؤں گا۔ خاص طور پر ایسے وقت کہ ہندوستان کے قدیم ترین تخت کا ایک وارث وہاں موجود ہے۔ کیا مجھے کورنش بجالانے کی اجازت ہے؟“

چاندنی، پرنس ارجن کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئی تو وہ ہنس دیا۔ ”مجھے دکھائی دے رہا ہے کہ بچے کی تربیت بھی ٹکا کے انداز میں ہونے والی ہے، شہزادی۔“ آسرن نے تبصرہ کیا۔ ”جب تک یہ گھوڑے پر بیٹھنے کے قابل نہیں ہو جائے گا، خدائیں اس کے پاؤں زمین پر نکلنے نہیں دیں گی۔“

جیہ نے بچے کو قالین پر چھوڑ دیا۔ پرنس ارجن نے آسرن کی کرسی کی طرف گھسٹنا شروع کر دیا۔ وہ ابھی گھسٹوں کے بل چلتا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ میجر کی کرسی تک پہنچتا فرش پر لڑھک گیا۔ میجر نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اسے اٹھایا اور بھلانے کے لئے کھڑکی کے پاس لے گیا۔

جیہ نے میجر آسرن کے مضبوط بازو اپنے بیٹے کے ننھے منے جسم سے لپٹے دیکھے تو اسے اپنا وہ دن یاد آ گیا۔ کبھی یہ بازو اس کے گرد بھی لپٹے تھے۔ اپنے دماغ کے چور خانوں میں آنے والی سوچ کو وہ روکے بغیر نہ رہ سکی کہ اگر اس کی شادی جیس آسرن جیسے کسی شخص سے ہو جاتی تو کیا ہوتا؟

ایک طرف ہندوستانی ریاستوں کے حکمران اپنی اپنی عملداریوں میں اصلاحات کی بحث میں الجھے ہوئے تھے اور دوسری طرف جیہ نے خود کو مکمل طور پر ماتا کی ذمہ داریوں میں الجھا رکھا تھا۔ وہ ان کمیشنوں کو مکمل طور پر بھول گئی تھی جو ہندوستانیوں کو خود مختاری دینے کے معاملات کا جائزہ لینے کے لئے آئے ہوئے تھے۔

لیکن مہاراجہ پرتاپ کا اصرار تھا کہ وہ لازمی طور پر اس ڈنر میٹنگ میں چلے جو قوم

ہستوں کے ساتھ طے تھی۔ ”میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں، مہارانی صاحبہ، یہ شام کوئی طوبصورت شام نہیں ہوگی۔ نہ ہی خوابناک۔“

اور جیہ کو مسز رائے کے ہاں ہونے والی گارڈن پارٹی یاد آگئی جو کم از کم اس کے لئے طواب ناک ضرور تھی۔

سر اکبر نے آگے بڑھ کر مہاراجہ پر تپ کے کانوں میں سرگوشی کی۔ طلائی دستے والی چھری اس کے ہاتھ میں تھی۔ ”میں نہیں سمجھتا کہ آج شام بے کار جائے گی، حکم! آپ برطانوی ہندوستان کے دو اہم ترین اور غیر معمولی افراد سے ملاقات کرنے والے ہیں۔ میری مراد محمد علی جناح اور سردار پٹیل سے ہے۔“

مہاراجہ پر تپ نے بھویں اچکائیں۔ ”تو کیا مجھے خوفزدہ ہونا چاہئے، مسٹر وزیر اعظم؟“ ”خوفزدہ نہیں، حکم! چونکہ“ سر اکبر نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ ”سردار پٹیل کا تعلق انڈین نیشنل کانگریس سے ہے سب سے بڑی قوم پرست تنظیم۔ اس کی تنظیم کے لوگ اسے ہندوستان کا مرد آہن کہتے ہیں۔ وہ دھمکی نہیں دیتا، عمل کرتا ہے اور جہاں تک مسٹر جناح کا تعلق ہے وہ مسلم لیگ کے صدر ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پورے برصغیر میں ان جیسا ذہین اور قانونی داؤ بیچ جانے والا شخص اور کوئی نہیں۔ ان کے سامنے جا کر بڑے بڑے اپنا اعتماد کھو بیٹھتے ہیں لیکن بس ایک بات ہے، مسٹر جناح ذرا سے تلخ ہیں۔“ ”تلخ کیوں؟“ پر تپ نے حیرت سے پوچھا۔ جیہ نے بھی چونک کر وزیر اعظم کو دیکھا۔

سر اکبر، جیہ کے تجسس پر مسکرایا۔ ”مسٹر جناح ایک زمانے میں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر تھے۔ حکم..... ایک عظیم صدر..... ان کی سربراہی میں مسلمانوں اور ہندوؤں نے اپنے ان مذہبی اختلافات تک کو دفن کر دیا تھا جن کی بنیاد پر یہ برصغیر تقسیم ہو سکتا تھا۔ وہ سب کو بھائی چارے، اخوت، رواداری اور محبت کا درس دیا کرتے تھے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ وہ آگ اور پانی کو ایک جگہ جمع نہیں کر سکتے تو وہ دل برداشتہ ہو کر ملک ہی چھوڑ گئے۔ مگر اب وہ واپس آ چکے ہیں پہلے سے زیادہ مضبوط ہو کر۔ اب ان کے پاس نئے خیالات اور نظریات ہیں۔ اب وہ مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے واپس آئے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ذہین اور تلخ مسٹر جناح ہندوستانی مسلمانوں کے ترجمان ہیں اور انڈین نیشنل کانگریس کے لئے یہ ایک ناممکن سی بات ہے کہ مسٹر جناح کے پائے کے لیڈر کے مطالبات سے صرف نظر لے۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ مہاراجہ پر تپ نے کسی مزید تبصرے کے بغیر سر ہلایا اور کار

کی طرف بڑھا۔ جیہ اور سرائیکبر نے اس کی تقلید کی۔

کار نئے دارالحکومت کی چوڑی چکلی شاہراہوں سے گزر کر پرانی دہلی کے علاقے

داخل ہو گئی۔ مہاراجہ اب تک کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر جیسے وہ چونک پڑا۔

”مسٹر وزیر اعظم۔“ اس نے سرائیکبر کو مخاطب کیا۔ ”ہمیں قوم پرستوں کو یہ بلور

ہو گا کہ ہم ان کے مطالبات سے پوری طرح آگاہ ہیں اور ان کے مخالف نہیں۔ اس

ترین ملاقات میں آپ کی موجودگی اس بات کی دلیل ہو گی کہ میرا تعلق ان بے وقوفوں

نہیں جو محض رقص اور طاؤس و رباب سے جی بہلاتے ہیں۔“

جیہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اسے اپنے شوہر کی سوچ پر حیرت ہو رہی تھی کہ

قوم پرستوں سے کس قسم کی توقعات وابستہ کر بیٹھا ہے۔ کیا وہ سیرپور میں انقلابی عمل

محض اس وجہ سے معطل کر دیں گے کہ مہاراجہ اپنی بیوی کے ساتھ ان سے ملاقات

لئے آیا ہے۔

سفر کا اختتام پرانی دہلی میں ایک محل نما عمارت پر ہوا۔ ان کا استقبال نہایت پر

انداز میں کیا گیا اور جلد ہی انہیں اس ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا گیا جہاں پہلے سے

ریاستوں کے حکمران اور قوم پرست رہنما موجود تھے۔

جیہ جس موٹی عورت سے مسز رائے کے کلکتہ والے گھر میں ملی تھی وہ بھی دہلی

تھی وہ فوراً جیہ کی طرف بڑھی۔ ”یہ تو ایک حیرت انگیز بات ہے، میری بچی!“ اس

نہایت پیار سے جیہ کو مخاطب کیا۔ ”کیا تمہاری پرانی ٹیوٹر تمہیں یہاں تک لانے میں کام

ہوئی ہے؟“

مسز ٹائیڈو، جیہ سے کیا مخاطب ہوئی، وہاں موجود تمام افراد کی آنکھیں جیہ پر مرک

گئیں۔ جیہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ حکمرانوں کی جانب سے کئی قیمتی سنائی دیئے کہ سیرپور

حکمران کی بیوی ہندوستان کے قوم پرستوں میں اس قدر معروف ہے۔

جیہ نے بطور خاص نوٹ کیا کہ پوری محفل میں سے صرف دو افراد نے نہ تو قی

ساتھ دیا اور نہ ہی انہوں نے جیہ پر کوئی خاص توجہ دی۔ اس کے برعکس ان کے

سپاٹ تھے۔ ان کے نزدیک سیرپور کے مہاراجہ یا مہارانی کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

جیہ نے ان کا جائزہ لیا۔ ایک شخص قدرے سیاہ رنگت کا تھا۔ اس نے اپنے کند

سفید شال ڈال رکھی تھی اور کونے میں بیٹھا کسی شکاری عقاب کی طرح حاضرین کو گ

تھا۔

دوسری شخصیت، دہلی تہلی اور طویل قامت تھی۔ نفاست سے استری شدہ قیمتی انگریزی سوٹ پہنا تھا کہ اسے پہننے والا اس سے کہیں زیادہ نفیس ہے۔ ایک آنکھ پر مونوکل لگائے وہ آتش دان پر جھکا ہوا تھا۔

مسٹر جنٹل نے آنکھ پر سے مونوکل ہٹایا، جیسے یہ اشارہ ہو کہ استقبالیہ رسومات پوری ہوئیں۔ اب کام کا وقت ہے۔

”میرے خیال میں تمام لوگ جمع ہو چکے ہیں۔“ مسٹر جنٹل کی پاٹ دار آواز ابھری۔ جیہ کے بدن میں ایک جھرجھری سی آگئی کھردری ہونے کے باوجود ایسی آواز تھی جو روح میں بس جاتی۔ انہوں نے انگریزی استعمال کی تھی۔ جیہ جانتی تھی کہ مسٹر جنٹل کی اردو کمزور ہے اور وہ اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لئے انگریزی کا سہارا ہی لیتے ہیں۔ ”میں صرف ایک سوال کروں گا۔“ مسٹر جنٹل کہہ رہے تھے۔ ”حکمران اپنی مجوزہ اصلاحات کو حقیقت کی شکل کب دیں گے؟“

ذرا دیر کے لئے تو محفل کو سانپ سونگھ گیا۔ وہاں موجود افراد کا خیال تھا کہ استقبالیہ کلمت سے میٹنگ کا آغاز ہو گا۔ حکمران یہ سوچے بیٹھے تھے کہ ان کی آمد پر متفکرانہ تبصرہ ہو گا لیکن یہاں تو کسی نے پھوٹے منہ سے بھی ان کی آمد کا ذکر نہ کیا تھا۔ بلکہ اس کے بجائے مسٹر جنٹل نے براہ راست ان کی دکھتی رگ دبا دی تھی۔

”ہم نے اصلاحات اپنانے کی غرض سے ایک قرار داد منظور کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔“ مہاراجہ بیکانیر نے اپنے ساتھی حکمرانوں کی ترجمانی کی۔

”قرار دادیں کسی مقصد کے اتوا کا باعث تو بن سکتی ہیں، عمل کا نہیں۔“ مسٹر جنٹل برجستگی سے بولے تو جیہ کو سر اکبر کا جملہ یاد آ گیا کہ وہ نہایت ذہین لیکن تلخ ہیں۔ ”ہم ان قرار دادوں کے متحمل نہیں ہو سکتے یور ہائی نیس۔“ مسٹر جنٹل کا لہجہ چٹانوں کی طرح سخت اور ٹھوس تھا۔ ”اپنی اصلاحات نافذ کریں ورنہ انگریز ہمیں آزادی نہیں دے گا۔“

”ہمیں کچھ وقت درکار ہے۔“ مہاراجہ پٹیالہ کی آواز ابھری۔

”آپ پہلے ہی وقت سے بہت پیچھے چل رہے ہیں، یور ہائی نیس“ مسٹر جنٹل کا ایک اور سرد جملہ حاضرین کی سماعتوں سے ٹکرایا۔ ”وہ دن دور نہیں جب تاریخ بھی وقت کی طرح آپ لوگوں کو فراموش کر دے گی اگر آپ لوگ چاہتے ہیں کہ تاریخ میں زندہ رہیں تو براہ کرم اپنی رفتار کو کمزور کر دیں ورنہ آپ لوگوں کے پاس اتنی مہلت بھی نہ ہو گی کہ اپنے سابقہ عمل پر پچھتا بھی سکیں۔ اس وقت ہم سب انقلاب اور آپ لوگوں کے درمیان کھڑے

ہیں۔“

محفل ایک بار پھر سکوت کا شکار ہو گئی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ مسٹر جنٹل کے سوالوں کے جواب کسی کے پاس نہیں ہیں۔

”مسٹر جنٹل“ اس بار بھی مہاراجہ پٹیالہ نے ہی بات شروع کی۔ ”آپ تاریخ کے بارے میں یوں بات کر رہے ہیں جیسے ابھی ابھی آپ پر تاریخ کا اوراک ہوا ہو لیکن یہ بات ذہن میں رکھیں کہ ہم ہر روز تاریخی حقائق کا سامنا کرتے ہیں۔ آپ کے ہندوستان میں آج تک مسلمان اور ہندو کسی نتیجے پر متفق نہیں ہو پائے لیکن اس کے برعکس شاہی ہندوستان میں ہم کم از کم پانچ سو تاریخی تنازعات پر متفق ہو چکے ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے اصلاحیوں نے نظر انداز کیا ہے اور آپ لوگ نہایت غیر ذمہ داری سے اس کی حمایت کر رہے ہیں۔“

”تم غلطی پر ہو دوست!“ سفید شمال اوڑھے ہوئے شخص نے کہا تو جیہ کو اس کی آواز کی سختی سے اندازہ ہو گیا کہ سردار پٹیل کو ہندوستان کا مرد آہن کیوں کہا جاتا ہے۔ ”اگر آپ لوگ ہندوستان میں خود مختاری کا راستہ روکیں گے تو شاہی ریاستوں کا وجود ختم ہو جائے گا۔“

سردار پٹیل کے الفاظ کے ساتھ ہی کمرہ جیسے جاگ اٹھا۔ ہر ایک نے بولنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ مہاراجہ پر تپ کا چہرہ بھی بگڑ گیا۔

”سین، دوستو!“ سروجنی ٹائیڈو نے ہاتھ اٹھا کر سب لوگوں سے خاموش ہو جانے کی درخواست کی۔ ”یاد رکھیں کہ ہم لوگ اپنے اپنے عوام کے نمائندے ہیں۔ مسٹر جنٹل ہندوستان کے پچاس ملین مسلمانوں کے ترجمان ہیں۔ حکمران شاہی ہندوستان کے دس کروا عوام کی بات کر رہے ہیں جبکہ ہم بیس کروڑ ہندوؤں کے ترجمان ہیں۔ اس کے باوجود کہ ہمارے مذہب اور اعتقاد الگ ہیں۔ ہم صرف ایک مشترکہ مقصد کے لئے لڑ رہے ہیں اور وہ ہے آزادی۔ آئیے ہم مل کر کوشش کریں کہ برطانوی راج، آل انڈیا فیڈریشن کو تسلیم کر لے تاکہ ہم مشترکہ طور پر برطانوی اور شاہی ہندوستان پر حکومت کر سکیں۔“

”حکمرانوں کے ساتھ الحاق سے قبل مسلم لیگ، شاہی ہند کے باسیوں کے لئے بنیادی اور شہری حقوق کا مطالبہ کرتی ہے۔“ مسٹر جنٹل نے پاٹ دار آواز میں کہا۔

”اور نیشنل کانگریس آپ کی حمایت کرتی ہے۔“ سردار پٹیل نے مسٹر جنٹل کی آواز میں آواز ملائی۔

اس کے باوجود کہ دونوں رہنماؤں کا مطالبہ ایک تھا لیکن جیہ نے یہ بات بطور خاص

اٹ کہ ان میں سے کسی نے بھی ایک دوسرے کی جانب دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ ڈرائنگ روم سے رخصت ہوتے وقت بھی دونوں رہنماؤں نے ایک دوسرے کو الوداع ملنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

مہاراجہ پر تپ، سیرپور ہاؤس آتے ہوئے راستے بھر خاموش ہی رہا تھا۔ جیہ کو یہ دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوئی تھی کہ اجلاس نے اس کے شوہر کے بہت سے خدشات کو دھو ڈالا۔

اچانک پر تپ نے ایک جملہائی لی۔ ”ذرا تصور تو کرو۔ مجھے ہر حال میں بمبئی میں بٹلر کمیشن کے سامنے پیش ہونا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ سیاست کی اس کثافت سے کچھ دن در رہنے کے لئے کلکتہ چلا جاؤں۔“

جیہ نے چونک کر اپنے شوہر کو دیکھا۔ وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکی تھی کہ پر تپ کا یہ لبرزمہ دارانہ رویہ اس کے اکلوتے بیٹے کے مستقبل کو مشکوک بنا دے گا۔

جیہ کی خوشیوں اور توجہ کا تمام تر محور پرنس ارجن تھا جو اب بچپن سے لڑکپن کی حدود میں داخل ہو رہا تھا لیکن اس کے باوجود وہ ریاست سے باہر ہونے والے واقعات سے خود کو الٹعلق نہیں رکھ پائی تھی۔

صبح میں جب پرنس ارجن بیدار ہو کر چھروں سے بچاؤ کے لئے نصب کی جانے والی ہلی سے کھیلنے لگتا تو جیہ سیرپور کے اخبارات کے مطالعے میں مصروف ہوتی۔ شہ سرخیوں میں ہندوستانی حکمرانوں کے وہ وعدے شائع کئے جاتے تھے جو انہوں نے چیمبر آف پرنسز میں اپنے عوام سے کئے تھے۔ ان اصلاحات کے ساتھ ساتھ پہلے صفحات پر ان ریاستوں کے حکمرانوں کا تذکرہ بھی ہوتا تھا جو اصلاحات کا مطالبہ کرنے والوں کو قید و بند کی سزائیں دے رہے تھے۔

وزیر اعظم تو سیرپور لوٹ آیا لیکن حکمران اس کے ساتھ نہیں تھا۔ پردہ پیلس میں سر کبر نے کرسی کھینچی اور شیردل مہارانی کو تازہ ترین واقعات سے آگاہ کرنے لگا۔

”سرلیزلے اسکاٹ نامی ایک برطانوی وکیل کی خدمات حاصل کی گئی ہیں تاکہ وہ ہندوستانی حکمرانوں کا نکتہ نظر بٹلر کمیشن کے سامنے پیش کر سکے۔“ سر اکبر کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ ”اس کے باوجود کہ وکیل نے حکمرانوں کو اپنے رویے اور ترجیحات تبدیل کرنے کو کہا ہے، کئی حکمران ان مجوزہ اصلاحات کو نافذ کرنے میں کوئی دل چسپی نہیں رکھتے۔“

شیر دل مہارانی نے اگلہ دن میں پیک تھوکی۔ ”ایک بوڑھی عورت کی رائے سے ممکن ہے کہ تم اختلاف کرو، وزیر اعظم لیکن میں پریشان ہوں۔“ مہارانی کا انداز ناصحانہ تھا۔ ”صرف اسی سال پہلے برطانوی بادشاہت نے ہمارے عوام کی طاقت چھین لی اور اسے ترقی کا نام دے دیا اور اب وہ یہی طاقت، ترقی کے نام سے ہم لوگوں کو لوٹانا چاہتے ہیں۔“

سر اکبر نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ یہ بھول گیا تھا کہ پردے کی دوسری جانب بیٹھی مہارانی اس کے سر کی جنبش کو نہیں دیکھ سکتی۔ ”صورت حال بادشاہوں اور ریاستوں کے ہاتھوں سے نکل چکی ہے، حکم! اصلاحیوں نے اپنی تحریک کو بادشاہت کے دل تک لے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ لندن میں مظاہرے کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔“

مہارانی کی متوحش آواز پردے کے عقب سے ابھری۔ ”کیا ہندوستان کے حکمران ان ناپسندیدہ عناصر کے ساتھ مل کر برطانوی راج کی مخالفت کریں گے، وزیر اعظم؟“

”ان کے پاس اور کوئی چارہ نہیں ہے حکم!“ وزیر اعظم نے مایوسی سے کہا۔ ”اصلاحیوں کا خیال ہے کہ لندن میں ان کے مظاہرے سے شہلی ہندوستان میں اصلاحات کے مطالبات کے سلسلے میں بٹر کمیشن پر خاطر خواہ دباؤ ڈالا جاسکے گا۔ مہاراجہ پرتاپ چھٹیاں گزارنے کے لئے لندن جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں دوسرے حکمرانوں کا خیال ہے کہ لندن میں ان کی مقبولیت اس مظاہرے کے لئے خاصی سودمند ثابت ہوگی۔“

جیہ دونوں کو بغور دیکھ رہی تھی البتہ دل ہی دل میں وہ اصلاحیوں کے اس اسلحے کے بارے میں سوچ رہی تھی جو وہ ہندوستان کے بادشاہوں کے خلاف لندن لے جانے کے خواہش مند تھے۔

وہ سوچ رہی تھی کہ برطانوی عوام معززین کے قتل اور ٹائٹ کلبوں کی رقاصوں پر حکمرانوں کی لڑائی کی خبروں پر کیا رد عمل ظاہر کریں گے؟ جب انہیں پتا چلے گا کہ ہندوستان کے متعدد مہاراجاؤں نے ڈانسروں اور طوائفوں سے شادیاں کر رکھی ہیں تو کیا سوچیں گے؟ یہ عاقبت نااندیش لوگ یقینی طور پر اس کے بیٹے کے تخت کو خطرے میں ڈال دیں گے۔

آئندہ گزرنے والے مہینوں میں لندن سے شائع ہونے والے اخبارات محض اس کی پریشانیوں میں اضافے کا باعث بنتے رہے۔ اندرونی صفحات پر جیہ کو جمیئر آف پرنسز کے رہنماؤں کی تقریروں کی تفصیلات پڑھنے کو ملتیں۔

ایک پرجوش پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مہاراجہ پٹیالہ نے کہا تھا۔ ”میں پوچھتا ہوں کہ ہندوستان جیسی وسیع و عریض مملکت میں دو سیاسی نظاموں کی گنجائش کیوں

میں سمجھتا ہوں کہ جمہوری اور بادشاہی نظام کے ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں۔ میں اس لمحہ پر پہنچا ہوں کہ اگر دونوں نظاموں کے سرخیل باہم مل کر کام کرنے پر رضامند ہو جائیں ہندوستان کی قسمت بدل سکتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ ہم اس مذہبی تفاوت کو فراموش کر دیں اور اس کی وجہ سے ہمارا ملک ماضی میں ناقابل بیان نقصانات اٹھا چکا ہے۔“

ہمارا جہ پٹیالہ کے اس بیان کو نظر انداز کرتے ہوئے برطانوی اخبارات نے اپنے اولین ملٹ پر ایک اور خبر شائع کی تھی۔

ہمارا جہ پٹیالہ نے انگلینڈ پہنچ کر ہوٹل سیوائے لندن کا پورا فلور کرائے پر حاصل کیا۔ صبح رہے کہ اس فلور پر پینتیس سوٹ ہیں۔

26 جولائی بمبھم پیلس میں ہندوستانی حکمرانوں کے اعزاز میں ایک خصوصی عشاہے کا مہروست کیا گیا۔ دوسرے لوگوں کے علاوہ عشاہے میں مسٹر اے بلیک میل کیس کے مرکزی کردار ہمارا جہ کشمیر اور پٹیالہ کے ہمارا جہ نے بھی شرکت کی۔ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنے ریشی انڈرویر پر سالانہ اکتیس ہزار پونڈ خرچ کرتا ہے۔

ہر بار جب بھی جیہ ان ڈوبتے ہمارا جاؤں کے بیانات سے جی سرخیاں دیکھتی اس کا بغین پختہ ہو جاتا کہ اصلاحی، شاہی ہندوستان کے خلاف جنگ جیت رہے ہیں۔ اسے اب ڈر لگنے لگا تھا کہ اصلاحیوں کی توجہ کسی بھی وقت ہمارا جہ پر تپ کی طرف مبذول ہو سکتی تھی ایک بار پہلے بھی خوفزدگی کا یہ دور اس پر گزر چکا تھا جب ہمارا جہ وکٹر یعنی پر تپ کا بھائی، انسرائے کی ناپسندیدگی کا نشانہ بنتے بنتے رہ گیا تھا۔

پرنس ارجن کی دوسری سالگرہ پر شیردل مہارانی اپنے پڑپوتے کو کامنی مندر لے گئی۔ نئے شہزادے نے یوں تو تمام پوجا بڑے سکون کے ساتھ دیکھی لیکن جب شیردل مہارانی نے اپنا ہاتھ دیوی کے تنگی بت پر پھیرا تو وہ بھاگ کر اپنی ماں کی ٹانگوں کے عقب میں جا چھپا کیونکہ شیردل مہارانی کی استخوانی انگلیاں سرخ مخلول سے تر تھیں۔

جیہ نے پرنس ارجن کو سختی سے پکڑ لیا حتیٰ کہ مہارانی نے اس کے ماتھے پر سرخ نشان مار کر اپنی پوجا مکمل کی۔ جیہ کو ارجن کا ماتھا اور رخسار سرخی سے تر دیکھ کر ایک عجیب سا خیال آیا اور اس نے بے اختیار اپنے بیٹے کو خود سے لپٹا لیا۔

موسم گرما شروع ہوا تو جیہ کے دماغ پر چھانے والی دھند کچھ اور گہری ہو گئی۔ اسے یہ گرم موسم ایک بخار کی مانند محسوس ہو رہا تھا جس کا زور شاید کبھی نہ ٹوٹا۔

اس کی دھند کا اختتام چھوٹے ڈنگرا کے ٹیلی گرام پر ہوا جس میں اس پر زور دیا گیا تھا

کہ اس وقت لندن میں اس کی موجودگی بے حد ضروری ہے۔

”پر تپ“ اپنی ساتھی لڑکی اسی مورے کے سلسلے میں بعض سنگین مشکلات سے دوچار ہو گیا ہے۔ بلیک میل کا خدشہ ہے۔ میں نے اس طرح کی ہولناک صورت حال کبھی نہیں دیکھی۔“

غمے اور کرب سے جیہ کی بری حالت تھی۔ اس نے ٹیلی گرام کو ہتھیلی میں بری طرح کچل ڈالا۔ اس نے بے اختیار اپنے شوہر کو کوسا تھا کہ اس وقت جبکہ پوی برطانوی بادشاہت کی نظریں ہندوستانی بادشاہوں پر مرکوز تھیں۔ اپنی داشتہ کے ساتھ لندن میں رنگ رلیاں منانے کی بھلا کیا تک تھی۔

ڈنگرا کے پیغام نے جیہ کی تمام توقعات اور امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اسے صرف اپنے بیٹے کا تخت ہی نہیں، سیرپور کی پوری ریاست ہی غرق ہوتی نظر آنے لگی تھی۔

انہی دنوں بمبئی سے لیڈی مودی کا خط موصول ہو گیا اس نے جیہ کے ساتھ لندن جانے کی پیش کش کی تھی۔ خط کے دوسرے صفحے کے نچلے حاشیے میں اس نے لکھا تھا۔

”بہتر ہے تم پہلے 14 کرائز اسٹریٹ کلکتہ میں میڈم اینڈ سے رابطہ کر لو، ڈارلنگ۔ تمہیں صورت حال کا مزید اندازہ ہو جائے گا۔ اسی مورے رقصہ بننے سے پہلے اسی کے ادارے میں کام کرتی تھی۔“

سیرپور کے ملازم ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لئے مستعد اور منتظر کھڑے تھے لیکن ان کے چروں پر وہ روایتی گرم جوشی نہیں تھی جو ان مواقع پر اکثر دیکھنے میں آتی تھی۔ بلکہ اس کے برعکس وہ کسی قدر حیران و پریشان تھے کہ مہارانی کی اچانک کلکتہ آمد کس سلسلے میں ہو رہی ہے۔

سڑھیوں پر جیہ کی خدامیں اس کے پیچھے پیچھے تھیں۔ ”ہم نے کرائز اسٹریٹ پیغام بھجوایا ہے، حکم!“ مہارانی جیہ کو آگاہ کیا گیا۔ ”سہ پہر کے وقت آپ کا وہاں انتظار کیا جائے گا۔“

جیہ نے کچھ دیر اپنے بیڈ روم میں آرام کیا اور پھر کڑی دوپہر میں وہ کرائز اسٹریٹ جانے کے لئے سیرپور ہاؤس سے نکل کھڑی ہوئی۔ کار میڈم اینڈ کے ادارے کی جانب جانے والی معروف شاہراہ سے گزر رہی تھی اور جیہ متحسّس نگاہوں سے شور مچاتے رکشاؤں اور پیدل راہ گیروں کو نظروں میں تول رہی تھی اس کے لمبے سیاہ بال، اس کی پسینے میں شرابور جلد پر کسی گرم تولنے کی طرح پڑے ہوئے تھے۔

مچھلی بیچنے والا ایک خانچہ فروش فٹ پاتھ پر بیٹھا برف کی سل پر رکھی ہوئی مچھلیوں پر کھیاں اڑانے میں مصروف تھا کہ اس نے ایک لمبی چوڑی کار قحبہ خانے کے سامنے رکتے ہی اور اس وقت تو اس کی حیرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا جب اس نے ساڑھی میں ملبوس ایک عورت ہی باوقار خاتون کو کار سے اتر کر قحبہ خانے میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس نے کئی بار جھپکائیں مگر وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا وہی حقیقت تھی۔

اس بدنام زمانہ جگہ میں داخل ہوتے ہی جیہ کو ایک عجیب سی محک کا سامنا کرنا پڑا تھا کاجی چاہا کہ وہ پلٹ کر بھاگ نکلے لیکن جس مجبوری کے باعث وہ یہاں تک آئی تھی کا تقاضا تھا کہ وہ ناپسندیدگی کے باوجود یہیں ٹھہرے۔

میڈم اینڈ اس کی منتظر تھی اس نے جیہ کو ایک گندے سے صوفے پر بٹھایا اور ایک کم لڑکی جیہ کے لئے برف کی طرح ٹھنڈی چائے لے آئی۔ جیہ کاجی چاہا کہ چائے سے انکار دے لیکن اخلاق کا تقاضا تھا کہ وہ ایسا نہ کرے۔

”آپ کو اتنی سستی مورے سے ناراض نہیں ہونا چاہئے۔ یور ہائی نیس“ میڈم اینڈ نے نیند نشے سے بوجھل لہجے میں جیہ کو مخاطب کیا۔ ”اس کے اپنے خواب تھے، جن کی تعبیر کے وہ کوشاں تھی۔ اس بچی کو دیکھیں۔“ اس نے چائے لانے والی بچی کی جانب اشارہ کیا۔ انگریز اور سیر نے اس کی ماں کی عزت لوٹی تھی ایک پٹھان ذلال نے اس کی پرورش اور جب اسے یقین ہو گیا کہ بڑی ہو کر یہ لڑکی خوبصورت نکلے گی وہ اسے مجھے فروخت کے چلا گیا۔ آپ کے شوہر ایک شاندار آدمی ہیں۔ ایک ایسے حکمران جو میری لڑکیوں سے دیویوں کا سا سلوک کرتے ہیں۔ اور بعض اوقات یہ لڑکیاں شہزادیوں کے سے انداز اپناتی ہیں۔“ اس نے لڑکی کے کان میں کچھ کہا۔ لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر بھاگتی ہوئی سے باہر چلی گئی۔

چند ہی منٹ بعد ایک عورت کمرے میں داخل ہوئی جو خوب صورت تو تھی لیکن اس چہرے کے نقوش چیخ چیخ کر اس کے طوائف ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔ اس نے نی کو سلام کیا اور منسوب انداز میں کچھ فاصلہ دے کر کھڑی ہو گئی۔

”وہلما!“ میڈم نے آنے والی لڑکی کو نرمی سے مخاطب کیا۔ ”ہمارا بیٹا کو بتاؤ کہ تم نے جہ پر تپ کو کبھی اپنے قریب آنے اور چھونے کی اجازت کیوں نہیں دی؟“

لڑکی نے نفی میں سر ہلایا تو اس کے بھورے بال شانوں پر بکھر گئے۔

”اوسر آؤ ڈیر!“ میڈم نے اسے پیار سے پکارا۔

کے شوہر مصر تھے کہ وہ ان کی داشتہ بن جائے اور اس مقصد کے لئے انہوں نے اس سے شادی کا وعدہ بھی کیا تھا۔ کیا آپ جانتی ہیں کہ ان لڑکیوں کے لئے اس قسم کے وعدوں کی کیا اہمیت ہوتی ہے؟“

جیہ بدستور نظریں جمائے زمین پر پڑے ہوئے جوتوں کو گھور رہی تھی۔ اسے اپنے حلق میں کڑواہٹ سی گھلتی محسوس ہو رہی تھی۔ کاش اس نے لندن میں منتظر شوہر کے بیٹے کو جہنم نہ دیا ہوتا۔

جیہ بحری جہاز میں اپنے وسیع و عریض کیمین کی کھڑکی سے عرشے کا نظارہ کر رہی تھی جہاں اسے ہندوانہ طرز کی جیکٹ پہنے مردوں کا ایک گروپ میز کے گرد بیٹھا خوش گہیوں میں مصروف نظر آیا تھا۔

اچانک اسٹیٹ روم کا دروازہ کھلا اور لیڈی مودی چوکھٹ پر نمودار ہوئی۔ ”ڈارلنگ!“ اس نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں جیہ کو مخاطب کیا۔ ”پوری اصلاحی کمیٹی ہمارے ساتھ لندن کے سفر پر نکلی ہے مگر ہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے۔ حیدر آباد گزشتہ کئی ہفتوں کے دوران بمبئی کی بندرگاہ سے روانہ ہونے والا پہلا بحری جہاز ہے۔“

اس نے بڑھ کر جیہ کو اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ ”پر تپ کے بارے میں مجھے افسوس ہے ڈارلنگ لیکن تم فکر نہ کرو۔ ہم کوئی نہ کوئی راہ نکال لیں گے۔“

”ایسا ہو گا“ پیسی!“ جیہ نے ایک عزم سے جواب دیا۔

”ہمارے شوہر کا خیال ہے کہ وہ جتنی بے قاعدگی چاہے کر لیں برطانوی تخت سے ان کی وابستگی انہیں بچالے گی۔“

”یہی تو اس خوبصورت آدمی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے ڈارلنگ۔“ لیڈی مودی نے جواب دیا۔ ”وہ اس لئے بے قاعدگیاں کر رہا ہے کہ اسے ہر کسی نے بے قاعدگیوں پر ہی اکسایا ہے۔“

”ہمیں اپنے شوہر کی بے قاعدگیوں سے کوئی غرض نہیں۔“ جیہ نے جہاز کے آہنی ڈھانچے سے پرے دکھائی دینے والے سمندر کی نیلی لہروں پر نظریں جما کر کہا۔ ”ہم تو اس لئے فکر مند ہیں کہ ان کی حرکتوں سے ہمارا بیٹا تخت سے محروم ہو جائے گا۔“

لیڈی مودی، جیہ کے چہرے کے ابھرنے والے تاثرات سے الجھ کر رہ گئی۔ ”لیکن ڈارلنگ! پر تپ مہاراج ہے اور تمہارے پاس تو کوئی اختیار نہیں۔“

”ابھی تو نہیں ہیں“ پیسی!“

”تم کتنا کیا چاہتی ہو، ڈارلنگ!“ تجسس اور پریشانی سے لیڈی مودی کی آواز قدرے بلند ہو گئی تھی۔

جیہ کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”وہ اس وقت تک اپنی بیوی کو چھوٹا پسند نہیں کرتا جب تک کہ وہ ایک کھلونے کا روپ نہ دھار لے جس کا عورتوں کی قبیل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا یا اس وقت تک وہ بیوی کے قریب نہیں پھٹکتا جب تک کوئی شخص اس شرابی کو سہارا دینے کے لئے موجود نہ ہو۔“ جیہ کا لہجہ انتہائی باغیانہ اور تمیز کی حدود سے بہت پرے تھا۔ ”اسے اس بیوی سے گھن آتی ہے جو اپنی چھاتیوں سے اپنے لخت جگر کو دودھ پلائے لیکن اس وقت شرم نہیں آتی جب جوتوں پر اپنا قدیم شاہی نشان لئے وہ قتبہ خانے کا دروازہ پھلانگے۔ کیا ایک شوہر کی ذمے داریاں یا بادشاہ کا مقام یہی ہے؟“

”ڈارلنگ میں نے تمہیں پر تاپ کے لئے قابل قبول بنانے کی غرض سے اپنی ہر ممکن کوشش کی ہے۔“ لیڈی مودی نے اسے بتایا۔ ”مجھے تو دکھائی نہیں دیتا کہ تم اس سے بڑھ کر بھی کچھ کر سکتی ہو۔ بہر حال اس نے تمہیں جو حقوق اور اختیارات دے دیئے ہیں، تم ان سے زیادہ کا مطالبہ نہیں کر سکتیں۔“

لیڈی مودی کے تلخ اور کھردرے لہجے نے جیہ کے جذبات سرد کر دیئے وہ بیڈ پر بیٹھی خاموشی سے ملازموں کو کام کرتے دیکھتی رہی جنہوں نے دیوی کے بت کے ساتھ مہاراجہ کی ایک تصویر لاسجائی تھی۔ جیہ کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

سمندر کا موسم چونکہ بہت زیادہ بہتر نہ تھا اسلئے تمام مسافر اپنے اپنے کینوں تک محدود ہو کر رہ گئے تھے جیہ نے بھی یہی کیا تھا اس لئے لیڈی مودی سے اس کی کچھ زیادہ ملاقات نہ ہو پائی تھی البتہ لیڈی مودی نے جب سے جیہ کو تلخ جوابات دیئے تھے اس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ لیڈی مودی کو صرف سماجی تقریبات تک محدود کر دے گی اور اسے مہاراجہ پر تاپ کے خلاف اپنی لڑائی میں استعمال نہیں کرے گی۔

جب جہاز بحیرہ احمر کے پرسکون پانیوں میں پہنچا تو موسم بھی بہتر ہو گیا۔ چنانچہ لیڈی مودی بھی اپنے کیمپ کے عین عقب میں واقع ڈرائنگ روم میں لانچ کے لئے پہنچ گئی تھی۔ یہ بھی اپنے کیمپ سی فکل آئی تھی۔ اسے اب بھی وہ آدمی عرشے پر گروپ کی صورت میں بیٹھے نظر آئے تھے جنہیں اس نے جہاز کی روانگی کے وقت دیکھا تھا۔

اس روز بھی کھانے کے وقت جیہ انہی کی طرف متوجہ تھی۔ میم صاحبوں کا ایک گروپ بھی کیمپن کی میز سے جیسے ان کا نظارہ کرنے میں مصروف تھا۔

لیڈی مودی نے ایک طویل سانس لی۔ ”میں نہیں جانتی کہ سب لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے لوگوں کی ہنسی چھن گئی ہو میں یہ البتہ جانتی ہوں کہ دھوٹی کرتے میں ملبوس ان غریب آدمیوں کی زندگی میں کبھی کوئی خوشی نہ آئی ہو گی۔“

جیہ نے ایک بار پھر پلٹ کر ان غیر دلچسپ قسم کے آدمیوں کی طرف دیکھا جنہوں نے ہندوستان کے شہنشاہوں کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ کندھوں پر شال ڈالے ہوئے ایک جانا پہچانا شخص بھی ان میں موجود تھا۔

لیڈی مودی کا لہجہ اچانک ہی خوشگوار ہو گیا۔ ”یہ تو ارون رائے ہے، ڈارلنگ۔ کیا تم نے کلکتہ میں یہ پروگرام بنایا تھا؟“

لیڈی نے وکیل کو متوجہ کرنے کے لئے اپنا سگریٹ ہولڈر لہرایا جیہ نے اسے جب اپنی میز کی طرف بڑھتے دیکھا تو پریشانی کے عالم میں سر جھکا لیا۔

”ارون ڈارلنگ!“ لیڈی مودی نے نہایت پیار سے اسے مخاطب کیا۔ ”تم ان بے کار قسم کے لوگوں کے ساتھ کیا کر رہے ہو؟“

”یہ ہندوستان کے بہترین قانون دان ہیں،“ ارون نے تبصرے پر برا مانے بغیر عام سے لہجے میں کہا۔ ”اصلاحیوں نے انہیں لندن میں اپنی تحریک کے سلسلے میں حاصل کیا ہے۔“

لیڈی مودی نے اظہار ناپسندیدگی کے طور پر ہونٹ سکوڑے ”ہاں، اگر تم کمزوروں کے اہل کو تحریک کہہ سکو تو!“

”کیا ہندوستان کے ان لیڈروں کے لئے ضروری ہے کہ وہ حکمرانوں کی نجی زندگیوں میں جھانکتے پھریں؟“ جیہ نے پوچھا۔

ہمیشہ کی طرح ارون رائے نے جب جیہ کو مخاطب کیا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ”ان اسکینڈلز کو محض اس ثبوت کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے کہ ہندوستان کے حکمران کس طرح اپنے اختیارات کا غلط استعمال کر رہے ہیں۔ اور ان کے عوام خاموشی سے اس استحصال کو برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔ آپ تو یہ اچھی طرح جانتی ہیں، شہزادی۔ آخر کار آپ نے پرنسپل گڑھ میں ایک کتیا کی شادی میں شرکت بھی کی ہے۔ کیا آپ جانتی ہیں کہ چند ہفتے قبل وائسرائے نے جب پرنسپل گڑھ کا دورہ کیا تو ان کے تاثرات کیا تھے؟ یہ کہ تمام طاقت اور قوت کو ذمے داری کے ساتھ استعمال کیا جانا چاہئے۔“

”ایسے بہت سے حکمران ہیں جو اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال نہیں کرتے اور ذمے

داری کا احساس بھی ان میں موجود ہے۔" لیڈی مودی نے اصرار کیا۔ "مہاراجہ جودھ پور اور مہاراجہ جے پور اس کی واضح مثال ہیں۔"

"کیا آپ جانتی ہیں کہ جودھ پور میں کتنے غلام موجود ہیں، پسی؟" ارون رائے نے دریافت کیا۔

"غلام؟" لیڈی مودی کے حلق سے چیخ سے ملتی جلتی آواز بلند ہوئی۔ "اب تو امریکہ میں بھی غلام ٹام کی کوئی شے نہیں پائی جاتی اور تم۔۔۔"

"آپ غلطی پر ہیں، پسی" ارون رائے نے اس کی بات کٹائی۔ "راجپوتوں کے اس دیس میں جہاں ہماری اس خوبصورت شہزادی نے جنم لیا ہے اب ڈوگرے، چکرے، حضوری، چیلاس اور گولاس قبائل کے افراد کی جانوروں کی طرح خرید و فروخت ہوتی ہے۔"

جیہ کو مسز رائے کی آنکھیں یاد آ گئیں جو جیشے کے عقب سے اسے گھورا کرتی تھیں جبکہ لیڈی مودی، ارون رائے کے جواب سے پریشان ہو کر اپنے شپین کے گلاس سے کھیلنے لگی۔

"اس میز پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے شاہی ہندوستان میں غلاموں کی خرید و فروخت کے خلاف آواز اٹھانے کی کوشش کی ہے۔" ارون رائے نے اپنی بات جاری رکھی تھی۔ "لیکن ان لوگوں کو ہندو بادشاہوں نے جانور سمجھا ہے اور ان کے ساتھ انتہائی گھٹیا سلوک روا رکھا ہے۔ عظیم سلطنت برطانیہ نے انہیں باغیوں کے خطاب سے نوازا ہے لیکن صورتحال یہ ہے کہ غلاموں کی خرید و فروخت تو ایک مثال ہے جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستانی ریاستوں میں ہر شخص قانون سے بے نیاز محض اپنے حکمرانوں کے اشاروں اور غیر انسانی خواہشوں کے سارے زندہ ہے۔"

"یہ سچ نہیں ہے۔" جیہ نے اعتراض کیا۔

"آپ بہتر سمجھ سکتی ہیں، شہزادی۔" ارون رائے ٹھوس لہجے میں بولا۔ "کیا آپ کے عوام واقعی آپ کے شوہر کو پسند کرتے ہیں۔ اگر انہیں یہ یقین ہو جائے کہ سلطنت برطانیہ نے آپ کے شوہر کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا ہے تو کیا وہ آپ کے شوہر کے خلاف اپنی ناراضی کا اظہار نہیں کریں گے؟"

وہ جواب دے کر رکھا نہیں، بلکہ اپنے ساتھیوں کی میز کی جانب واپس چلا گیا۔

لیڈی مودی نے فوراً جیہ کے کانوں میں کھسر پھسر شروع کر دی۔ "سیاست نے ہر شے تباہ کر دی ہے۔" اس نے تہمہ کیا۔ "ابھی لندن پہنچنے میں کم از کم ایک ہفتہ باقی ہے۔ میں

”سمجھ رہی تھی کہ ہم اچھا وقت گزاریں گے۔“

جیہ، لیڈی مودی کے تبصروں سے بیزار تھی۔ اس میں مزید ہمت نہیں تھی کہ ان تبصروں کو برداشت کرے چنانچہ وہ ڈرائنگ روم سے نکلی اور ڈیک پر آگئی۔

اپنے شوہر کی خلاف جنگ میں ہندوستان کے بہترین قانونی دماغوں کے شامل ہونے کی خبروں اور جہاز سے مسلسل نکلنے والے سمندری پانی کو دیکھتے رہنے سے اس کا سر چکرا گیا اور اس نے بے اختیار آنٹی رینگ تھام لی۔

اسی لمحے ایک ہاتھ اس کی کلائی کے گرد جم گیا۔ ”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے، شہزادی؟“

جیہ نے کمزور سے انداز میں سر کو اثبات میں ہلا دیا۔

”پانی کی طرف مت دیکھیں، شہزادی۔ گرمی میں اس طرح کا منظر کچھ اچھا تاثر نہیں چھوڑتا۔“

لیکن جیہ مڑ کر وکیل کی بولتی آنکھوں کا سامنا کرنے سے گھبرا رہی تھی۔ یہ غلطی وہ پہلے بھی ایک بار مسز رائے کے گھر کے تاریک لان میں کر چکی تھی۔ اب وہ یہ غلطی دہرانا نہیں چاہتی تھی۔

ارون رائے نے اسے اپنی بانہوں کے حلقے میں قید کر لیا۔

”میں جانتا ہوں کہ آپ لندن کیوں جا رہی ہیں، شہزادی۔“ اس نے اپنی گرفت مضبوط کی توجیہ کا پورا بدن ارون رائے کی پوروں کے نیچے کپکپا اٹھا۔ ”آپ کے شوہر کا اسکینڈل ان لوگوں کے سامنے پوری طرح عیاں ہو چکا ہے جو برطانوی ہندوستان میں اس طرح کے معاملات میں دلچسپی رکھتے ہیں۔“

اب جیہ کے سامنے اپنے آنسو روکنا ناممکن تھا۔ اس کے آنسو آنٹی رینگ پر سے سمندر کے پانی میں گرتے رہے اور ارون رائے کے ہاتھ اس کے لمبے سیاہ بالوں کو سہلاتے رہے۔

”آپ جنگل میں بے حد خوفزدہ تھیں۔ شہزادی۔“ ارون رائے اپنی سرگوشیوں کا شد اس کے کانوں میں ٹپکا رہا تھا۔ ”آپ اب بھی ایک جنگل میں موجود ہیں۔ ایک اجنبی اور ناخوشگوار جنگل میں لیکن اس بار اپنے حوصلوں کو جوان رکھیے گا۔“

جیہ شرم سے دہری ہو گئی اس نے خود کو ارون رائے کی گرفت سے آزاد کیا اور اپنے کیبن کی طرف بڑھ گئی لیکن ارون رائے کی آواز اسے اب بھی سنائی دے رہی تھی۔

”مجھے امید ہے کہ ہم جلد ہی پھر کسی جنگل میں اکٹھے ہوں گے، شہزادی۔“ وہ بدستور کہہ رہا تھا ”مگر یقین رکھیے گا کہ فطرت انسان کی نسبت کہیں کم بے وفا ہے۔“

سیرپور کے ملازمین نے نہایت تپاک کے ساتھ رٹز ہوٹل میں جیہ کا استقبال کیا تھا۔ مہاراجہ پر تپ ان فرانسیسی طرز کی کھڑکیوں کے پاس موجود تھا جو گرین پارک کی طرف کھلی تھیں۔ جیہ نے جب اس کے چہرے پر پھیلی تاریکی دیکھی تو اس کا غصہ، ہمدردی میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ پریشانی اس کے خوبصورت شوہر کے چہرے پر کچھ اچھی نہیں لگتی تھی۔

جیہ نے خاموشی کے ساتھ وہ تمام رسومات ادا کیں جو ایک راجپوت بیوی اپنے شوہر سے ملنے پر ادا کرتی ہے اور پھر اس کے برابر جا کر کھڑی ہو گئی۔

مہاراجہ نے انگلیوں سے شیشہ بجایا۔ جیسے بات چیت شروع کرنے کا اشارہ دے رہا ہو۔

”اسمی مورے جیسی لڑکی پر پچاس ہزار پاؤنڈ خرچ کرنا ایک جوئے سے کم نہیں لیکن وائسرائے اپنے احکامات سے اسے پابند نہیں کر سکتا۔“ جب وہ بولا تو اس کے لہجے میں کوئی ندامت نہیں تھی۔ ”اور وہ اس بات کو بھی جانتی ہے۔ دوسری جانب اس بات میں بھی کوئی جھوٹ نہیں کہ میں جتنی بیویاں چاہے کر سکتا ہوں لیکن قباحت یہ ہے کہ وہ ہندوستانی ہے اور اس کے بچے سیرپور کے تخت پر اپنا حق جتا سکتے ہیں۔“

جیہ کو لیڈی اینڈ کے قحبہ خانے کی وہ بچی جس نے اسے چائے لا کر دی تھی یاد آ گئی۔

”آپ کے خیال میں شادی کے سلسلے میں وہ آپ پر کس قسم کا اور کتنا دباؤ ڈال سکتی ہے؟“ حکم!

مہاراجہ نے کھڑکی چھوڑ دی اور ایک آرام کرسی پر آ بیٹھا۔ اس نے جواب دینے سے قبل میز پر رکھی شپین کا گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ لیا تو اس پر کھانسی کا ایک طویل حملہ ہوا۔ کچھ دیر وہ اس کھانسی سے لڑتا رہا پھر وہ نڈھال ہو گیا۔

”وعدہ توڑنے کی سزا تو ملے گی، مائی ڈیئر!“ چند ثانیوں بعد اس کی حالت سنبھلی تو اس نے نہایت کمزور سی آواز میں جواب دیا۔ ”تصاویر، خطوط جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس نے عراقی سوداگر سے اپنی متلکی توڑ دی تھی کیونکہ میں نے اس سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔ اس نے مجھے توپ کے دہانے پر کھڑا ضرور کر رکھا ہے لیکن ابھی اسے اسکیٹل اچھالنے کا کچھ زیادہ وقت نہیں مل سکا۔ وائسرائے اپنے والد کی نوے ویں سالگرہ منانے کے لئے لندن سے روانہ ہو چکا ہے اور تم جانتی ہو کہ یہ عیسائی لارڈ ارون کس قدر منحوس آدمی ہے۔ زیادہ

امکان اس بات کا ہے کہ مجھے دستبردار ہونے پر مجبور کیا جائے گا۔ کاش بوڑھی ملکہ دکتوریہ زندہ ہوتی۔ اس سے مجھے اپنی بہت زیادہ حمایت کی توقع تھی۔“

مہاراجہ نے پھر گلاس اٹھایا۔ اس بار اس کے ہاتھ کپکپائے اور شراب چھلک کر اس کے کپڑوں اور فرش پر آگری۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اپنی بیوی کی طرف بڑھا۔

”اب بھلا مجھے کیا کرنا چاہئے؟“ اس نے بھکے ہوئے لہجے میں عجیب سا سوال کیا۔ ”مہاراجہ بیکانیر اور مہاراجہ پیالہ اس معاملے کے ختم ہونے تک مجھے کسی اجلاس میں شرکت کی اجازت دینے کو تیار نہیں ہیں۔ میری خواہش ہے کہ وہ منحوس طوائف کسی حادثے میں مر ہی جائے تو اچھا ہے۔“

جیہ نے خشکیوں نگاہوں سے اپنے آوارہ شرابی شوہر کو گھورا جو بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ اپنی بیوی سے ایک فاحشہ کے بارے میں گفت و شنید کر رہا تھا۔ ایک بگڑا ہوا بچہ، جیہ نے دل ہی دل میں تبصرہ کیا، جو اپنے ماں باپ کا نام ڈبونے پر تلا بیٹھا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس نے اپنی بادشاہت کو ختم کرنے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ جیہ کا بس چلتا تو وہ اسے جنگل بدر کر دیتی۔

”تم کیا کر سکتی ہو؟“

”ممکن ہے ہم ایک عورت ہونے کے ناطے سودے بازی کا کوئی نکتہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں۔“

نئے میں سرخ آنکھوں میں امید کی روشنی جگمگا اٹھی۔ اس نے بے اختیار جیہ کی ساڑھی پکڑ کر اسے اپنے قریب گھسیٹ لیا۔ جب اس کے ہونٹوں نے گلے سے سینے تک کا سفر طے کرنا شروع کیا تو شراب چھلک کر جیہ کی ساڑھی پر جاگری۔ جیہ نے اسے پوری قوت سے پیچھے دھکیل دیا تھا۔ پرتاپ نے حیرت سے اسے دیکھا لیکن شاید وہ کچھ کہنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے“ چند ثانیوں بعد پرتاپ نے ایک طویل سانس لی ”تم اپنے طور پر اس معاملے کو نمٹا سکتی ہو۔“

”مگر ہماری خدمات بن مول نہیں ہوں گی، حکم!“

پرتاپ نے چونک کر اپنی بیوی کو دیکھا لیکن وہاں تو چہرے پر شناسائی کی ذرا سی بھی رمت نہیں تھی۔ پرتاپ نے اپنے تاثرات چھپانے کے لئے رخ موڑ لیا۔ ذرا دیر بعد جب وہ پلٹا تو خود کو پرسکون کر چکا تھا۔ ”اوہ!“ پرتاپ خود کو مکمل طور پر بجمع کر چکا تھا۔ ”وقت“

کس قدر بدل گیا ہے۔ تم تو میری وہ وفادار بیوی ہو جو ہر سے میری درازی عمر کے لئے پوجا میں مصروف رہتی ہو۔“ اس نے ایک بار پھر شراب کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ ”مگر یہ تو بتاؤ کہ تم نے اپنے شوہر کے وقار کی قیمت کیا رکھی، مائی ڈیئر!“

”بااختیار اور برسر اقتدار مہارانی۔“

جیہ کے الفاظ تھے یا بم کا دھماکہ تھا جس نے کمرے کے در دیوار کو ہی نہیں، پرتپ کو بھی ہلا ڈالا تھا۔

”کک.... کیا مطلب....؟“ وہ ہکا کر رہ گیا۔

”ہم چاہتے ہیں کہ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو ارجن کے تخت پر بیٹھنے کی عمر تک کے لئے ہمیں سیرپور کی بااختیار اور برسر اقتدار مہارانی قرار دیا جائے۔“ جیہ نے اپنے شوہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پورے اعتماد سے جواب دیا۔

”طاقت.... قوت۔“ مہاراجہ پرتپ نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا تھا۔ ”تو تمہاری قیت قوت اور اختیارات ہیں۔“

پرتپ کے صحیح اندازوں سے جیہ ڈگمگا کر رہ گئی۔ اس نے اپنی اب تک کی زندگی اختیارات سے متاثرہ فرد کی طرح گزاری تھی لیکن اب وہ ایسے مقام پر فائز ہونے کی خواہش مند تھی جہاں رہ کر وہ ان اختیارات کو خود استعمال کر سکے حالانکہ وہ اس امر سے بخوبی واقف تھی کہ اس کا شوہر ایک جوان اور صحت مند آدمی ہے جو اس کے بیٹے کے بالغ ہونے کے بعد بھی کئی سال زندہ رہ سکتا ہے۔

”جھگوان سے ہماری پارتھنا ہے کہ آپ کو کچھ بھی نہ ہو، حکم!“ جیہ باوجود کوشش کے اپنی آواز کی تلخی کو پوشیدہ نہ رکھ پائی تھی۔

”لیکن ایسا ہو گا۔ ہم نہیں سمجھتے کہ برطانوی ریزیڈنٹ کی ہمدردیاں اس حد تک دراز ہو جائیں گی کہ وہ ایک بچے کو اصلاحوں یا قوم پرستوں سے بچانے میں کامیاب ہو سکیں۔“

مہاراجہ پرتپ نے ذومعنی نظروں سے اپنی بیوی کو گھورا۔ ”ہم پہلے ہی جانتے ہیں کہ سیرپور کا آئندہ ریزیڈنٹ کس نوعیت کا ہو گا۔ سر اکبر نے مجھے گذشتہ ہفتے ایک ٹیلی گرام روانہ کیا ہے۔ میجر جیمس آہرن کو سیرپور کا نیا برطانوی ریزیڈنٹ مقرر کیا گیا ہے۔“ پرتپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم اپنی زندگی، مجھ سے زیادہ بہتر انداز میں ترتیب دے سکتی ہو، مائی ڈیئر!“

جیہ کو ایک جانب ہندوستانیوں سے کچھ کھچ بھرے لندن میں اسمی مورے کا انتظار تھا۔

دوسری جانب وہ اصلاحیوں اور ہندو بادشاہوں کے درمیان ہونے والے پروپیگنڈے کی جنگ کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

مہاراجہ پٹیالہ شمالی ہندوستان کا مرکزی ترجمان تھا۔ پورے لندن میں اس کی جنسی شش، پر تعیش انداز رہائش، پولو اور کرکٹ میں اس کی ناقابل یقین کارکردگی اور نشانہ بازی، ہر چہ تھے۔ مہاراجہ بھوپندر نے بارہا لندن کے مختلف ٹاؤن ہاؤز، ڈرائنگ رومز اور قلمروں میں اس بات کا برملا اظہار کیا تھا کہ برطانوی پریس اور اصلاحی ہندوستانی بادشاہوں کے خلاف من گھڑت کہانیاں بنا رہے ہیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

مگر اس کے برعکس، دوسری جانب جیہ، ہندوستانی بادشاہوں کے خلاف افواہوں کے باب سے پریشان تھی۔ ہر طلوع ہونے والا دن اپنے جلو میں نئے نئے ہنگامے اور افسانے لے لے کر نمودار ہوتا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان تھی کہ اتسی مورے اپنی راتیں راتوں رات کہانیاں، بوڑھے گدھوں کی طرح منڈلاتے اخبار نویسوں کو فروخت کر دے گی۔ اور وہ اس شائع کر کے اپنے عوام کی توجہ ملک کی بگڑتی ہوئی معاشی صورت حال سے ہٹانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

جب مہاراجہ پرتاپ نے اسے بتایا کہ اتسی مورے نے لندن آنے کے بجائے براہ راست نیویارک جانے کا فیصلہ کیا ہے تو جیہ بھی بحری جہاز کے ذریعہ امریکہ روانہ ہو گئی۔ وہ جاتی تھی کہ اتسی مورے کے ساتھ معاملات طے کر کے فوری طور پر لندن آجائے جہاں ہی ہند کے مستقبل کی جنگ پورے زور و شور سے جاری تھی۔

بلند و بالا عمارتوں کے اس جگمگاتے شہر میں جیہ کو سوائے بے آرامی کے کچھ نہیں ملا۔ اتسی مورے کی جانب سے رابطے کی منتظر رہی جبکہ اس عرصے میں چھوٹا ڈنگرا نیویارک زندگی دکھا کر جیہ کا دل بہلانے کی کوششوں میں مصروف رہا۔

جیہ بہت سی جگہوں پر اپنے لباس سے شرمندہ سی ہو جاتی تھی لیکن ایسے موقعوں پر ہونا ڈنگرا اس کے کان میں سرگوشیوں کے ذریعے اس کی ہمت بندھاتا اور بتاتا کہ وہ اپنا دھار صحیح طور پر ادا نہیں کر رہی۔ یہ سن کر وہ ڈانس فلور پر چلی جاتی اور اپنی ساڑھی پر اس کی چھٹی ہوئی نگاہوں کو نظر انداز کر کے رقص میں مصروف ہو جاتی۔

والڈ ورف اسٹور یا ہوٹل میں چاندنی نے ہوٹل کی ملازموں کے ساتھ دوستی گانٹھ لی۔ ایک سہ پہر، نیویارک کی مصروف سڑکوں کے شور سے بیس منزلیں بلند ہوٹل میں چاندنی نے اپنی ماکن کو بتایا کہ ہوٹل کی ایک سیاہ فام ملازمہ اسل مہارانی سے ملنے کی خواہش

مند ہے۔

جیہ نے مسکراتے ہوئے اس سیاہ فام لڑکی کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔ وہ ہال کی ہی عمر کی تھی۔ اس کے چہرے پر امریکیوں کی روایتی شوخی تھی۔
 ”میں آپ کے لئے ایک تحفہ لائی ہوں، میڈم!“ سیاہ فام لڑکی نے ایک کتبہ ہال کی طرف بڑھائی۔ ”یہ امریکہ کی یادگار ہے۔ اس کتبہ کا نام دی ڈارک پر نر ہے اس میں دکھایا گیا ہے کہ آپ ہندوستان میں اور ہم امریکہ میں کس طرح گوروں سے اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہے ہیں۔“

جیہ بہت دیر تک اس سے باتیں کرتی رہی۔ امریکہ کے بارے میں پوچھتی رہی۔ یہاں بھی گوروں اور کالوں کے درمیان جنگ جاری تھی۔ لڑکی نے پوری تفصیل کے ساتھ اس جنگ کا احوال جیہ کے گوش گزار کیا تھا۔

جیہ اطمینان سے بستر پر لیٹ کر دی ڈارک پر نر کے پلاٹ کا مطالعہ کرتی رہی۔ یہ الہا مقامی شہزادی کی کہانی تھی جس نے ایک سیاہ فام کے بچے کو جنم دیا تھا۔ جب بچہ مہاراجہ کے فرائض انجام دینے کے قابل ہو گیا تو شہزادی نے نیگرو سے شادی کر لی اور بادشاہت کا خلاف ایک عالمگیر تحریک شروع کرنے کے لئے دنیا کے دورے پر نکل کھڑے ہوئے۔ جیہ کی تنظیم کے نام پر بنے بغیر نہ رہ سکی۔ تنظیم کا نام گریٹ کونسل آف دی ڈارک پینل ا مگر جیہ کی ہنسی میں ایک تلخی تھی وہ سیاہ جھنڈے اسے یاد آ گئے تھے جنہیں لہراتے ہوئے برطانوی ہندوستان نے سائن کمیشن سے ملاقات کی تھی۔ مہاراجہ پٹیل ان برطانوی مرد اور عورتوں کے ناز و خیرے اٹھانے میں مصروف تھا جو اس کی بادشاہت کو قائم و دائم رکھنے کے لئے بلٹر کمیشن پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر سکتے تھے۔ صرف یہی نہیں، بادشاہت بچانے کے لئے ایک بیوی کو داشتہ سے ملاقات پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو جیہ نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری جانب خاموشی ایک طویل وقفہ تھا۔ جیہ کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ اتسمی مورے کا فون ہے۔
 ”میں آپ کو اس معاملے میں ملوث نہیں کرنا چاہتی۔ یور ہائی نیس۔“ بلاخر اتسمی جھپٹتے ہوئے بات شروع کی۔

جیہ اپنی آواز اور لہجے کے کرب کو چھپانے میں کامیاب ہو سکی تھی۔ ”ہم ملوث؟“
 ”میں مورے۔ تم بتاؤ ہماری ملاقات کب اور کہاں ہو سکتی ہے؟“
 ”میں ابھی آ رہی ہوں، یور ہائی نیس۔“

جیہ نے ریسیور رکھ دیا۔ اس کے دل نے پسلیوں سے ٹکرانا شروع کر دیا تھا۔ اسکول کی طالبات کی طرح چہلیں کرتی دو ملازمتیں دروازے پر نمودار ہوئیں۔ چاندنی اورا جبکہ کر جیہ کو تعظیم دی جبکہ اس کی سیاہ قام دوست نے ماتھے پر ہاتھ لے جا کر

”ہمارا جے آف ڈنگرا“ باریابی کے لئے منتظر ہیں۔ یور ہائی نیس۔“ چاندنی نے جیہ کو آگاہ کیا۔

بے اختیار جیہ کے حلق سے اطمینان کی ایک طویل سانس خارج ہو گئی۔ یہ بہتر تھا کہ لا ڈنگرا، اسی مورے سے ملاقات کے دوران وہاں موجود رہے۔ وہ یوں بھی چھوٹے راپر بہت زیادہ اعتماد کرتی تھی اس لئے اسے اطمینان تھا کہ جہاں کہیں وہ کمزور پڑے گی لا ڈنگرا معاملے کو سنبھال لے گا۔

ڈنگرا اندر داخل ہوا تو جیہ کے دل کی دھڑکن معمول پر آتی چلی گئی۔ آغاز رسمی باتوں ہوا اور پھر جیہ نے اسے اس معاملے سے آگاہ کیا جو اس کے اور پرتپ کے مابین طے تھا۔

”اس نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ اگر ہم اسی مورے کو شادی کے لئے بلیک میل کرنے سے روکنے میں کامیاب ہو گئے تو ہمیں سیرپور کی بااختیار اور برسر اقتدار مہارانی بنا گا۔“

چھوٹے کی بڑی بڑی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”میں تمہیں اس شاندار سودے بازی پر دلی ک باد پیش کرتا ہوں، شہزادی۔“ چھوٹا ڈنگرا واقعی خوش تھا۔ ”تمہاری ڈور بیل بج رہی ہے۔ میرے خیال میں دروازے پر اسی مورے ہے جب تک تم اس سے فارغ نہیں ہو۔ میں اندرونی کمرے میں انتظار کرتا ہوں۔“

جیہ کے ہاتھ پسینے سے شرابور ہو رہے تھے۔ اس نے اپنے بھیگے ہوئے ہاتھوں سے زہ کھولا تو سامنے ہی نیم ہندوستانی خوب صورت لڑکی اپنے ہونٹوں پر قاتل مسکراہٹ نے کھڑی تھی۔

جیہ کو اس میں بے پناہ اعتماد دکھائی دیا۔ وہ ایک لمحے میں ہی سمجھ گئی کہ اسی جیسی نادر لڑکیاں سیرپور کے مہاراجہ ہی کو نہیں، انگلستان کے بادشاہ تک کو بلیک میل کر سکتی

جیہ نے اپنی مہمان کو کلاؤچ پر بٹھایا۔ لڑکی نے بات چیت کا آغاز موسم کے بارے میں

مختصر سے جملوں سے کیا تھا۔ اور پھر بلا کسی تمہید کے اپنی تمام تر عزت اور وقار کو پس پشت ڈال کر وہ اصل موضوع پر آگئی۔

”انہوں نے مجھے رقم کی پیش کش کی ہے، یور ہائی نیس“ اس نے براہ راست پر تپا نام نہیں لیا تھا۔ ”لیکن بھلا میں رقم کا کیا کرتی؟ قحبہ خانہ کھولتی؟“

”مگر یہ دولت تمہیں خود مختار ضرور بنا دیتی۔“

”اور اگر میں ان کی بیوی بن جاتی تو دولت سے کہیں زیادہ حاصل ہوتا مجھے، مجھے حقوق مل جاتے، اختیارات آ جاتے میرے پاس۔۔۔۔۔“

”تم غلطی پر ہو مس مورے۔“ جیہ نے نفی میں سر ہلایا ”اگر ہمارے پاس اختیارات ہوتے تو ہم یہاں بیٹھ کر تم سے بات چیت نہ کر رہے ہوتے، بلکہ۔۔۔۔۔ اس نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”میں آپ کے شوہر کو پریشان نہیں کرنا چاہتی، شہزادی۔“ اسی نے فوراً وضاحت کی۔

”میں تو صرف اپنے ماضی کا صفایا چاہتی تھی۔ اسے بھلانا چاہتی تھی اور انہوں نے اس مقصد کے لئے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔“

”کیا تم کوئی خاندان چاہتی ہو؟“

”نہیں، نہیں“ لڑکی نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا۔ ”حقیقت یہ ہے کہ میں صرف بیوی نہیں بننا چاہتی۔ میرا مقصد تو فلموں میں آنا ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ میں ایک بہت بڑی اداکارہ بن سکتی ہوں۔“

جیہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”ہمارے ایک دوست یہاں موجود ہیں۔“ اس نے اسی کو آگاہ کیا۔ ”ہم انہیں بلاتے ہیں ممکن ہے اس سلسلے میں وہ تمہاری مدد کر سکیں لیکن اس امداد اور تعاون کے بدلے میں تمہیں وہ سب کچھ واپس کرنا ہو گا جو ہمارے شوہر نے تمہیں دیا ہے۔“

”لبوسات اور زیورات بھی؟“

”نہیں، مس مورے۔ وہ تو ہمارے شوہر نے تمہیں تحفے میں دیئے ہوں گے۔ ہماری مراد ان کے خطوط اور تصویروں سے ہے۔“

چھوٹا ڈنگرا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے اسی کو مورے کے برابر والا صوفہ سنبھالا تھا بیٹھے ہی اس نے دوستانہ انداز میں اسی کو مورے کا گھٹنا تھپتھپایا۔

”خاصی مشہور ہوتی جا رہی ہو، مس مورے۔“ وہ خوش دلی سے بولا۔ ”کبھی دعائیں

کبھی بدعائیں لیکن خیر۔ یہ تو مذاق ہے تم بتاؤ کہ تم نے اپنے لئے کیا شرائط منتخب کی ہیں۔ اسکرین ٹیسٹ؟ آغاز کے طور پر ایک چھوٹا سا کردار؟

لڑکی کے خوبصورت نقوش پر حرص و ہوس غالب آگئی۔ ”میں جینے کے لئے بھی کچھ چاہتی ہوں۔“ اس نے چھوٹے ڈنگرا کو بتایا ”ذاتی طور پر تو میں بہت ہی غریب سی لڑکی ہوں جو اس کی خواہشوں پر ناپا کرتی تھی۔“

”اور اپنے اس کردار میں پوری طرح کامیاب رہی ہو۔“ ڈنگرا نے طنز کیا لیکن اس کے طنز کا اسے کسی اثر نہیں ہوا تھا۔ ”کیا ہم اسے کسی الاؤنس کا نام دیں، جو تمہیں اس وقت تک دیا جائے جب تک تم ہالی وڈ میں قدم جمانے میں کامیاب نہیں ہو جاتیں؟“

”میں نہیں چاہتی کہ کوئی میری کلکتہ کی زندگی اور میڈم اینڈ کے بارے میں جانے۔“ اسے مورے نے جواب دیا۔ ”کلکتہ کے مختلف قبہ خانوں سے تعلق رکھنے والی کم از کم تین دوسری لڑکیاں اس وقت ہالی وڈ اشار ہیں۔ میں بھی ان جیسی بننا چاہتی ہوں۔“

رقاصہ کو اس یقین دہانی کے ساتھ رخصت کیا گیا کہ اگلے روز اس سے ملاقات کی جائے گی جو نئی وہ روانہ ہوئی چھوٹے ڈنگرا نے اپنے برفی کيس سے کانڈات کا ایک پلندہ نکال لیا۔

”یہ ایک منگنا سودا ہے، شہزادی۔“ اس نے جیہ کو آگاہ کیا۔ ”اگر تمہیں یقین ہے کہ تمہیں مہارانی بنانے کے سلسلے میں پرتاپ اپنا وعدہ پورا کرے گا، تب تمہیں یہ سودا اپنی جیب سے کرنا ہو گا۔ کم از کم میری تجویز یہی ہے۔ اور میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ بچائی ہوئی دولت استعمال کرنے کا یہ بہتر وقت ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ امریکہ میں تمہاری کچھ جائیدادیں اور اثاثے فروخت کر دیئے جائیں۔“

اس نے ایک کانڈہ دستخط کے لئے جیہ کو تھما دیا۔ ”ویسے تو اس بات کو یہاں پاگل پن سمجھا جاتا ہے۔ اشاک مارکیٹ ایک ایسا بازار ہے جہاں بکنے کے لئے اشیاء نہیں ہوتیں۔ یہاں صرف خواب بکتے ہیں۔ میرے خیال میں تمہاری فلوریڈا کی زمین کی فروخت سے مس مورے کی قیمت بہ آسانی ادا ہو جائے گی۔“

جیہ نے کانڈہ پر دستخط کر کے چھوٹے ڈنگرا کو واپس کر دیا۔ ”اور اب شہزادی! میں سوچ رہا ہوں کہ فلم انڈسٹری میں تمہارے معاملات وسیع کر دیئے جائیں۔“

جیہ نے حیرت سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”حیران ہونے کی ضرورت نہیں، شنزادی۔“ چوٹا ڈنگرا مسکرایا۔ ”ہلی وڈ میں تمہاری سرمایہ کاری موجود ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو میں بھلا مس مورے کو اسکرین ٹیسٹ کی پیشکش کر سکتا تھا؟“

جیہ نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔
ہلی وڈ روانہ ہونے سے قبل لالچی رقاصہ نے مہاراجہ پر تپ کے تمام خطوط اور تصاویر جیہ کے حوالے کر دیں۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے واقعی اپنے ماضی سے جان چھڑانا چاہتی ہو۔
جب چاندنی کو علم ہوا کہ وہ لوگ لندن واپس روانہ ہو رہے ہیں تو وہ مارے خوشی کے چلا اٹھی تھی۔

”ہمیں یہاں ایک مہینہ ہو گیا ہے، حکم!“ اس نے اپنی جلد کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔
”اپنے حبشی دوستوں کے ساتھ رہ رہ کر میرا بھی رنگ کالا ہو گیا ہے یہ سیاہی اتر جائے گی تا حکم؟“

جیہ نے محض مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔
مہاراجہ پر تپ کے ہوٹل سوٹ کا ڈرائنگ روم حکمرانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔
پٹیلہ کے مہاراجہ نے اٹھ کر ڈنگرا کا استقبال کیا تھا۔
”بٹلر رپورٹ کچھ ہی دیر قبل جاری ہوئی ہے۔“ مہاراجہ نے آنے والے کو بتایا۔
”برطانویوں نے ہمیں کچھ بھی نہیں دیا، چھوٹے۔“

جیہ نے اپنے کمروں کی طرف جاتے ہوئے اس جنوبی ہندوستانی بادشاہ کو ہاتھ جوڑ کر منتے کہا۔ مہاراجہ پٹیلہ نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی کیونکہ ابھی تک اس کا غصہ فرو نہیں ہوا تھا۔

”برطانوی راج نے اصلاحیوں کو بالواسطہ طور پر ہماری ریاستوں میں ایجنسی ٹیشن شروع کرنے کی دعوت دی ہے۔“
اظہار ناراضگی کے لئے بلند ہونے والی آوازیں جیہ اپنے کمرے کے بند دروازوں کے باوجود سن رہی تھیں۔

”انگلینڈ ہمیں جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتا ہے۔“ مہاراجہ پٹیلہ بدستور جھاگ اڑا رہا تھا۔
”لیکن ذرا یہ تو بتاؤ کہ اصلاحیوں کو ہماری حدود میں مضحک کرنے پر سلطنت برطانیہ کس قدر دولت خرچ کرے گی۔“

”اب انگریز ہمارے معاہدوں سے پہلو تہی کریں گے اور کہیں گے کہ یہ ہمارے عوام

لواٹھ ہے“ ایک اور مہاراجہ نے اپنے ناراض ساتھی کی ہاں میں ہاں ملائی۔
جیہ دروازے سے گلی کھڑی تھی اس لئے جب کسی نے دھکیل کر دروازہ کھولا تو وہ بے
ار چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔ آنے والا مہاراجہ پر تپ تھا۔ ”کیا تم وہ سب کچھ لے آئیں“
کی مجھے ضرورت تھی؟“ اس نے بغیر کسی تمہید کے دریافت کیا۔

جیہ نے اپنے زیورات کا بکس اپنے شوہر کو تھما دیا۔ پر تپ نے بے تابی سے بکس کھولا
ندر موجود کاغذات اور تصاویر کا جائزہ لینے لگا۔

”مجھے امید ہے کہ تم نے تصاویر دیکھنے کی کوشش نہیں کی ہوگی!“ پر تپ نے انتہائی
ا سے کہا۔ اس کے چہرے پر شرم کی ذرا سی رمت تک نہیں تھی۔

اس نے اپنی جیب سے کچھ نکال کر ہوا میں لہرایا جیہ کو بھاری لفافے پر وائسرائے کی
صاف دکھائی دے رہی تھی۔ ہنستے ہوئے مہاراجہ پر تپ نے لفافہ بیڈ پر پھینکا اور کچھ
بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔

جیہ کچھ دیر تو بیڈ پر پڑے لفافے کو گھورتی رہی پھر کپکپاتے ہوئے خود بھی بیڈ پر ڈھیر ہو
اس نے لفافہ چاک کیا اور اندر رکھی ہوئی دستاویزات نکال لیں۔

اسے سیرپور کی باختیار اور برسر اقتدار مہارانی کی تقرری کا فرمان جاری کر دیا گیا تھا۔
وہ جیت گئی تھی۔

اس نے اپنے شوہر کو شکست فاش دی تھی جس نے آج تک ایک بیوی کی حیثیت سے
اس کے حقوق نہیں دیئے تھے اور نہ ہی شوہر کی حیثیت سے اپنے حقوق پورے کئے

آج سے وہ سیرپور کی مہارانی تھی۔

باختیار اور برسر اقتدار مہارانی۔

اس کا جی چاہا کہ وہ اپنی فتح پر دل کھول کر قہقہے لگائے۔ اپنی خوشی کا اظہار کرے لیکن
رے کمرے سے آنے والی آوازیں اسے مسلسل بے چین کئے دے رہی تھیں۔

اس وقت جبکہ ہندوستان کے مضبوط ترین بادشاہ، برطانیہ کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کی
ریاں کر رہے تھے اور اصلاحیوں کے ہاتھوں ان کی شکست واضح اور صاف دکھائی دے رہی
’وہ..... ایک کمزور اور ناؤاں عورت اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں اس سلطنت کو اپنے
ہ کے لئے کیسے سنبھال سکے گی؟

ہندستان واپس آتے ہوئے دوران سفر جیہ نے زیادہ شد و مد کے ساتھ مہاراجہ پر تپ

کی درازی عمر کی دعا کی تھی۔ اس طرح کی پراگتھنا پر تپ کی دلہن کی حیثیت سے سیر ہونے کے بعد اس نے کبھی نہیں کی تھی۔ اس کے باوجود کہ وہ جانتی تھی کہ سیر پور پہنچ کر وہ ایک باز پھر دھتکاری ہوئی اور ٹھکرائی ہوئی بیوی ہو گئی مگر اسے پر تپ کی زندگی عزیز تھی۔ ہر بار وہ جب بھی بالائی عرشے پر گئی اسے ہندوستانیوں کا گروپ بلٹر رپورٹ پر بحث تمحیص میں الجھا دکھائی دیا۔ اس روز بھی اسی طرح کا مباحثہ جاری تھا۔ ایک قوم پرست لہڑا نے جیہ کو دیکھا تو وہ اپنے ساتھیوں سے الگ ہو کر اس کی طرف بدھا جیہ نے اسے الٹا جانب آتے دیکھا تو بے دم ہو کر کرسی پر گر پڑی۔ وہ پریشان تھی کہ وہ اپنے بیٹے کے تختہ ان قوم پرستوں کی دست برد سے کیسے بچائے گی۔

ارون رائے اس کی ڈیک چیز کے برابر آ کر رک گیا۔

”تمہارے اصلاحی دوست بلٹر کمیشن کی رپورٹ پر اپنی فتح کا جشن منا رہے ہوں گے؟“ جیہ نے تلخی سے پوچھا۔

وہ مسکرا دیا۔ ”نہیں شنزادی۔“ وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ”آپ کے خیال میں برطانوی نے کسی کو کچھ دیا ہے؟ ہر گز نہیں۔ ہم سب خلی ہاتھ واپس جا رہے ہیں۔ اس وقت صورت حال جو بھی ہو اس سے بحث نہیں، لیکن میری یہ بات یاد رکھئے گا کہ اگر اصلاحی تحریک کامیاب ہو گئی تو بھی سلطنت، عوام کے حوالے نہیں کی جائے گی۔“

”تب یہ سلطنتیں کہاں جائیں گی؟“

”یہ سب تاج برطانیہ میں ضم ہو جائیں گی، شنزادی“ ارون رائے نے پرسوج انداز میں جواب دیا۔ ”نہ بالیر رہے گا نہ سیر پور۔ بس سلطنت برطانیہ کے نقشے میں چند لائنوں اضافہ ہو جائے گا۔ میں نے آپ کو متنبہ کیا تھا کہ یہ ایک خوشگوار اور بد صورت جنگ ہے۔“

سیر پور میں ہندو دیو مالا نے تاریخ پر ایک پردہ سا تان دیا تھا۔ دیوالی کی تقریبات کے دوران پجاری روزانہ کامنی مندر میں مہا بھارت کے بھجن گاتے اور وہاں موجود لوگوں کے اطمینان کے لئے قدیم سیر پور کے بادشاہوں کے نام دہراتے۔

اسی مورے سے جان چھوٹ جانے کے بعد پر تپ کے رویے میں قدرے تبدیلی گئی تھی۔ صبح کے وقت جیہ پوجا سے فارغ ہوتی تو تین سالہ پرنس ارجن کو اپنے والد کے ساتھ چل قدمی میں مصروف پاتی۔ ننھے ارجن کا سر بہ مشکل مہاراجہ کے پولو بوٹوں کے سرے تک پہنچتا تھا۔ اس کے بعد مہاراجہ پولو فیلڈ میں چلا جاتا اور ایک اتالیق جس کے

پرتاپ کو گھڑ سواری کرائی تھی، ارجن کو گھوڑے پر سوار کر کے میدان میں لے آتا۔ ایک گھنٹے بعد ننھا شنزادہ محل واپس آ جاتا اور جیہ کو خبر ملتی کہ مہاراجہ اپنے نئے ہوائی جہازوں میں سے کسی ایک کی ٹیسٹنگ کے لئے ایئر فیلڈ چلا گیا ہے۔

سر ہنری کوزی واپس انگلینڈ روانہ ہوا تو صورت حال کچھ اور بہتر ہو گئی۔ اب جیہ اکثر مہاراجہ کو اپنی اسٹڈی میں مصروف دیکھتی جہاں وہ گھنٹوں کے بل بیٹھا پرنس ارجن کو ٹیکوں کی لڑائی کے بارے میں بچوں کی کہانیاں یا کیمبرائے کی لڑائی کی تفصیلات بتا رہا ہوتا۔

شروع شروع میں تو وزیر اعظم، نئے برطانوی ریزنڈنٹ سے کچھ مطمئن تھا لیکن پھر اس کا یہ اطمینان پریشانی میں بدلتا چلا گیا اور آخر کار ایک دن وہ ہندوستان کے بارے میں اس انگریز کے خیالات کے سلسلے میں جیہ سے سوالات کرنے پر مجبور ہو گیا۔

”ہم میجر آبرن کو اپنے بچپن سے جانتے ہیں، سر اکبر۔“ جیہ نے سیرپور کے وزیر اعظم کو بتایا۔ ”ہم نے ہمیشہ اسے ہندوستانیوں کا ہمدرد پایا ہے۔“

”وہ سلطنت کا عروج تھا حکم!“ سر اکبر نے جواب دیا۔ ”میرا مطلب ہے کہ آپ کے بچپن کے دنوں میں کوئی ہندوستانی، کسی سفید فام کے طرز عمل پر معترض نہیں ہو سکتا تھا لیکن اب صورت حال خاصی مختلف ہے اس وقت برطانوی ہندوستان سائن کیشن کے خلاف ہونے والے مظاہروں اور احتجاج کی زد میں ہے اور اگر میجر آبرن نے یہ سن لیا کہ ہندوستانی حکمران، برطانوی راج کے خلاف افواج تیار کرنے کے لئے....“

”عداری؟“ جیہ نے اپنے دونوں ہاتھ یوں منہ پر جمائے جیسے وہ اس لفظ کی آوازی سے خوفزدہ ہو۔

”ہاں، مہارانی صاحبہ!“ سر اکبر نے جیہ کے بدترین اندیشوں کی تصدیق کی۔ ”بٹلر کیشن کی رپورٹ درحقیقت شہی ہندوستان کے لئے ایک ڈھکی چھپی دھمکی ہے اور اب جبکہ سلطنت برطانیہ قدرے کمزور ہو چلی ہے بعض حکمرانوں نے اس پر ضرب لگانے کی منصوبہ بندی کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جنگ سے وہ برطانوی راج اور اصلاحی تحریک، دونوں کو شکست دے سکتے ہیں۔“

”کیا ہمارے شوہر نے بھی ان مباحثوں میں حصہ لیا ہے؟“ جیہ نے دریافت کیا۔

سر اکبر نے اثبات میں سر ہلایا تو جیہ کو پہلی بار احساس ہوا کہ جب وہ خود سیرپور کی بااختیار مہارانی بننے اور اپنے شوہر کی پوزیشن بچانے کی لڑائی میں مصروف تھی اس کے شوہر نے اپنے آپ کو ایسے خطرناک منصوبوں میں ملوث کر لیا تھا کہ جیہ کے اپنے بیٹے کے

مستقبل کے تحفظ کے اقدامات بے معنی سے ہو کر رہ گئے تھے۔

”وہ لوگ ایک دوسرے سے قریبی رابطہ رکھے ہوئے ہیں۔“ سر اکبر جیہ کو بتا رہا تھا۔
 ”مہاراجہ کو خطرے کا احساس تو ہے لیکن وہ کبھی سلطنت برطانیہ کے خلاف لڑیں گے نہیں،
 ابھی کچھ بگڑا تو نہیں لیکن اگر ہماری خفیہ فائلیں منظر عام پر آ گئیں تو یہ سمجھنے میں دیر نہ
 لگے گی کہ مہاراجہ بھی باغیانہ سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔“

جیہ نے ایک طویل سانس لی۔ وہ اندر سے خوفزدہ تھی لیکن اس نے اپنا خوف چہرے پر
 نہیں آنے دیا تھا۔

”لیکن یہ منصوبے کبھی رو بہ عمل نہیں ہو سکیں گے، مہارانی صاحبہ“ سر اکبر نے ابھی
 اپنی بات ختم نہیں کی تھی۔ ”اگر ہندوستانی حکمران کچھ کرنے کے قابل ہوتے تو ہندوستان اور
 خود ان کا حال ایسا نہ ہوتا جو آج ہے۔ وہ میدان جنگ کی سختیاں جھیلنے کے بجائے فیڈریشن
 تشکیل دینے کو ترجیح دیں گے۔“

”اور اگر برطانوی راج کو ہمارے شوہر کے ملوث ہونے کے بارے میں خبر ہو گئی تو؟“
 جیہ نے خدشہ ظاہر کیا۔ ”اگر انہیں اس خط و کتابت کی نقول مل گئیں تو کیا....؟“ اس نے
 جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

”یہ کبھی نہیں ہو گا، مہارانی صاحبہ!“ وزیر اعظم دھیمے سے انداز میں مسکرایا۔ ”جب
 تک انگریز خود سیر پور کے خلاف اعلان جنگ نہ کر دے۔ ہماری خفیہ ترین فائلیں پردہ پیلس
 میں رکھی جاتی ہیں اور یہ بات آپ بھی جانتی ہیں کہ سلطنت برطانیہ کا بوئے سے بڑا عمل دار
 بھی شہابی ہندوستان کے حرم میں داخل نہیں ہو سکتا۔“

جنوری میں جیمس آبرن نے مہاراجہ سیر پور کو سلطنت برطانیہ کے سفیر اور نمائندے
 کی حیثیت سے اپنی اسناد پیش کیں۔ اس تقریب میں سفارتی آداب کا خاصا خیال رکھا گیا تھا
 پھر بھی جیہ دربار ہال میں موجود ریزیڈنٹ اسٹاف کے چہروں پر پھیلے ہوئے تباہ کو محسوس کئے
 بغیر نہ رہ سکی تھی۔

تقریب کے انتہائی رسمی انداز کو پس پشت ڈالتے ہوئے مہاراجہ پرنسپ نے اپنی گدی
 سے اٹھ کر آبرن سے ہاتھ ملایا۔ ورزشی جسم کے حامل خوبصورت جوڑے نے مسکراتے
 ہوئے معاف کیا تو جیہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ کیا آبرن اس کے بھائی کی طرح اس کے
 شوہر کا بھی قابل اعتماد دوست ثابت ہو گا یا نہیں۔ حکمران کی کمر میں جھولتی ہوئی تلوار اور
 ریزیڈنٹ کے سینے پر آویزاں تمغے اسے یہ احساس دلا رہے تھے کہ ان میں سے ایک مہاراجہ

ہے اور دوسرا سفیر لیکن دونوں ہی جنگ کو منطقی انجام قرار دیتے ہیں۔

تقریب کے اختتام پر مہاراجہ اور ریزیڈنٹ، اسٹڈی میں چلے گئے۔ موضوع بحث پولو کے گھوڑے تھے لیکن ریزیڈنٹ اسٹاف اور سیرپور کابینہ کے ارکان نے اپنی اپنی جگہوں سے جنبش کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ ان لوگوں کے چہروں پر ایک دوسرے کے لئے چھپی عداوتوں کو دیکھ کر جیہ کو یہ اندازہ لگانے میں کسی وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا کہ جیس آبرن اب وہ نوجوان نہیں جو گول مینار کے سائے میں ٹکا کے ساتھ کرکٹ کھیلا کرتا تھا بلکہ اب وہ سلطنت برطانیہ کا نمائندہ ہے جو سیرپور کو تباہ کر سکتا ہے۔

ایک ہفتے بعد حکمران، برطانوی ریزیڈنٹ کے دورے پر گیا۔ کارشہر کی بھیڑ بھاڑ سے نکل کر ایک پہاڑی کی ڈھلوان کو جانے والے درختوں میں گھری سڑک پر آگے بڑھی تو جیہ اپنے شوہر کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔ سڑک کے ایک جانب دریائے برہم پڑا تھا جو ہمالیہ کی ترائیوں تک پھیلا ہوا تھا جبکہ دوسری جانب تاحد نظر سرسبز و شاداب کھیت دکھائی دے رہے تھے جن کا سلسلہ بنگال کے میدانوں تک چلا گیا تھا۔

کار ایک آہنی گیٹ سے گزری جس پر سلطنت برطانیہ کا نشان کندہ تھا۔ گیٹ کی دوسری جانب ایک وسیع باغ تھا جس کی مناسب انداز میں دیکھ بھال نہ ہو پاتی تھی۔ اگر مرکزی عمارت پر یونین جیک نہ لہرا رہا ہوتا تو دیکھنے والے کبھی اس عمارت کو یکے بعد دیگرے تین برطانوی ریزیڈنٹس کی رہائش گاہ قرار نہ دیتے۔

جیس آبرن، مہاراجہ کے استقبال کے لئے کپاؤنڈ میں ہی موجود تھا۔ وہ انہیں سیدھا ایک ایسے کمرے میں لے گیا جو پھولوں سے منک رہا تھا۔

”ہم تمہارے اصطلیل دیکھنا چاہتے ہیں، آبرن۔“ مہاراجہ پر تپ نے رسمی بات چیت کے بعد ریزیڈنٹ سے کہا۔

ریزیڈنٹ اور مہاراجہ لان پر سے ہوتے ہوئے اصطلیل کی طرف بڑھے تو جیہ، سر اکبر کے ساتھ کھڑی ایک کھڑکی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”کیا برطانوی ریزیڈنٹ اپنی خفیہ فائلیں یہاں رکھتا ہے؟“ اس نے سرگوشی کی انداز میں دریافت کیا۔

”جی مہارانی“ سر اکبر کی آواز بھی بلند نہیں تھی ”لیکن فائلیں اور خفیہ انداز بہت جلد ماضی کا حصہ بننے والے ہیں۔ آج صبح ہی چیمبر آف پر نرنے شاہی ہندوستان میں اصلاحات کی ضمانت دے دی ہے اور اصلاحیوں نے اپنا ایجنڈیشن ختم کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ دہلی

سے موصول ہونے والے پیغامات میں مجھے بتایا گیا ہے کہ ہر کوئی ممکنہ آزادی کے نشے میں دمت ہے۔“

جیہ کے چہرے پر پریشانی ابھری تو اس نے اپنی بات کی مزید وضاحت کی۔ ”برطانوی راج کا کہنا ہے کہ خود مختاری کے راستے کی آخری رکاوٹ ریاستوں اور برطانوی ہندوستان کے درمیان سوچ کا تفاوت تھا۔ اب وائسرائے کی ذاتی دلچسپی سے اس تضاد کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ جونہی سائنس کیشن اپنی رپورٹ جاری کر دے گا۔ پارلیمنٹ، ہندوستان کو خود مختاری کی پیش کش کر دے گی۔ ذرا تصور تو کریں، مہارانی! ہم دہلی میں سلطنت برطانیہ کو اقتدار منتقل کرتے ہوئے دیکھیں گے۔“

مہاراجہ پرتاپ اور جیمس آبرن کمرے میں داخل ہوئے۔ وزیر اعظم ان کی طرف مڑا۔ اس کا ہاتھ اب تک فضا میں ہی لہرا رہا تھا۔ دونوں کو اچانک دیکھ کر وہ پریشان سا ہو گیا۔ ”ہوا میں کیا تلاش کر رہے ہو، سر اکبر؟“ مہاراجہ پرتاپ نے سوال کیا۔

”میں ہر ہائی نہیں کو بتا رہا تھا کہ اگر سائنس کیشن اپنی بات پر قائم رہے اور فیڈریشن کی تشکیل کر دے تو ہندوستان بھی کینیڈا اور آسٹریلیا کی طرح نیم خود مختار ملک بن جائے گا۔“ وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ ”اور انگریز لوگ ہمیں کزن کہنا شروع کر دیں گے۔“

”کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں ایک بار پھر چیمبر آف پرنسز کے بور سیشن میں شرکت کے لئے دہلی جانا ہو گا؟“ مہاراجہ پرتاپ نے قدرے ناخوشگوار سے پوچھا۔

”جی، حکم!“ سر اکبر نے سر جھکا کر اسے تعظیم دی۔ ”لیکن یہ بور نہیں ہو گا۔ یہ آج، تک کے چیمبر کے اجلاسوں میں سب سے اہم اجلاس ہو گا۔“

جیہ یہ دیکھ کر پریشان ہو گئی کہ جیمس آبرن اس بات چیت میں الجھ کر اپنے مرتبے کا فرق بھول گیا تھا۔

”وزیر اعظم درست کہہ رہے ہیں، یور ہائی نہیں۔“ جیمس آبرن کے الفاظ غیر متوقع تھے۔ ”پارلیمنٹ نے یہاں جتنے سفید فام مشن بھیجے ہیں لارڈ ارون نے ان سے پہنچنے والے نقصانات کا انکشاف کیا ہے۔ ہند کو پہلی بار ایک ایسا وائسرائے ملا ہے جو مکمل طور پر فیڈریشن کا حامی ہے۔ ہم میں سے بہت سے لوگ جو اس عظیم سرزمین سے محبت کرتے ہیں چاہتے ہیں کہ ہندوستان کو داخلی خود مختاری مل جائے۔ یہ وہ عظیم تحفہ ہے جو برطانیہ، برصغیر کو دے گا کہ ہندوستان میں بھی آزاد عوام اسی طرح حکومت چلائیں گے جیسے برطانیہ میں چلاتے ہیں۔“

آبرن، جیہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ ”مہارانی جانتی ہیں کہ میں ہمیشہ اسی بات پر اکتاد رکھتا ہوں۔“

دہلی میں ہونے والے چیمبر سیشن کے سلسلے میں جیس آبرن کئی بار مہاراجہ سے ملنے آیا۔

جیہ سٹی پولیس کی بلند و بالا چھت کے نیچے، سنگ مرمر کے چکنے فرش پر اس کے فوجی جوتوں کی دھمکتی سنتی تو اسے وہ دن یاد آجاتا جس دن اس نے جیس آبرن کی تصویر کو کسی اور انداز میں دیکھا تھا۔ بیرن ان مردوں کی تصویریں جیہ کے بیڈ روم میں چھوڑ گئی تھی جنہوں نے مستقبل میں جیہ کا ہاتھ تھامنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن جیہ ان تصویروں کے بجائے تمام رات جیس آبرن کی تصویر کو دیکھتی رہی تھی۔

کبھی کبھی وہ جیہ اور پرنس ارجن سے گپ شپ کے لئے رک جاتا دونوں کے درمیان کوئی خاص بات نہیں ہوتی تھی پھر بھی جانے کیوں جیہ، آبرن کی سیرپور میں موجودگی سے خاصی مطمئن تھی۔ آبرن بھی دل میں شاید جیہ کے لئے ایسے ہی جذبات رکھتا تھا اس لئے وہ کبھی کبھی اس کے شوہر کی بعض عادتوں کے بارے میں اسے ٹوکتا اور رہنمائی کرتا رہتا تھا۔ ایک بار اس نے جیہ سے کہا کہ وہ اپنے شوہر کو اتنی زیادہ فلائنگ سے منع کرے۔ ”کسی بھی وقت کوئی حادثہ ہو سکتا ہے“ شہزادی۔ ”آبرن نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔“ مہاراجہ کو ایسے خطرات مول نہیں لینے چاہئیں۔“

جیہ کو اس اعتراف میں خاصی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا کہ اس کا شوہر چیمبر آف پر نر کے اجلاس سے زیادہ اپنے نئے ہوائی جہاز میں دل چسپی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

”ہم انہیں نہیں روک سکتے، جیس صاحب!“ شہزادی نے اپنی بے چارگی کا اظہار کیا۔ ”خطرہ ہمارے شوہر کے لئے ایک دوا کی حیثیت رکھتا ہے۔“

جیس آبرن مسکرا دیا۔ ”اور کیا آپ کے لئے نہیں؟ بھول گئیں کیا، میں نے آپ کو شیر کا شکار کرتے دیکھا ہے، شہزادی۔“

جیہ کو آج بھی جیس آبرن کے بدن پر بارود کی محک یاد تھی۔ آبرن کے وہ بازو یاد تھے جو اس کے اپنے بدن کے گرد حائل ہو گئے تھے۔ اس کی ٹانگوں سے لپٹنا یاد تھا اور..... اس نے رخ پھیر لیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ عمر اور مرتبے کے اس مقام پر جیس آبرن کو اس کی آنکھوں میں محبت کے سمندر موجزن دکھائی دیں۔

جب جیہ نے آخری بار دہلی کو دیکھا تھا تو مٹی اور دھول میں سے نئے شاہی

دارالحکومت کی عمارتیں سر اٹھانے کے لئے پر تول رہی تھیں لیکن اب ان عمارتوں نے آسمان کو چھو لیا تھا۔ پہاڑی پر شاہی دفاتر کے ساتھ سرخ پتھر کی نئی عمارتیں بن گئی تھیں۔ کنگز وے نامی وہ عظیم سڑک مکمل ہو گئی تھی جو وائسرائے ہاؤس کے دربار ہال پتھروں کی بنی ہوئی عظیم محراب انڈیا گیٹ تک جاتی تھی۔

اس کے ساتھ ہی جیہ کو دہلی کی زندگی میں ایک خوش کن تبدیلی نظر آئی تھی۔ دوریاں نہیں تھیں جو پہلے ہوا کرتی تھیں۔ اس نے کئی کوشیوں میں شاندار پگڑیاں ہوئے حکمرانوں اور سفید سوتی ٹوپیاں پہنے ہوئے قوم پرستوں کو آنے سامنے اور ایک بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ جمہوریت پسندوں اور حکمرانوں کے درمیان سے جنم لیتے ہوئے ہندوستان کی باتیں کیا کرتے تھے۔

مہاراجہ پر تپ اس قسم کے اختیارات کو بے حد پسند کرتا تھا مگر اس کے باوجود اس فطری سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

جب قوم پرست ان حکمرانوں سے جو اب بھی اصلاحات کرنے سے گریزاں تھے کرتے کرتے تھک جاتے تو وہ مدد کے لئے مہاراجہ پر تپ کی طرف ہی دیکھتے تھے۔

ہندوستان ایک جانب داخلی خود مختاری کے سلسلے میں سائن کمیشن کی رپورٹ کا منتظر اور دوسری جانب سر اکبر جیہ کو چیئرمین آف پر نزل کے ایک اجلاس میں لے جا رہا تھا۔ اس نے پہلے اس نے جیہ کو لیجسلیو اسمبلی دکھائی جہاں سے وائسرائے کونسل برطانوی ہندوستان انتظام و انصرام چلاتی تھی۔ جیہ نے پہلی بار اس سنہرے تخت کو دیکھا جس پر وائسرائے تھا۔ اس کے دونوں جانب چوبی پنج تھے ایک طرف انگریز تھری پیس سوٹ پہنے بیٹھے تھے دوسری جانب مقامی باشندے تھے۔

”لیجسلیو اسمبلی میں ہندوستانیوں کی موجودگی ڈیکوریشن سے زیادہ نہیں حکم!“ سر اکبر نے تبصرہ کیا ”ابھی تک برطانیہ انہیں نظر انداز کر رہا ہے لیکن جو نئی سائن کمیشن رپورٹ منظر عام پر آئی، سب کچھ ہمیشہ کے لئے بھول جائے گا۔“

سر اکبر، جیہ کو چیئرمین آف پر نزل میں لے گیا وہ رینگ کا سارا لے کر نیچے دیکھنے انگریزوں کے تھری پیس سونوں اور ہندوستانیوں کی ٹوپوں کے برعکس حکمران اپنی رنگ پگڑیاں باندھے بیٹھے تھے۔ جب وہ بات چیت کے لئے ایک دوسرے کی جانب پلٹتے تو ان لبابوں پر لگے زر و جواہر جگمگاتے لگتے۔

لارڈ اردن کمرے میں داخل ہوا تو سب لوگوں نے اسے تعظیم دی۔ وائسرائے

سب سے پہلے مہاراجہ بیکانیر کی طرف بڑھا۔ یہ وہ حکمران تھا جس نے جنگ عظیم کے خاتمے اور اقوام متحدہ کی تشکیل کی تقریب میں ہندوستان کی نمائندگی کی تھی۔ وہ وائسرائے کے خیر مقدم کو اٹھا تو ہال میں خاموشی چھا گئی۔

مہاراجہ بیکانیر نے ہونٹوں پر آ جانے والی سفید مونچھیں ہاتھ سے ہٹائیں اور پاٹ دار آواز میں گویا ہوا۔ ”ہم یعنی ہندوستانی ریاستوں کے حکمران اور شہزادے ہندوستانی ہیں اور اس ناطے نہایت سچائی اور دیانت داری سے اپنے ملک اور یہاں کے رہنے والوں کے خیر خواہ ہیں۔ ہم بڑی شدت سے اس دن کا انتظار کر رہے ہیں جب برطانوی ہند ہم سے آ ملے گا اور ہم سب مل کر متحدہ ہندوستان میں داخلی خود مختاری کی بنیاد رکھیں گے۔“

ایک کے بعد ایک حکمران اپنی جگہ سے اٹھتا رہا اور مہاراجہ بیکانیر کی تائید کرتا رہا۔ جیہ مسلسل وائسرائے کی جانب نگراں تھی جو یوں مسکرا رہا تھا جیسے ان کی باتوں سے متفق ہو۔ سردیاں ختم ہوئیں تو پیش میں اضافہ ہو گیا اور شہر کو گرد آلود ہواؤں نے گھیر لیا۔

اور پھر آخر کار سائنس کمیشن کی رپورٹ بھی شائع ہو گئی۔ ہندوستانیوں نے نہایت خوفزدگی کے عالم میں سنا کہ برطانوی راج اپنے اختیارات منتقل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ داخلی خود مختاری کا معاملہ غیر معینہ مدت تک کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔

موسم کی طرح دہلی کا موڈ بھی بدل گیا۔ شہر برطانوی راج کے خلاف سربراہ احتجاج بن گیا۔ ہر دفعہ جب بھی جیہ اپنے بچے کو گود میں بٹھائے سیر پور ہاؤس سے باہر نکلتی، ہندوستانیوں کو غیظ و غضب کا شکار دیکھتی۔ برطانویوں نے آزادی دینے کا اپنا وعدہ ایک بار پھر توڑ دیا تھا۔

موسم کی بڑھتی ہوئی گرمی نے پورے ہندوستان کو آگ کے گولے میں تبدیل کر دیا۔ برطانوی اشیاء کا بائیکاٹ خطرناک حدود کو چھونے لگا۔ عام ہڑتالیں شروع ہو گئیں اور بے روزگاری میں اچانک اضافہ ہو گیا۔

اپریل میں ارجن کی چوتھی سالگرہ کے موقع پر ہندوستان کی حالت خطرناک حد تک دگرگوں ہو گئی۔ وائسرائے ایچسٹیو اسمبلی میں اپنے تخت پر موجود تھا کہ وزیٹرز گیرلی میں سے ٹریڈری پنوں پر ایک بم پھینکا گیا جہاں انگریز بیٹھے ہوئے تھے۔ بم کو اس انداز میں ڈیزائن کیا گیا تھا کہ اس سے کوئی نقصان نہ ہوتا لیکن اس واقعے نے پورے ہندوستان کو دہلا دیا۔

بم پھینکنے والے بھگت سنگھ نے دہلی کی ایک عدالت کے کچا کچھ بھرے ہوئے کمرے میں اپنے عمل کی وضاحت کی۔

”حملہ کسی ایک آدمی کے نہیں بلکہ ایک ادارے کے خلاف تھا۔“ اس نے پرزور انداز میں اپنی کارروائی کی وضاحت کی۔ ”ہم جس مقام پر کھڑے ہیں وہاں انسانیت کی محبت دم توڑ جاتی ہے۔ ہمارے ہاں انسانیت جس خوف سے دوچار ہے اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس ناطے آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے جس کے حصول کے لئے ہم کوئی بھی قربانی دے سکتے ہیں۔ آزادی کے لئے کیا جانے والا ہمارا کوئی بھی عمل غیر قانونی نہیں۔“

وائسرائے نے فوری طور پر بھگت سنگھ کا بیان سن کر دیا لیکن بھگت سنگھ کے الفاظ پر نافذ کیا جانے والا سنر برصغیر کے عوام کے منہ بند نہیں کر سکا اور جب بھگت سنگھ کو پھانسی کی سزا دی گئی تو اس کا نام آزادی کی جنگ میں شامل لوگوں کے لئے آزادی کا نعرو بن کر سامنے آیا۔

پورا ہندوستان انگریزوں کے خلاف نعروں سے گونج رہا تھا جگہ جگہ لوگوں کا ہجوم تھا جو انگریزوں کو کتوں اور جانوروں سے شیشہ دے رہا تھا۔

ہندوستانی حکمرانوں کو اپنا مستقبل خطرے میں نظر آنے لگا۔ چنانچہ انہوں نے جیمبر آف پرنسز سے دامن بچا کر مضبوط اور مستحکم برطانیہ کے پردے میں چھپنے کی کوششیں شروع کر دیں۔

وائسرائے کی طرف سے مخصوص کئے جانے والے وقت کو نظر انداز کرتے ہوئے مہاراجہ الور نے سات گھنٹے کی تقریر کی اور ان زیادتیوں اور ناانصافیوں پر روشنی ڈالی جو برطانوی راج ان سے روا رکھے ہوئے تھے۔ اس کی درخواست درخور اعتنا نہیں سمجھی گئی اور وائسرائے کے اشارے پر حکمرانوں نے ان ہندوستانیوں کو جیلوں میں ٹھونسا شروع کر دیا جو آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔

جونہی جیل بھرے جانے کی اطلاعات دہلی پہنچیں، عوام کے غم و غصے کا رخ ہندوستانی حکمرانوں کی طرف ہو گیا۔ ان کے بلند و بالا شہری محل مظاہرین کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ مہاراجہ پرتاپ نے شکایت کی کہ اسے فلائنگ کلب تک پہنچنے میں ایک گھنٹے سے بھی زیادہ وقت لگا ہے جبکہ مشتعل مظاہرین اس کی سیاہ رولس رائس پر مکے مار رہے تھے، تھوک رہے تھے اور نعرو بازی کر رہے تھے۔

سیرپور ہاؤس بھی اس خوف سے آزاد نہیں تھا۔ خوفزدہ جیہ اپنے لخت جگر کو بانہوں میں چھپائے بند کھڑکیوں سے اندر آنے والے نعروں کی آوازیں سنا کرتی۔

مئی میں جب گرمی ناقابل برداشت ہو گئی تو جیہ نے اپنے ملازمین کو حکم دیا کہ اس کی

ہاگی کے انتظامات کئے جائیں۔

مظاہرین سیرپور ہاؤس کے سامنے جمع تھے۔ انہوں نے سیرپور کے ملازمین کی گاڑی کو لٹ سے باہر جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا چنانچہ پولیس اور نیم فوجی دستوں نے اہل چارج کیا اور متعدد افراد کو لہولہاں کر دیا۔

مہاراجہ کی رولس رائس جب ڈرائیوے میں داخل ہوئی تو جیہ کھڑکی کے شیشوں سے لکھڑی تھی۔ اس نے سیرپور کے دو اخبار نویسوں کو فوراً پہچان لیا تھا۔ جیہ کو یقین تھا کہ ان کا شوہر مظاہرین کی مدد کے لئے جا رہا ہے لیکن اس وقت اسے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں لاجب اس نے کار کی رفتار تیز ہوتے اور پولیس والوں کو ہجوم پر ڈنڈے برساتے دیکھا۔ وہ باہر کی جانب بھاگی تاکہ پولیس کو اس غیر انسانی فعل سے روک سکے۔ کیونکہ اسے لگتا تھا کہ یہاں ہونے والی کوئی کارروائی سیرپور میں اس کے شوہر کے خلاف مشکلات نہ کھڑی کر دے۔

حیرت انگیز طور پر کانشیلوں نے اسے ایک جانب دھکیل دیا اور مظاہرین کو پولیس ریلوں میں ٹھونسنے شروع کر دیا۔

تمام سہ پہر جیہ اپنے شوہر کی واپسی کی منتظر رہی اور پرارتھنا کرتی رہی کہ وہ بہ حفاظت واپس آ جائے۔

شام کے سائے ڈھلنے شروع ہو گئے تھے کہ اچانک چاندنی نے اس کے بیڈ روم کے دروازے پر دستک دی۔ ”مہارانی صاحبہ“ جلدی کریں مہاراجہ کو اسپتال لے جایا گیا ہے۔“

فلاننگ کلب کے ایک انسٹرکٹر نے جیہ کو رولس رائس میں بیٹھنے میں مدد دی۔ جونہی گاڑی سیرپور ہاؤس کے گیٹ سے باہر نکلی انسٹرکٹر نے جیہ کو بتایا کہ مہاراجہ کا طیارہ گر کر تباہ ہو گیا ہے۔

لوگ اس سے اور وہ لوگوں سے ٹکرا رہی تھی۔ پروٹوکول اور ادب آداب دھڑ دھڑے رہ گئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ملازمین، مصاحبوں اور محافظوں سے بھری ہوئی کئی دائیں بائیں آگئی تھیں۔ کاروں کا کارواں جلد ہی ہجوم سے الٹی ہوئی سڑکوں سے ٹکا نسبتاً کھلی اور کم رش والی شاہراہوں پر آگیا۔

کاروں کی رفتار خاصی تیز تھی۔ اس لئے لوگ باگ خود ہی انہیں راستہ دے تھے۔ جلد ہی وہ لوگ واٹسوائے ہاؤس اور جے پور ہل کے سبز ستارے کو چھوڑ کر آگے چلے گئے۔

اسپتال پہنچ کر بھی ہنگامی کیفیت اسی طرح طاری رہی تھی جیسے دوران سفر برآمدوں میں مفت علاج معالجے کی سہولتیں حاصل کرنے والوں کا ہجوم تھا لیکن ان میں کسی کو بھی اتنی فرصت نہ تھی کہ وہ رک کر ان کا حال احوال دریافت کرتا۔

ایک سرجن آپریشن تھیٹر سے برآمد ہوا۔ اس کے عقب میں کچھ اردلی تھے جو ٹرالی دھکیل رہے تھے راہداری میں کھلبلی مچ گئی۔ لوگوں نے ایک بار پھر بھاگ دوڑ شروع دی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے دہلی میں موجود میرپور کے تمام ہمدرد بیک وقت اسپتال پہنچ رہے ہیں۔

جیہ اس عالم افزا تفری میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ بھاگتے دو لوگوں کی دھکم پیل سے بچنے میں مصروف تھی۔ البتہ اس کی نگاہیں اسی ٹرالی پر تھیں اردلی دھکیلتے ہوئے آپریشن تھیٹر سے برآمد ہوئے تھے۔

اور پھر اس کے ایک مصاحب نے آگے بڑھ کر ٹرالی پر پڑا ہوا خون آلود کپڑا الٹ م مہاراجہ پر تپ، جیہ کے سامنے تھا۔

اودھڑا ہوا مہاراجہ پر تپ، جگہ جگہ سے زخمی اور کچلا ہوا مہاراجہ پر تپ، جسے النظر میں پہچانا جانا مشکل تھا۔

جیہ سکتے کی سی کیفیت میں کھڑی تھی۔

مہاراجہ پر تپ کے چہرے اور جسم پر اتنے زخم تھے کہ انہیں گننا محال تھا۔

سیاہ پڑ چکی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ زخموں سے اٹے ہوئے اس جسم کو طویل کے لئے کسی بھی میں رکھ کر نکالا گیا ہے۔

بہ کا دل متلی کرنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا معدہ اور پیٹ کے تمام حصے کے راستے باہر آ جائیں گے۔ وہ لہرائی لیکن اس سے پہلے کہ گرتی، ایک مصاحب نے اس کا بازو تھام لیا۔

”آئیے! مہارانی صاحبہ۔“ مصاحب کے جملے سے جیہ جیسے چونک کر ہوش میں آ گئی۔ ”ملا ت ہم دیکھ لیں گے۔ آپ سیر پور ہاؤس واپس چلی جائیں۔“

نوجوان مصاحب اسے واپس لے چلا تو جیہ نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے شہر کی کٹی پھٹی لاش کی صورت دیکھ کر ٹوٹ گئی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا اچھوٹ پھوٹ کر روئے۔ اپنا آپ کوچ ڈالے اور سر میں خاک ڈال کر کہیں دور نکل لیکن وہ یہ سب کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

وہ ایک ریاست کی مہارانی تھی اور یہ سب ایک مہارانی کو سرعام زیب نہیں دیتا تھا۔ اسپتال کے باہر ہجوم اب بھی جمع تھا۔ مشتعل لوگ سیاہ رولس رائس پر کئے برسا رہے ”شرم کرو، انگریز کتو..... شرم کرو، انگریز کتو!“ نعروں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔

مصاحب بڑی مشکل سے ہجوم میں راستہ بنا رہا تھا۔ جیہ بھی اس دھکم پیل کے باعث دھڑلہ رہی تھی۔ اسی عالم میں اس کی کلائی میں موجود کلنج کی چوڑیاں کار کے بے پر لگ کر ریزہ ریزہ ہو گئیں۔ وہ شور شرابے سے پریشان، ایک نشے کے عالم تک برنگی کرچیوں کو سڑک پر گرتے دیکھتی رہی۔

اور پھر طوفان کی منہ زور لہروں کی طرح حقیقت نے اس کے وجود کو دہلا دیا۔ وہ بیوہ ہوئی۔ اب وہ دھوا تھی۔ اس کا چار سالہ بیٹا مہاراجہ سیر پور ہو گیا تھا اور وہ اگلے چودہ سال ترین سالوں کے لئے اس کی سرپرست تھی۔

کسی حد تک پریشان حال اسٹیشن ماسٹر نے سرخ جھنڈی دکھا کر ٹرین کو ریلوے اسٹیشن روڈ سے باہر ہی روک دیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اگلی سائیڈنگ میں برطانوی پولیس انسپکٹرز سفید ٹرین کے حوالے میں مصروف تھے۔ سیر پور کے محافظین ٹرین سے نیچے کودے تو ہینفارم میں ملبوس پولیس والوں نے حفاظتی نقطہ نگاہ سے ان پر ریوالور تان لئے۔

”کیا معاملہ ہے، سارجنٹ؟“ آبرن نے چلا کر ان سپاہیوں کو مخاطب کیا جو ٹرین کے

گرد جمع ہو جانے والے جھوم کو منتشر کرنے میں مصروف تھے۔ آہرن خود سیرپور ریل کیرج پر سوار تھا۔

ایک سپاہی نے ہیلٹ کے نیچے سفید چہرہ دیکھا تو گویا جواب دینا اس کے لئے لازم گیا۔ ”کچھ بزدلوں نے واٹر سرائے کی ٹرین کو بم سے اڑا دیا ہے سر!“ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ بنا کر زور سے ہانک لگائی۔

”ڈیئر ایکسی لینسی زخمی تو نہیں ہوئے؟“ میجر جیمس آہرن کے لمبے میں تشویش تھی ”دہشت گرد کچھ زیادہ تربیت یافتہ نہیں تھے، سر۔“ سپاہی بولا۔ ”بھگوان کا شکر ہے ہم غلط کپارٹمنٹ کے نیچے پھنسا۔“

میجر آہرن چھلانگ لگا کر کپارٹمنٹ سے نیچے اترا اور جھوم میں جگہ بنانا ہوا آ بڑھا۔

”ہٹو، ہٹو“ سپاہی کی آواز کے ساتھ ساتھ اس کا بید بھی کئی لوگوں کے جسموں پر تھا۔ درد میں ڈوبی ہوئی کئی چیخیں ابھریں اور متعدد ہندوستانی باشندے زمین بوس ہو گئے۔ ”یہ ہندوستانی اس قابل نہیں کہ انہیں لارڈ ارون جیسا واٹر سرائے ملے۔“ آہرن تبصرہ کیا۔ ”دہشت گرد اسے مارنے کے درپے ہیں اور وہ شریف آدمی اب بھی پارلیمنٹ گول میز کانفرنس کے انعقاد پر رضامند کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے تاکہ شاہ براد از خود ہندوستانیوں کے مسائل اور معاملات سن سکے۔۔۔“

جیہ اور سر اکبر اپنے کپارٹمنٹ کے دروازے پر متوحش کھڑے تھے۔ ان کی چہرہ خوف کی زردی تھی کہ مبادا مشتعل جھوم کا رخ کہیں ان کی طرف ہو جائے لیکن خیر گ اور سپاہی، جھوم کو سیرپور ٹرین کی طرف آنے میں روکنے میں کامیاب رہے۔

وہاں خاصا وقت ضائع ہوا لیکن اس کے بعد سیرپور تک کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا۔ سیرپور کے دربار ہال سے سارا یورپی فرنیچر ہٹا لیا گیا تھا۔ مہاراجہ پر تپ کی ار تھی ہال کے عین وسط میں پھولوں میں ڈھکی ہوئی پڑی تھی۔ اس کی گردن ٹوٹ گئی تھی اس سارے کے لئے گردن کے نیچے روٹی سے بھرے ہوئے گدی لے رکھ دیئے گئے تھے۔ چہرہ ننگا تھا جس پر زخموں کے نشان اب بھی دکھائی دے رہے تھے۔

اس منظر کو سات ماہ گزر چکے تھے لیکن جیہ کی آنکھوں میں اب بھی سب کچھ تازہ اسے پوجا پات اور پجاریوں نے گھیر لیا تھا اور ننھا منا مہاراجہ اپنے ارد گرد ہونے والی تہذیب سے خوفزدہ تھا۔ ملازمین جن بڑی بڑی آنکھوں کو گنگا، جمناکہہ کرپکارتی تھیں ان میں

کے مارے سیاہی اتر آئی تھی۔

جیہ کو وہ وقت بھی یاد تھا جب ملازموں نے اس کے لمبے سیاہ بال تراش دیئے تھے اور ٹوکوں کے کارواں مہاراجہ پر تپ کی لاش کو محفوظ کرنے کے لئے برف کی سلیں لئے محل میں آ رہے تھے۔ بڑی بوڑھی عورتیں ار تھی کے ارد گرد بین کرنے میں مصروف تھیں اور پجاری اشلوک اور منتر پڑھ رہے تھے۔

شوہر کے دیہانت کے باعث جیہ اب پاک صاف نہیں رہ گئی تھی چنانچہ اسے نیم تاریک ایک پوجا گھر تک محدود ہو جانا پڑا تھا راج گورو نے اس کی آنکھوں کے سامنے ننھے مہاراجہ کو جھک کر تعظیم دی اور کہا ”آئیے مہاراجہ صاحب! آپ کی والدہ اس وقت آپ کے ساتھ نہیں آ سکیں گی کیونکہ وہ پوتر نہیں ہیں۔“

معصوم بچے نے پجاری کی تھلید کی اور جیہ کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ راج گورو نے دوسرے الفاظ میں اس کے اختیارات اور اقتدار کو چیلنج کیا ہے۔

پورے تیرہ دن وہ پوجا گھر میں مقید رہی اور محل کی راہداریاں اور کمرے تعزیت کے لئے آنے والوں کی آہوں اور سکیوں سے گونجتے رہے۔

چودھویں دن جب مہاراجہ پر تپ کی راکھ بنارس کے مقام پر دریا کے حوالے کر دی گئی، اسے اپنے کمروں میں واپس آنے کی اجازت دے دی گئی۔

”پجاریوں کی طاعت بہت زیادہ ہے، حکم!“ چاندنی نے سنگ مرمر کی اس چوکی پر پانی ڈالتے ہوئے سرگوشی کی جس پر جیہ بچپن سے اب تک غسل کرتی آئی تھی۔ ”جب آپ سوگ میں تھیں تو ان پجاریوں نے ننھے مہاراجہ کے ذریعے ریاست پر قابض ہونے کی کوشش کی۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ غیر ہو۔ آپ کا سیر پور سے کوئی تعلق نہیں۔ راج گورو سرعام یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ ریاست کے اختیارات وہ اپنے پاس رکھیں گے۔۔۔“

جیہ کی جان آدمی رہ گئی اب وہ واقعی بے یار و مددگار تھی اس کی کلائیوں کلنج کی چوڑیوں سے خالی تھیں۔ وہ لمبے بال نہیں رہے تھے جو کبھی اس کے ٹخنوں تک آتے تھے۔ مانگ میں سیندور باقی نہیں رہا تھا۔ اسے اب اپنے کئے ہوئے بالوں والا سر بھی ڈھانپنے کی اجازت نہیں تھی۔ اب وہ ایک بیوہ تھی جس کی اپنی کوئی خواہش نہ تھی بلکہ اسے ایک بد نصیب عورت کے مقام پر فائز کر دیا گیا تھا۔

پوجا گھر میں کئی روز گزارنے کے بعد دربار ہال اسے ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا جیہ کو یہ کمرہ ہی اجنبی لگتا تھا۔ وہ اس مقام پر آ کر کھڑی ہو گئی جہاں کبھی اس کے پتی دیو کی ار تھی

رکھی گئی تھی۔

تھری پیس پنے ہوئے ایک شخص ہال کے کونے سے اسے دیکھ رہا تھا اسے اس عورت پر ترس آ رہا تھا۔

”ان لوگوں نے آپ سے کیا سلوک کیا ہے، شنزادی؟“ اس کی نرم و گداز انگلیوں کے لمس سے جیسے جیہ کے بدن میں برقی رو دوڑ گئی تھی وہ اس انگریز کی بانہوں میں سمٹ کر بے اختیار بچوں کی طرح رو دی۔

وزیر اعظم کا ہاتھ اس کے کندھے پر معلق تھا شاید وہ پروٹوکول کے آداب توڑ کر اسے چھونے کے بارے میں شش و پنج میں مبتلا تھا۔ آبرن نے جیہ کو چھوڑا تو وہ اسے متوجہ کرنے کے لئے دھیرے سے کھانسا۔

”ہمیں فوری طور پر سیر پور جانا ہے، حکم!“ اس نے جیہ کو آگاہ کیا۔ ”اگر ایسا نہ ہوا تو بھاری، مہاراجہ کی تاجپوشی کے ساتھ ہی ریاست میں ایک بحران کھڑا کر دیں گے۔“

ارجن کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں نے کھڑکی کی آہنی سلاخوں کو تھاما تو جیہ کو وہ لمحہ یاد آ گیا جب تاجپوشی کے لئے جاتے ہوئے ٹرین میں اس نے سیر پور برج پر ہاتھیوں کے غول دیکھنے کے لئے سلاخوں کو جکڑ لیا تھا لیکن اس وقت جیہ کی گویا آدھی جان نکل گئی جب اس نے سیر پور کے گرم موسم میں صاف اور شفاف آسمان پر گرد کے بادل اٹھتے دیکھے۔ چند ہی لمحوں میں اس گرد و غبار نے سیر پور لائسنز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

مصاحبین فوراً جیہ کو ہجوم میں سے نکال کر لے گئے تاکہ ایک بیوہ کو ان خوشی کے لمحوں سے دور رکھا جاسکے۔ پردہ پیلس کی بالکونی پر تنہا کھڑی وہ دریا کے ریتیلے کناروں کا نظارہ کرتی رہی اور گرد و غبار کی سیاہ چادر کو ماحول پر قبضہ کرتے دیکھتی رہی وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان تھی کہ اگر اس آندھی سے ارجن پریشان ہو گیا تو سیر پور کی تین ہزار سالہ تاریخ کے بادشاہوں کے ان ناموں کا کیا ہو گا جو تاجپوشی کے موقع پر پڑھ کر سنائے جاتے تھے۔

ایک سو ایک توپوں کی سلامی یہ خبر دے رہی تھی کہ ارجن کو مہاراجہ سیر پور تسلیم کر لیا گیا ہے اور جیہ تصور کی آنکھ سے ایک معصوم بچے کو سینکڑوں اور ہزاروں مردوں کے درمیان سیر پور کی شاہی گدی پر براجمان دیکھ رہی تھی۔

بادلوں کے جتھے کچھ اور قریب آ گئے اور پھر سیاہ آسمان بری طرح رو دیا۔ دریا کے پار جیہ کو وہ شاہی ہاتھی دکھائی دیا جو مہاراجہ کی سواری کے لئے تھا۔ اس وقت اس ہاتھی کا ہودہ برہنی طرح لرز رہا تھا۔

اور پھر جلوس پردہ پیلس کی طرف روانہ ہو گیا۔

پردہ پیلس اس وقت تک پرسکون رہا جب تک جلوس وہاں نہیں پہنچ گیا۔ جلوس کے آتے ہی پورا محل نعروں سے گونج اٹھا۔ مہاراجہ زنان خانے میں داخل ہوا تو بادشاہت کے نشان کے طور پر سنہرا کڑا اس کی پنڈلی میں تھا۔ جیہ کو اس کے چہرے پر ایک عجیب سی چٹنگی دکھائی دی۔ یوں لگتا تھا جیسے تاجپوشی کے ساتھ ہی اسے یہ علم بھی ہو گیا ہو کہ اب وہ ریاست کا مہاراجہ ہے، بچہ نہیں ہے۔

خواجه سراؤں کی بلند آوازیں راہداریوں میں گونج رہی تھیں۔ ”بابوب‘ بلا حظ‘ ہوشیار۔۔۔ وزیر اعظم اور وزارتی کونسل کے ارکان تشریف لاتے ہیں۔“

جیہ پہلی بار شیردل مہارانی کے قریب گئی تھی وہ باریک شیون کے پردے کے عقب میں بیٹھی ضروری ہدایات جاری کر رہی تھی۔ اس کی آواز اور لہجے سے قطعاً یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ یہ بوڑھی عورت پے در پے اپنے دو پوتوں کی موت کا صدمہ اٹھا چکی ہے۔

”مہاراجہ ارجن کے دربار کے وزیرو!“ مہارانی کی ٹھہری ہوئی آواز ہال میں گونجی۔ ”آپ لوگ ان کرناک حالات سے بخوبی واقف ہو جن کے باعث دہلی میں میرے پوتے کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اسمبلی پر بم پھینکے جا رہے ہیں۔ حکمرانوں کو ان کے گھروں میں محصور کر دیا گیا ہے اور پورا ہندوستان مظاہروں کی زد میں ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ برطانوی اشیاء کا بائیکاٹ ہو رہا ہے۔ یہ دگرگوں صورت بادشاہت پر اعتماد کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ یہاں بھی یہی صورت حال پیش آئے لیکن معاملہ یہ ہے کہ جب تک مہارانی جیہ دیوی کے سوگ کی مدت پوری نہیں ہوگی ریاست کی سرس اور خزانے کی کٹھیاں برطانوی ریزیڈنٹ کی تحویل میں رہیں گی۔“ مہارانی نے چند ثانیوں کے لئے توقف کیا اور اپنے سنہرے حقے کی منہ میں دبا کر ایک طویل کش لیا۔ ”ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس نازک صورت حال میں یہ بات بے حد خطرناک ہے کہ ایک سال تک ریاست کا انتظام و انصرام کسی انگریز کے ہاتھ میں ہو۔“

جیہ نے دل ہی دل میں اس وقت کو کوسا جب وہ اقتدار اور اختیارات کا مطالبہ کر رہی تھی۔ اس نے اپنے موجودہ مقام کے لئے تو یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ وہ ایک پردے کے پیچھے بٹھادی جائے اور اس کی آنکھوں کے سامنے لیکن اس سے پوچھے بغیر ریاست کے معاملات نمٹائے جا رہے تھے۔

”راج گورو کا کہنا ہے کہ تاجپوشی کے وقت اٹھنے والی آندھی کوئی نیک شگون نہیں۔“

بولنے والا ریاست کا وزیر زراعت تھا۔ ”اس لئے پجاریوں کا خیال ہے کہ وہ سوگ کا سال ختم ہونے تک بچے کو اپنی تحویل میں لے لیں، حکم!“

”اس سلسلے میں ایک اور بات بھی ذہن میں رکھی جائے، حکم!“ دربار میں سے ایک اور پاٹ دار آواز ابھری۔ ”اگر مہارانی صاحبہ بنارس میں مقدس پانیوں سے غسل کر لیں تو وہ پاک ہو جائیں گی اور سوگ کا عرصہ بھی ختم ہو جائے گا۔“

جیہ کے حلق سے اطمینان کی ایک طویل سانس خارج ہو گئی اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے ابتلاء کا دور ختم ہونے کو ہے۔

”کیا راج گورو اس قسم کی کسی تجویز سے اتفاق کرتے ہیں؟“ شیردل مہارانی نے فوراً ہی اس معاملے کو آگے بڑھایا۔ مہارانی کی آواز سے یہ اندازہ لگانے میں بھی جیہ کو کوئی پریشانی نہیں ہوئی کہ ریاست میں اقتدار کی رسہ کشی بہر حال شروع ہو چکی ہے۔ جیہ کی سانس گویا حلق میں اٹک گئی تھی وہ دم سادھے نیچے دربار ہال میں وزراء کے مابین ہونے والی سرگوشیوں کی جھنجھٹاہٹ سن رہی تھی۔ حقے گڑ گڑانے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں لیکن جیہ کو یہ اندازہ نہ ہو پایا تھا کہ وزراء میں سے کون راج گورو کے حلقے میں شامل ہے اور کون اس کا حامی ہے۔

کونسل کے ارکان کے منتشر ہونے کے بعد وزیر اعظم ان کے قریب آ گیا۔ ایک ڈھکن کے کھلنے کی آواز سے اندازہ ہو گیا کہ سر اکبر پان کے ساتھ مصروف ہے۔

”مہارانی صاحبہ کی پاس اب بھی ایک کارڈ باقی ہے۔“ وہ نسبتاً دھیمی آواز میں گویا ہوا۔ ”ریاست کی مہرین اور خزانے کی چابیاں آبرن کے پاس ہیں۔ وہ اگر چاہے تو ان معاملات سے نمٹنے کے لئے.....“

”کیا اختیارات کی چابی شہنشاہ برطانیہ کو دینا چاہتے ہو؟“ شیردل مہارانی نے قدرے ناراضی کی ساتھ سر اکبر کا جملہ کاٹا۔ ”اگر تم آبرن کو استعمال کرو گے تو تاج برطانیہ کو اپنے اندرونی معاملات میں براہ راست مداخلت کا موقع فراہم کر دو گے۔ ہمیں اپنے مہروں سے پجاریوں کی چالوں کو ناکام بنانا ہو گا۔“

اگلے چند ہفتے جیہ کے لئے بے حد پریشان کن تھے۔ دربار ہال میں اختیارات کی بحث بدستور جاری تھی۔

پجاری بھی شاید پردے کے پیچھے بیٹھی جیہ کی بے بسی سے مکمل طور پر آگاہ تھے۔ اس کے برعکس ننھا منا مہاراجہ پردہ پیلس کے دربار ہال میں بیٹھا طلائی سکوں سے کھیلتا رہتا۔ اسے

اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اس کی ماں کس عذاب سے گزر رہی ہے یا یہ کہ راج گورو ان دنوں اصلاحیوں سے خفیہ مذاکرات کرنے میں مصروف ہے۔

سر اکبر البتہ پجاریوں اور جیہ کے درمیان بڑھتی ہوئی چپقلش پر نہ صرف کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھا بلکہ وہ اس معاملے سے قدرے پریشان بھی تھا۔ اسی لئے وہ ایک روز اس پردے کے سامنے آکر بیٹھ گیا جس کے عقب میں جیہ موجود تھی۔

”آپ بچے کو لے کر سیرپور سے باہر چلی جائیں، شہزادی۔“ اس نے سرگوشی کی۔ ”صرف چھ ماہ میں ہی پجاریوں نے آپ کے اقتدار کے خلاف فضا مکر کر دی ہے۔ آپ کی عدم موجودگی میں ریزیڈنٹ اور میں آپ کی نیابت کریں گے۔ لیکن اگر حکمران یہاں رہے گا تو ہم پجاریوں کو تکمیل نہیں ڈال سکتے۔“

سر اکبر پردے کے کچھ اور قریب ہو گیا اور پھر اس کا سانولا ہاتھ پردے کے پیچھے آگیا۔ ”مہاراجہ ڈنگرا“ ہندوستان واپس آ رہے ہیں اور وہ خواہش مند ہیں کہ آپ ان کے پاس چلی جائیں۔“ سر اکبر نے اپنی آواز کچھ اور دھیمی کر لی تھی۔ ”آپ کی والدہ محترمہ نے بھی پیغام بھیجا ہے کہ وہ اپنے نواسے سے ملنے کی متمنی ہیں۔ مہاراجہ نے آپ کے لئے یہ چیزیں بھیجی ہیں۔“

جیہ نے ننھا سا پارسل سر اکبر کے ہاتھ سے لے کر کھول ڈالا۔ وزیر اعظم اب بھی پردے کے عقب سے سرگوشیوں میں مصروف تھا لیکن اب جیہ اس کی باتیں سن نہیں رہی تھی۔ پارسل کھلتے ہی چوڑیاں اس کی گود میں آگری تھیں جو اس بات کی غماز تھیں کہ مہاراجہ ڈنگرا نے اسے بہن بنا لیا ہے۔

اسٹیشن ماسٹر بار بار دسل بجا رہا تھا۔ ارجن کھڑکی میں کھڑا اچھل اچھل کر میجر آبرن کو جلد آنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر ایک سپاہی بید سے ہجوم میں ریزیڈنٹ کے لئے راستہ بنانے میں مصروف تھا۔

جونہی آبرن نے ڈبے میں قدم رکھا۔ ٹرین ایک دھچکے سے آگے بڑھ گئی۔

”وائسرائے نے ایک معجزہ کر دکھایا ہے۔“ اس نے قدرے جوش سے بتایا۔ ”شہنشاہ اس بات پر رضامند ہو گئے ہیں کہ بنگلہم پیلس میں ہندوستانیوں سے ملاقات کریں۔“ وہ ایک لمحے کے لئے رکا اور پھر گویا ہوا۔ ”لیکن دہشت گردوں کے یہ ہم خود مختاری کے فوری اور غیر فطری مطالبے، کیا ہندوستانی نہیں جانتے کہ وال اسٹریٹ کی تباہی کے بعد سلطنت برطانیہ کے معاشی اور مالی مسائل کس قدر گہیر ہو چکے ہیں؟“

جیہ نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا لیکن سر اکبر خاموش نہیں رہ سکا تھا۔ ”ہندوستان اس تباہی کا ذمے دار نہیں ہے۔ میجر آبرن جبکہ اس کے برعکس برطانیہ نے ہندوستان آنے والی اشیاء کے مصارف میں یک لخت دگنا اضافہ کر دیا ہے۔“

آبرن غصے سے تقریباً پھٹ پڑا۔ ”یہ ہندوستانی‘ برطانیہ کو اپنی سرزمین بھی تو نہیں سمجھتے۔ کیا ان کے خیال میں وہ معصوم اور بے گناہ بچوں اور عورتوں کو قتل کر کے اپنے ملک یا قوم کی کوئی خدمت کر رہے ہیں۔ ان کے اس عمل سے بنی بنائی عمارت منہدم ہونے میں محض دو منٹ لگیں گے۔“

سر اکبر نے بھویں اچکائیں اس کی سنجیدگی‘ الفاظ سے کہیں زیادہ خوفناک تھی۔ ”لیکن کبھی تم لوگوں نے یہ غور بھی کیا ہے کہ سلطنت برطانیہ ہرپل اپنا رنگ بدلتی ہے۔ اس لئے تو تم پر بموں سے حملے کئے جا رہے ہیں۔ پچھلے سال ہم لوگوں سے وعدہ کیا گیا تھا کہ داخلی خود مختاری دے دی جائے گی لیکن اس سال برطانویوں کا خیال ہے کہ ہم لوگ ابھی اپنی حکومت بنانے کے قابل نہیں ہوئے۔“

ٹرین دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر داخل ہوئی تو سر اکبر نے تھکے تھکے سے انداز میں آبرن کو دیکھا۔ ”حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ہم نے خود پر حکومت کرنا سیکھ لیا تو برطانیہ کو ہندوستان کی پر تعیش زندگی سے ہاتھ دھونا پڑ جائے گا۔ مجھے تو شک ہے میجر کہ ہندوستان نے تمہیں بھی بد عنوان بنا دیا ہے۔ اور اب تم لوگ تقسیم سے زیادہ اتحاد سے خوفزدہ ہو۔“

برطانوی راج کے دار الحکومت کی رونقیں عروج پر تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس شہر کی سڑکیں اور گلیاں ارد گرد رونما ہونے والے حالات سے بالکل بے خبر ہوں۔ باغوں میں موسم سرا کے پھول مک رہے تھے کھڑکیاں سرمائی دھوپ میں چمک رہی تھیں اور کرسمس ٹری کی سجاوٹ شروع ہو گئی تھی۔

کنٹ پیلس کے شاپنگ ایریا میں میم لڑکیاں دھڑا دھڑ خریداری میں مصروف تھیں۔ پورٹر بڑے بڑے پیکٹ اٹھائے ایک دکان سے دوسری دکان میں آ جا رہے تھے۔

کار جوئی ایک پہاڑی پر چڑھی سر اکبر نے ان بلند و بالا عمارتوں کی طرف اشارہ کیا جو برطانوی راج کے افسران کی رہائش کے لئے مخصوص تھیں۔ ان عمارتوں کے باہر پتھر لیلے ستون بنے ہوئے تھے۔ اور ان پر مختلف عبارتیں درج تھیں۔

”ان تحریروں کو پڑھو میجر آبرن“ سر اکبر نے کہا۔ ”نیوزی لینڈ سے ہندوستان کو۔ جنوبی افریقہ سے ہندوستان کو‘ آسٹریلیا سے ہندوستان کو‘ کینیڈا سے ہندوستان کو‘ ہندوستان

تمہاری عظیم سلطنت کا انمول ہیرا ہے لیکن ان تمام کالونیوں کو داخلی خود مختاری حاصل ہے ہندوستان کو نہیں۔“

کار سیرپور ہاؤس کی طرف مڑی تو جیہ نے گھبراہٹ کے عالم میں ارجن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مگر اس کی توقعات کے برعکس اس بار ناراض اور مشتعل لوگوں کا ہجوم نہیں بلکہ گیٹ پر بانھیچہ اور پھولوں کی کیاریاں ان کی منتظر تھیں۔

دربار ہال میں فرنیچر واپس رکھا جا چکا تھا۔ دیوار پر آویزاں مہاراجہ وکٹر اور اس کی پسندیدہ گھوڑی کی قد آدم تصویر کے نیچے آتش دان میں آگ جل رہی تھی جس کی وجہ سے ماحول کسی برطانوی حویلی کا سا لگ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کمرے میں کبھی کوئی لاش ہی رکھی نہ گئی تھی۔

جیہ نے جب یہ دیکھا کہ مکان میں ماضی کے سانچے کا کوئی بھی عکس موجود نہیں تو وہ یوں مطمئن ہو گئی جیسے اسے یقین ہو کہ گزرے ہوئے دنوں کی تلخی اسے قطعی پریشان نہیں کرے گی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا کھویا ہوا اعتماد بحال ہونے لگا تھا۔

نئے سال کے پہلے دن وہ پوجا گھر کی کھڑکی میں کھڑی گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھی کہ دروازے پر کسی نے ناخن مارنے شروع کر دیے۔ اس نے اسے اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔

اس کے ذہن میں اس لمحے شادی کا منظر تازہ تھا جب اسے ایک تلوار کے ساتھ بیابا جا رہا تھا۔ اس کے بعد ایک تلخ زندگی اس نے گزاری تھی لیکن ماں سے ملاقات کے بعد یہ تلخی کس قدر زائل ہو سکتی تھی۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ محض چار ماہ بعد سرکاری سوگ کی مدت ختم ہو جاتی اور وہ برسرِ اقتدار مہارانی بن کر سامنے آتی۔

دروازے پر ایک بار پھر کسی نے ناخن مارے۔ اب جیہ کو انداز ہوا کہ باہر کوئی موجود ہے۔ اس نے پلٹ کر دروازہ کھول دیا۔ اسکاٹ اور وارڈ اچھل کر اس کی گود میں آ رہے۔

”ڈارلنگ!“ کتوں کے ساتھ ہی لیڈی مودی کی آواز سنائی دی۔ زرد جواہر کی چمک نے اس کے جسم کے گرد ایک ہالہ سا بنا رکھا تھا۔ ”تو آخر کار تم یہ سب کر گزریں! مجھے بتائے بغیر۔“

”کس کی بات کر رہی ہو، ہنسی؟“ جیہ نے کتوں سے جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

”تمہارے بال۔“ لیڈی مودی کسی قدر پر جوش دکھائی دے رہی تھی۔ ”تمہیں اس

بلے میں دیکھ کر تو لوگ سانس لینا بھول جائیں گے تم تو کلار ابو کی طرح دکھائی دے رہی ہو۔“

”ہم بیوہ ہیں، پیسی۔“ جیہ نے جواب دیا۔ ”ہمارے بال ہمارے شوہر کے دیہانت کے وقت تراشے گئے تھے۔“

لیڈی مودی اس کی توجیہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی۔ ”کیا بے وقوفی کی بات ہے۔ کیا پرتاپ قبر میں لینا یہ سب دیکھ رہا تھا اس وقت جبکہ دنیا ختم ہونے جا رہی ہے یہ کام جو تمہارے بڑوں نے کیا ہے، احقانہ نہیں ہے؟“

جیہ نے موضوع بدلنا چاہا۔ ”لندن سے واپسی کا سفر کچھ ایسا ناخوشگوار تو نہ تھا۔“
 ”فلائٹ بھی بہت اچھی تھی۔“ لیڈی مودی بھی اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔ ”میں تو حادثے کی بات کر رہی تھی ڈارلنگ! پرتاپ کو جہاز سمیت گرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟ میرے تمام دوست بلند و بالا عمارتوں سے چھلانگ لگانے یا ٹرین کے سامنے کودنے کو ترجیح دیتے ہیں۔“ لیڈی مودی نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھمائیں۔ ”لیکن ان سب سے بڑھ کر وہ خبر ہے جو آج سہ پہر کو ہی زبان زد عام ہوئی ہے۔“
 ”کیا کوئی اور اشاک مارکیٹ تباہ ہو گئی ہے؟“

”اوہ ڈارلنگ!“ لیڈی مودی اٹھلائی۔ ”اگر تم ہر وقت پوجا میں مصروف رہنے کے بجائے کچھ وقت وائرلیس پڑھنے میں صرف کرو تو ایسے سوالات کی نوبت نہ آئے۔ کیا تم نے نہیں سنا؟ نیشنل کانگریس، شہنشاہ برطانیہ سے ملنے نہیں جا رہی ہے انہوں نے لندن میں گول میز کانفرنس میں شرکت سے انکار کر دیا ہے۔“
 ”لیکن، کیوں؟“

لیڈی مودی مسکرائی۔ ”انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ایک ایک انگریز کو ہندوستان سے نکال باہر کریں گے۔ انہیں اب داخلی خود مختاری کی ضرورت نہیں رہ گئی۔ وہ جمہوریہ ہونا چاہتے ہیں۔ 26 جنوری کو یوم جمہوریہ قرار دے دیا گیا ہے۔ ہم سب اس روز مل کر یونین جیک سرنگوں کریں گے اور ہندوستانی پرچم لہرا کر برطانوی راج کے خاتمے کا اعلان کریں گے۔ بلی اب واقعی کبوتروں میں آ پھنسی ہے، ڈارلنگ! دہشت گردوں کے بموں کے حملے تیز ہو جائیں گے۔ ہم سب لوگوں کو اپنے ریشی لبادوں کو آگ لگانی ہو گی اور اس کی جگہ وہ بے سرے اور بے ڈھنگے سوتی جے زیب تن کرنے ہوں گے۔“

اس نے اپنی انگلی کو ہونٹوں پر رکھ کر ایک ہوائی بوسہ اچھالا۔ ”لیکن ہمیں خہ فزہ

ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نیا سال شروع ہو چکا ہے مجھے امید ہے کہ تمہارا یہ نیا پیر اسٹائل 1935ء کا ایک خوبصورت انداز ثابت ہو گا۔“

مہاراجہ ڈنگرا کی رہائش گاہ شیش محل کی راہداریوں میں ہزاروں آئینے چمک رہے تھے۔ جیہ ان آئینوں میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے چھوٹے ڈنگرا کے پیچھے چلتی ہوئی بیرونی صحن کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں ایک کار اس کو، اس کی ماں کے پاس لے جانے کو تیار کھڑی تھی۔ شو فر کو راستے کا بخوبی علم تھا۔ وہ کار کو ایک ایسی کشادہ گلی میں لے آیا تھا جس کی دونوں جانب سفید رنگ کے بنگلوں کی ایک طویل قطار موجود تھی۔

”آپ بہت خوش قسمت اور خوش بخت بیٹی ہیں، شہزادی۔“ اس نے نہایت ادب اور احترام سے جیہ کو مخاطب کیا۔ ”میں نے ستی ماتا کو محض ایک بار دیکھا ہے لیکن مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی بہت ہی مقدس، معتبر اور پوتر ہستی کے چرنوں میں حاضر ہوں ان کا سر میں نے ہمیشہ بلند دیکھا ہے۔ ان کی آنکھیں یوں روشن ہیں جیسے ان میں بھگوان چمکتا ہو۔“

جیہ اس شہابی گاڑی میں بیٹھی ہوئی اس لمحے کو فراموش نہ کر سکتی تھی جب اس نے بالمیر کی مہارانی کو بالمیر کے زنان خانے میں ایک ناپسندیدہ شخصیت کے روپ میں دیکھا تھا جسے پوری ریاست پر ایک بوجھ سمجھا جا رہا تھا۔

کار ایک گیٹ سے مڑ کر اس شاندار بنگلے میں داخل ہو گئی جس کے برآمدے میں موٹا قالین بچھا ہوا تھا۔ وہاں کئی لوگ موجود تھے۔ تعداد کے برخلاف وہ نہایت خاموشی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں بچے بھی تھے اور بڑے بھی۔ لیکن جیہ کو دیکھ کر نہ کسی بڑے نے کوئی رد عمل ظاہر کیا اور نہ کسی بچے نے شرارت کی۔ البتہ انہوں نے کسی کو آتے ہوئے محسوس کیا اور چند ایک نے گردنیں گھما کر کار کا جائزہ لیا۔

ایک عمر رسیدہ آدمی جیہ کو ہجوم سے اٹے ہوئے برآمدے میں سے گزارتا ہوا ایک بڑے کمرے میں لے گیا۔ جہاں زیادہ تر لوگ زمین پر بیٹھے ہوئے تھے البتہ ایک بات جیہ نے بطور خاص نوٹ کی کہ وہ لوگ آلتی پالتی مارے چر خاکتنے میں مصروف تھے۔

”ستی ماتا کا کہنا ہے کہ ہم اپنی مصنوعات کو فروغ دے کر ہی برطانوی جادو کا اثر توڑ سکتے ہیں۔“ جیہ کے گائیڈ نے جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔

جیہ نے اپنی حیرت چھپانے کے لئے رخ بدل لیا۔

اور پھر اس نے خاموشی سے چرخہ کاتنے والوں کے عقب سے سوتی ساڑھی میں ملبوس

ایک باوقار خاتون کو اپنی جگہ سے اٹھتے دیکھا.....

جیہ نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا۔ بس اس نے اٹھنے والی ہستی کے انداز کو پہچانا اور اپنی ماں کے چرن چھونے کی لئے تیزی سے آگے بڑھی۔ سانولے ہاتھ نے جیہ کے بالوں پر سے ساڑھی ہٹائی اور جیہ نے اس ہاتھ کو اپنے رخسار کے ساتھ پیوست کر لیا۔ دس سال سے اس نے مہارانی کو نہیں دیکھا تھا لیکن وہ بچپن سے لے کر اب تک اس جلد کی ٹکٹکی کو بھول نہیں پائی تھی۔

”ہم جانتے تھے کہ مرنے سے پہلے ایک بار اپنی بیٹی سے ضرور مل لیں گے۔“ مہارانی کا لہجہ نرم لیکن انداز میں وہی تمکنت تھی جو کبھی بالیئر کی مہارانی کے طور پر ہوا کرتی تھی۔ ”لیکن ہمارا خیال تھا کہ وہ دلہن کے روپ میں سامنے آئے گی۔ بیوہ کے روپ میں نہیں۔“ آنسو جیہ کی آنکھوں میں ترپ اٹھے۔ مہارانی نے جیہ کو یاد نہیں دلایا کہ راجپوت لڑکیاں اپنے دکھ آنکھوں کے راستے نہیں بہایا کرتیں۔ اس کے برعکس بوڑھے ہاتھ اس کے بال سہلانے لگے جیسے وہ کوئی جوان عورت نہیں، کوئی بچی ہو۔

”ہم جانتے ہیں کہ یہ غم جھیلنا آسان نہیں۔“ مہارانی نے اسے تسلی دی۔ ”لیکن ستی ماتا کے الفاظ یاد کرو شہزادی، اصل اور حقیقی ستی یہ ہے کہ عورت اپنے ارد گرد کی دنیا ٹوٹ پھوٹ جانے کے باوجود بھی زندہ رہے۔“

”ہم آپ کے نواسے کو آپ کی آشریاد کے لئے ڈگرالائے ہیں، حکم!“ جیہ نے پہلی بار زبان کھولی۔

مہارانی کے چہرے کی بوڑھی لکیریں مسکرانے کے انداز میں پھیل گئیں۔ خوشی جیسے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

”ہم آج سہ پہر شیش محل آئیں گے۔“ مہارانی نہال ہو رہی تھی۔ ”ہم نہیں چاہتے کہ وہ یہاں آئے، اس وقت تک، جب تک ہم اس بات کی وضاحت نہ کر لیں کہ لوگ ہمیں ستی ماتا کہتے ہیں اور کوئی اختیار نہ ہونے کے باوجود محبت میں جانے کن کن ناموں سے پکارتے ہیں۔ لیکن اب ہمیں جانا چاہئے کیونکہ ڈاکٹرز ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

جیہ کے چہرے پر تشویش کے سائے لہرائے تو مہارانی ہنس دی۔ ”فکر کی بات نہیں ہے، شہزادی، دراصل ہم یہاں ایک ڈپنری چلا رہے ہیں اور نرسنگ ہوم ہے۔ دوسری جانب ایک اسکول اور فری کچن ہے۔ چھوٹا ہمارے اخراجات پورے کرتا ہے۔ وہ لڑکا بہت اچھا ہے، ذہین ہے۔ اسے اس سے کوئی غرض نہیں کہ ہم کتنا خرچ کرتے ہیں۔ اس نے

”بھی ہمیں فنڈز میں کمی نہیں آنے دی۔“

پتلی اور لمبی انگلیوں نے جیہ کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی۔ ”اب ہم یہاں سستی ماما کے منٹروں کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ تمہیں وہ یاد ہے نا، شہزادی؟“

”کیوں نہیں، حکم!“ جیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”رام نام ست ہے..... رام نام ست ہے....“

مہارانی نے جیہ کو گلے لگا کر پیار کیا اور پلٹ کر باوقار انداز میں چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

جیہ چرخہ کاٹنے والوں کے درمیان کھڑی بہت دیر تک یہ سوچتی رہی کہ کیا اس کے سوگ سے ارجن کا مستقبل محفوظ رہ سکے گا۔ مہارانی نے ایک بار اسے سبق دیا تھا کہ حرم کی اونچی اونچی دیواریں ہی عورت کے تحفظ کی ضمانت ہوتی ہیں۔ بقول مہارانی کے، عورت کے چہرے کا نقاب اسے بیرونی دنیا کے خطرات سے، ایک تیز دھار تلوار کے مقابلے میں زیادہ تحفظ دے سکتا ہے لیکن اب اس کی ماں کہہ رہی تھی کہ نقاب، آزادی کے راستے کی رکاوٹ ہے۔ کم از کم مہارانی کی باتوں سے جیہ نے یہی اندازہ لگایا تھا۔

ارجن بہت جلد اپنی نانی سے بے تکلف ہو گیا اور چند ہی دنوں کے اندر وہ ہر جگہ اس کا تعاقب کرنے لگا۔ مہارانی اپنے اداروں کے دورے پر جاتی تو ارجن ساتھ ہوتا۔ مویشیوں کی دیکھ بھال کرتی تو ارجن موجود ہوتا۔ غرضیکہ یوں لگتا جیسے وہ اپنی نانی کا سایہ بن گیا ہو۔

ڈنگرا کی سرحدوں کے باہر جو واقعات رونما ہو رہے تھے انہوں نے سرحدوں کے اندر کی زندگی پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا چنانچہ چھوٹے ڈنگرا نے جیہ کو تجویز پیش کی کہ وہ ریاست کے انتظامی امور کی سوجھ بوجھ پیدا کرے اور ان میں دلچسپی لے۔

”کیا تم نے راج نیتی کو پڑھا ہے، حکم!“ جیہ نے شیش محل کی راہداریوں میں اس کے پیچھے پرائیویٹ اسٹڈی کی طرف جاتے ہوئے دریافت کیا۔

چھوٹے نے مسکرا کر جیہ کو دیکھا۔ ”راج نیتی، حکومت چلانے کا ایک فن ہے، شہزادی۔“ اس نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ ”لیکن آج کے دور میں بھی اس کی وہی اہمیت ہے جو پہلے دور میں تھی۔ میرے والد نے مجھے ریاستی امور سیکھنے کے لئے مہاراجہ بڑودہ اور فاراجہ امور سیکھنے کے لئے مہاراجہ بیکانیر کے پاس بھیجا تھا۔“

اس نے ایک ایسے کمرے کا دروازہ کھولا جس کے دیوار گیر شیلٹ ڈنگرا گزٹ کی مجلد کتابوں سے بھرے ہوئے تھے۔ چیمبر کے وسط میں ایک بڑی میز پر کتابوں کا انبار لگا ہوا تھا۔

دیواروں پر کوئی تصویر آویزاں نہ تھی۔ روشن کمرے میں جلد کتابوں پر بنے ہوئے سنہری مونوگرام چمک رہے تھے۔

قسط کنٹرول 1897ء-1903ء معاہدوں کی بات چیت وائس ریگل کے دورے۔ آپاشی کے منصوبے 1900ء-1928ء

چھوٹے نے ایک بھاری بھرکم کتاب شیفت سے نکال لی۔ ”مثال کے طور پر اسے دیکھیں۔ کیا آپ جانتی ہیں شہزادی کہ مہاراجہ بیکانیر نے صرف بیس برس کی عمر میں ہندوستان میں آپاشی کا نظام متعارف کروایا تھا۔ ایک عظیم نظام آپاشی لیکن برطانیہ نے اس کے خوابوں کی تکمیل کے لئے اسے مطلوبہ فنڈز فراہم نہیں کئے۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتا شہزادی تو تمہارا صحرا یعنی صحرائے مرگ اس وقت ہندوستان کے غلے کا گودام ہوتا۔“

اس نے کتاب واپس شیفت میں رکھی اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”اگلا سال ہم حکمرانوں کے لئے بے حد سخت ہو گا، شہزادی ہم سلطنت برطانیہ اور اصلاہیوں کے درمیان پس رہے ہیں۔ سلطنت برطانیہ پہلے ہی ریاستوں سے ایک کروڑ پاؤنڈ کے ٹیکس جمع کرتی ہے تاکہ اس رقم کو برطانوی ہندوستان پر خرچ کر سکے۔ جب قوم پرستوں کے مطالبات بڑھیں گے اور صورت حال مزید تشویش ناک ہو گی تو سلطنت سوائے ہمارے کس کی طرف دیکھے گی۔ جوں جوں ہم ٹیکسوں میں اضافہ کریں گے ہمارے عوام مشتعل ہوں گے اور اصلاہیوں کے حق میں ہوتے جائیں گے۔“

جیہ کو کمرے کی فضا میں ایک عجیب طرح کا کھنچاؤ سا محسوس ہونے لگا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اگر اس کا بیٹا کامیابی کے ساتھ اپنا تخت بچانا چاہتا ہے تو خود اسے اپنی ناتجربہ کاری کو تجربے کی بھٹی میں ڈالنا ہو گا۔ چنانچہ اس نے اپنے معمولات بدل ڈالے۔ اب وہ اپنی مہاجر ڈنگرا کے انجینئروں اور انتظامی افسران کے ساتھ گزارنے لگی تاکہ دیکھ سکے کہ وہ ریاست کے امور کس طرح چلاتے ہیں اور انہیں کس قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

دریائے برہم پترا کے پانی کو آپاشی کے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے منصوبوں پر بات چیت ہوتی۔ اسے حتمی صورت دی گئی تو ڈیم کی جگہ کا انتخاب کیا گیا۔ فیصلہ کیا گیا کہ اس کا نام سابق انجمنی حکمران کے نام پر رکھا جائے گا۔ عرصہ دراز سے نظر انداز کئے جانے والے قبائل کو اسکولوں اور شفاخانوں کی ضرورت تھی اس مقصد کے لئے ڈنگرا کے مالی مشیر و مسائل میں اضافے کی تجاویز مرتب کر رہے تھے۔

جب یہ لوگ چلے جاتے تو جیہ خود کو ڈنگرا کی اسٹڈی میں مقید کر لیتی لیکن آرام کرتی۔

کے لئے نہیں۔ بلکہ وہ گزٹ کی موٹی موٹی کتابوں کا مطالعہ کرتی اور فائلیں دیکھتی۔ اعداد و شمار کی لمبی لمبی فہرستیں اس کی آنکھیں تھکا ڈالتیں۔

البتہ شام جبہ جس ماحول میں گزارتی اس سے اسے بالمیرہ کا زنان خانہ یاد آ جاتا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ بالکونی میں بیٹھ کر دیر تک آسمان کی بلندیوں پر محو پرواز پرندوں کو دیکھتی۔ یا لان میں مور کا رقص دیکھتی۔

”ڈنگرا میں تمہارا قیام سود مند تو ہے، شنرا دی؟“ مہارانی نے ایک روز اس سے دریافت کیا۔

”جی حکم!“ جبہ نے جواب دیا۔ ”ہر ہائی فیس نے انتظامی امور میں ہماری بہت مدد کی ہے۔“

مہارانی یوں مطمئن ہو گئی جیسے وہ اسی جواب کی خواہش مند تھی۔ وہ اس کے بعد بھی جبہ سے اس کے مستقبل کے حوالے سے بات چیت کرتی رہی تھی۔

موسم بہار آیا تو ڈنگرا میں جشن بہار کا آغاز ہو گیا۔ ریاست کی حدود سے باہر ہونے والے سیاسی اتار چڑھاؤ کا سایہ بھی یہاں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ نوجوان لڑکیاں رنگ برنگے لباس پہنے مختلف چوراہوں پر رقص میں مصروف تھیں۔

اس کے بعد ہولی تھی۔ رنگوں کا تہوار۔ دربار کے ہاتھی کو شیش محل تک لایا گیا اور چھوٹا ڈنگرا اس پر سوار ہو گیا۔ ہاتھی کے پیچھے پیچھے ایک ٹرک تھا جس کے اوپر لگے ہوئے ٹینک میں رنگین پانی تھا۔ اس ٹینک سے دو پائپ نکل کر ہودے تک چلے گئے تھے۔ ارجن چھوٹے ڈنگرا کے ساتھ ہودے میں موجود تھا۔

ہاتھی اور ٹرک آگے پیچھے دارالحکومت کی گلیوں اور سڑکوں پر گشت کرتے رہے۔ پرنس ارجن اپنے پائپ کی مدد سے رنگین پانی جھوم پر اچھالتا رہا اور قہقہے لگاتا رہا۔ چھوٹا ڈنگرا یہ سب دیکھ دیکھ کر محظوظ ہوتا رہا۔

لوگوں نے بڑے بڑے فوارے تھام رکھے تھے۔ وہ ان کا رخ مہاراجہ ارجن کی طرف کر کے پانی پھینکتے۔ راستے میں آنے والی ہر بالکونی سے سبز نیلا اور پیلا پاؤڈر مہاراجہ پر پھینکا جاتا رہا حتیٰ کہ مہاراجہ ارجن ہاتھی اور ٹرک کے علاوہ اس کا جلوس رنگوں کا ملبوہ بن کر رہ گیا۔

سیرپور کا ایک نقشہ میز پر پھیلا ہوا تھا۔ ایک انجمن اس نقشے پر جھکا جبہ کو مختلف نشانات کی تفصیل بتانے میں مصروف تھا کہ اسنڈی کا دروازہ پرستو انداز میں کھلا۔ ”ڈارلنگ!“ لیڈی

مودی کی جانی پہچانی آواز جیہ کو سنائی دی۔ ”پورا ہندوستان ساحل سمندر کی جانب رواں ہے لیکن تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“

لیڈی مودی کے ننھے سے کتے نے ایک لمبی چھلانگ لگائی تو انجینئر گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ خوفزدہ نگاہوں سے کبھی کتے کو دیکھ رہا تھا اور کبھی آنے والی کا جائزہ لے رہا تھا۔
”اور یہ بور قسم کے کاغذات کیا ہیں؟ لیڈی مودی نے میز پر پھیلے ہوئے نقشوں کی طرف اشارہ کیا۔

ڈنگرا کا قوی الجشہ جسم دروازے پر نمودار ہوا۔ ”اس عمر میں بھی تم اتنی پر جوش ہو؟“ اس نے وہیں سے ہانک لگائی۔

”قدرتی بات ہے، ڈارلنگ!“ لیڈی مودی نے پلٹ کر جواب دیا۔ ”میں تو تک آگئی ہوں۔ پرنس آف ویلز کے دورہ ہندوستان کے بعد تو جوش نام کو نظر نہیں آیا۔“
”تو کیا اب تم قانون توڑنے جا رہی ہو؟“

لیڈی مودی نے سگریٹ ہولڈر سے اس کا شانہ تھمتھایا۔ ”عداری اور حکم عدولی کے بہت سے طریقے ہیں، ڈارلنگ۔ میں انہیں دیکھوں گی۔ لیکن پنہیں کیا؟ کم از کم ہیرے جواہرات پہن کر تو سلطنت برطانیہ کی حکم عدولی نہیں ہو سکتی۔“

چھوٹے ڈنگرا نے قہقہہ لگایا۔ ”میرے پاس ایک گاندھی کیپ رکھی ہے، وہ تمہیں بھجوا دوں گا۔“

جیہ جھٹکے سے پلٹی۔ اسے چھوٹے کے تبصرے پر حیرت اور افسوس ہوا تھا۔ گزشتہ تین ہفتوں کے دوران گاندھی نے ساحلی شہر ڈانڈی کی طرف دو سو میل کا سفر پیدل طے کیا تھا جہاں وہ برطانوی قوانین توڑنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا گاندھی کے قافلے کا حجم بڑھتا جا رہا تھا۔ سینکڑوں کی تعداد اب ہزاروں ہو چکی تھی۔

لیڈی مودی نے جیہ کے چہرے کے تاثرات دیکھے تو مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ ”اوہ ڈارلنگ“ اس نے جیہ کے کندے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”سنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ گاندھی بھگوان نہیں انسان ہے۔ وہ بھی بنتا ہے۔ اس سے بڑھ کر وہ ڈانس بھی کرتا ہے۔ لندن میں قیام کے دوران وہ فاکس ٹراٹ کا دیوانہ تھا۔ ممکن ہے اس نے ٹانگو بھی سیکھا ہو۔ اب تم ذرا جلدی کرو، ورنہ اتنے اچھے نظارے سے محروم رہ جائیں گے۔“

جیہ نے تصور کی آنکھ سے لیڈی مودی کے سر پر گاندھی کیپ دیکھی تو قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکی۔ تاہم جلد ہی ان کی کار ڈنگرا کی سرحد کی طرف رواں دواں تھی جہاں گاندھی کا

ہلوس پہنچنے والا تھا۔

نصف شب سے ذرا پہلے چاندنی نے جیہ کو بیدار کیا۔ یہ وہی دن تھا جب گاندھی نے قوانین توڑنے کا اعلان کرنا تھا۔

”ستی ماتا“ ڈانڈی روانہ ہو چکی ہیں، حکم!“ چاندنی نے مہارانی کی بابت جیہ کو آگاہ کیا۔ ”مہاتما کی جانب سے انگریز کی حکم عدولی سے قبل وہ رات بھر مہاتما کے ساتھ پرارتھنا کی خواہش مند تھیں۔“

جیہ کے ہونٹ خود بخود ستی کی پوجا کے انداز میں سکڑ گئے۔ اسے وہ وقت یاد آ رہا تھا جب اس نے آخری بار بحرہند کو دیکھا تھا۔ وہ تب اپنے شوہر کے ہمراہ ایک کتیا کی شادی میں شرکت کے لئے پرتاپ گڑھ گئی تھی۔ صرف پانچ سال بعد وہ عورت جس سے اس نے ستی پوجا سیکھی تھی، گاندھی کے کیپ میں موجود تھی۔

کار شیش محل کے بلند و بالا دروازے کے سامنے لگ چکی تھی۔ ابھی سورج دیوتا اپنے سفر پر روانہ نہیں ہوا تھا لیکن گرمی کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ لیڈی مودی کے لئے یہ گرمی ناقابل برداشت تھی سو اس نے بے دم ہو کر جیہ کے کندھے سے سر نکال دیا تھا۔

جوں جوں وہ لوگ سمندر کے قریب ہو رہے تھے ہوا میں نمی آتی جا رہی تھی۔ کپڑے البتہ اب بھی پسینے میں شرابور تھے۔ عین ساحل کے اوپر انہیں ایک چوٹی ڈاکس دکھائی دے گیا تھا۔ تمام علاقہ گاندھی کے ورکروں سے کچھا کھچ بھرا ہوا تھا اور وہ سب بیک زبان ہو کر ”اللہ۔ رام۔ کراسٹ“ کا ورد کر رہے تھے۔

جا بجا اخبار نویس بکھرے ہوئے تھے جو گاندھی کی طرف سے قانون توڑنے کے اعلان کے منتظر تھے۔ ان کی نوٹ بکس تیار تھیں اور نگاہیں اس ہٹ پر مرکوز تھیں جس میں گاندھی جی قیام پذیر تھے۔

تب ہی ایک لٹھ بردار ہٹ کے دروازے پر نمودار ہوا اور اس نے گاندھی کی آمد کا اعلان کیا۔

چند ہی ثانیوں بعد جھکی ہوئی کمر والا ایک شخص چھڑی لئے دروازے سے باہر آیا اور جوم کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

یہی مہاتما گاندھی تھے۔ وہ مسز نائیڈو کے ہمراہ چوٹی ڈاکس کی طرف بڑھے۔ سمندر کے قریب پہنچ کر گاندھی نے اپنی چھڑی مسز نائیڈو کو تھمائی اور پانی میں اتر گئے۔

سمندر کی لہریں جھاگ اڑاتی اس کمر خیمہ شخص کو ہلانے کی کوششوں میں مصروف

تھیں لیکن وہ اپنے پیر جمائے کھڑا تھا۔

جب لہریں خشکی کو بھگو کر دوبارہ سمندر کے سینے میں اتریں تو گاندھی نے جھک کر ایک مٹھی ریت اٹھالی۔

مزنائیڈو نے اپنے ہاتھ فضا میں لہرائے۔ ”جے ہند“ اس نے بلند آواز سے نعرہ لگایا اور گاندھی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

دونوں رہنما آہستہ آہستہ لکڑی کے پلیٹ فارم پر آ گئے۔ مائیکروفون ان کے سامنے کر دیئے گئے۔ گاندھی نے ریت سے بھری ہوئی مٹھی اوپر اٹھائی۔ تب ان کی بھاری بھر کم آواز

ہوا کے دوش پر لہرائی۔ ”یہ رہا ہندوستان پر برطانوی سلطنت کا غاصبانہ قبضہ۔“

اس کے ساتھ ہی گاندھی نے مٹھی کھول دی اور گیلی ریت فضا میں بکھرا دی۔

ہجوم نعرے لگاتا سمندر میں کود گیا۔ چند ہی لمحوں کے اندر ہر شخص ریت سے مٹھیال بھر بھر کر فضا میں بکھیرنے لگا۔

جیہ نے مہارانی کو اس وقت دیکھا جب وہ سمندر سے باہر آ رہی تھی۔ اس کی سفید ساڑھی بھیگ کر ٹخنوں سے چمٹ گئی تھی۔ جیہ اس کی طرف بھاگی۔

”آپ کیا کر رہی ہیں، حکم؟“ اس نے سرگوشیانہ انداز میں ماں کو مخاطب کیا۔ ”آئیے ہمارے ساتھ ڈنگرا واپس چلیں۔“

مہارانی رک گئی۔ اس نے اپنی مٹھی کھول دی اور ریت جیہ کے کپڑوں پر آگری۔

جب قحط نے بالیر کو تباہی کے کنارے پر پہنچا دیا تھا تو تمہارے والد نے ملکہ وکٹوریہ سے مدد

کی درخواست کی تھی۔ وہ خالی ہاتھ واپس آئے تھے۔ حتیٰ کہ لارڈ کرزن نے پارلیمنٹ کی

درخواست کے باوجود ٹیکس اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ اسے ہماری پریشانیوں اور تکالیف

کوئی احساس نہ تھا۔ جب انگریز وائسرائے نے از خود ہماری مدد کے لئے کہا تو اس کے

آقاؤں نے ان التجاؤں پر کان نہ دھرا۔ اب مہاتما ریت کے ان ذروں کو ایسا اسلحہ بنا دے

جو اس سلطنت کو تباہ کر دے گا۔“

”لیکن انگریز اسے گرفتار کر لیں گے، حکم!“ جیہ نے خدشہ ظاہر کیا ”کیا آپ اس کی

تقلید میں جیل جائیں گی؟“

”ہم سچائی کی راہ پر چلنے کے لئے آزاد ہیں، خواہ اس کا اختتام جیل کے دروازے پر ہو

کیوں نہ ہوتا ہو۔“ مہارانی نے ایک عزم سے جواب دیا۔ ”سیرپور واپس جاؤ، شنزادی اور

اپنے بیٹے کے تحت کی حفاظت کرو۔ ہمیں کچھ نہیں ہو گا۔“

جیہ ایک بار پھر ڈنگرا میں موجود تھی تاکہ وہ رسومات ادا کر سکے جو اس کے سوگ کے خاتمے کے لئے ہونے والی تھیں۔ اس کے ذہن میں اب بھی اس کی ماں تھی جسے وہ ڈانڈی میں گاندھی کے آشرم میں چھوڑ آئی تھی۔

ہر سہ پہر وہ انتظار کرتی کہ چھوٹا ڈنگرا آج اپنے سیکرٹریٹ سے واپس آ کر اسے گاندھی کی گرفتاری کی خبر سنائے گا مگر اس کے برعکس چھوٹا ڈنگرا ہر شام آ کر اسے یہی یقین دلاتا کہ وہ اب تک اپنے آشرم میں موجود ہے۔ البتہ گاندھی کی نمک ملی ریت کی مٹھی کو ملک گیر شہرت حاصل ہوئی تھی۔

اب حالت یہ تھی کہ برطانوی ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں سمندری نمک فروخت ہو رہا تھا۔ ہندوستان کے تمام ساحلی دیہات کے کلین بڑے بڑے برتن لے کر سمندر میں گھس گئے تاکہ غیر قانونی نمک تیار کر سکیں۔ کلکتہ کے میسن نے ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے لوگوں پر زور دیا تھا کہ وہ برطانوی سوت یا ریشم سے بنے ہوئے کپڑے پہننا چھوڑ دیں۔ اسے جیل بھیج دیا گیا۔

دہلی میں پندرہ ہزار مردوں اور عورتوں نے پولیس کے ہاتھوں پنڈت مالویا کی گرفتاری کا نظارہ کیا جو مٹھی بھر نمک بھی اپنے ساتھ لایا تھا۔ پنڈت میں ہزاروں افراد ڈاکٹر راجندر پرشاد کی ہدایات کے تحت نمک بنانے کے منتظر تھے۔ پولیس والوں نے ہائی دے بلاک کر دی تھی۔ مظاہرین گھڑ سوار پولیس کے سامنے لیٹ گئے تھے۔ جو لوگ گھوڑوں تلے روندے گئے تھے انہیں فوراً ہی وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا اور ان کی جگہ نئے رضاکاروں نے لے لی تھی۔

وائسرائے نے اوپر تلے کئی آرڈیننس پاس کئے تھے جن کی رو سے پولیس کو گرفتاری کے لامحدود اختیارات دے دیئے گئے تھے۔ پورے برصغیر میں اساتذہ خانہ دار عورتوں اور کاشتکاروں کی ایک بڑی تعداد وائسرائے کے احکامات کی خلاف ورزی کر کے گرفتاریاں پیش کر رہی تھی۔

سول نافرمانی کی خبروں کو کچلنے کے لئے سنسرشپ سخت کر دی گئی تھی۔ ہندوستانی اخبارات نے برطانوی حکومت کے ان فیصلوں پر احتجاج کرتے ہوئے اپنے چھاپے خانے بند کر دیئے تھے۔

”جھگوان ہی جانتا ہے کہ ان اقدامات کے ذریعے وائسرائے کیا چاہتا ہے؟“ چھوٹے ڈنگرا نے تازہ ترین خبریں جیہ کو سناتے ہوئے تبصرہ کیا۔ ”مقامی پولیس پر سنسرشپ کا مطلب یہ ہوا کہ ہند کے کسی بھی کونے میں ہونے والا واقعہ زبانی طور پر ہی معلوم ہو سکے گا۔“ اس

نے اپنا بڑا سا سرمہ انداز میں ہلایا۔ ”اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس سال کے آخر میں ہمیں شریف آدمیوں کی طرح گول میز کانفرنس میں شرکت کرنا ہے۔ بالکل یہ سوچ کر کہ یہاں ہنگامے نہیں بلکہ کرکٹ کا کوئی میچ ہو رہا ہے۔“

ڈنگرا کی رپورٹیں یہ تھیں کہ کھیل بگڑتا جا رہا ہے۔ شمال مغربی سرحدی صوبے میں قبائلیوں نے اٹلی میں گرے بالڈی کی ری بیلکن موومنٹ کی طرز پر سرخ پوشی کی تحریک شروع کر دی ہے۔ اس کے باوجود کہ ان کی تحریک تشددانہ نہیں ہے۔ برطانوی سلطنت نے اپنی سب سے بہترین رجمنٹ تھرٹی سیونٹھ گارل رائفلز کو ان پر گولی چلانے کا حکم دے دیا ہے۔ جب اسی سالوں میں پہلی بار راج کے فوجیوں نے اپنے برطانوی افسروں کے احکامات ماننے سے انکار کیا اور اپنی رائفلوں کو سرنگوں کر لیا تو انگریز انسپکٹر آف پولیس نے غصے سے بے قابو ہو کر اپنی مسلح جیپ مظاہرین پر چڑھا دی اور مشین گن سے فائر کھول دیا جس سے ستر افراد ہلاک ہو گئے اور متعدد زخمی ہوئے۔

دو ہفتوں کے اندر اندر برطانوی راج نے ساٹھ ہزار افراد کو جیلوں میں ٹھونس دیا اور جب گاندھی نے دھرنا سالٹ ڈپو کی طرف پیش قدمی شروع کی تو انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ جیہ نے مہاراجہ کی اسٹڈی کی طرف جانے والی منقش راہ داریاں تقریباً بھاگتے ہوئے طے کی تھیں۔ ڈنگرا آگے کو جھکا تو کرسی اس کے بھاری بوجھ تلے چرچا اٹھی۔

”سب صحیح ہے شنزادی۔“ اس نے بوکھلائی ہوئی جیہ کو ٹھہرے ہوئے انداز میں مخاطب کیا۔ ”تمہاری والدہ ابھی تک آزاد ہیں۔“

”کیا وہ آشرم میں واپس آگئی ہیں؟“

”نہیں۔“ ڈنگرا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”سالٹ ڈپو کے مارچ میں مسز نائیڈو نے کمان سنبھال لی ہے۔ تمہاری والدہ زخمیوں کی مرہم پٹی میں مدد کے لئے ان کے ساتھ ہیں۔“

”تب لازمی طور پر ہمیں جا کر ان کی مدد کرنا ہوگی۔“ جیہ بول اٹھی۔ ”ہم فوری دھرنا روانہ ہونا چاہتے ہیں۔“

”قطعاً نہیں۔“ ڈنگرا نے حتمی لہجے میں کہا۔ ”اگر تمہیں سالٹ ڈپو کے ارد گرد دیکھ لیا گیا تو تمہارا حق حکمرانی چھین لیا جائے گا۔ ارجن لازمی طور پر سیرپور کے تخت سے محروم ہو جائے گا۔ میں نے اپنے آدمی روانہ کر دیئے ہیں جو سستی ماتا کی حفاظت کریں گے اور انہیں کسی بھی آفت سے تحفظ دیں گے۔“

”اگر وہاں ہنگامہ ہو گیا تو؟“ جیہ کے لہجے میں تشویش تھی ”فرض کرو پولیس نے ان پر

حملہ کر دیا تو کیا ہو گا؟

”میرے آدمی پل پل کی خبریں روانہ کریں گے۔“ ڈنگرا نے اسے یقین دلایا۔ ”تم جانتی ہو کہ اخبارات پر سنسر ہے۔ اس صورت میں کون جانتا ہے کہ ہنگامے کی خبریں محض افواہ ہوں۔“

انہیں دھڑکا سے تازہ ترین خبروں کا انتظار تھا۔ ڈنگرا اس عرصے کے دوران اپنے انتظامی امور میں الجھا رہا تھا۔ اس کی اسٹڈی فائلوں کا کوئی گودام محسوس ہوتی تھی۔ جب بھی کوئی سیکرٹری اندر داخل ہوتا جیہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوتی لیکن وہ رنگ برنگی فائلیں مہاراجہ کو تھما کر لوٹ جاتا۔

ایک شام غروب آفتاب کے وقت ایک سیکرٹری بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا۔ دھڑکا سے آنے والا ٹیلی گرام اس کے ہاتھ میں تھا۔ ڈنگرا نے اسٹیل لیپ جلا دیا۔ لفافہ کھولنے میں بھی اس نے بے تلبی کا مظاہرہ ہی کیا تھا۔

اس نے بلند آواز سے ٹیلی گرام کا پیغام پڑھنا شروع کر دیا۔ ”حکم برطانوی راج کے عظیم الشان نمک کے گوداموں کے گرد خار دار تاریں لگا دی گئی ہیں اور خندقیں کھود دی گئی ہیں۔ خار دار تاروں کے باہر چار سو ہندوستانی پولیس والے چھ برطانوی افسروں کی سربراہی میں حفاظت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ تمام وقت رضاکاروں کے جتھے مرکزی دروازہ عبور کرنے کی کوششیں کرتے ہیں اور تمام وقت پولیس والے انہیں بے دردی سے مارتے ہیں۔ رضاکار کسی قسم کی کوئی مزاحمت نہیں کر رہے۔ سٹی مائٹا اور مسز ٹائیڈو دیگر عورتوں کے ساتھ زخمیوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہیں۔“

”ہم لوگوں نے بعض غیر ملکی اخبار نویسوں کے ہمراہ ایک عارضی ہسپتال کا دورہ کیا جو عورتوں نے قائم کیا ہے۔ سٹی مائٹا نے ہمیں کہا ہے کہ ہم تمہیں بتا دیں کہ اردن رائے ٹائی وکیل کو بری طرح مارا پیٹا گیا ہے۔ اس کی ہنسی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے لیکن یہ زخم ایسا نہیں ہے کہ مستقل اسے پریشان کرے۔“

”یونائیٹڈ پریس کے نمائندے ویب ملر نے تین سو بیس زخمی گنے ہیں۔ دو اموات ہوئی ہیں۔ ہم نے بہت سے رضاکاروں کو بے ہوش دیکھا ہے۔ کل رضاکار ایک بار پھر سالٹ ڈپو کی طرف پیش قدمی کی کوشش کریں گے۔“

دنوں پر دن گزرتے رہے اور جیہ مہاراجہ کی اسٹڈی میں بیٹھ کر اپنی ماں سے متعلق خبروں کا انتظار کرتی رہی۔ اس کی سوچ کا محور اردن رائے بھی تھا جو زخمی ہو کر مسز ٹائیڈو

کے ہسپتال میں پڑا ہوا تھا۔ اسے اپنے بالوں پر اردن کی انگلیوں کا لمس محسوس ہو رہا تھا۔ وہ رو رہی تھی اور اردن رائے اپنی نرم آواز میں اسے سمجھا رہا تھا۔ ”یہ ایک بد صورت اور ناخوش گوار جنگل ہے۔“ جیہ سوچ رہی تھی کہ کیا اس وقت بھی اردن رائے کے ذہن میں یہی سوچ جاگزیں تھی جب برطانوی راج کی پولیس کی لائیں اس کے جسم پر برس رہی تھیں۔

بعض اوقات گرمی کے باعث اس کے سر میں درد ہونے لگتا تو وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتی۔ چھوٹا ڈنگرا ”وقتا“ ”وقتا“ اسے سالٹ ڈپو سے آنے والے پیچلت پڑھ کر سنا۔ ہر پیغام میں یہی درج ہوتا کہ آج کتنے لوگ سالٹ ڈپو پر چڑھائی کی کوشش میں زخمی ہوئے۔ مسز ٹائیڈو کا ہسپتال زخمیوں سے بھر رہا تھا۔

کوئی ایک ہفتے کے بعد مہاراجہ ڈنگرا نے پیغام سنایا کہ مہارانی واپس ڈنگرا روانہ ہو چکی ہیں۔ ”برطانوی راج نے مسز ٹائیڈو کو گرفتار کر لیا ہے، شہزادی۔“ چھوٹے ڈنگرا نے جیہ کو بتایا۔ ”لیکن میرے آدمی آپ کی والدہ کو بچانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔“

گو کہ رات نصف سے زیادہ بیت چکی تھی لیکن لوگوں کا ایک جھوم اب بھی آشرم میں جمع تھا تاکہ مہارانی کو واپسی پر مبارک باد پیش کر سکے۔ چھوٹا ڈنگرا، جیہ کو اس جھوم میں سے گزار کر آشرم کے لان پر لے آیا جہاں برف کی بڑی سی سل کے عقب میں بجلی کا ایک پنکھا چل رہا تھا۔

جب ستی ماتا آشرم پہنچی تو اس نے سب سے پہلے برآمدے میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے ملاقات کی اور اس کے بعد کچا کچھ بھرے ہوئے کمروں میں گئی۔ سب سے آخر میں وہ لان پر آئی تاکہ اپنی بیٹی اور چھوٹے ڈنگرا سے مل سکے۔

مہارانی بہت دیر تک خاموش بیٹھی جھینگروں کی آوازیں سنتی رہی اور برف کے گھلنے کا نظارہ کرتی رہی۔ پھر اس نے بولنا شروع کیا لیکن انداز خود کلامی کا تھا۔

”ہم نے تمام عمر بہادروں کی طرح جینا گویا دھرم کا حصہ بنائے رکھا۔ نقاروں کی آوازیں ہمیشہ ہمارے کانوں میں گونجتی رہی ہیں اور ہمارے ہونٹ انہیں دہراتے رہے ہیں لیکن اس سے پہلے کہ ہم ستی کا اصل مطلب جان سکتے، ہم بیوہ ہو گئے اور اب ہم دھرنا گئے تاکہ جنگ کا اصل مطلب جان سکیں۔“

اس نے جیہ کا سالوا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ ”ہم نے دیکھا کہ انگریز نیتے ہندوستانوں کو لائیں اور رائیوں کے دستے سے بری طرح مار رہے تھے۔ وہ احتجاج نہیں کر

رہے تھے اور نہ ہی چیخ چلا رہے تھے لیکن اس سے اہم بات یہ ہے کہ وہ پسپا بھی نہیں ہو رہے تھے۔ ان کے خاموش حوصلوں نے انہیں ناقابل شکست بنا دیا ہے۔ برطانوی راج ختم ہو گیا ہے، شہزادی۔ کاش تمہارے والد یہ سہرا دن دیکھنے کے لئے زندہ ہوتے۔“

یہ ڈنگرا میں جیہ کی آخری شام تھی لیکن مہارانی صرف سول ٹاٹا کی تحریک کے بارے میں ہی بات کرتی رہی تھی جیسے ایک ریاست کی حکمرانی سنبھالنے کے لئے اس کی بیٹی کی روانگی کوئی غیر اہم واقعہ ہو۔

ارجن آشرم کے لان میں بھاگتا دوڑتا اور چمکتا پھر رہا تھا لیکن جیہ کو ایک عجیب سی بے کلی لاحق تھی۔ جیہ نے جھک کر اپنی ماں کے چرن چھوئے اور ایک نئے سفر پر چل کھڑی ہوئی جس کے دوران سب سے اہم کام ارجن کے تخت کی حفاظت کرنا تھا۔

جیہ نیند کے غمار میں تھی کہ کسی نے گہرائے ہوئے انداز میں خواب گاہ کے دروازے پر دستک دی اور پھر چاندنی اس کے بستر کے قریب آگئی۔ ”مہاراجہ صاحب نے آپ کو بلایا ہے حکم!“ اس نے پھولی ہوئی سانپوں کے درمیان کہا۔

”اس وقت؟“ جیہ نے آنکھیں ملٹے ہوئے پوچھا۔
”کوئی بہت ضروری کام ہے، حکم!“ چاندنی نے مبہم سی وضاحت کی۔ ”انہوں نے جلدی آنے کی درخواست کی ہے۔“

جیہ نے دیر نہیں لگائی۔ جب وہ اسٹڈی میں پہنچی تو چھوٹا ڈنگرا ٹیلی فون پر چلا رہا تھا۔ پھر اس نے زور دار آواز میں ریسپور کریڈل پر ڈالا اور جیہ کی طرف مڑا۔

”اپنا سفر منسوخ کر دو شہزادی۔ کلکتہ کے راستے میں آنے والے اسٹیشنوں پر ہنگاموں کا خطرہ ہے۔ آج ہی دہلی اسمبلی میں وائسرائے پر دو بم پھینکے گئے ہیں۔ ایک دہشت گرد نے سرکاری پنچوں پر بیٹھے ہوئے انگریزوں پر فائرنگ کی کوشش بھی کی ہے۔ بد قسمتی یا خوش قسمتی سے ریوالور جام ہو گیا۔“

”یہ سب کس نے کیا ہے، حکم؟“ جیہ کی آواز سوچ اور تفکر میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”انڈین ری پبلکن آرمی۔“

”کیا ہندوستانی فوج نے بغاوت کر دی ہے، حکم؟“

”نہیں، شہزادی۔“ چھوٹے نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ تو طالب علم، شاعر اور رومان پسند نوجوان لڑکے، لڑکیوں کا گروہ ہے جس نے ڈہلن میں آئرش ری پبلکن آرمی کی طرز پر انڈین ری پبلکن آرمی کی داغ بیل ڈالی ہے۔“

جیہ نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ان لوگوں کا ہیڈ کوارٹر کلکتہ میں ہے۔“ چھوٹا بتا رہا تھا۔ ”برطانوی جلد ہی ان پر قابو تو پالیں گے لیکن فی الحال مزید ہنگاموں کا خطرہ ہے۔ لہذا جب تک صورتحال معمول پر نہیں آ جاتی تم یہیں رکو گی۔۔۔“

جیہ نے آخری بار الماریوں میں سجے مجلد ڈنگرا گزٹ پر نظر ڈالی۔ صرف پانچ ماہ پہلے وہ سیرپور کی پجاریوں کی سیاست سے فرار حاصل کر کے ڈنگرا آئی تھی لیکن حالات ایسا رخ اختیار کر رہے تھے کہ فرار کی اس مدت میں اضافے کا امکان پیدا ہو چلا تھا مگر وہ اب یہاں مزید رکنے کے حق میں نہیں تھی۔ وہ سیرپور واپس جانا چاہتی تھی۔

”ہم مزید تاخیر کے متحمل نہیں ہو سکتے، حکم!“ بالآخر جیہ نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”مہاراجہ کو ہر حال میں اپنی ریاست واپس پہنچنا ہے۔۔۔“

کلکتہ کے ریل کے طویل سفر نے ڈنگرا کی پیش گوئی سچ ثابت کر دکھائی تھی۔ قوم پرستوں کے گروہ ہر اسٹیشن پر موجود تھے۔ جونہی ٹرین اسٹیشن پر رکنے کے لئے رفتار کم کرتی وہ آگے بڑھتے اور چھوٹی چھوٹی تھیلیاں کھڑکیوں سے اندر اٹھال دیتے۔ ساتھ ہی وہ نعرے بلند کرتے۔ ”ہندوستان کی آزادی کے لئے نمک خریدو!“

چاندنی او دیگر ملازمین ٹرین کی کھڑکیوں سے چپے ہوئے تھے وہ پولیس کے ہاتھوں ہجوم کی درگت کا نظارہ کر رہے تھے۔ پولیس بار بار لوگوں پر لٹھیاں برساتی لیکن مشتعل لوگوں کو جیسے اس مار پیٹ کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ ایک گروہ مار کھا کر پیچھے ہٹا تو دوسرا تازہ دم گروہ پولیس والوں کے سامنے آ جاتا۔

کھڑکیوں کی آہنی سلاخوں کی آڑ سے خواتین ملازمائیں پولیس والوں پر آوازے کس رہی تھیں۔ ”تم لوگوں کو شرم نہیں آتی، عورتوں اور بچوں پر تشدد کر رہے ہو؟“

”تم ان لوگوں کو جیل کیوں لے جا رہے ہو؟ ان کے خاندانوں کی کفالت کون کرے گا؟“

ارجن، جیہ کے پہلو سے لگا کپکپا رہا تھا۔ وہ اس وقت بھی کپکپا رہا تھا جب اس نے بم حملے سے متاثر ہونے والی دائسرائے کی ٹرین دیکھی تھی۔ اب جیہ نے اسے کھڑکیوں سے دور رکھنے کی کوشش کی تھی تاکہ وہ پولیس والوں کے چرے نہ دیکھ سکے اور نہ ہی پٹنے والے ہندوستانیوں کا نظارہ کر سکے۔

جوں جوں اسٹیشن گزرتے رہے۔ کھڑکیوں سے اندر آنے والی نمک کی تھیلیوں کی تعداد

میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ہر جگہ پولیس والے اور برطانوی افسران لاثیموں کی مدد سے انہیں پیچھے دھکیلنے کی کوشش کرتے لیکن اس سے پہلے وہ کھڑکیوں سے نمک کی تھیلیاں ٹرین کے اندر اچھالنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ نمک کی یہ تھیلیاں برطانوی قوت کے خلاف ہندوستانیوں کی جدوجہد کا ایک نشان تھیں۔

”غریب لوگ بھلا نمک کے بغیر کیسے زندہ رہ سکتے ہیں؟“ خاتون ملازمین کھڑکیوں میں سے چلا رہی تھیں۔

”ایک چمکی نمک کے لئے برطانیہ نے مہاتما کو جیل میں ڈال دیا ہے اور تم لوگ ان کے احکامات کی پابندی کر رہے ہو، لعنت ہو تم پر، بزدلو! گیدڑوں کی اولادو۔۔۔!“ جیہ نے انہیں خاموش کرانے کی کوشش کی۔ وہ اس بات سے خوفزدہ تھی کہ کہیں پولیس والے ان ملازموں کے کوسنوں سے چڑ کر کمپارٹمنٹ پر دھاوا نہ بول دیں۔ خادموں نے اس کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور بدستور پولیس والوں پر آوازیں کستی رہیں۔

جیہ کی پریشانیوں کو قرار اس وقت آیا جب ٹرین آخر کار کلکتہ کے ہلوڈ اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ تب ہی اس کی نظر سیرپور کے محافظوں پر پڑی جو ٹرین کے ساتھ بھاگ رہے تھے۔

”سر اکبر کہاں ہیں؟“ اس نے کھڑکی میں سے ہی چلا کر دریافت کیا۔

”مشرقی حصے میں بغوت کی اطلاع ملی ہے، حکم!“ ایک محافظ نے جواب دیا۔ ”انڈین ری پبلکن آرمی نے چٹاگانگ پر قبضہ کر لیا ہے اور وہ۔۔۔“

”چٹاگانگ پر قبضہ کر لیا ہے؟“ جیہ نے کسی طوطے کی طرح جملہ دہرایا۔ ”بھلا شاعروں کا ایک ٹولہ طاقت کے بول بوت پر کیسے سلطنت برطانیہ کے ایک اہم شہر پر قبضہ کر سکتا ہے؟“

”برطانوی کسی قسم کی اطلاعات فراہم کرنے کو تیار نہیں ہیں، حکم! البتہ مہزرائے نے ٹیلی فون پر خبریں وصول کی ہیں۔ سر اکبر ان کے ساتھ گئے ہیں تاکہ صورت حال سے آگاہ ہو سکیں۔“

پورٹرز نے کمپارٹمنٹ کے اندر داخل ہونے کی کوشش کی لیکن محافظوں نے انہیں ایک سمت دھکیل دیا۔ ”جلدی آئیں، حکم!“ انہوں نے جیہ کو مخاطب کیا۔ ”اسٹیشن پر صورت حال کسی بھی وقت قابو سے باہر ہو سکتی ہے۔“

پلیٹ فارم کے اوپر بنے پختہ پل پر اس قدر رش تھا کہ لوگوں کا چلنا محال ہو رہا تھا۔

محافظوں نے جیہ اور کم سن مہاراجہ کو آہنی جنگلے کے ساتھ کر دیا تھا کہ وہ لوگوں کی دھکم پیل سے پریشان نہ ہوں۔ پل کے نیچے سائیڈنگ میں ایک مل گاڑی سے سلمان اتارا جا رہا تھا۔ پورٹرز بوریوں کی بوریاں ڈبوں میں سے نکال کر پلیٹ فارم پر ڈھیر کئے جا رہے تھے جن پر میڈان، مانچسٹر اور میڈان لنکاسٹر کے الفاظ صاف دکھائی دے رہے تھے۔

چار نوجوان مٹی کے تیل کے ڈبے اٹھائے ہوئے بھاگتے ہوئے بوریوں کے پاس پہنچے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے ڈبوں کے ڈھکنے کھولے اور تیل بوریوں پر انڈیل دیا۔ تیل کی تیز بو پورے پلیٹ فارم پر پھیل گئی تھی۔ لوگ جیہ پر گر پڑے تھے تاکہ نیچے ہونے والی کارروائی کو دیکھ سکیں۔ ایک شخص نے ماچس کی تیلی جلائی اور بوریوں پر اچھل دی۔ چشم زدن میں شعلہ بھڑکا اور اس نے تمام بوریوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

لوگ آگ آگ چلاتے ہوئے چاروں طرف بھاگنے لگے۔ ”بندے ماترم.... اپنی سرزمین.... مادر وطن کی فتح....“

پل کے اوپر موجود جھوم مارے خوف کے چلا اٹھا۔ ارجن نے پرجوش انداز میں شعلوں کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے ننھے ننھے ہاتھ پل کے نیچے ان لوگوں کی طرف اٹھے ہوئے تھے جو بھاگ دوڑ میں مصروف تھے۔ ”کیا یہ کوئی کھیل ہے، حکم؟“

جیہ نے فوراً اسے پیچھے کھینچ لیا۔ پولیس والوں نے آگ کی طرف بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ ان کی لاشیاں حسب معمول جھوم پر برس رہی تھیں لیکن جھوم پہلے ہی منتشر ہو رہا تھا۔ محافظوں نے بے حد مشکل سے جیہ کو کار تک پہنچایا۔ روانگی تک جیہ کے نکتوں میں مٹی کے تیل کی بو بسی ہوئی تھی۔

کلکتہ ویسا ہی تھا جیسے وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ بازار میں ایک بار پھر لائینیں اور مٹی کے تیل کی بو اس کی منتظر تھی۔ یہاں بھی کہیں کہیں ہنگاموں کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ جیہ سوچ سوچ کر حیران تھی کہ کیا ان ہنگاموں کے ذمے دار دنیا کی اس سب سے بڑی بادشاہت کو ہلانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

کتوں اور ہندوستانیوں کو داخلے کی اجازت نہیں کے نیون سائن کے ساتھ بنگال کلب اپنی جگہ موجود تھا۔ اس کے عقب میں فورٹ ولیم ایک سائے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اس پر یونین جیک بدستور لہرا رہا تھا۔ جیہ کو یوں لگا جیسے چند پاگل ہندوستانی کبھی بھی اس جھنڈے کو سرنگوں نہ کر پائیں گے۔

سیرپور ہاؤس میں ایک پوری فوج ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لئے اس کی منتظر تھی۔

ملازمین نے آگے بڑھ کر جیہ کی کار کا دروازہ کھول دیا۔
 ”سزرائے نے آپ کے لئے ایک پیغامبر روانہ کیا ہے، حکم!“ ایک ملازم نے جیہ کو
 آگاہ کیا۔ ”وہ ایک گھنٹے سے آپ کی آمد کا انتظار کر رہا ہے۔“
 دربار ہال میں سفید کپڑوں میں ملبوس ایک شخص کتاب پر جھکا ہوا تھا۔ اس کا سر روشنی
 میں نہلایا ہوا تھا جبکہ چشمے کے شیشے چمک رہے تھے۔ جیہ کی پازیب کی آواز نے اسے اپنی جگہ
 سے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

اردن رائے کے ہونٹوں پر پہلے مسکراہٹ اتری اور پھر یہ ہنسی میں تبدیل ہو گئی۔ ”
 آؤ، شہزادی، آؤ۔“ اس نے لہجہ نرم ہی رکھا تھا۔ ”کیا منڈب معاشرہ ہے اور کیا منڈب
 بادشاہت ہے۔۔۔ ایک نے تمہارے بالوں کی قربانی لے لی اور دوسرے نے مجھے بالوں سے
 محروم کر دیا۔“ وہ جیہ کے چھوٹے بل سلانے کے لئے آگے بڑھا تو اس کی کلف لگی دھوتی
 سرسرا اٹھی۔ ”تم تو بالکل بچی لگ رہی ہو شہزادی لیکن تمہاری والدہ نے جب میرے زخموں
 کی مرہم پٹی کے لئے سر کے بل صاف کئے تو یوں لگتا ہے میں کئی سال بوڑھا ہو گیا ہوں۔
 میرے زخم تو بھر گئے ہیں لیکن سر پر بل نہیں آئے۔“

”کیا یہ درست ہے کہ انڈین ری پبلکن آرمی نے بادشاہت کو شکست دے دی ہے؟“
 جیہ نے غیر محسوس انداز میں اس سے دور ہوتے ہوئے پوچھا۔ اس نے اردن رائے کے
 جملوں پر بھی کوئی تبصرہ نہ کیا تھا۔

”ایک بہت ہی کم عمر اور کمزور فتح، شہزادی۔“ اردن رائے نے جواب دیا۔ ”برطانویوں
 نے پولیس اسٹیشن پر دوبارہ قبضہ کر لیا ہے اب وہ اسلحہ خانے پر فائرنگ کر رہے ہیں۔
 نوجوانوں کا جو گروہ اس پر قابض ہے وہ رات ختم ہونے سے پہلے یا تو ہلاک کیا جا چکا ہو گا یا
 پابہ زنجیر جزائر انڈیمان کو روانہ کیا جا چکا ہو گا۔“

”تو کیا تمہیں ان کی زندگی یا موت کی کوئی پروا نہیں؟“ جیہ نے تیوریاں چڑھائیں۔ ”یا
 ان کے ہنگاموں سے تم ناراض ہو؟“

اس نے کندھے اچکائے اور بالوں سے محروم اس کا سر قدرے تاریکی میں آگیا۔ ”
 ہنگامے یا امن۔۔۔ اگر ہم آزادی حاصل کر لیتے ہیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

اچانک کسی کوٹنے سے ایک چمگاڑ اڑی اور اس کے پر جیہ کے رخسار چھوتے ہوئے
 گزر گئے۔ جیہ چیخی اور بے اختیار آگے کو جھک آئی اردن رائے نے فوراً اسے اپنی بانہوں
 میں قید کر لیا۔ چمگاڑ چند لمحے کمرے میں چکراتی رہی پھر غائب ہو گئی البتہ اردن رائے کافی

دیر تک جیہ کے بل سلاتا رہا۔

جیہ نے پیچھے ہٹ کر اردن رائے کی بانہوں کے حلقے سے نکلنا چاہا لیکن اردن رائے نے گرفت ڈھیلی کرنے سے انکار کر دیا۔ ”بے چاری شہزادی۔ تمہیں بہت سے کردار ادا کرنے ہیں لیکن ان میں سے کوئی ایک کردار بھی تمہیں عورت بننے کی اجازت نہیں دیتا۔“ وہ مسکرایا تو بھاری مونچھوں کے عقب سے اس کے سفید دانت چمکنے لگے۔ ”تم اب بھی نوجوان ہو شہزادی۔ کیا فرائض اور ذمے داریاں کلفتی نہیں ہو گئیں؟ یا تم ہمارے مہاتما کی طرح مجرد رہنے کا فیصلہ کر چکی ہو۔“

جیہ نے خود کو اردن رائے کی گرفت سے چھڑانے کے لئے اپنی کلاہیاں اس کے شانوں پر ماریں تو اس کی کالج کی چوڑیاں بج اٹھیں لیکن وہ اپنے بدن کو اس کے جسم میں پیوست ہونے سے روک نہیں سکی تھی۔

دربار ہال کا دروازہ کھلا تو اردن رائے نے اسے اپنی بانہوں کے حلقے سے آزاد کر دیا۔ ”اب بتاؤ شہزادی۔ ہنگامے اور امن میں فرق نظر آیا۔ وہ گھبرائی ہوئی جیہ کی آنکھوں میں جھانک کر مسکرایا۔“

جیہ خود پر قابو پانے کی کوششوں میں مصروف تھی۔ وہ اردن سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔ دروازے سے مسز رائے اور سر اکبر اندر داخل ہوئے تھے۔

”وہ تمام بے چارے مارے گئے ہیں“ شہزادی۔ ”مسز رائے نے سرگوشی کی۔ سر اکبر کی چھتری فرش بجا رہی تھی۔ ”برطانیہ نے چٹاگانگ پر دوبارہ قبضہ کر لیا ہے“ حکم! انڈین ری پبلکن آرمی کا انقلاب اپنی موت آپ مر گیا ہے۔“

1931ء۔ ہندوستان میں ہونے والا ہر حلوشہ جیہ کو پریشان کر دیتا۔ قرینہ کے ہر عمل کے پیچھے کہیں نہ کہیں زبردستی اور تشدد موجود تھا اور جیہ دونوں سے ہی خوفزدہ تھی۔

وہ اردن رائے سے بھی خوفزدہ تھی کیونکہ اس نے یاد دلایا تھا کہ جیہ ایک عورت بھی ہے اور یہ وہ جذبہ تھا جسے وہ عرصہ دراز سے بھلائے بیٹھی تھی۔

اسی خوف کے باعث جیہ سیرپور میں پسا ہو گئی تھی لیکن سرحدوں کی دوسری طرف ہونے والے واقعات نے خود اس کی اپنی حکمرانی پر بھی منفی اثرات ڈالے تھے۔

روزانہ سر اکبر شیر دل مہارانی کو لندن میں ہونے والی گولی میز کانفرنس کی تازہ ترین پیش رفت سے آگاہ کرتا جہاں ہندوستانی رہنما شہنشاہ برطانیہ کے سامنے فیڈریشن سے متعلق اپنا کیس پیش کر رہے تھے۔

”برطانویوں نے اس مقصد کے لئے ایک خاص بیضوی میز بنوائی ہے تاکہ کوئی ہندوستانی تفریق محسوس نہ کرے۔“

مہارانی نے ہنکارا بھرا۔ ”ایک صدی سے زیادہ انگریزوں نے ہمیں تقسیم کرنے میں صرف کی ہے کیا اب وہ سمجھے ہیں کہ ایک گول میز کانفرنس ہمیں متحد کرنے کے لئے کافی ہو گی؟“

”انہوں نے شہنشاہ کی تقریر کے لئے سونے اور چاندی کا ایک خصوصی مائیکروفون بھی بنایا ہے۔“

”اوہ۔“ مہارانی نے ایک طویل سانس لی۔ ”اگر کوئی ہندوستانی حکمران ایسی حرکت کرتا تو اسے عیاشی کہا جاتا۔“

”لیکن اس وقت ہندوستانی حکمرانوں پر تنقید نہیں ہو رہی بلکہ انہیں سراہا جا رہا ہے۔“ سر اکبر نے شیردل مہارانی کو آگاہ کیا۔

”تو کیا آپ اس تعریف پر خوش نہیں ہیں، مسٹر وزیر اعظم؟“ مہارانی نے تھکے انداز میں پوچھا۔

”گاندھی ہنوز جیل میں ہے، حکم!“ اس کی شرکت کے بغیر اس گول میز کانفرنس کی کوئی اہمیت نہیں۔ اصلاحی اس امر کو ریاست پر حملے کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔“

سر اکبر نے راج گورو کے ان جاسوسوں کا کوئی حوالہ نہیں دیا جو ویلز پیلس میں ریزیڈنٹ سے جیہ کی ملاقات کی خبریں بہم پہنچانے پر متعین کئے گئے تھے۔ خود اس کی خواہش تھی کہ کاہنی مندر کے پجاریوں کو اس بات چیت کی ہوا بھی نہیں لگنی چاہئے۔

اسی شب جب چار سو تاریکی چھا گئی ریزیڈنٹ، جیہ سے ملنے کے لئے ویلز پیلس آیا۔ جیہ نے اسے سیرپور کے مستقبل اور گول میز کانفرنس کے مضمرات پر بات چیت کے لئے طلب کیا تھا۔

جیمس آبرن کے ٹھہرے ہوئے لہجے نے جیہ کی پریشانیاں بڑی حد تک کم کر دی تھیں۔ ”ہم برطانوی اتنے ہیبت ناک نہیں ہیں شہزادی۔“ جیمس آبرن کا انداز ناصحانہ تھا۔ ”ہم ظالم بھی نہیں، ہم جانتے ہیں کہ گاندھی بیمار اور بے حد لاغر ہیں۔ لارڈ ارون انہیں رہا کر کے وائسرائے ہاؤس میں مذاکرات پر غور کر رہے ہیں۔ آج تک کسی ہندوستانی کو وائسرائے کے برابر عزت نہیں دی گئی۔ نصف سے زیادہ انگریز وائسرائے کو غدار کے لقب سے پکارے گا لیکن اگر گاندھی اگلی گول میز کانفرنس میں شرکت کرتے ہیں اور برطانوی

پارلیمنٹ فیڈریشن کی منظوری دے دیتی ہے تو برطانوی راج بہت جلد اپنا بوریا بستر لپیٹنے پر مجبور ہو جائے گا۔“

جیہ نے نگاہیں جھکا لیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ آبرن اس کی آنکھوں سے یہ خوف پڑھ لے کہ وہ اس کی مدد کے بغیر سیرپور کا انتظام چلانے کے قابل نہیں۔ آبرن کو بھی شاید یہ شوق نہ تھا کہ وہ جیہ کو اپنے سامنے سرنگوں دیکھے اس لئے اس نے جیہ کے اس عمل پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔

پھر وہ دن بھی آگیا جب وائسرائے نے گاندھی کو رہا کرنے کے احکامات صادر کر دیے۔ گاندھی کی رہائی کی خوشی میں جو تقریبات منعقد ہوئی تھیں ان کی بازگشت حرم کی دیواروں تک سنائی دی تھی۔ جیہ کو جب شیردل مہارانی نے طلب کیا تو اسے بہت سی عورتیں وہاں موجود دکھائی دیں جو سیرپور ہیرالڈ میں شائع ہونے والی خبروں پر تبصروں میں مصروف تھیں۔ ”سمرنائیڈو نے کہا ہے کہ ہندوستان پر دو مہاتماؤں کا سایہ ہے، حکم!“ ایک عورت بولی۔

”کون کون سے؟“ کسی نے پوچھا۔

”گاندھی اور لارڈ اردن۔“

”کیا آپ نے آج صبح کا اخبار پڑھا ہے، حکم؟“ ایک اور عورت نے دریافت کیا۔ وائسرائے نے مہاتما سے پوچھا کہ وہ چائے میں چینی پسند کریں گے تو مہاتما نے چینی کے بجائے غیر قانونی نمک کی ایک چٹکی پیالی میں ڈال لی۔

”وائسرائے کے دفتر کے تمام افراد کے سامنے۔“

”اور گزشتہ روز حکم....! آپ نے پڑھا، برطانوی وزیر اعظم چرچل نے پارلیمنٹ میں

گاندھی کا حوالہ دیا۔“

انہوں نے اخبارات کا پلندہ جیہ کو تھا دیا۔ ”اس موٹے انگریز نے ہمارے مہاتما کی بے عزتی کی ہے لیکن اس روز وہ کیا محسوس کرے گا جب یہ نمک دھڑنگ فقیر اس سے یہ بادشاہت چھین لے گا۔“

تمام عورتوں نے ایک بلند آہنگ ققمہ لگایا۔ جیہ نے کوشش کی تھی کہ اس کے چہرے سے کسی قسم کے تاثر کا اظہار نہ ہونے پائے لیکن اسے یہ سن کر واقعی خوشی ہوئی تھی کہ گاندھی نے دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔

اس واقعے کی ساتھ ہی گویا محل کی پردہ دار عورتوں کی دلچسپی برطانوی ہندوستان میں

نے والے واقعات سے ختم ہو گئی اور وہ اپنی پرانی زندگی کی رو میں لوٹ گئیں۔
موسم برسات شروع ہوا تو گلیوں اور سڑکوں پر جل تھل ہو گیا۔ برقی رو کا سلسلہ بھی
منقطع رہا جس کی وجہ سے دارالحکومت تاریکی میں ڈوبا رہتا۔ جیمس آبرن نے بھی اس عرصے
میں ویلز پبلش کا کوئی دورہ نہیں کیا تھا۔ جیہ البتہ مطمئن تھی کہ وہ انگریز اس کی مدد کے لئے
ہوز سیرپور میں موجود ہے۔

لیکن جونہی موسم برسات ختم ہوا اسے برطانوی ریزیڈنسی میں رات کے کھانے کی رسمی
دعوت موصول ہوئی۔ کار میں برطانوی ریزیڈنسی جلتے ہوئے جیہ یہ سوچ رہی تھی کہ اگر
آبرن کو یہ علم ہو جائے کہ یہ سیرپور کی حکمران اس کے رحم و کرم پر ہے تو اس کا رد عمل
کیا ہو گا؟

میجر جیمس آبرن نے جس گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ اس سے جیہ کے
فدائیت کسی حد تک کم ہو گئے تھے۔ جیمس آبرن نہایت احترام کے ساتھ اسے ڈرائنگ
روم میں لے گیا تھا۔

وزیر اعظم چل قدمی میں مصروف تھے۔ ان کے کشادہ ماتھے پر پریشانی صاف پڑھی جا
رہی تھی۔

”گاندھی کی موجودگی کے باوجود گول میز کانفرنس کا دوسرا راؤنڈ ناکام ہو گیا ہے۔“ سر
اکبر نے کسی خاص شخصیت کو مخاطب نہیں کیا تھا۔ ”نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین
ایک جنگ شروع ہو گئی ہے جس کا انجام مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین خونریزی کی صورت
میں نکل سکتا ہے۔“

”اوہ کم آن سر اکبر۔“ جواب جیمس آبرن نے دیا تھا۔ ”اگر ہندوستانی ریاستوں کے
پانچ سو حکمران ایک آواز ہو کر بول سکتے ہیں تو جتھ اور گاندھی بھی کسی معاہدے پر پہنچ سکتے
ہیں۔“

کھانے کی میز پر جیمس آبرن اور سر اکبر بات چیت میں مصروف رہے تھے۔ تقریبی شمع
ان میں نصب موم بتیوں کی کم روشنی میں جیہ دیواروں پر آویزاں پورٹریٹ دیکھتی رہی تھی۔
اسے انگریز لڑکے کا وہ پہلا دورہ یاد آیا جب وہ ریاست بالیر کے زٹن خانے میں آیا تھا
اور جیہ نے اس سے چاند محل کی دیواروں پر بنی ہوئی رومانوی روغنی تصاویر کے بارے میں
بات کی تھی۔ تب وہ پریشان ہو گیا تھا مگر اب یہ لڑکا ایک مرد بن گیا تھا اور سر اکبر کو دلا سے
بے رہا تھا۔

”مسٹر جنل اور گاندھی بہر حال ہندوستان کے خیر خواہ ہیں۔ ان میں سے کوئی بھ
ہندوستان میں خون کی ندیاں بہانا پسند نہیں کرے گا۔“

”اللہ کرے کہ آپ درست کہہ رہے ہوں۔“ سر اکبر نے ایک طویل سانس لی۔
لیکن میری بوڑھی آنکھیں ہندو مسلم فسادات کی ابتدا دیکھ رہی ہیں۔“ وہ جیہ کی طرف مڑا
”لیکن ہم سیرپور میں ایسے فسادات کی اجازت ہرگز نہیں دیں گے۔ اس لئے حکمران کو
چاہئے کہ وہ فوراً قبائلیوں کے ساتھ اتحاد کرے۔“

آبرن کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”میں اس تقریب میں شریک ہو کر بے حد خوش
محسوس کروں گا۔“

”شاید آپ کو اس میں مزہ نہ آئے جیسے صاحب!“ جیہ کو قبائلی رقص دیکھنے کا اپنا پہلا
تجربہ یاد آگیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ایک مذہب قوم کے اعلیٰ انتظامی افسر کو یہ غیر مذہبان
انداز کیسے ہضم ہوں گے؟“

”پلیز، شزدادی۔“ آبرن اب بھی اپنی بات پر مصر تھا۔ ”اگر بار خاطر نہ ہو تو میں ان
تقریبات میں شمولیت کا خواہش مند ہوں۔“

تقریب بھی ہوئی اور اس میں قبائلی رقص بھی پیش کئے گئے لیکن حیرت انگیز طور پر
جیسے آبرن نے نہ صرف انہیں دیکھا بلکہ بھرپور اور پر جوش انداز میں ان میں شرکت بھی
کی۔

مہاراجہ کا قافلہ قبائلی علاقوں کے دورے سے واپس آیا تو برطانوی ریزیڈنٹ کی ہدایت
پر مہاراجہ ارجن کے لئے مسٹر اسٹیونز نامی ایک انگریز ٹیوٹر مقرر کر دیا گیا۔

کاشی مندر مسلسل تیسری بار سیرپور کے مہاراجہ کو اپنی مرضی کی تعلیم دینے میں ناکام
رہا تو راج گورو نے اس الزام کی تشہیر شروع کر دی کہ برطانوی ریزیڈنٹ نے حکمران کو اس
کی مل کے ذریعے کنٹرول کر رہا ہے۔ اس کے جواب میں جیہ نے ترقیاتی پروگراموں کی رفتار
تیز کر دی کیونکہ وہ پر امید تھی کہ تعمیراتی کام اس کے اختیارات اور حکمرانی میں معاون ثابت
ہو گا۔

رات کے وقت سٹی پبلک ڈائنامیٹ کے ان دھماکوں سے گونج اٹھا جو ڈیم کی بنیادوں کے
لئے ہونے والی کھدائی کی غرض سے کئے جاتے تھے۔ مہاراجہ پرتپ ڈیم جو دارالحکومت سے
چند میل پرے واقع تھا اور رفتہ رفتہ دھرتی کے سینے پر نمودار ہو رہا تھا۔

سیرپور کی پہاڑیوں کی دوسری جانب ہوائی اڈے تعمیر کئے جا رہے تھے تاکہ دور دراز

کے علاقے بہ آسانی دارالحکومت تک رسائی حاصل کر لیں۔ ارجن اور اس کے دوست اکثر و بیشتر وزیر اعظم کے ہمراہ ملحقہ پہاڑی جنگل پر پرواز کرتے تاکہ سیر کے ساتھ ساتھ اڈوں کے فیراتی کاموں کا جائزہ بھی لیا جاسکے۔

ترقیاتی پروگرام کے نتائج نے بہت جلد راج گورو کے پھیلانے ہوئے شکوک و شبہات تم کر دیئے۔ دیہاتی عوام جوق در جوق دربار ہال میں حاضری دینے لگے۔

اکثر و بیشتر صبح کے اوقات میں جیہ اور آبرن ڈیم کے تعمیراتی کاموں کا معائنہ کرنے کے لئے محل سے نکل کھڑے ہوتے۔ ریزینڈنٹ گھڑ سواری کے دوران جیہ کو ارجن کی محلی کے معاملات سے بھی آگاہ کرتا رہتا تھا۔

”شروع شروع میں تو مسٹر اسٹیونز کو مہاراجہ سے عدم توجہی کی شکایت تھی۔ میرے خیال میں تو یہ محل میں ہونے والے بے جالاذ پیار اور بچاریوں کی غلط معلومات کا نتیجہ تھا مگر اب صورت حال مختلف ہے۔ اسٹیونز نے محسوس کیا ہے کہ مہاراجہ مشینوں میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں اسی لئے ان کی کلاسیں ازفیلڈ محل کے گیراج یا بوٹ یارڈز میں ہو رہی ہیں۔“

جیہ ہنس دی۔ اسے ٹکا اور اس کے دوست یاد آگئے۔ جو چاند محل میں کیپٹن آبرن کو لہر لیتے تھے اور اس سے ہوائی جہازوں اور دیگر مشینوں کے بارے میں سوالات کرتے رہتے تھے۔

”ممکن ہے کہ ہمارے بیٹے کو بھی سیر پور لائسنز کی بھرکس میں ہی تربیت دی جائے۔ وہ بچیوں سے بے حد پیار کرتا ہے۔“

”بہت کچھ تو وہ ابھی سے سیکھ چکے ہیں۔“ آبرن نے جیہ کو بتایا۔ ”لیکن وہ فوجی معلومات پر صرف مجھ سے بات کرنا پسند کرتے ہیں کیونکہ انہیں علم ہے کہ ان کے ماموں اہل میں میرے شانہ بشانہ جنگ میں حصہ لے چکے ہیں۔“

آبرن کی تجویز پر کرکٹ میچ کی از سر نو استرکاری کی گئی اور ارجن اور مسٹر اسٹیونز سے پلنے کے لئے آنے والے بچوں کے لئے ایک چھوٹا سا پولین تعمیر کیا گیا۔ اکثر جیس آبرن نا ان کے ساتھ کھیلنے کے لئے وہاں آ جاتا۔

جیہ بچوں کو اس انگریز کی طرف ملتفت ہوتے دیکھ رہی تھی۔ اسے احساس ہونے لگا کہ ار وہ مسلسل آبرن پر انحصار کرتی رہی تو اس کے نتائج بھیانک نکل سکتے ہیں۔

چونکہ جیہ کے تعمیراتی پروگرام کو برطانوی ریزینڈنٹ کی منظوری درکار تھی اس لئے وہ لڑجیس آبرن کو ویلز پبلش میں مدعو کر لیتی۔ صوفے پر وہ اس کے بے حد قریب بیٹھ جاتی

اور سوچتی رہتی کہ اگر تعلقات کار اسی طرح چلتے رہے تو وہ اس سے نئے اسکولوں اور سڑکوں کے بارے میں بھی بات کرے گی۔

اسے جیسے آبرن کا پہلا دورہ سیرپور یاد آگیا۔ جو اس نے مہاراجہ وکٹر کی دعوت پر کہا تھا۔ کس طرح وہ بنگوئیٹ روم سے بھاگی تھی وہ خوفزدہ تھی کہ کہیں سیرپور کے معززین چنبیلی کی کلیوں سے ڈھکی اس کی کلائی آبرن کے ہاتھ میں نہ دیکھ لیں یا آبرن کی گرفت میں آکر اس کی کالج کی چوڑیوں کے ٹوٹنے کی آواز نہ سن لیں لیکن اب اسے کسی کا خوف نہ تھا اور وہ گھنٹوں آبرن کے ساتھ تنہا بیٹھی مختلف معاملات اور مسائل پر باتیں کرتی رہتی تھی۔

لیکن جیسے آبرن اب بہت زیادہ محتاط تھا۔ شاید اسے احساس تھا کہ جیہ کے کندھوں پر کس قسم کی ذمے داریاں ہیں اور اس کی ایک لغزش جیہ کو گہری تاریکیوں میں گرا سکتی ہے۔ البتہ لوگ بدظن ضرور تھے۔ حتیٰ کہ چاندنی بھی اس بات پر معترض ہونے لگی تھی کہ جیہ بلا کسی ججک کی انگریز کی ہر بات تسلیم کر لیتی تھی۔

”میں جانتی ہوں حکم! کہ راج گورو قاتل اعتبار نہیں۔“ اس نے ایک روز جیہ کو آگ کیا۔ ”لیکن یہ انگریز مہاراجہ کو ایک غیر ملکی بنانے میں مصروف ہے۔ مہاراجہ بھی پریشان ہو جائیں گے، بالکل اسی طرح جیسے آپ کے بھائی ہو گئے تھے۔“

”دیا اب وہ نہیں رہی جو ہمارے بھائی کے زمانے میں تھی چاندنی!“ جیہ نے نرمی سے اسے سمجھایا۔ ”یہ وہ معاملات ہیں جنہیں تم نہیں سمجھو گی۔“

خادمہ نے ساڑھی کا پلو سمیٹا۔ ”یہ وہ معاملات ہیں، حکم جنہیں میں بہت اچھی طرح سمجھتی ہوں۔“ اس کی آواز بڑبڑاہٹ سے زیادہ بلند تھی۔

لیڈی مودی کی اچانک سیرپور آمد نے جیہ کی دنیا کی دیواریں مزید شکستہ کر دی تھیں۔ دوپہر کے کھانے پر لیڈی مودی شیشے کی بڑی سی میز پر بیٹھی حسب معمول مسکراہٹیں اچھال رہی تھی اور سیرپور کی معزز خواتین کے سامنے اپنے تجربات بیان کر رہی تھی۔ کھانہ ختم ہوا تو میجر آبرن اور سر اکبر بھی بات چیت میں شریک ہو گئے۔

”ہر کوئی پرنس آف ویلز اور سنز سمپسن کے معاشرے کے بارے میں باتیں کر رہا ہے۔ لیڈی مودی کی زبان قہنجی کی طرح چل رہی تھی۔“ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میجر آبرن۔ لندن میں تو یہ بچے بچے کی زبان پر ہے اور وہ تمہارا بوڑھا وزیر اعظم تو اس چاک میں پاگل ہوا پھرتا ہے۔“

جیس آبرن نے گھبرا کر سر جھکا لیا جبکہ سیرپور کی معزز خواتین زیر لب مسکرانے لگیں۔

”لیڈی مودی۔۔۔ لیڈی مودی۔۔۔“

”ہر کوئی جانتا ہے کہ مستقبل کا بادشاہ کسی اور کی بیوی سے شادی نہیں کر سکتا۔“
لیڈی مودی کا بیان ہنوز جاری تھا۔ ”وہ بوڑھی گلابو بھی اس چکر میں بے حد پریشان ہے۔“
”لیکن یہ بوڑھی گلابو کون ہے؟“

لیڈی مودی نے چونک کر بلند آہنگ تقہ لگایا۔ ”نئے وائسرائے لارڈ ولنگٹن کی بیوی۔“

لیڈی مودی کی تقلید میں حاضرین نے بھی تقہ لگایا۔ ”لیکن اسے گلابو کیوں کہتے ہیں؟“

”اس لئے کہ اس نے وائسرائے کے گھر میں آ کر ہر جانب گلاب کے پھول پینٹ کروا دیئے ہیں۔“ لیڈی مودی نے وجہ بیان کی۔ ”اس کے علاوہ اسے گلاب کے پھول بے حد پسند ہیں اور وہ جہاں بھی جاتی ہے اسے گلاب ہی خفے میں پیش کئے جاتے ہیں۔“

جیس آبرن نے برا سامنہ بنا کر لیڈی مودی کے جملوں پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ جیہ نے اس تاثر کو بطور خاص نوٹ کیا تھا۔ وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ لیڈی مودی آخر کب تک سیرپور میں مقیم رہے گی۔

یہی وجہ تھی کہ وہ لیڈی مودی کی موجودگی میں جیس آبرن سے ملاقات سے احتراز کرنے لگی لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جیہ اور لیڈی مودی مہاراجہ وکٹر کی اسٹڈی میں بیٹھی گپ شپ میں مصروف ہوتیں اور جیس آبرن ملاقات کے لئے آ جاتا۔ گو یہ ملاقات انتظامی نوعیت کی ہوتی لیکن لیڈی مودی کچھ ایسے تاثرات دیتی کہ جیس آبرن کے ساتھ ساتھ خود جیہ کو بھی ناگوار گزرتا۔

اکثر و بیشتر ارجن اور اس کے دوست میجر آبرن کی جان کو آ جاتے اور اس سے مطالبہ کرتے کہ فضائی سفر میں وہ ان کے ساتھ چلے۔

”تمہیں اس بچے کو اپنے ساتھ رکھنا چاہئے۔“ ایسے میں لیڈی مودی حسب معمول جیہ کے سامنے نصیحتوں کا پٹارا کھول دیتی۔ ”اس میں پرتاپ جیسی عادتیں پرورش پاری ہیں۔“
جیس آبرن اس حد تک لیڈی مودی سے متفق تھا۔ ”اس سے پہلے کہ ہندو مسلم فساد کوئی خطرناک صورت اختیار کرے میں چاہوں گا کہ حکمران کچھ عرصے کے لئے ہندوستان

چھوڑ دیں۔ انہیں ان کے والد کے اسکول میں تعلیم کے لئے انگلینڈ بھیج دیا جائے۔“ لیڈی مودی نے خوشی کے اظہار کے طور پر تالیاں بجائیں۔ ”اٹین ڈارلنگ! کیا مزے کی بات ہے۔ اٹین بہت خوبصورت جگہ ہے۔ ہم پکنک کے لئے جاسکتے ہیں اور۔۔۔“ پہلی بار جیہ نے اس انگریز کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ ”نہیں، کبھی نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہم اپنے بیٹے کو اس کے اپنے ملک میں اجنبی نہیں بنانا چاہتے۔“ جیہ کے ان خیالات پر میجر آبرن کو حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا تھا۔ ”مگر غیر یقینی صورت حال کا تقاضہ ہے کہ بچے کو ریاست سے باہر بھیج دیا جائے۔“ اس نے اپنی رائے پر اصرار کیا۔ ”فی الوقت ان کے حق میں یہی بہتر ہے۔“

”ناکہ وہ نکا کی طرح نافرمان اور سرکش بن جائے؟“ جیہ نے تھکے انداز میں سوال کیا۔ ”نکا کے لڑکپن کے دور اور آج کے زمانے میں بہت فرق ہے شزاوی۔“ میجر آبرن نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔ ”دنیا بھی بدل گئی ہے اور ہم بھی۔“ وہ تھکے تھکے سے انداز میں مسکرایا اور اٹھ کر باہر چل دیا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ میجر آبرن کو تمہارے رویے سے شدید دھچکا لگا ہے۔“ لیڈی مودی نے رائے دی۔

”شاید۔“ جیہ نے اتفاق کیا۔ ”ہم نے آج تک اس کی کسی تجویز کو رد نہیں کیا۔“ ”صرف اس لئے کہ تم اسے خوش کرنا چاہتی ہو، ڈارلنگ اس لئے نہیں کہ تمہارے خیال میں وہ صحیح ہے۔ وہ ہمیں تبدیل کرنے میں ناکام رہا ہے۔ میجر آبرن اگر اب تک ہندوستان میں موجود ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ درغلانی کے بجائے قائل کرنے پر یقین رکھتا ہے۔“

”لیکن ہم بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔“ جیہ نے خفیف سا احتجاج کیا۔ ”وہ برطانوی ریزیڈنٹ سے ہٹ کر بھی ہمارے لئے بہت کچھ ہے۔ وہ ہمارا دوست ہے۔“ لیڈی مودی نے نہایت احتیاط کے ساتھ اپنا سگریٹ ہولڈر میں فٹ کیا۔ ”تھا ہونے کے باوجود اگر آبرن کے دفتر کو نظر انداز کرو گی تو میں تمہیں بے وقوف سمجھوں گی، ڈارلنگ!“ لیڈی مودی کی تیز نگاہیں جیہ کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ”تم ہمیشہ سے میجر آبرن کو پسند کرتی ہو۔ پرنس آف ویلز کے دورہ سیرپور کے دوران میں نے دیکھا تھا کہ وہ تم پر سے نظریں ہٹا نہیں پا رہا تھا۔ اب بھی صورت حال یہ ہے کہ اسے خود پر قابو پانے میں خاصی جدوجہد کرنی پڑ رہی ہے لیکن اگر اسے اپنی بادشاہت اور تم میں سے کسی ایک شے کا

انتخاب کرنا پڑا تو وہ یقینی طور پر بادشاہت کا انتخاب ہی کرے گا اگر وکٹر اور پرنسپل کی طرح تم بھی سلطنت برطانیہ کی وفادار اور خیر خواہ بن جاؤ گی تو یہ دوستی خوب چلے گی بصورت دیگر ڈارلنگ تمہیں اپنے بچپن کے تعلقات کو بھولنا ہو گا۔“

جیہ جانتی تھی کہ لیڈی مودی صحیح کہہ رہی ہے لیکن اس کے باوجود اس نے لیڈی کی باتوں کو جھٹلا دیا تھا۔ ”تم غلط کہہ رہی ہو بیسی۔ ریزیڈنٹ اہم نہیں ہے۔ ہم نے آج تک جو کچھ کیا ہے وہ اپنے بیٹے کے لئے کیا ہے۔“

”تب پھر اپنے بھائی کے تجربات کو بھول جاؤ اور اپنے بیٹے کو پڑھنے کے لئے انگلینڈ بھیج دو۔ آبرن نے تمہیں ہنر مشورہ دیا ہے۔“ لیڈی مودی نے گویا بات ختم کر دی تھی۔

لیڈی مودی کے کرخت لہجے اور تلخ تجربے نے جیہ کو جھنجھوڑ دیا تھا اور وہ بچپن کی دنیا سے نکل کر حقیقت میں آگئی تھی۔ وہ پوری تندی کے ساتھ سیرپور کے تعمیراتی منصوبوں میں مصروف تھی تاکہ میجر آبرن کی توجہ اسے حاصل رہے جبکہ دوسری جانب تیسری گول میز کانفرنس کے ناکام ہونے کے بعد سیرپور کی حدود میں مذہبی کشیدگی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

جیہ نے سیرپور کی سرحدوں سے باہر ہونے والے واقعات سے بچا کر اپنی جو دنیا بنائی تھی وہ اس وقت ٹوٹ کر بکھرنے کے قریب پہنچ گئی جب انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ میں مذہبی تضادات کم کرانے کی غرض سے فیڈریشن کی تجویز ایک بار پھر ملتوی کر دی گئی اور یوں پورے ہندوستان میں ہندو مسلم فساد پھوٹے پڑے۔

برطانوی ہندوستان میں ہندو مہاجنوں اور ٹھاکروں کے ہاتھوں ستائے ہوئے مسلمان کاشت کار سیرپور میں موجود اپنے رشتے داروں کے پاس پناہ کی غرض سے سرحدوں میں داخل ہو گئے۔

جبکہ ہندو دکانداروں نے مسلمان طلبہ کی دھمکیوں سے تنگ آ کر کلکتہ جانا شروع کر دیا لیکن سیرپور کے بازاروں میں وہ اپنی بہت سی کمائیاں چھوڑ گئے۔

سیرپور کے لئے یہ سب کچھ اجنبی تھا۔ چنانچہ جیہ نے مختلف مذہبی جماعتوں کے رہنماؤں کے ساتھ اجلاس منعقد کرنے شروع کر دیئے تاکہ اس مذہبی لہر کا اثر زائل کیا جا سکے۔ دس سالہ مہاراجہ کو اکثر و بیشتر مسٹر اسٹیونز کی کلاسوں سے غیر حاضر رہنا پڑتا۔ وہ دربار ہل میں اپنی نشست پر بیٹھا بے چینی سے اس طویل گفتگو کو سنا کرتا جس کا ایک لفظ بھی اس کے پلے نہیں پڑتا تھا۔

کبھی کبھار برطانوی ہندوستان سے آنے والا کوئی مہاجر ایک ہندو ریاست کے مسلمان وزیر اعظم کو چیلنج کرتا تو مہاراجہ بڑی شد و مد کے ساتھ اس کا دفاع کرتا۔ جیہ جب اسے معصوم بیٹے کی بلند آواز سنتی تو اسے وہ ننھا متا رجن یاد آ جاتا جو محض پانچ سال قبل اپنی ماں کے آشرم میں بکریوں کے پیچھے دوڑا کرتا تھا۔ وہ سنجیدگی سے سوچ رہی تھی کہ کیا وہ آبرور کی تجویز مان کر پڑھنے کے لئے اسے انگلینڈ بھیج دے۔

جب آبرن نے اسے بتایا کہ برطانوی پارلیمنٹ ہندوستان میں ہونے والے مذہبی ہنگاموں سے پریشان ہے چنانچہ اس نے آل انڈیا فیڈریشن پر رضامندی ظاہر کر دی جس میں ہندوستانوں نے وائسرائے کے ساتھ مل کر حکومت کرنا تھی۔ جانے کیوں جیہ کو محسوس ہوا تھا کہ اس نے آبرن کے لہجے سے کوئی بڑا بوجھ کم ہوتے دیکھا ہے۔

”حکمرانوں کو فیڈریشن میں طاقتور پوزیشن دی جا رہی ہے شہزادی۔“ میجر آبرن نے اسے بتایا۔ ”پارلیمنٹ کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں تجویز کیا گیا ہے کہ ایک ایوان ہائے تشکیل دیا جائے جس کی نصف نشستیں حکمرانوں کے پاس ہوں گی جبکہ ایوان زیریں میں ایک تہائی نشستیں حکمرانوں کو دی جائیں گی۔ یہ دونوں ایوان ہندوستان پر حکومت کریں گے لیکن ریاستوں کا وجود اس کے باوجود برقرار رہے گا۔“

وہ مسکرایا۔ ”اب حکمرانوں کو یہ کرنا ہو گا کہ انہوں نے دس سال پہلے جیمیر آف پر نہیں میں جن اصلاحات کا وعدہ کیا تھا ان پر عمل کیا جائے۔ پارلیمنٹ نے فیڈریشن کے آغاز سے قبل ہی واحد شرط عائد کی ہے۔“

اگلے مشکل سالوں میں جیہ کو اندازہ ہو گیا کہ پارلیمنٹ کی شرائط کے بارے میں جیمیر آبرن کی تفصیل بے حد سادہ تھی۔ پارلیمنٹ نے ہر حکمران کو آزادی دے دی تھی کہ وہ اپنی مرضی سے انڈیا فیڈریشن میں شرکت کر سکتا ہے مگر اس کے باوجود کہ ہندوستانی حکمرانوں کی اکثریت نے یہ فیصلہ کر لیا تھا پارلیمنٹ نے اب تک فیڈریشن کی توثیق نہیں کی تھی۔

اس سے بھی کہیں زیادہ بھیاں تک بات یہ تھی کہ چھوٹی ریاستوں کو بڑی ریاستوں میں ضم ہونے کو کہا گیا تھا۔ یہ ایک ایسی تجویز تھی جو مذہبی تفاوت کے باعث حکمرانوں کے لئے قاتل قبول نہ تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ حکمران اصلاحیوں سے بھی خوفزدہ تھے کیونکہ انہوں نے ریاستوں میں جمہوری انتخابات کا مطالبہ کر دیا تھا۔

اس کے باوجود کہ سیر پور میں شہریوں کو دوسری ریاستوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ حقوق حاصل تھے، سیر پور ہیرالڈ اکثر اصلاحیوں کی تقاریر پر مبنی رپورٹیں جلی سرخیوں کے

ساتھ شائع کرتا تھا۔

وقت گزرتا رہا اور حالات تبدیل ہوتے رہے۔ تب ہی جیہ کو اندازہ ہوا کہ وہ کتنی بے وقوف تھی جو اب تک جیمس آبرن پر انحصار کئے بیٹھی تھی کیونکہ اصلاحیوں کی تحریک رفتہ رفتہ زور پکڑ رہی تھی۔ اس صورت حال میں جیمس آبرن سیرپور میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین مذہبی رواداری کو فروغ دینے میں ناکام ہو گیا۔ جیہ کی پریشانی اس وقت عروج پر پہنچ گئی جب اسے چھوٹے ڈنگرا کا خط ملا کہ مہارانی کی صحت رفتہ رفتہ گر رہی ہے اور حکیموں کو ناکامی ہو رہی ہے۔

1935ء۔ چھوٹا ڈنگرا اپنے ہم منصب کے استقبال کے لئے خود ریلوے اسٹیشن پر موجود تھا۔ جب ارجن کو قلعہ ڈنگرا سے اکیس توپوں کی سلامی دی گئی تو اس نے خود کو پرسکون رکھنے کی خاص کوشش کی تھی لیکن جب ڈنگرا لائسنرز نے اپنی رانٹیں اس کے سامنے جھکانیں تو وہ اپنا جوش چھپا نہیں سکا تھا۔

مہارانی کے آشرم جاتے ہوئے ارجن نے جن چیزوں میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا انہیں دیکھ کر ڈنگرا خاموش نہ رہ سکا تھا۔ ”ارجن یقینی طور پر اپنے باپ پر گیا ہے۔“ اس نے جیہ کو مخاطب کیا۔ ”کرکٹ، جہاز اور انگریز اس کی دلچسپیوں کا مرکز ہیں۔“

”اور اب برطانوی ریزیڈنٹ چاہتا ہے کہ ہم اپنے بیٹے کو اس کے والد کے اسکول میں پڑھنے کے لئے انگلینڈ بھیج دیں۔“

ڈنگرا نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے جیہ کا بطور خاص جائزہ لیا تھا۔ ”ریزیڈنٹ صحیح کہہ رہا ہے شہزادی۔“ اس نے اپنی بھاری بھر کم آواز میں کہا۔ ”یہ وقت ہماری بھرپور توجہ چاہتا ہے۔ ارجن کے دور جانے سے تم صحیح طور پر قوم پرستوں سے نمٹ سکو گی۔ اردن رائے کو سیرپور بلا لو۔ تمہیں ایک نہ ایک دن اس کی مدد کی ضرورت محسوس ہو گی۔“

جیہ نے ڈنگرا سے نظریں چرانے کی کوشش کی تاہم اسے یقین تھا کہ ڈنگرا وکیل کے نام سے اس کے چہرے پر آنے والی سرخی کو دیکھ چکا ہے۔

”اگر ارجن کی ثانی جانبر نہ ہو سکیں تو ارجن کے ہندوستان میں رہنے کی کوئی ضرورت نہ ہو گی۔“ کار آشرم میں داخل ہوئی تو ڈنگرا نے دبے لفظوں میں کہا۔

اور پھر ڈنگرا اچانک خاموش ہو گیا تو جیہ کے پیٹ میں جیسے گرہ پڑنے لگی۔ وہ ڈنگرا کے پیچھے اس کمرے میں داخل ہوئی جہاں عورتیں بیٹھی بدستور چرخہ کات رہی تھیں۔

سفید ساڑھیاں پہنے ہوئے دو عورتیں عقبی برآمدے میں کسی پر جھکی ہوئی تھیں۔ جیہ

کو دیکھ کر وہ پیچھے ہٹیں۔ مہارانی فرش پر دراز تھی۔ اس کی شکل دیکھتے ہی جیہ کو اندازہ ہو گیا کہ اس کی ماں کا آخری وقت آ پہنچا ہے اور وہ ہندوؤں کی رسومات کے عین مطابق مرنے سے پہلے پرا تھنا میں مصروف ہے۔

مہارانی نے بہ دقت سر اٹھایا اور اپنی کمزور آواز میں ڈنگرا کو مخاطب کیا۔
ڈنگرا آگے کو جھکا۔ اس نے ہیروں کی مالا ایک ہاتھ میں تھام لی تھی تاکہ وہ مہارانی کو نہ چھوئے۔ جیہ بھی ڈنگرا پر جھک آئی تھی تاکہ مہارانی کی آواز سن سکے۔

”چھوئے! کئی سال پہلے یہ پیش گوئی کر دی گئی تھی کہ مجھے ستی ماتا کے نام سے پکارا جائے گا۔“ الفاظ بہ مشکل مہارانی کے حلق سے ادا ہو رہے تھے۔ ”شہزادی جانتی ہے کہ ہم نے کیسی کوشش کی تھی کہ یہ لقب اختیار کرنے سے بہتر ہے کہ ستی ہو جائیں لیکن جب ہمیں اس نام اور لقب کی اہمیت کا احساس ہوا تو ہم نے صورت حال کو خندہ پیشانی سے قبول کر لیا یہ ہمارے لئے ایک اعزاز تھا اور اب ہم تم سے ایک اور اعزاز کے خواہش مند ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری موت کا سوگ نہ منایا جائے۔“

ارجن برآمدے میں سے بھاگ کر آیا اور اپنی ٹانگیں پر جھک گیا۔ اس کی حالت اس بچے جیسی تھی جس سے کوئی راز چھپایا جا رہا ہو۔ مہارانی نے اپنا دہلا پتلا ہاتھ اپنے نواسے کے سر پر رکھ دیا اور اس کے سیاہ بال سہلانے لگی۔ جیہ رو دی۔ اسے وہ رات یاد آ گئی تھی جب جنگ پر جانے سے پہلے ٹکا کے سر پر بھی مہارانی نے اسی طرح ہاتھ پھیرا تھا۔ بالکل ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے مہارانی کے جانے سے شاہی ہندوستان بھی ختم ہو جائے گا۔

اور جس کے مہاراجہ نے اپنے دھرم کو بھرشٹ ہونے سے بچانے کے لئے شہنشاہ برطانیہ سے ہاتھ ملاتے وقت دستانے پن لئے تھے اسے سرنگوں ہونے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ مہاراجہ پٹیالہ جس نے دھمکی دی تھی کہ اگر سلطنت برطانیہ نے اسے تخت سے محروم کرنے کی کوشش کی تو وہ بادشاہت کے خلاف انقلاب کی سربراہی کرے گا، کو اپنی ریاست کی سرحدوں سے نکال باہر کیا گیا تھا۔

مہاراجہ بیکانیر جس نے جمیئر آف پر نزم میں بڑے فخر سے اعلان کیا۔ ”ہم ہندوستانی ریاستوں کے شہزادے ہندوستانی ہیں ہم بڑی شدت کے ساتھ اس دن کے منتظر ہیں جب ہمارا متحدہ ملک ایک عظیم سیاسی نظام کو جنم دے گا۔“ اپنی صحرائی ریاست کو لوٹ گیا تھا۔ وہ اپنے ساتھی حکمرانوں کی ناپالی اور برطانیہ پر ان کے انحصار سے دل برداشتہ ہو گیا تھا۔

اور اب چیمبر آف پر نرزمیں کوئی دیو زاد موجود نہ تھا جو اپنے ساتھی حکمرانوں کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے اختیارات کو سہارا دینے میں کامیاب ہو سکتا۔

سارانی کے دیہانت کے ساتھ ہی جیہ کو محسوس ہونے لگا کہ ایک شاندار ماضی کے ساتھ ارجن کا رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا ہے۔ وہ سیرپور واپس آئی تو میجر آبرن مہاراجہ وکٹر کی اسٹڈی میں فیڈریشن کے بارے میں تازہ ترین خبروں کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔

ہندوستانی بادشاہوں میں نفاق کی اطلاعات سن کر جیہ خوفزدہ ہو گئی کیونکہ اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ ارجن کا مستقبل ان ہاتھوں میں ہے جو خود اپنے مستقبل کی فکر میں ہیں چنانچہ اس نے جیمس آبرن سے کہا کہ وہ انگلینڈ میں ارجن کی پڑھائی کے انتظامات مکمل کر دے۔

جیہ نے ابھی اپنی ماں کے دیہانت پر ہونے والی پوجا ختم کی ہی تھی کہ ملک کے کئی حصوں میں تباہ کن زلزلہ آیا۔ دوسرے مشرقی حصوں کی طرح اس کے اثرات سیرپور میں بھی محسوس کئے گئے تھے۔

سربز و شلواب کھیتوں کی دوسری جانب واقع پہاڑی علاقے زلزلے سے بری طرح متاثر ہوئے تھے۔ جنگل نہ دبلا ہو گئے تھے اور کئی مقامات پر آبشار پھوٹ پڑی تھیں۔ سیرائر کے ساتوں جہاز قبائلی علاقوں میں خوراک اور دیگر امدادی سامان گرا رہے تھے۔ جیہ نے نصف شب کے وقت اپنی پوجا ختم کی اور تیاری میں مصروف ہو گئی۔ وہ صبح متاثرہ علاقوں کے فضائی جائزے کا ارادہ رکھتی تھی۔

سیرائر کے طیارے سے جیہ نے زندگی کی بریادیاں دیکھیں اور غریب اور تنگ دھڑنگ قبائلی اپنی تباہ حال دنیا کو بسانے کی نئی کوششوں میں مصروف تھے۔ چھوٹے جہازوں سے ان کے لئے خوراک گرائی جا رہی تھی اور وہ بھوکے گدھوں کی طرح ان پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ جگہ جگہ پل ٹوٹ گئے تھے۔ چنانچہ ہنگامی بنیادوں پر پلوں اور راستوں کی تعمیر کا آغاز کر دیا گیا تھا۔

امدادی کاموں پر اٹھنے والی رقم اتنی زیادہ تھی کہ سیرپور کونسل کے ارکان پریشان ہو گئے۔ وزیر اعظم نے جیہ کو متوقع مشکلات کے بارے میں متنبہ کر دیا تھا۔

”فیکسوں میں اضلے کے باعث لوگ اصلاحیوں سے ربط و ضبط برعبار ہے ہیں، حکم!“

”کیا ہمارے لوگوں کو احساس نہیں کہ قبائلی علاقے کس آفت کا شکار ہوئے ہیں؟“

”احساس ہے مگر وہ خوفزدہ ہیں، حکم!“ وزیر اعظم نے جواب دیا۔ ”وہ اپنے مستقبل سے خوفزدہ ہیں۔“

جیہ خاموش تھی۔ متعدد ہندوستانی حکمرانوں کو ٹیکسوں میں اضافے کے باعث اسی خوف کا سامنا تھا۔ ان حکمرانوں کو ہر روز ہندوستان کی آزادی کے ڈاکو قرار دیا جا رہا تھا۔

”راج گورو نے سلطنت کے بے وقوف اور جاہل لوگوں کو یہ باور کرا دیا کہ زلزلہ مہاراجہ ارجن کو انگلینڈ کے اسکول میں بھیجنے کے آپ کے فیصلے کا نتیجہ ہے۔“ وزیر اعظم نے جیہ کو آگاہ کیا۔ ”اس کا کہنا ہے کہ آپ نے دیوی کو ناراض کر دیا ہے۔“

راج گورو نے کہا ہے کہ اگر حکمران کے انگریزوں کے ساتھ رابطے جاری رہے تو ایسی کئی اور آفتیں نازل ہوں گی۔

جیہ نے کمزور سے انداز میں سر ہلا دیا۔ اس نے محل کی راہداریوں میں سیر پور کی ملازموں کو مہاراجہ وکٹر اور مہاراجہ پر تپ کی عبرتناک اموات پر تبصرہ کرتے سنا تھا۔ انہوں نے ان اموات کے ڈائریے بھی انگریزوں سے روابط کے ساتھ ملا دیئے تھے۔

جیہ نے پلٹ کر کتابوں کی دیوار گیر الماری کو دیکھا۔ ایک بہت بڑا آہنی سیف اس الماری کے عقب میں موجود تھا۔ جیہ نے اٹھ کر سیف کا ڈاکل گھمایا تو کئی آوازیں سنائی دیں کیونکہ اس سیف کو بہت کم استعمال کیا گیا تھا۔ جیہ نے بھاری دروازہ کھولا تو سبز مخمیس جلد میں لپٹی کئی فائلیں سامنے آ گئیں جن پر بالمر کا شاہی نشان کندہ تھا۔ جیہ نے فائلیں دزیر اعظم کو تھما دیں۔

”یہ ہماری شادی کے وقت ہمارے حوالے کی گئی تھیں۔“ اس نے وزیر اعظم کو آگاہ کیا۔ ”آپ انہیں پڑھ کر بتائیں کہ کس شے کی فروخت سے ہم اپنے امدادی کاموں کے لئے زیادہ سے زیادہ رقم حاصل کر سکیں گے۔“

سر اکبر دستاویزات کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔

اور پھر وہ چونک اٹھا۔

”یہ تو ہماری توقعات سے کہیں زیادہ قیمتی ہیں، حکم!“ اس کے لہجے میں ایک انجانا سا جوش تھا۔ ”ہماری ضروریات سے کہیں زیادہ مگر یہ فلوریڈا والی زمین.... اسے تو پہلے ہی اسی مورے کے حق میں دستخط....“

دروازے پر دستک سے سر اکبر کا جملہ ادھر اڑا رہ گیا۔ ”آپ نے پہلے ہی سیر پور کے لئے بہت کچھ کیا ہے، حکم!“ اس نے دروازہ کھولتے ہوئے تبصرہ کیا۔ سامنے ہی لانسرز کے

عقب میں ایک کلرک مووب کھڑا تھا۔

جیہ نے کلرک کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے لفافے پر نگاہ ڈالی بچپن سے ہی وہ واٹسرایگل کے معاملات پر مبنی لفافوں کو پہچانتی تھی۔

امداد کا سلسلہ اور ریاست کے سیاسی منظر نامے سے ارجن کو ہٹانے کی ضرورت اچانک ہی واضح ہو گئی۔ سلطنت برطانیہ نے حل ہی میں مہاراجہ ریوا کو اس کے تخت سے ہٹا دیا تھا۔ جیہ کے ذہن میں فوراً ہی یہ سوال اٹھا تھا کہ کیا راج گورو ارجن کو سیرپور سے روانہ ہونے سے روک کر اس کی قائم مقامی ختم کرانے میں کامیاب ہو گیا ہے؟

سراکبر نے دروازہ بند کر دیا۔ ”کیا میں آپ کو پیغام پڑھ کر سناؤں، حکم؟“ سراکبر نے بڑے نارمل انداز میں جیہ کو مخاطب کیا تھا اور جیہ نے نہایت خفیف سے انداز میں سر کو اٹھاتی جنبش دے کر سراکبر کو اجازت دی تھی۔

سراکبر نے لفافہ کھولا اور کلفڈ نکال لیا۔

”ڈارلنگ!“ لیڈی مودی کا جانا پہچانا لفظ سراکبر کے ہونٹوں سے آزاد ہوا تو جیہ کے حلق سے اطمینان کی ایک طویل سانس خارج ہو گئی۔ ”بوڑھی گلابو کے ذہن میں ایک شاندار خیال پیدا ہوا ہے۔ اس نے آخری کلکتہ سیزن مٹانے کا فیصلہ کیا ہے۔ چروں پر نقاب ڈال کر بل میں شرکت تقاضہ ہے اس کا لوئیس شازڈہم امید ہے تم بھی شرکت کرو گی۔۔۔ پس!“

جلد ہی ریاست کے طول و عرض سے پیغامات وصول ہونے شروع ہو گئے جن میں جیہ کو بتایا گیا تھا کہ تباہ شدہ سڑکوں اور قبائلی دیہات کی تعمیر مکمل ہو گئی ہے۔ جیہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی کہ جب وہ ارجن کو اسکول میں داخل کروانے کے لئے لندن جائے گی تو اس کی عدم موجودگی میں سراکبر کو معاملات سے نمٹنے میں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

لیکن لیڈی مودی کے ٹیلی گراموں کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا ان سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے زلزلے کی خبروں سے زیادہ اہم وہ معاملہ ہو جس کے لئے وہ ٹیلی گرام پر ٹیلی گرام دے رہی تھی۔

”لگتا ہے کہ پر نزل لوگوں میں مقبول نہیں رہی۔ براہ کرام بل ڈانس کو سنجیدگی سے لینا تاکہ واٹسرایگل پر زیادہ سے زیادہ خوش گوار تاثر پڑے۔“

ایک اور ٹیلی گرام موصول ہوا تھا۔

”بس چار ہفتے رہ گئے ہیں۔ تم بتاؤ کہ بل کے موقع پر کیا پن رہی ہو؟“

جیہ نے ٹیلی گرام ایک طرف اچھال دیئے۔ اسے ارجن کی روانگی کی فکر تھی۔ سیرپور

کے دو اور بچے مہاراج کے سات انگلینڈ جا رہے تھے۔ انہیں بھی وہاں داخل کر لیا جانا تھا۔ دونوں بچے محل کی راہ داریوں میں ارجن کے ساتھ کھیلتے کودتے اور ان کی قلعاریوں۔ پورا محل گونجتا رہتا۔

لیکن جب جیہ کرکٹ گراؤنڈ کے قریب سے گزرتی اور ان بچوں کو مسٹر اسٹیونز کے ساتھ کرکٹ کھیلتے دیکھتی تو اسے احساس ہوتا کہ ٹکا کی طرح اپنے بیٹے کو بھی وہ ایک دن کھیل دے گی۔

1936ء۔ بل کی رات کو لیڈی مودی اور جیہ بل گاؤن پنہ ہوئے نمودار ہوئیں۔ اس کے ماسک گھوٹوں کی ایال جیسی دگوں کے نیچے پڑے ہوئے تھے۔ لڑکے اس وقت اپنی ہڈی نہیں روک سکے تھے جب انہوں نے چھوٹے ڈنگرا کو ان خواتین کو گاڑی میں سوار کرا دیکھا۔ اس کا موٹا تازہ جسم چست کپڑوں میں عجیب لگ رہا تھا۔

کپڑے تو جیہ اور لیڈی مودی سے بھی سنبھالے نہیں جا رہے تھے۔ گاڑی جس گورنمنٹ ہاؤس میں داخل ہوئی تو جیہ ایک ہاتھ سے بہ مشکل اپنا اسکرٹ سنبھالے ہو۔ تھی۔

وائسرائے کے لانسز اپنی جگہ تے کھڑے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے مجتہدوں گھوٹوں پر بٹھا دیا گیا ہو۔

”ڈارلنگ!“ لیڈی مودی نے جھک کر جیہ کے کان میں سرگوشی کی۔ ”ذرا ان گھڑ سواروں کی وردیاں تو دیکھو۔ بوڑھی گلابو کا پسندیدہ رنگ ان پر بھی دکھائی دے رہا ہے۔“ وہ لوگ ذرا سا آگے بڑھے تو لیڈی مودی پھر چلا آئی۔ ”اوہر دیکھو۔“ اس کا لہجہ پر جوش تھا۔ ”بوڑھی گلابو نے میری انتونیو کا میک اپ کیا ہے۔“

جیہ نے لیڈی مودی کی تقلید میں دیکھا۔ ایک اوجیز عمر قوی الجشہ ملکہ فرانس کے گیر اپ میں ہولے ہولے تھرک رہی تھی ایک ہندوستانی حکمران فرانسیسی درباری کے روپ میں اس کے سامنے جھک کر اسے تعظیم دے رہا تھا۔ دونوں ارد گرد کے ماحول سے بے بہرہ اپنے اپنے گیٹ اپ کو نبھانے میں مصروف تھے۔

بال روم میں بھی بات چیت ایک خاص ڈھب سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ ”حکم! کیا ہر برلن اوپیکس کے موقع پر آپ کو دیکھ سکیں گے؟“

مہاراج کپور تلہ نے اس تمنے کا حوالہ دیا جو گزشتہ موسم گرما میں روم کے دورے کے موقع پر مسٹین نے اسے دیا تھا۔ ”ممکن ہے جرمن چانسلر بھی مجھے اسی طرح کامیڈل دے۔“

دے۔“

”میں اپنے والدین کے ساتھ گزشتہ گرمیوں میں آسٹریا گئی تھی۔“ مہارانی کوچ بہار نے اپنی بڑی بیٹی کو ڈانس فلور پر ایک انگریز افسر کے ساتھ محو رقص دیکھ کر کہا۔ ”ہم نے وہاں عجیب و غریب کہانیاں سنی تھیں کہ براؤن شرٹس والے کس طرح دکانداروں اور خانہ بدوشوں پر تشدد کر رہے ہیں۔ موسیقی کے بلیک شرٹس والے اٹلی میں بھی تو یہی کر رہے ہیں نا؟“

”نہیں، نہیں، حکم!“ اٹلی میں فاشٹ اپنے ملک کو کیونز سے بچانے کی کوششوں میں ہیں۔ یہ مت بھولیں کہ ان کیونسٹوں نے روس میں زار کو قتل کر دیا تھا اور اگر یہ موسیقی کے لئے نہ ہوتا تو وکٹر ایمانویل اب تک مارا جا چکا ہوتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے انہیں اسپین کے بادشاہ کے قتل کی سازش کرتے دیکھا۔ انہوں نے شاہ کی شادی کے جلوس پر بم پھینک دیا تھا۔“

اس نے پلٹ کر وائسرائے کی بیوی کی طرف دیکھا لیکن وہ اپنی خوش گپیوں میں مصروف تھی۔

جیہ اپنے ملک کی وجہ سے مطمئن تھی کیونکہ ملک نے بل روم میں اس کے چہرے کے تاثرات چھپا لئے تھے۔ بھاری بھر کم اور ذرق برق گاؤں پہنے ہوئے ہندوستانی عورتیں، انگریز افسروں کی بانہوں میں تھرک رہی تھیں۔ جو کوئی ملک کے باوجود ایک دوسرے کو پہچان لیتا وہ کندھا تھتھا کر شہسائی کا اظہار کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔

جیہ نے بھی وائسرائے کی بیوی کو پہچان لیا تھا جو مہاراجہ پور تھلہ کی بانہوں میں سمٹی رقص کر رہی تھی لیکن جیہ نے اسے پکارنے یا شہسائی کے اظہار کی کوشش نہیں کی تھی۔ بل کے بعد کرسمس کی تقریبات اور پولو میچوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا لیکن جیہ وائسرائے کی بیوی کے فرانسیسی ملکہ کے روپ سے جان نہ چھڑا سکی تھی۔

وہ اس میں اتنی الجھ گئی تھی کہ جب لیڈی مودی شہنشاہ برطانیہ کے مرنے کی خبر لے کر اس کے پاس آئی تو بھی جیہ کو یہ محسوس نہ ہوا کہ یہ کسی نئے عہد کا آغاز ثابت ہو سکتا ہے۔

لیڈی مودی نے شہین کا ایک گلاس اس کے ہاتھوں میں دے دیا۔ ”کتنے مزے کی بات ہے ڈارلنگ۔ شاندار پرنس آف ویلز برطانیہ کا بادشاہ بن گیا ہے۔ آخر کار ہندوستان کو ایک پلے بوائے میسر آ گیا ہے اور ہمیں ایک شریف آدمی وائسرائے کی شکل میں دیا گیا ہے خوش رہو ڈارلنگ۔ یہ ولنگٹن آخر کار یہاں سے جا رہا ہے۔ چلو گلاب کے پھولوں کا گلہ ستہ

تیار کریں۔“

لندن پہنچنے پر جیہ کو احساس ہوا کہ لیڈی مودی کا جوش بلا وجہ تھا۔ برطانوی سلطنت کا دارالحکومت پہلے بوائے بادشاہ کی تاجپوشی کا جشن نہیں منا رہا تھا۔ پرانے دوست آٹھ سال کے بعد جیہ کو لندن میں دیکھ کر بے حد خوش تھے۔ وہ کچھ دیر تو اس کے بارے میں باتیں کرتے لیکن پھر نیا بادشاہ زیر بحث آ جاتا۔ شاہ ایڈورڈ ہشتم ایک مطلقہ عورت مسز سمپسن کے عشق میں مبتلا تھا اور لوگ یہ سوچ رہے تھے کہ کیا یہ معاشقہ انگلینڈ میں بادشاہت کے خاتمہ کی وجہ تو نہیں بن جائے گا۔

انگریز بادشاہ کے معاشقے کی خبر سن کر جیہ کو اپنے شوہر کا اسکیڈل یاد آ گیا۔ وہ عورتیں یاد آئیں جنہیں استعمال کر کے برطانوی راج طاقتور ہندو حکمرانوں کو ان کے تخت و تاج سے محروم کیا کرتا تھا۔ اب یہی وقت خود برطانوی سلطنت پر آن پڑا تھا۔ ہندوستانی حکمرانوں کو وضاحتوں کا موقع نہیں دیا گیا تھا لیکن شاہ ایڈورڈ ہشتم کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ پارلیمنٹ کے سامنے اپنی پوزیشن کی وضاحت کرے۔

حالات پل پل بدل رہے تھے۔ اس تیزی نے لیڈی مودی کو بھی خوفزدہ کر دیا تھا۔ لیکن ڈارلنگ! میں سمجھ نہیں سکی کہ آخر شاہ مسز سمپسن سے شادی کا خواہش مند کیوں ہے۔ دہلی میں ویشٹائن ہال کے دوران اس نے کورا ہارٹ سے وکٹر کی شادی کو کوئی اچھا فعل قرار نہیں دیا تھا۔ حالانکہ کورا کے پہلے سے دو سابق شوہر موجود نہیں تھے۔“

جیہ نے کوئی جواب نہیں دیا گزشتہ بار جب وہ انگلینڈ آئی تھی تو عورتوں کی وجہ سے مہاراجاؤں کے تحت چھپنے جانے کے واقعات رونما ہو رہے تھے۔ خود اس کے اپنے شوہر کے خلاف یہ مم اتنی طاقت ور تھی کہ اس کا اختتام جیہ کی قائم مقامی کی صورت میں نکلا تھا۔ ہندوستانی بھی مے فیز ہاؤس آتے تھے جہاں جیہ مقیم تھی لیکن وہ مسز سمپسن کے موضوع پر بات نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی بات چیت کا موضوع ہندوستان میں ہونے والے انتخابات ہوا کرتے تھے۔

”ان انتخابات نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین فاصلے بڑھا دیئے ہیں۔“
”کیا مزید مذہبی فسادات ہو سکتے ہیں؟“ جیہ پوچھتی۔ ”جی حکم! صورتحال اب بھی قابو میں نہیں ہے۔“ اسے جواب دیا جاتا۔

”جناح کو قائد اعظم کا خطاب دیا گیا ہے، یعنی عظیم قائد اور ان کے مقابلے پر ہے مہاتما گاندھی یعنی عظیم روح۔ دیکھیں کس فتح نصیب ہوتی ہے؟“

جیہ اس بات سے مطمئن تھی کہ اس کا بیٹا اس خطرناک صورت حال سے دور ہے۔ سو وہ لڑکوں کے ساتھ شہر گھومتی رہی۔ ارجن اور اس کے دوست لندن کی نئی زندگی پر بے حد خوش تھے۔ زیر زمیں ریلوے۔ ٹاور آف لندن۔ ہیمپٹن کورٹ۔ بکنگھم پیلس اور لاتعداد جہیں انہوں نے دیکھیں۔ ارجن کی خوشی دیکھ کر جیہ کو احساس ہوا تھا کہ اس نے اسے انگلینڈ بھیج کر درست فیصلہ کیا ہے۔

لیکن لیڈی مودی کو اس امر سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ اب تک ایڈورڈ ہشتم میں ابھی ہوئی تھی۔ ”یہ ناقابل یقین ہے ڈارلنگ۔ اسے بادشاہ بنے ہوئے چھ ماہ ہو گئے ہیں، میں منتظر ہوں کہ وہ اپنا ذہن کب تک بناتا ہے؟ چیز آپ پسند۔“ جیہ نے بات اڑائی۔ ”اگر وہ چلا گیا تو ڈیوک آف یارک بادشاہ بن جائے گا اور اس طرح ہمیں خود پر حکومت کے لئے ایک اور شاہ جارج اور ملکہ میری مل جائیں گے۔“

لیڈی مودی نے برا سامنہ بنایا لیکن کہا کچھ نہیں۔

آنے والے دنوں میں بھی وہ اسی فکر میں رہی کہ شاہ ایڈورڈ کب تخت سے دستبردار ہو کر سنز مپسن کو گلے لگاتا ہے جبکہ جیہ اسکول کے معاملات نمٹانے میں مصروف رہی۔ اس عرصے میں ڈکٹیز کا لفظ اخبارات میں عام ہوتا رہا اور پتہ چلتا رہا کہ اٹلی نے ایتھوپیا میں بمباری کی ہے اور شہر کے فوجی دستی نئے رہائے لینڈ پر چڑھ دوڑے ہیں۔

جیہ نے کوشش کی تھی کہ وہ تمام تر محبت اور جذبات کے باوجود ارجن سے جدا ہوتے ہوئے روئے نہیں۔ اس نے خود پر قابو پانے کا شاندار مظاہرہ کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب رولس ہائس سے فیئر ہاؤس کی سیڑھیوں سے روانہ ہونے لگی تو ارجن کی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہیں نکلا تھا۔

”ہم جلد واپس آئیں گے، حکم!“ ارجن نے چند قدم کار کے پیچھے بھاگتے ہوئے ماں کو یقین دلایا۔ ”آپ اس بات کو یقینی بنائیے گا کہ کرکٹ پیچ صحیح حالت میں رہے۔“

واپسی کے سفر میں لیڈی مودی نے کوشش کی تھی کہ ارجن کی جدائی سے جیہ رنجیدہ نہ ہونے پائے۔

”ہم سروریاں شاندار طریقے سے گزاریں گے۔“ اس نے جیہ کو یقین دلایا۔ ”تمہیں خوش رکھیں گے۔ پرانے دنوں کی طرح جب پر تپ اور وکٹر ہمارے ساتھ ہوتے تھے۔ پولو، گیم، رقص ہم کلکتہ سے خصوصی بیڈ بلوائیں گے۔“

لیکن ہر شام لیڈی مودی، بڑا بڑھوم اسٹیٹ روم میں کھس جاتی اور سنز مپسن کے بارے

میں شاہ ایڈورڈ کے اگلے بیٹن کا انتظار کرتی رہتی۔

بہی میں جہاز لنگر انداز ہونے سے دو دن پہلے عرشے کے ارد گرد چوٹی دیواروں پر پھیل چکائے گئے جن میں مسافروں کو ہدایت دی گئی تھی کہ بادشاہ اس سلسلے میں سہ پہر کے خود برطانوی سلطنت سے خطاب کریں گے۔

میں سیلون میں ایک بڑا ساریڈیو رکھ دیا گیا تھا اور خطاب سے بہت پہلے کمرے موجود کرسیاں بھر چکی تھیں۔ دیر سے آنے والے کھڑکیوں سے چٹے ہوئے تھے جبکہ آنے سے محروم رہ جانے والے عرشے پر نصب لاؤڈ اسپیکروں کے آس پاس جگہ تلاثر رہے تھے۔

بالآخر انتظار ختم ہوا اور اس آواز نے بولنا شروع کر دیا جو جیہ نے پندرہ سال پہلے تھی جب پرنس ویلز نے سیرپور کا دورہ کیا تھا۔ لیڈی مودی نے اپنا منہ رومال میں چھپا جیہ نے ارد گرد دیکھا۔ تمام لوگ جذبات سے گویا بھرے بیٹھے تھے۔ لیڈی مودی کی سس ابھریں تو جیہ نے دوسری عورتوں کا جائزہ لیا۔ کمرے میں موجود تمام عورتیں رو رہی تھیں جیہ کی آنکھوں میں کوئی آنسو نہ تھا۔ وہ ساکت و جلد بیٹھی اس شخص کی آواز سن تھی جسے ہندوستان کا بادشاہ بننا تھا ”میں سلطنت کا بھاری بوجھ اس عورت کی مدد کے نہیں اٹھا سکتا جس سے میں محبت کرتا ہوں۔“

ارجن کے چلے جانے سے جیہ تنہا رہ گئی۔ وہ سرکاری ذمہ داریاں ادا تو کر رہی تھی مگر اس کی حالت اس خالی مندر کی سی تھی جس سے بت اٹھا لیا گیا ہو۔ اسے محل کی راہ اندریوں میں گھومتے ہوئے ملازمین اور لائبریرز چلتے پھرتے بھوت محسوس ہوتے تھے۔ وہ اکثر ل کی عقبی سمت چلی جاتی جہاں بچے کھیل کود میں مصروف ہوتے لیکن اسے ان کی ہنسی بھی لکھلی محسوس ہوتی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے پوری ریاست ہی اپنے حکمران کی جدائی کا کوس کر رہی ہے۔

کبھی کبھار وہ جیسے آبرن سے ملنے جاتی تو اس کی آنکھوں میں عجیب سی پریشانی لگتی دکھائی دیتی۔ یوں لگتا جیسے عوام سے ایڈورڈ ہشتم کی غداری نے رینڈنٹ سے بھی اس کا اعتماد چھین لیا ہو۔ یوں بھی ہندوستان کے بادشاہ کا سلوک عام لوگوں کے ساتھ ایسا ہی رہا جیسے اسے ہندوستان کے رہنے والوں پر اعتماد نہ ہو اور وہ اس سرزمین پر ہونے والی تمام باتوں کا ذمہ دار حکمرانوں کو سمجھتا ہو جو نہ صرف یہ کہ خود کو حکمران ثابت کرنے میں ناکام رہے بلکہ انہوں نے اپنے عوام کے لئے بھی کوئی خاص کارنامہ انجام نہیں دیا۔

ایک روز آبرن نے جیہ کو بتایا کہ وائسرائے نے ہندوستان کے تمام حکمرانوں کو پیغام دیا ہے کہ وہ فوری طور پر فیڈریشن میں شامل ہو جائیں ورنہ یہ امر خود ان کے لئے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ ”وائسرائے دہلی سے سفارتی مشن بھیجا رہا ہے تاکہ حکمرانوں کو اس فیصلے مجبور کیا جاسکے۔“ اس نے جیہ کو آگاہ کیا۔

لیکن اس کا کوئی بہتر نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ بعض حکمران تو ان اصلاحات پر متفق ہو گئے مگر بعض نے اسے اپنی سالمیت اور آزادی کے خلاف ایک تجاوز قرار دیا جبکہ سیرپور میں رت حال الگ تھی وہاں اخبارات دیگر ریاستوں کی طرح انتخابات کا مطالبہ کر رہے تھے اور ستم ظریفی یہ ہوئی کہ سر اکبر اکثر و بیشتر جیہ کے لئے میسور، بے پور، راجکوٹ، کشمیر ایسی ہی دوسری طاقتور ریاستوں میں بغاوت اور بلوڈ کی خبریں ہی لاتے تھے۔

”لیکن سیرپور میں تو اصلاحات کی جا چکی ہیں۔“ جیہ جواب دیتی۔ ”ہماری ریاستیشن کی حامی ہے۔ برطانوی ہندوستان کی آزادی سے ہماری رعایا بھی لطف اندوز ہو رہی

ہے تب پھر اصلاح پسند ہماری ریاست کے سکون کو برباد کیوں کر رہے ہیں؟“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کسی ایک ریاست نے اصلاحات کی ہیں یا نہیں۔“
اکبر جواباً توضیح پیش کرتا۔ ”اصلاحی، دراصل طاقت و قوت کی بو سونگھ لیتے ہیں حکم! میں
یہی سمجھتا ہوں کہ جب تک یہ پاگل پن جاری ہے مہاراجہ ارجن کو ریاست سے دور ہی
چاہئے۔“

جیہ کے دل کی دھڑکن محض یہی سوچ کر رک جاتی کہ اب اسے اپنے بیٹے کو دیکھنے
کے لئے مزید ایک سال کا انتظار کرنا پڑے گا۔

لیکن جب شیردل مہارانی کو پتا چلا کہ ارجن مزید ایک سال تک واپس نہیں آئے
غم و غصے سے لال پیلی ہو گئی جیہ کو یہ سمجھنے میں خاصی دیر لگی تھی کہ بوڑھی ملکہ ایک
پھر اپنے ماضی سے خوفزدہ ہو گئی ہے اسے ڈر تھا کہ جیسے مہاراجہ وکٹر برطانوی بادشاہت کی
میں جا بیٹھا تھا اسی طرح وہ مہاراجہ ارجن کو بھی اپنے پاس گروی رکھ لیں گے۔

موسم برسات شروع ہونے پر شیردل مہارانی کا یہ خوف ایک بیماری میں تبدیل ہو
اور جیہ کو اس کی تیار داری کے لئے پردہ پیلس تک محدود ہونا پڑا۔ اب وہ ساری سا
رات مہارانی کی تیار داری کرتی یا اپنے بیڈ روم میں وسیع و عریض بیڈ پر بے چینی
کروٹیں بدل بدل کر ان ملازموں کا انتظار کرتی جو مہارانی کی صحت کے بارے میں پل پل
خبریں اسے فراہم کرتیں۔ جب بے تابی زیادہ ہوتی تو وہ اٹھ کر محل کی راہداریوں میں
شروع کر دیتی۔

اور پھر ایک رات ایک خواجہ سرانے جیہ کو بتایا کہ بوڑھی عورت قریب المرگ ہے
جیہ فوراً مہارانی کے کمرے میں پہنچی لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی کھیل ختم ہو
تھا۔ شیردل مہارانی اپنے پڑپوتے کی واپسی کا انتظار کر کے اس دنیا سے چلی گئی تھی جیہ
میں ہی محدود رہی تھی کیونکہ اب اسے تیرہ دن کی اس پوجا میں شرکت کرنی تھی جو بوڑھی
مہارانی کے دیہانت کے بعد ہوئی تھی۔ چودھویں دن مہارانی کی راکھ بتارس کے مقام
مقدس دریا میں بہا دی گئی۔

جب جیہ ویلز ہیلس واپس آئی تو سر اکبر اور جیمس آبرن برآمدے میں اس کے
تھے۔ ”وائسرائے نے ایک سفارت سیرپور بھیجی ہے، حکم!“ وزیر اعظم نے اسے آگاہ کیا
لیکن آپ زنان خانے میں مصروف تھیں اس لئے آپ کو آگاہ نہیں کیا جاسکا۔“
جیہ کو سر اکبر کی حالت دیکھ کر افسوس ہوا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے سر اکبر برسوں کا

ہو۔ الفاظ بہ دقت اس کے حلق سے خارج ہو رہے تھے شاید اسے مہارانی کے مرنے کا شدید دکھ تھا۔ ”میں نے سفارت کو یقین دلانے کی بھرپور کوشش کی تھی کہ سیرپور دوسرے مہاراجاؤں کو فیڈریشن میں شامل ہونے پر رضامند کرنے کے لئے تمام تر وسائل بروئے کار لائے گا۔“ سر اکبر نے جیہ کو آگاہ کیا۔ ”لیکن شاید برطانیہ اس بات کو سمجھنے کے لئے تیار نہیں کہ حکمران بادشاہ ایک قائم مقام مہارانی کی بات سن لیں گے اور اسے تسلیم بھی کر لیں گے۔“

اچانک وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے سہرے دستے والی چھڑی کا سہارا لیا اور کیاریوں کے درمیان ٹھٹھا شروع کر دیا۔ اچانک ہی ایک پھول سر اکبر کے شانے پر آگرا سر اکبر چونکا ضرور لیکن جیہ کو یہ دیکھ کر بے حد حیرت ہوئی تھی کہ اس کا ہاتھ پھول ہٹانے کے لئے بلند نہیں ہوا۔

آبرن نے کھٹکار کر گلا صاف کیا۔ ”سر اکبر نے آپ کو یہ نہیں بتایا شہزادی کہ وائسرائے نے ہندوستانی حکمرانوں کو الٹی میٹم دے دیا ہے یا تو ستمبر 1939ء تک نصف سے زائد حکمران اس فیڈریشن میں شامل ہو جائیں ورنہ شمالی ہندوستان کو حکمرانی کے حق سے محروم کر دیا جائے گا۔“

جیہ نے بغور آبرن کا جائزہ لیا۔ اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ پردہ پیلس میں اس کی غیر حاضری کے دنوں میں آبرن کا اعتماد قدرے بحال ہو گیا ہے۔ ”یہ تو حیرت انگیز ہے جیس صاحب!“ اس نے اپنی کھٹکھٹاتی آواز پر ریزیڈنٹ کو مخاطب کیا۔ ”ہم حلیفہ کہہ سکتے ہیں کہ اپنے بیٹے کے حوالے سے وہ غلطیوں کبھی نہیں دہرائیں گے جن کا شکار ہمارا بھائی، شوہر یا جیٹھ ہو گیا ہے لیکن یہاں تو صورت حال زیادہ خراب ہے کیونکہ ہم نے تو اپنے بیٹے کو دو سال سے نہیں دیکھا۔“

آبرن نے کچھ نہیں کہا لیکن یہ خاموشی دونوں کے درمیان دوستی کی گویا تجدید تھی جب وہ لڑکپن کا دور گزار رہے تھے تو یہ خاموشی الفاظ سے زیادہ ان کی معلومت ثابت ہوتی تھی اب بھی وہ اس بات سے آگاہ تھی کہ یہ لمبا چوڑا انگریز اس کے ان خدشات سے آگاہ ہے کہ برطانوی کہیں اس کے بیٹے کو خراب نہ کر دیں اور وہ حکمرانی کی دوڑ میں الجھ کر اپنی بنیاد اور مقاصد کو فراموش کر بیٹھے۔

جیس آبرن مڑا۔ اس کی نیلی آنکھیں مارے غصے کے اسٹیل کے رنگ جیسی ہو گئی تھیں۔ ”مجھے تو یوں لگتا ہے شہزادی کہ ہندوستانی حکمران اب اپنے آپ سے اور اپنے وجود

سے بھی تنگ آچکے ہیں۔“ اس کا انداز سوالیہ تھا۔ ”وائسرائے نے ان حکمرانوں کو ماضی کے راستوں پر چلنے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے لیکن اسے کیا کہا جائے کہ آپ لوگ ماضی سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ اس میں مرنا چاہتے ہیں۔ وائسرائے یہ راستے بند کرنے میں ناکام ہو گیا ہے۔ اس لئے اس نے آپ لوگوں کو الٹی میٹم دیا ہے لیکن شنزادی! ایک لمحے کے لئے یہ ضرور سوچئے گا کہ اگر مہاتما گاندھی یا مسٹر جناح کے حامی سیرپور کی حدود میں داخل ہو گئے تو آپ کی حکومت کب تک چلے گی؟“

آسرن نے اپنا گلاس اتنی زور سے میز پر رکھا کہ اس سے خاصی آواز پیدا ہوئی تھی۔ جیہ کو اس کے غصے سے خوف محسوس ہوا تھا۔ اس نے اپنے والد اور اپنے شوہر کو ایسے مواقع پر یونہی غصے میں دیکھا تھا۔ جیہ کا تجربہ کتنا تھا کہ یہ صورت حال اس وقت پیدا ہوتی تھی جب وہ کسی چیز پر اپنا کنٹرول کھونے جا رہے ہوں یا طاقت کی ڈور ان کے ہاتھوں سے نکل جا رہی ہو۔ جب انگریز ریزیڈنٹ اٹھ کر اس راستے پر پہنچ گیا جہاں ایک بار سیرپور بینڈ نے پرنس آف ویلز کے استقبال کے لئے دھن بجائی تھی تو جیہ کو احساس ہو گیا کہ اب اردن رائے کو سیرپور بلانے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

1938ء

محض تیرہ برس پہلے ہندوستان کے وائسرائے نے سیرپور کا دورہ کیا تھا لیکن اس وقت دارالحکومت کی بالکونیاں وائسرائے کی سفید ٹرین دیکھنے کے لئے نہیں بلکہ اردن رائے کی سفید گاندھی کپ دیکھنے والوں سے لٹی پڑی تھیں وہ ایک دوسرے کو دھکے دے رہے تھے تا کہ آنے والے کی بہتر طور پر جھلک دیکھ سکیں۔

جیہ نے وکیل کے اس استقبال کے بارے میں سنا تو حیرت زدہ رہ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وقت کیسے بدلتا ہے۔ جب وہ مہارانی بنی تھی تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ جیسے ہندوستان کے وائسرائے کا دل جیتنے کے لئے اسے محنت کرنی پڑی تھی اسی طرح اسے ایک قوم پرست کو اپنا گردیدہ بنانے کے لئے محنت کرنا پڑے گی۔

جس طرح وائسرائے کی آمد پر توپ چلا کر اس کا استقبال کیا گیا تھا بالکل اسی طرح اردن رائے کو خوش آمدید کیا گیا تھا۔

لیکن جب اردن رائے ٹرین کے دروازے پر نمودار ہوا تو ایک لمحے کے لئے جیہ پریشان ہو گئی پچھلی بار اس نے اردن رائے کو گنجا دیکھا تھا لیکن اب نفرتی رنگت کے بال اس کے سر پر چمک رہے تھے اس نے مونچھیں بھی رکھ لی تھیں جن سے اس کا چہرہ مزید رعب

دار ہو گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ تھی جو اس کی پہچان تھی وہ نہایت مسرت کے عالم میں اس ہجوم کو دیکھ رہا تھا جو اس کے استقبال کو جمع ہو گیا تھا۔

سیرپور میں ایک ہفتے کے دوران اردن رائے جہاں بھی گیا ہجوم نے اس کا تعاقب کیا۔ اس نے مہاراجہ پر تپ ڈیم کے کام کی رفتار کا جائزہ لیا اور متعدد اسکولوں اور شفاخانوں کا دورہ کیا۔ ہر جگہ اس کا زبردست استقبال کیا گیا اور اسے تحفوں اور پھولوں سے لا کر واپس بھیجا گیا۔

جیہ کو اس وقت خاصا اطمینان ہوا تھا جب رائے نے اسے ریاست میں انجام پانے والے ترقیاتی کاموں پر مبارکباد پیش کی تھی۔ یہ مبارکباد ایسے رسمی انداز میں پیش کی گئی تھی جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی رہے ہوں۔ جب اردن رائے ریاست کے آپاشی کے منصوبوں کے فضائی جائزے پر نکلا تو جیہ نے انتہائی فخر کے ساتھ اسے ان اثر اسٹریس کے بارے میں بتایا جو ریاست کے دور دراز علاقوں میں ذرائع نقل و حمل کی ترقی کے لئے تعمیر کی گئی تھیں۔

”میں واقعی بہت متاثر ہوا ہوں شہزادی۔“ جہاز کے انجنوں کے شور کے باعث اردن رائے کو چلا کر اپنی بات کہنی پڑی تھی۔ ”لیکن میں گزشتہ ڈیڑھ سال سے پورے ہندوستان کے دورے کر رہا ہوں۔ تقریریں کر رہا ہوں اور کارکنوں کو اکٹھا کر رہا ہوں۔ تم نے جتنے کام کئے ہیں ان کا تقاضا ہے کہ میں سیرپور میں بھی کچھ کموں لیکن اس سے پہلے کہ میں دوبارہ اس کام کا آغاز کروں، کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم ذرا دیر کے لئے اس ہجوم سے دور ہو جائیں؟“

جیہ اتنی پرجوش تھی کہ اس سے پہلے وہ اس قوم پرست سے قدرے خوفزدہ رہا کرتی تھی لیکن اب یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس خوف کو فراموش کر بیٹھی ہو۔ ”معاف کرنا۔“ وہ ذرا سی پریشان ہو کر بولی۔ ”کل ہم قبائلی علاقوں کا دورہ کر رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ وہاں تمہارے مداح تمہیں پریشان نہیں کریں گے۔“

پورے ہفتے کے دوران وہ پہلی بار اس کا ذاتی مہمان بنا تھا۔ اردن رائے نے اسی لئے اپنے لمبے میں شناسائی کا عنصر شامل کر لیا تھا۔ ”جنگل کے دورے کو پروگرام میں شامل کرنا مت بھولنا، شہزادی۔ کون جانتا ہے کہ ہم پھر کسی سور کی کھوپڑی سے ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔“

وکیل کی درخواست پر شی پیل میں ہنگامی تیاریاں کی گئیں۔ قبائلی سرداروں کو دورے

کی اطلاع کر دی گئی تھی لیکن سر اکبر کا اصرار تھا کہ اس دورے کو حتی المقدور خفیہ اور رکھا جائے۔ ”ارون رائے قبائلی علاقوں کو زیادہ نہیں سمجھتا۔“ سر اکبر نے اپنے تئیں جو پیش کیا۔ ”لیکن اگر معلومات اور خاموشی ہمارے ہمراہ ہوں گے تو ممکن ہے وہ کوئی ایسی بات کہہ دیں جس سے ارون ہمارے مفادات کے خلاف ہو جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ جب ارون دارالحکومت میں تقریر کرے تو وہ سراسر ہماری حکومت کی حمایت میں ہو۔ آپ ذرا تصور کریں کہ اس سے ہمیں کس قدر فائدہ حاصل ہو گا۔ ہم ایک تیر سے دو شکار کریں گے۔“ جیپ گھاس سے ڈھکے ہوئے ناہموار راستے پر دوڑ رہی تھی اور لمحہ بہ لمحہ انہیں قبائلی سرحدوں کے نزدیک کر رہی تھی پھر وہ قبائلی حدود میں داخل ہو گئے ان کے عقب میں گرد غبار کا ایک طوفان تھا اس لئے جب جیپ رکی تو ارون نے دھول مٹی سے بچنے کے لئے ٹانگ پر رومال رکھ لیا۔

سر اکبر نے قدرے حیران نگاہوں سے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ ”یہ انتظامات مہمان کے لئے تو نہیں ہیں؟“ اس نے کمزور سی آواز میں سوال کیا۔

”ہم اپنی مہمانی کے ساتھ ایک اجلاس منعقد کرنا چاہتے ہیں۔“ سر اکبر کو جواب دیا۔

مٹی کے تیل کے ہنڈے اور لالٹین روشن کر دی گئیں اور قبائلی آلتی پالتی مار کر اپنی مہمانی کے روبرو بیٹھ گئے۔ وکیل نے ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگالی اور قبائلیوں کو بحر کرتے اور ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچتے دیکھنے لگا۔ ”یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں، شنزادی؟“ اس نے جیہ سے دریافت کیا۔

”یہ لوگ جانا چاہتے ہیں کہ انتخابات کا مطلب کیا ہوتا ہے۔“ جیہ نے اپنے مہمان بتایا۔ ”وہ ان طلباء کے بارے میں پوچھ رہے ہیں جو ان سے ملاقات کے لئے آئے تھے اور حکومت کی تبدیلی کا مطالبہ کر رہے تھے۔“

”اور آج رات جنگل میں شیر کی موجودگی کے بارے میں ان کا کیا کہنا ہے؟“ ارون رائے نے بالکل الگ سوال کیا تھا۔

قبائلیوں نے اپنے حقے اور بیڑیاں لہراتے ہوئے اس خوشخوار درندے کی نشاندہی کی جو اسی روز دیکھا گیا تھا جیہ نے اس کا ترجمہ کیا تو ارون رائے خوش دکھائی دیئے لگا۔ ”اس پہلی گولی تم ہی چلاؤ گی، شنزادی۔“ اس نے جیہ سے کہا۔

”لیکن ہم تمہارے ساتھ نہیں ہوں گے۔“

وکیل نے ایک جھٹکا سالیہ۔ ”کیا یہ میزبانی کی روایت کے خلاف نہیں ہو گا کہ کسی ایسے آدمی کو نصف شب کے وقت تنہا جنگل میں چھوڑ دیا جائے جو اپنے ہمراہیوں کی زبان سے بھی واقفیت نہ رکھتا ہو۔“

جیہ نے پریشان نگاہوں سے سر اکبر کو دیکھا۔ وزیر اعظم کی عمر ایسی تھی کہ اسے تمام رات ایک پلیٹ فارم پر جگا کر شیر کے شکار کے لئے مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جیہ کو حیرت تھی کہ وزیر اعظم جب معاونین اور خادمین کو ہمراہ نہ لے جانے پر ہند تھا تو جیہ کے ذہن میں یہ بات کیوں نہیں آئی۔ سر اکبر نے وکیل کی بات سن کر سر کو اثباتی جنبش دی اور جیہ دوبارہ اردن رائے کی طرف مڑی۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ جانے اس کی مسکراہٹ میں ایسی کیا بات تھی کہ جیہ کو اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہونے لگا تھا۔

قبائلی اب بھی سیرپور میں انتخابات کے بارے میں پوچھ رہے تھے اور بے اختیار جیہ کو جیس آسرن کے الفاظ یاد آ رہے تھے۔ ”اگر گاندھی اور مسٹر جناح کے حامی سیرپور میں داخل ہو گئے تو آپ کی حکومت کا مستقبل کیا ہو گا، شنزادی؟“

جیہ گھٹنوں کے بل بیٹھے ہوئے ہاتھی کے ہودے میں خاموشی کے ساتھ سوار ہوئی تھی جو نئی سرمئی رنگت کا یہ دیو ہیکل جانور اپنی جگہ سے اٹھا تو جیہ کو بندوقیں لوڈ کئے جانے کی آوازیں سنائی دی تھیں جو ان شکاریوں کی تھیں جو اس شاہی ہاتھی کے ہمراہ جنگل میں داخل ہونے جا رہے تھے۔

مہات نے ہاتھی کی گردن تھپتھپائی اور پھر ایک نغمہ اس کے ہونٹوں سے نکل کر جنگل کی خاموش فضاؤں میں پھیل گیا۔ جیہ کو اپنا بچپن یاد آ گیا جب وہ اپنے والد اور بھائی کے ساتھ شیر کے شکار پر گئی تھی اور مہات اسی طرح نغمے گنگاتا ہوا ہاتھی کو جنگل میں آگے بڑھانے میں مصروف تھا۔

جنگل میں کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد جیہ ہاتھی کے ہودے سے اس بلند پلیٹ فارم پر نکل ہو گئی جو شیر پر نگاہ رکھنے اور اسے شکار کرنے کے لئے ایک اونچے درخت پر نصب کیا گیا تھا۔ اردن رائے پہلے ہی پلیٹ فارم پر پہنچ چکا تھا۔ پلیٹ فارم کے ایک کونے میں جیہ کی ساڑھی پھنسی تو مہات نے ہاتھ آگے بڑھا کر اسے چھڑایا اور سرگوشی میں مہارانی کو آگاہ کیا کہ وہ ایک میل کے فاصلے پر دریا کے کنارے ان کا منتظر ہے۔۔۔۔۔ پھر ہاتھی اور مہات رفتہ رفتہ پلیٹ فارم سے دور ہونے لگے اور وہ جنگل کی تاریکی میں تھما رہے گئے۔ وکیل نے ہاتھ بڑھا کر لالٹین کی لو اور مدھم کر دی جو پلیٹ فارم کے تھوڑے سے حصے کو روشن کر رہی

تھی۔

جیہ نے آسمان کی طرف نگاہیں دوڑائیں۔ اسے ستارے درختوں کی شاخوں سے لٹکتے دکھائی دیئے۔ وہ کچھ دیر ستاروں کو دیکھتی رہی لیکن جب اردن رائے کی انگلیوں نے اس کے بال سہلانے شروع کئے تو اس کی سانس حلق میں اٹک گئی وہ بیک وقت اپنے ماضی اور حال سے خوفزدہ تھی لیکن وکیل کے لمس نے اسے کئی خطرات سے بے نیاز کر دیا تھا۔ وہ بے سدھ ہو گئی اور جب اردن رائے کے ہاتھ اس کی ساڑھی کی بندشوں سے کھیلنے لگے تو جیہ کو احساس ہوا کہ یہ صرف اردن رائے کی ہی خواہش نہیں بلکہ وہ خود بھی یہی چاہتی ہے بس یہی سوچ کر اس نے گستاخ ہاتھوں کی راہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی۔

صبح کے وقت شکاریوں کی چیخ و پکار سے وہ عالم ہوش میں آئے تھے۔ شکاریوں کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔ ”اگر معزز مہمان مناسب سمجھیں تو آج رات دوبارہ کوشش کر سکتے ہیں۔“ شکاریوں نے جیہ اور اردن رائے کو آگاہ کیا۔ ”ہم ابھی ڈرم بجانے اور نھارے والوں کو گھنے جنگل میں بھیج دیتے ہیں تاکہ شیر کو اس علاقے میں محدود رکھا جاسکے۔“

سراکبر تمام دن اردن رائے کو علاقے کا دورہ کراتا رہا تاکہ اسے وہ پل دکھا سکے جو زلزلے سے تباہ ہو گئے تھے اور انہیں از سر نو تعمیر کیا جا رہا تھا۔ شام کے وقت اردن رائے دوبارہ ہاتھی پر سوار ہو گیا تاکہ جیہ کے ساتھ جنگل کی تنہائی میں جاسکے۔ مہلوت کے نفعے نے ایک بار پھر انہیں اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔

جیہ، اردن رائے کی بانہوں میں خود کو محفوظ تصور کر رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ جب اگلا سورج طلوع ہو گا تو وہ دونوں ایک بار پھر اپنے لباس کی سلوٹس دور کریں گے اور شکاریوں پر یہی ظاہر کریں گے کہ وہ شیر کے انتظار میں رات بھر جاگتے رہے ہیں۔

دوسری رات بھی پہلے سے مختلف نہ تھی لیکن جیہ کو تیسری بار جنگل میں جانے کا موقع نہ مل سکا۔ وہ دارالحکومت لوٹ آئے۔ سراکبر نے اسے ان کے دورے کی کامیابی پر مبارکباد پیش کی تھی۔ ”مسٹر رائے کی تقریر کی تیاری کی جائے، شنراوی!“ اس نے جیہ کو بتایا۔ ”اس تقریر سے سیرپور میں ہمیں اصلاحیوں کا زور توڑنے میں مدد ملے گی۔“

جیہ ایک بار پھر اسٹڈی میں کھڑی تھی۔ یہ وہی اسٹڈی تھی جہاں مہاراجہ وکٹرنے قدیم نیوی کو پرنس آف ویلز کو متاثر کرنے کی کوششوں کی مخالفت کی تھی۔ یہیں اس کے شوہر نے ان لائن قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ وائسرائے کی توجہ جیتی جاسکے اور یہیں خود اس نے جیس آئرن کو متاثر کرنے کے لئے بجٹ اور ترقیاتی منصوبوں کی دن رات اسٹڈی کی

تھی لیکن اس دفعہ وہ خود کو کہیں زیادہ تنہا اور اکیلی محسوس کر رہی تھی۔

اس کے عقب میں دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ ”تمہارے لوگ بہت زیادہ ہوشیار ہیں، شنزادی۔“ اسے اردن رائے کی آواز سنائی دی۔ وہ شہر کے مرکزی چوک پر ایک بہت بڑے جلسہ عام سے خطاب کر کے آیا تھا جس میں اس کی تقریر نے لوگوں کے دل جیت لئے تھے۔ ”وہ مجھے آنے نہیں دے رہے تھے وہ مجھ سے اپنے مستقبل کے بارے میں سوالات کر رہے تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ میں انہیں بتاؤں کہ سیر پور میں انتخابات کی کیا صورت ہے۔“

”ہمیں امید ہے کہ تم ان کے خاطر خواہ جواب دے سکتے ہو۔“ جیہ نے اس کی بات کٹی۔ ”آخر تم ایک وکیل ہو اور ہم ٹھہرے بے وقوف مرد و زن جن کی دلچسپیاں اور عقل و دانش محض حرم اور شکار کے قصے کہانیوں تک محدود ہیں۔“

اردن رائے نے اس کی چٹیا کے بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا اور جھک کر اپنے ہونٹ اس کی گردن پر رکھ دیئے۔ وہ تڑپ کر پلٹی۔

وہ جیہ کے رد عمل پر مسکرا دیا۔ ”تم ناراض کیوں ہو، شنزادی؟“ اس نے دھیمے لہجے میں دریافت کیا۔

جیہ کا ہاتھ گھوما اور پھر اس کا زور دار تھپڑ مسکراتے گل پر پڑا۔ ”کیا تم بھول گئے تھے کہ تمہاری حیثیت ہماری ریاست کے مہمان کی سی تھی۔“ جیہ کے ذہن میں اردن رائے کے وہ الفاظ تھے جو جلسے سے خطاب کرتے ہوئے اس نے ادا کئے تھے۔ اس نے ہندوستانی حکمرانوں کو وہ پانچ سو بے وقوف مرد اور عورتیں قرار دیا تھا جنہیں اپنے حرم، شکار اور دولت سے دلچسپی تو تھی لیکن انہیں انسانیت سے کوئی غرض نہ تھی۔ اردن رائے نے حکمرانوں کے خلاف جی بھر کر زہر اگلا تھا اور عوام کو اکسلیا تھا کہ وہ ان حکمرانوں کی غلامی سے نجات حاصل کر لیں۔ ہجوم مشتعل ہو گیا تھا اور اس نے جیہ اور دیگر حکمرانوں کے خلاف نعرے بازی شروع کر دی تھی۔

”بتاؤ، غدار شخص!“ جیہ کا غصہ اپنے عروج پر تھا۔ ”کیا تم ہمیشہ سے ایسے ہی ہو کہ جس کا نمک کھاؤ اسی سے نمک حرامی کرو؟ کیا تم نے یہ سوچ کر مجھے اپنی بانہوں میں لیا تھا کہ اس سے تم مجھے بے دست و پا کر دو۔ میرے اختیارات استعمال کرو۔ میرے بیٹے کو تخت سے محروم کرنے کی سازش کرو اور اس سارے کام پر پانی پھیر دو جو بڑی محنت سے میں نے انجام دیا ہے؟“ جیہ پر شاید ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا تھا۔

رائے نے بڑھ کر جیہ کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی آنکھوں اور ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ ”ہمارے درمیان کچھ بھی طے نہیں پایا تھا، شہزادی تم اپنی خواہش پر میرے پاس آئی تھیں۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ تم یا تمہارے بدن کی خوبصورتی مجھے عوام سے جھوٹ بولنے پر آمادہ کر سکتی تھی؟“

ستمبر 1939ء

جیہ نے تو کوشش کی تھی کہ وہ اردن رائے کو بھول جائے لیکن سیرپور سے شائع ہونے والے اخبارات نے اس کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہونے دی تھی۔ خاص طور پر دی سیرپور ہیرالڈ نے اردن رائے کی خبریں شہ سرخیوں سے شائع کی تھیں۔ یہی نہیں وہ پورے ہندوستان میں کی جانے والی وکیل کی تقریروں کا ایک ایک لفظ شائع کرنا شاید اپنا فرض سمجھنے لگے تھے۔

”اگر یہ جنگ سریاہ دارانہ نظام کے تحفظ کے لئے لڑی جا رہی ہے تب ہندوستان اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ غلام ہندوستان، برطانیہ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“

”آخر بھوک اور افلاس کے مارے ہوئے ہندوستانی کب تک برطانوی جنگوں کے اخراجات برداشت کرتے رہیں گے؟“

جیہ شدید غصے میں تھی لیکن جب سیرپور کی ہنگامی کونسل نے جنگ پر اٹھنے والے اخراجات کے تخمینے لگانے شروع کئے تو اس کا غصہ قدرے کم ہو گیا۔ گزشتہ پچاس سالوں میں چین، جنوبی افریقہ، فرانس، میسوپوٹیمیا اور افغانستان میں برطانیہ کے شاہی مہمان نے سیرپور کو دیوالیہ کر دیا تھا۔ سیرپور زمانہ امن میں بھی برطانوی دست برد سے محفوظ نہیں رہا تھا۔ پرنس آف ویلز اور وائسرائے کے دوروں نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔

”ہمارے بیٹے کا کیا ہو گا؟“ سر اکبر نے اس صورت حال میں اپنے وزیر اعظم سے دریافت کیا۔ ”کیا ہم اسے بلا بھیجیں؟“

”جلد بازی کی ضرورت نہیں، حکم! برطانوی اسے جعلی لڑائی قرار دے رہے ہیں۔ موسم سرما میں مہاراجہ آف ڈنگرا اور لیڈی مودی یورپ کے لئے روانہ ہو رہے ہیں۔ ان سے کہہ دیں کہ وہ مہاراجہ ارجن کو واپس لے آئیں۔ کم از کم مہاراجہ کا واپسی کا سفر خوشگوار گزرے گا۔“

اس کے برعکس برطانیہ سے آنے والے ارجن کے خطوط میں جنگ کا کوئی ذکر نہ تھا۔ وہ عموماً موسم گرما میں ڈان بریڈمین کی سربراہی میں انگلینڈ کا دورہ کرنے والی آسٹریلوی ٹیم کا

دورہ زیر بحث لاتا یا پھر مگن دودھ دی وڈنٹائی فلم کا تذکرہ کرتا جس میں ہندوستان میں پیدا ہونے والی ایک خوبصورت اداکارہ نے کام کیا تھا۔

جیہ کو اس جنگ اور اس جنگ عظیم میں کوئی توازن دکھائی نہ دیتا تھا جس نے اس کے بھائی کی جان لے لی تھی۔ اسے شہی جھروکے سے ٹیلی گراف کے بجنے کی آوازیں یاد آ رہی تھیں جن کے ذریعے شہی افواج کی نقل و حمل کی خبریں دی جاتی تھیں۔ یہ جنگ مختلف تھی اور یوں لگتا تھا کہ یہ صرف برطانوی ہندوستان میں اٹھنے والی شورش کو دبانے کے لئے لڑی جا رہی ہے۔

جونہی ہٹلر کی فوجیں پولینڈ میں داخل ہوئیں، انڈین نیشنل کانگریس کے تمام ارکان نے حکومت سے استعفیٰ دے دیا۔ وہ ہندوستانوں کو ان کی مرضی کے خلاف ایک اور جنگ میں دھکیلنے پر احتجاج کر رہے تھے۔ سونے پہ ساگا یہ کہ مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح نے استغفوں کے اس دن کو ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے یوم نجات قرار دے دیا تھا۔ مسٹر جناح کے فیصلے پر دی سیرپور ہیرالڈ تملانا اٹھا اور اس نے نہایت گرم آوارے تحریر کئے جن میں سیرپور کے مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ مسلم لیگ کے عظیم رہنما کی جگہ نیشنل کانگریس کی عظیم روح کی حمایت کریں۔

جیہ صورت حال پر شی پیلز میں سر اکبر کے ساتھ اجلاس میں مصروف رہتی لیکن پرانے شہر سے آنے والے مسلم وفد اس کی مصروفیات میں رخنہ ڈالتے رہتے۔ ”اخبارات ہمارے خلاف شکوک و شبہات پیدا کر رہے ہیں، حکم!“ مسلمان اپنی مہارتی کو آگاہ کرتے۔

الفاظ بے شک جیہ کو مخاطب کر کے ادا کئے جاتے لیکن عمر رسیدہ اور سنجیدہ مسلمان کن اکھیوں سے سر اکبر کی طرف دیکھتے تاکہ ایک ہندو ریاست کا مسلمان وزیر اعظم ان کی حمایت میں کچھ کہے۔ سر اکبر بھی اس بات کو سمجھتا تھا لیکن خاموش رہنے کی کوشش کرتا تھا۔

”مسٹر جناح اگر ہندوستانی مسلمانوں کے نجات دہندہ بن گئے ہیں تو اس میں بھلا ہمارا کیا قصور ہے؟“

”مسلم لیگ اور نیشنل کانگریس کی لڑائی برطانوی ہندوستان پر حکومت کرنے کی لڑائی ہے لیکن ہم تو سیرپور میں رہتے ہیں۔ ہم تو اس میں حصہ دار نہیں۔“

جنگ کی غیر یقینی صورت حال کے پیش نظر جیس آسرن شی پیلز آیا تاکہ ایک صدی

پہلے، ایک تجارتی کمپنی جو اب ایک بادشاہت بن گئی تھی اور تین ہزار سال پرانی شہنشاہیت کے درمیان ہونے والے مہلے کی تجدید کر سکے۔ سیرپور کی مہارانی برطانوی ریزیڈنٹ کا مدعا سن کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

جیہ انسانی زندگیوں کی اہمیت سے آگاہ تھی اس لئے اس نے فوج کے بجائے سیرپور کے ساتوں ہوائی جہاز دینے کی پیش کش کر دی تھی۔ جیس آبرن نے فوری طور پر اس سے انکار کر دیا۔ ”جنگ یہاں سے پانچ ہزار میل دور لڑی جا رہی ہے، شہزادی۔“ اس نے جیہ کو بتایا۔ ”بھلا یہ سات ہلکے طیارے کیا کر سکیں گے؟“

جیہ کو یاد تھا کہ جیس آبرن نے اپنی جوانی کے کئی قیمتی سال میدان جنگ میں گزارے ہیں۔ اس لئے اس نے بلجے کی سختی پر زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔

”ہم اسے تسلیم کرتے ہیں، مگر آبرن۔“ جیہ نے برطانوی ریزیڈنٹ سے اتفاق کیا۔ ”لیکن اس سے کم از کم یہ تو ظاہر ہو گا کہ سیرپور اپنی مرضی سے جنگ کا پارٹنر بننا چاہتا ہے جبکہ دوسری جانب انڈین نیشنل کانگریس نے جنگ میں کسی بھی شمولیت کو مسترد کر دیا ہے۔“ آبرن نے مایوسی سے کندھے اچکائے اور اسٹڈی سے باہر چل دیا۔ سر اکبر اسے رخصت کرنے کے لئے اٹھا تو جیہ نے محسوس کیا کہ شیردل مہارانی کے دہانت کے بعد وہ کس قدر کمزور ہو گیا ہے۔ دروازے پر پہنچ کر وہ ذرا سا جھجکا جیسے کچھ بھول گیا ہو۔ جیہ بغور اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ شئی پیل میں اس سے ملاقات کے لئے آنے والے مسلمانوں کا خوف کیسے اس کی ریاست کے مسلمان وزیر اعظم پر تو اثر انداز نہیں ہو رہا۔

وہ پلٹا اور اس نے جیہ کو ایک فائل تھما دی۔ ”میرے خیال میں آپ اسے پڑھ لیں، شہزادی۔“

”یہ کیا ہے؟“ جیہ نے فائل لیتے ہوئے سوالیہ انداز میں بھویں اچکائیں۔ نگاہیں اب بھی وزیر اعظم کے چہرے پر تھیں۔

”دہلی کے پو لیتیکل آفس کے نام برطانوی ریزیڈنٹ کی خفیہ رپورٹس۔“ سر اکبر نے سرگوشی کی اور واپس دروازے کی طرف چل دیا۔

جیہ چند ثانیے فائل کا جائزہ لیتی رہی پھر اس نے پہلا صفحہ پلٹا۔ ”سیرپور کی مہارانی ایک ایسے وقت میں انڈین نیشنل کانگریس کے لیڈر ارون رائے کے انتہائی قریب رہی ہے جب وہ برطانوی بادشاہت کے لئے خطرہ بنا ہوا تھا۔ کنونشن کو پس پشت ڈالتے ہوئے مہارانی نے

کانگریس کے لیڈر کو تین دن دربار سے دورہ گزارنے کی دعوت دی۔ یہی نہیں بلکہ مہارانی جیہ نے پبلک اسکینڈل کا خطرہ مول لے کر جنگل میں دو راتیں تنہا ارون رائے کے ساتھ گزاریں۔ ارون رائے جیسے آدمی سے مہارانی کی اتنی قربت سیرپور میں برطانوی مفادات کے لئے کسی بڑے خطرے سے کم نہیں۔“

جیہ نے فائل بند کر دی۔ اس کا بدن غصے اور شرم سے تپ اٹھا تھا۔ تصور کی آنکھ سے وہ ان جاسوسوں کو دیکھ رہی تھی جنہوں نے اس کی مصروفیات کی ایک ایک رپورٹ جیسے آبرن کو پیش کی تھی۔ اسے آبرن دکھائی دے رہا تھا کہ وہ اپنے تنخواہ داروں سے صوفے پر لیٹا اس کی تمنائی کے قصے مزے لے لے کر سن رہا ہے۔ جنگل میں پلیٹ فارم کی جاسوسی کون کر رہا تھا؟ برطانوی بادشاہت کو اس کی مصروفیات اور حرکات و سکنات کی رپورٹس کس نے ارسال کی تھیں؟

کچھ دیر وہ اسی عالم میں خاموش بیٹھی غصے سے پیچ و تاب کھاتی رہی وہ نہیں چاہتی تھی کہ فائل کو دوبارہ کھولے لیکن اس بے کیا فرق پر تا تھا۔ آبرن کی رپورٹس اس کے ٹائپسٹوں نے ٹائپ کی ہوں گی اور انہوں نے ان لذت آمیز لمحات کی تفصیل پڑھی ہوگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ان کلرکوں کی نظر میں اب اس کی کیا عزت رہ گئی ہوگی۔ سر اکبر نے بھی تو اس فائل کا مطالعہ کیا تھا وہ اب اسے کن نظروں سے دیکھتا ہو گا۔ جوں جوں وہ سوچتی رہی اس کی کنپٹیاں جلتی رہیں۔ بالآخر اس نے فائل دوبارہ کھول لی۔

”یہ رپورٹ بھی ملی ہے کہ مہارانی اس جلسہ عام میں بھی شریک تھیں جس میں ارون رائے نے سلطنت برطانیہ پر کڑی تنقید کی اور اسے بھرا بھلا کہا لیکن میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مہارانی ذاتی طور پر ایک خوبصورت اور چارمنگ لیڈی ہے اس لئے اس کا جذبات میں بہہ جانا قاتل حیرت نہیں۔ البتہ یہ سلطنت برطانیہ اور اس کے مفادات کے لئے کسی طور بھی مناسب نہیں۔ میرا جانشین لازمی طور پر نہایت قریب سے مہارانی کا مشاہدہ کرے اور اگر مہارانی قوم پرست لیڈروں سے اپنی دوستی ترک نہ کرے تو اسے تخت سے محروم کرنے کی سفارش کرے۔“

جیہ نے غصے سے فائل سامنے دیوار پر دے ماری جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی اپنی ایک تصویر گر کر ٹوٹ گئی جس میں وہ ایک گھوڑے پر سواری کر رہی تھی۔ شیشے کی کرسیاں اسی طرح زمین پر گر گئیں جیسے شیر دل مہارانی کے ہاتھوں کاغذی مندر میں کورا ہارٹ کی تصویر کے شیشے گرے تھے۔ وہ بے بسی سے ان کچیوں کو دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ اگر اس کے

بیٹے کو تخت دے کر اسے مہارانی سے ہٹا دیا گیا تو کیا وہ باقی زندگی کسی عمار میں بسر کرے گی؟

1940ء

”ہٹلر نے فرانس کو تاخت و تاراج کر دیا ہے، حکم۔ ڈنکرک سے بڑی تعداد میں متحدہ فوجیں پسپا ہو رہی ہیں۔ اس وقت بند گارہ میں موجود ہر جہاز اور ہر کشتی اتھلوی فوجوں کو جرمن ٹینکوں کی دست برد سے محفوظ کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔“

جیہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ”لیکن ہمارا بیٹا تو اگلے ہفتے لندن سے روانہ ہونے والا ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں مہارانی۔“ وزیر اعظم نے جیہ کو تسلی دی۔ ”مہاراجہ ڈنگرا ان کے ہمراہ ہیں۔ وہ ان کی بہ حفاظت واپسی کو یقینی بنائیں گے۔“

جیہ نے وزیر اعظم کی بات کا یقین تو کر لیا تھا لیکن جنگ کی تباہ کاریوں سے وہ واقف تھی۔ دن ہفتوں میں بدلتے رہے لیکن مہاراجہ ڈنگرا کے سفر کے بارے میں کوئی خبر..... موصول نہ ہوئی۔ بس ریڈیو پر یہ خبر موصول ہوئی تھی کہ ونسن چرچل کو اس ملک کی جنگی کابینہ کا وزیر اعظم بنا دیا گیا ہے جو بلہ بولنے کی تیاری کر رہا ہے۔

حالات نے ایک بار پھر پلٹا کھلایا اور برطانیہ نے خود کو ہندوستان کی نگاہوں میں ایک بار پھر محترم ثابت کروا لیا۔ اس کے باوجود کہ چرچل نے ہندوستان کی خود مختاری کی مخالفت کی تھی۔ ہندوستانی رضاکاروں کی تعداد دو لاکھ سے بڑھ کر بیس لاکھ ہو گئی اور یہ تعداد پہلی جنگ عظیم سے گئی تھی اور تو اور جرمنی نے برطانیہ پر فضائی حملہ کیا تو انڈین نیشنل کانگریس بھی جنگ میں شامل ہو گئی اور نظام حیدر آباد نے اپنا پورا اسکواڈرن برطانوی فضائیہ کو عطیہ کر دیا۔ آخر کار سیرپور کو یہ اطلاع ملی کہ مہاراجہ ڈنگرا، مہاراجہ ارجن اور دیگر لڑکوں کے ساتھ ہندوستان واپسی کے لئے جہاز پر سوار ہو گیا ہے۔ ایک عرصے سے جنگ کی خوفناک اور بھیاںک خبروں کے بعد خوشی کی یہ پہلی اطلاع تھی جس نے جیہ کے دل کی دھڑکن تیز کر دی تھی۔

”سیرپور کے فوجی دستوں کی محاذ جنگ پر روانگی سے قبل ہمارا بیٹا ان کے مارچ پاسٹ کی سلائی لے گا۔“ جیہ نے احکامات صادر کئے۔

جس آسرن نے کئی بار متنبہ کیا تھا کہ رد میل ایک ٹینک کمانڈر تھا اور صحرا میں کیولری کی کوئی ضرورت نہ ہو گی لیکن جیہ نے اس انتباہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے وزراء کو دہلی بھیجا تاکہ سیرپور کے اسپتالوں کے لئے گھوڑے اور ساز و سامان حاصل کیا جا

یکے۔ دوسری طرف سیرپور لانسز کا جوش بھی دیدنی تھا۔ وہ ایک بار پھر جانی پھجانی زمین پر لڑنا چاہتے تھے۔ انہیں یاد تھا کہ سیرپور لانسز نے پہلی جنگ میں راجہ پر تپ کی مکھن میں میسو ہنسیا کی سرزمین پر داد شجاعت دی تھی۔

جرمن آبدوزوں سے بچنے کے لئے راس امید کے گرد بحری سفر میں تاخیر کے سبب اس ارجن نومبر تک دہلی نہیں پہنچ سکا اور یہ وہ وقت تھا جب فوجی دستوں کی محاذ جنگ پر مددگی میں محض چند دن باقی تھے جبکہ اس سلسلے کی تمام تیاریاں پہلے ہی مکمل کی جا چکی تھیں۔

جذباتی ملن کے بعد لیڈی مودی، جیہ کو ایک طرف لے گئی۔ ”لڑکے بری طرح خوفزدہ ہیں، ڈارلنگ۔“ اس نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ”جرمن کتوں کی طرح یہودیوں کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ پیرس میں ہمارا جہ کپور تھلہ کی بیٹی نے اپنے تمام زیورات محض اس لئے بیچ ڈالے کہ اس ساری رقم سے اپنے یہودی دوستوں کی زندگی خرید سکے۔ ان میں سے بعض کو اسمگل کر کے اس نے ہمارے جہاز پر پہنچا دیا تھا لیکن ہمیں خبر ملی کہ اسے ایک بیگار کیمپ میں لے جایا گیا ہے۔“

ہمارا جہ ڈھمرا کو ان خبروں سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس کی سوچ کا محور وہ فوجیں تھیں جو جنگ پر روانہ ہونے کو تیار تھیں۔ ”ہم جانتے ہیں کہ اس بار کوئی بادشاہت ہمارے مقابلے پر نہیں۔“ اس نے جیہ کو بتایا۔ ”لیکن یہ بات ذہن میں رہے شہزادی کہ فوجیں مردوں اور عورتوں کے ساتھ پادریوں کو بھی نہ تیغ کرنے سے دریغ نہیں کریں گی۔“

”یہی سب کچھ یہاں بھی ہو سکتا ہے، حکم!“ سر اکبر نے اپنے اندیشوں کا اظہار کیا لیکن اس کی آواز سرگوشی سے بلند نہ تھی۔ ”لاہور میں قلعے کے عین سامنے اس جگہ جہاں نہرو نے اعلان کیا تھا کہ ہندوستان ایک جمہوریہ بنے گا، مسٹر جنٹل نے ہزاروں مداخلوں کی سامنے اعلان کیا ہے کہ مسلمانوں کو ایک ملک چاہئے۔“

موسم سرما کی ایک سرد صبح برطانوی راج کے دارالحکومت میں قلعے کے سامنے اٹھارہ کیولری ریمپٹس ہندوستانی فوج کے کمانڈر انچیف کے معائنے کے لئے تیار کھڑی تھی۔

عرصہ دراز پہلے وہ بھی نومبر کی ہی ایک صبح تھی جب بالمر لانسز کے دستے اپنے ہمارا جہ جے سنگھ کی سلامی کے لئے صف آرا ہوئے تھے۔ اس وقت جیہ ہندوستانی قانون ساز اسمبلی کی عمارت کی بالکونی سے کمانڈر انچیف کو سلامی لیتے دیکھ رہی تھی۔ یہ وہی عمارت تھی جس میں دائسرائے ہند کے طلائی تخت پر ہم بھینکا گیا تھا۔

ارجن نے سیرپور کے دستوں کی سلامی لی۔ جیہ اسے فخریہ انداز سے دیکھتی رہی تھی۔ جب کمانڈر انچیف نے فوجیوں سے خطاب شروع کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اسے ٹکا کے وہ خطوط یاد آ گئے تھے جو وہ جنگ کے محاذ سے لکھا کرتا تھا اور ان میں وہ اپنی امید افزا باتیں لکھتا تھا جن کا اظہار کمانڈر انچیف نے اپنی تقریر میں کیا تھا۔ کاش یہ سچ ہو۔ جیہ نے بے اختیار سوچا اور آنسو چھپانے کے لئے منہ پھیر لیا۔

سیرپور لائنز کی محاذ پر روانگی کے ساتھ ہی ریاست کی تمام تر توجہ اور دل چسپی نے بلین پر مرکوز ہو گئی جو جنگ کی صورت حال معلوم ہونے کا واحد ذریعہ تھے جیہ اپنے بچپن میں یہ خبریں ٹیلی گراف پر سنا کرتی تھی لیکن اب مہاراجہ وکٹر کی اسٹڈی میں ایک طاقتور ریڈیو ٹرانسمیٹر موجود تھا۔ اب سٹی پبلش میں خبریں اسی ٹرانسمیٹر سے گردش کرتی تھیں۔ جیہ اکثر ٹینکوں اور کیولری دستوں کی تباہی کی خبریں سنتی اور آزرہ بیٹھی رہتی۔

ارجن کو صرف فضائی جنگ سے دل چسپی تھی۔ وہ اکثر اسپٹ فلز اور میسر ٹمٹس کے بارے میں میجر آبرن سے معلومات حاصل کرتا رہتا تھا۔ اس کا انداز ٹکا جیسا تھا۔ وہ ہمہ یک زمانے میں میجر ویرنگھ کے پیچھے بھاگا کرتا تھا تاکہ میکسم اور گیٹ لنگ توپوں کے بارے میں معلومات حاصل کر سکے۔

”میں بھی جہاز اڑانا سیکھوں گا“ ارجن کی آواز میں ضد اور عزم کا عنصر موجود تھا۔ ذرا تصور تو کریں کہ ایک بادشاہ طیارہ اڑاتے ہوئے کمانڈر خود کرے گا۔“

جیہ نے ایک طرف تو سر اکبر کو جنگ کے لئے فنڈز جمع کرنے کی ہدایت کی جبکہ دوسری جانب اس نے ارجن کو فلائنگ سیکھنے کی اجازت دے دی۔ اسے توقع تھی کہ اس طرح وہ برطانوی ریزروٹ کے وہ خیالات بدلنے میں کامیاب ہو جائے گی جن کا اظہار وہ اپنی رپورٹس میں کر چکا تھا۔

کبھی کبھار وہ پردہ پیلس میں روپوش ہو جاتی جہاں موجود عورتوں کا آبدوزوں اور آرمڈ کاروں سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ یہاں آکر اسے خاصا سکون ملتا تھا اس کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ دن یہاں گزارے لیکن ریاستی مصروفیات اسے پھر پردہ پیلس سے باہر کھینچ لاتیں جیہ کو یہ بھی علم ہوتا رہا تھا کہ اس جنگ میں جہاں ایک طرف تباہی و بربادی کی نئی داستانیں رقم ہوئی ہیں وہیں یہ جنگ متعدد ایجالات کا پیش خیمہ بھی بنی ہے۔

جنگ ہندوستان کی سرحدوں سے بہت دور لڑی جا رہی تھی لیکن ہندوستان کی گلی گلی میں اس جنگ کے بارے میں تبصرے ہوتے رہتے تھے سر اکبر اور برطانوی ریزروٹ گھنٹوں

پٹھے جنگ پر ہلولہ خیال کرتے رہے اور تازہ ترین اطلاعات پر تبصرہ کرتے۔

ہندوستان نے اس سے پہلے برطانیہ کو ہراس ریلوے لائن اور ٹیلی گراف پوسٹ کی لوائنگ کی تھی جو کسی بھی برطانوی کلرک اور فوجی نے ہندوستانی سرزمین پر استعمال کی تھی۔ اب صورت حال یہ تھی کہ پانچ لاکھ سے زائد ہندوستانی فوجی سمندر پار محاذ پر مصروف تھے اور ہندوستانی فیکٹریاں چوبیس گھنٹے ان کے لئے ٹینک اور ہتھیار تیار کرنے میں مصروف تھیں۔ برطانیہ کا مکمل یہ تھا کہ اس نے پہلی بار اپنی عظیم ترین کالونی کو اسٹرلنگ کا تحفظ دیا۔

ہندوستانوں کے تعاون کو جاری رکھنے کے لئے چرچل نے دارالعوام کے لیڈر اور برطانیہ کی جنگی کابینہ کے ایک رکن سر اسٹیفورڈ کریس کو ہندوستان بھیجا تاکہ وہ ہندوستانوں کو خود اپنا آئین بنانے کی پیش کش کرے۔ انڈین نیشنل کانگریس اس امر سے آگاہ تھی کہ امریکی صدر روز ویلٹ، ہندوستانوں سے ہمدردی رکھتا ہے اور چرچل اس طرح اسے خوش کرنا چاہتا ہے چنانچہ کانگریس نے سول ناقلی کی تحریک شروع کر دی اور مطالبہ کیا گیا کہ ہندوستان کو فوری طور پر حکمرانی کا حق دیا جائے۔ بصورت دیگر جنگ کے لئے ہندوستان کی سرزمین سے کی جانے والی تمام تر امداد اور سرگرمیاں روک دی جائیں گی۔ وائسرائے نے اس تحریک پر جو رد عمل ظاہر کیا وہ یہ تھا کہ اس نے کانگریس کے سرکردہ لیڈروں کو جیل بھرا دیا تھا۔

برطانیہ کے خلاف ہندوستان کی نفرت اس وقت عروج پر پہنچ گئی جب جاپانیوں نے پرل ہاربر پر حملہ کر دیا اور جیس آبرن کو آخر کار فوج میں شمولیت کی اجازت مل گئی کم سن ارجن کے لئے یہ ایک عجیب لیکن جوش دلانے والی خبر تھی۔ اس نے فوراً اس سے سوالات شروع کر دیئے۔

”میجر آبرن!“ مارے جوش کے ارجن کی آواز تھر تھرا رہی تھی۔ ”کیا آپ صحرائی مڑی کے خلاف جنگ کریں گے؟“

”نہیں۔“ آبرن نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مجھے کلکتہ میں تعینات کیا گیا ہے۔ سپلائز اور یونی کیشنز کے لئے۔“

ارجن کا شوق ماند پڑ گیا۔ ”کلکتہ میں تو آپ کو لڑائی دیکھنے کو بھی نہیں ملے گی۔“
”آپ صحیح کہہ رہے ہیں، یور ہائی نہیں۔“ آبرن نے کہا تو جیہ کو اس کے چہرے پر اب تاثرات دکھائی دیئے۔ اسے یوں لگا کہ جیسے وہ دونوں ہی اپنی اپنی ذمہ داریوں سے

مجبور ہوں چنانچہ اس نے فوری طور پر آسرن کو خفیہ رپورٹوں کے جرم پر معاف کر دیا
1942ء

ہندوستان نے بہ دقت ان خبروں کو برداشت کیا تھا کہ امریکیوں نے جنگ میں اس
چھلانگ لگائی جب جاپانیوں نے ہندوستانی بندرگاہوں پر بمباری شروع کی تھی۔
”کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ سیرپور لائسنز کو مشرق وسطیٰ سے واپس طلب کر لیا
گا؟“ ارجن نے بے قراری سے سر اکبر کو مخاطب کیا۔

”مجھے بھی اس کا یقین ہے یور ہائی نہیں۔“ سر اکبر نے ارجن کی تائید کی۔ ”بر
راج یقینی طور پر اپنی مشرقی کالونی کو ہیرو ہیٹو کے ہاتھوں تباہی سے بچانے کی کوشش
کے لیے سر اکبر نے یہ پیش گوئی بھی کی تھی کہ جاپانی ہفتوں کے اندر ملایا اور سنگاپور پر قبضہ
لیں گے اس کے ساتھ ہی وہ براہ پر قابض ہونے کی کوشش بھی کریں گے تاکہ ہندو
فوجوں کو چاول اور خوراک کی دیگر رسد بند کی جاسکے۔

اور پھر یہی ہوا۔ جاپانیوں نے براہ پر قبضے کے لئے ہندوستان کی اہم ترین بندرگاہ
چٹاگانگ اور کلکتہ پر حملے تیز کر دیئے۔ اس کے ساتھ ہی امریکی فوجی دستے ہندوستان پہنچے
تاکہ برطانیہ کی مشرقی بادشاہت کے تحفظ کے متحدہ دفاع میں شریک ہو سکیں۔

امریکی اور برطانوی ہوا باز سیرپور تک آپہنچے۔ جیہ نے اڑ اسٹریٹس کا جہل اس مقصد
لئے بھجایا تھا تاکہ قبائلی علاقوں کو دارالحکومت اور ریاست کے مشرقی حصوں کے قریب
رکے لیکن اس وقت دن دے براہ سے برطانوی شہریوں کے فضائی انخلاء کے لئے استعمال
رہے تھے۔

جیہ کو ان پروازوں سے ایک اور مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہ مشکل ارجن کا
تھی کہ وہ سیرپور کے پائلٹس کے ہمراہ برطانوی شہریوں کے انخلاء کے لئے براہ پرواز کرے
اس کے ساتھ ہی سیرپور کی دیہی آبادی شہروں کی جانب منتقل ہونا شروع ہو گئی وہ غلہ
خریداری کے لئے آئے تھے تاکہ ان فوجیوں کو غذا فراہم کی جاسکے جو جاپان کے خلاف
کے لئے سیرپور کی سرحدوں میں موجود تھے غلہ دریائی اسٹیمروں کے ذریعے سیرپور سے
بھی بھیجا جا رہا تھا۔

جیہ نے سر اکبر کے ہمراہ دیہی علاقوں میں جانے کا فیصلہ کیا تاکہ اگلی فصل کی کا
کے لئے مشورہ کر سکے۔ اس نے ارجن کو بلور کرانا چاہا کہ دارالحکومت سے ان کی غیر حاکم
کے دنوں میں اس کی یہاں موجودگی بے حد ضروری ہے۔ اس مقصد کے لئے اس نے ا

کو کلکتہ سے آنے والی ایک رپورٹ دکھائی تھی۔

”خوراک کی صورت حال روز بروز دگرگوں اور خوفناک ہوتی جا رہی ہے۔“ رپورٹ میں کہا گیا تھا۔ ”لاکھوں موٹی مرچے ہیں اور قحط شدید ہو رہا ہے۔“

لیکن سولہ سالہ حکمران اپنا زیادہ تر وقت ایئر فیلڈز پر صرف کر رہا تھا وہ ان امریکی پائلٹوں کے پیچھے پیچھے تھا جو چنکدار ہیلٹ پٹے، قہقہے لگاتے ہوئے جہازوں کی پیش قدمی پر تبصرے کیا کرتے تھے۔ دربار میں وہ کبھی کبھی حاضر ہوا کرتا تھا لیکن جب بھی حاضر ہوتا کاشتکاروں کو جیہ کے ساتھ بحث کرتے دیکھ کر بے قرار رہتا۔

”کلکتہ کے تاجروں نے آج سے پہلے کبھی اتنے زیادہ دام نہیں دیئے ہم راتوں رات امیر ہو گئے ہیں۔“

”اگر اگلی فصل خراب ہو گئی تو تم لوگ کیا کھاؤ گے؟“ سر اکبر سوال کرتا تو پورے دربار پر خاموشی طاری ہو جاتی۔

سر اکبر کی بیشتر تقریروں کا موضوع غلے کی یہ قلت ہوتی۔ ہر گزرنے والا دن خطرے میں اضافے کا باعث ہی بن رہا تھا لیکن کوئی اس طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ راتوں رات امیر ہو جانے کی خواہش نے کاشتکاروں کو اندھا کر دیا اور برصغیر میں سیاسی بے چینی کے ساتھ غلے کی قلت میں اضافہ ہونے لگا۔ نوجوان ارجن ان باتوں سے لاتعلقی تھا۔ اس کی دلچسپیوں کا محور اب بھی وہ امریکی پائلٹ تھے جو سیرپور کو برما کی سرحد سے الگ کرنے والی پٹی پر پرواز سے قبل شراب پیا کرتے تھے۔

ادھر مشرقی ہندوستان قحط کی زد میں آگیا اور ادھر کانگریس نے ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک شروع کر دی اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ برطانوی جنگ میں ہندوستانی تعاون فوری طور پر ختم کر دیا جائے۔

مسز رائے کا ایک خط جیہ کو موصول ہوا جس میں ہندوستان کی بگڑتی ہوئی صورت حال سے آگاہ کیا گیا تھا۔ خط سے معلوم ہوا کہ برطانوی ہندوستان اس وقت شدید ترین ہنگاموں اور مظاہروں کی زد میں ہے۔

”کلکتہ پاگلوں کی آماجگاہ بن گیا ہے۔“ مسز رائے نے خط میں لکھا تھا۔ ”بے روزگار و جوان برطانوی ریکروٹنگ دفاتر کے سامنے قطاریں بنائے کھڑے ہیں جبکہ قحط کے شکار پریشان حال کسان سیلاب کی طرح شہر میں اُلٹ آئے ہیں۔ وائسرائے نے بہار اور بنگال میں ہوائی جہاز سے مظاہرہ کرنے والے نوجوانوں پر گولیاں برسانے کے احکامات دے دیئے ہیں تا

کہ ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک کو کچلا جاسکے۔ یہ سب کچھ اس وقت ہو رہا ہے جبکہ جاپانی تقریباً روزانہ چٹاگانگ پر بمباری کر رہے ہیں اور گذشتہ ایک ہفتے میں چار بار کلکتہ پر حملہ آور ہو چکے ہیں۔ اس عالم میں تاجروں کے علاوہ کوئی یہ نہیں جانتا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔“ اسی اثناء میں یہ خبر ملی کہ سیرپور لانسز جاپانیوں کے خلاف مہم میں حصہ لینے کے لئے مشرق وسطیٰ سے واپس آ رہے ہیں اس کے ساتھ ہی ہوائی جہازوں میں ارجن کی دلچسپی ختم ہو گئی اب وہ اپنا تمام وقت پردہ پیل کے خزانے میں صرف کرتا تاکہ اپنے سپاہیوں کے سینوں پر آویزاں کرنے کے لئے تمغے کا انتخاب کر سکے۔

سیرپور لانسز کی آمد کلکتہ میں متوقع تھی اس لئے ارجن بذریعہ ٹرین کلکتہ روانہ ہوا راستے میں جہاں بھی سیرپور کی خصوصی ٹرین رکتی وہ پلیٹ فارم پر اتر جاتا اور وہاں موجود خلی یونیفارم والوں سے مختلف سوالات کرنے لگتا اسے راستے میں ریل کی پٹری کے آس پاس فاقوں اور قحط کے شکار بے شمار لوگ دکھائی دیئے تھے جن کے جسم اتنے ناتواں اور کمزور ہو چکے تھے کہ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو چکے تھے وہ خوراک کے منتظر تھے جس کی قلت کا پورا ہندوستان شکار تھا۔

ان دگرگوں حالات کا مشاہدہ کرتا ہوا ارجن جب کلکتہ پہنچا تو اسے ایک اور جھٹکا لگا پچھلی بار جب وہ یہاں آیا تھا تو شہر میں ایک جشن کا سا سماں تھا لیکن اب اسے جگہ جگہ پھکڑے کھڑے دکھائی دے رہے تھے جن پر رنگے ہوئے درختوں کے تنے فٹ کر کے ان کا رخ آسمان کی طرف کر دیا گیا تھا یہ جاپانی جہازوں کو دھوکا دینے کے لئے کیا گیا تھا تاکہ وہ یہ سمجھیں کہ شہر میں جگہ جگہ ایٹمی ائیرکرافٹ گنیں فٹ ہیں۔ وہ کار میں بیٹھا حیرت سے ان نقلی گنوں کو دیکھتا رہا تھا۔

میجر آبرن فورٹ ولیم کے دروازے پر موجود تھا تاکہ محافظوں سے ارجن کی کار کا پروانہ راہداری حاصل کر سکے۔ میرس کے ارد گرد رنگین چھتریوں کے نیچے بیٹھے انگریز افسران مشغلے نوشی میں مصروف تھے ان کے دبے دبے قمقمے یہ بتانے کے لئے کافی تھے کہ کسی حد تک وہ بھی صورت حال سے پریشان ہیں۔

ارجن حسرت بھری نگاہوں سے میجر آبرن کے سینے پر آویزاں تمنے دیکھ رہا تھا۔ ”یہ ان سے کہیں زیادہ بہتر ہیں جن کا انتخاب میں نے اپنے لانسز کے لئے کیا ہے۔“ ارجن نے کھلے دل سے تبصرہ کیا۔ ”کیا آپ جانتے ہو میجر آبرن کہ سیرپور لانسز کلکتہ سے کہاں جائیں گے؟ یا یہ بھی کوئی فوجی راز ہے؟“

”لانسز واپس نہیں آ رہے۔“ میجر آسبن نے ارجن کو آگاہ کیا۔ ”جنرل سلم نے توب مشرقی ایشیا میں ایک نیا محاذ کھول لیا ہے لہذا لانسز وہاں جائیں گے ہندوستان نہیں آئیں گے تمام اتحادی مل کر جاپان پر جوبلی حملے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔“

”لیکن اس غلے کا کیا بنے گا جو متحدہ فوجوں کے لئے جمع کیا گیا ہے؟“ سر اکبر نے سوال کیا۔

”حکومت اسے تاجروں کو واپس کر رہی ہے۔“

جیہ نے بے یقینی سے آسبن کو دیکھا غلے سے بھری ہوئی بوریاں پہلے ہی بوٹینیکل گارڈن میں ذخیرہ کی جا رہی تھیں۔ باہر گلیوں میں غریب کاشتکار گندا پانی پینے پر مجبور تھے۔ جیہ نے بڑی نفرت کے تاثرات کا اظہار کیا تھا وہ جانتی تھی کہ اب تاجر یہ غلہ ہنگے داموں فروخت کریں گے۔

ارجن نے اپنی ماں کے چہرے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کیا سمجھ رہی ہے۔ ”برطانیہ ہر شے کا ذمہ دار تو نہیں ہو سکتا۔“ اس نے روکھے پن سے کہا۔ ”جنگ کے دوران یہ کچھ ہو ہی جاتا ہے۔“

جیہ کو اچانک ہی اپنے بیٹے سے خوف آنے لگا تھا اگر وہ خوف کو پہچان نہیں سکے گا تو حکومت کیسے کرے گا؟ ارجن، نکا کی طرح انگلینڈ سے درغلایا ہوا واپس نہیں آیا تھا وہ ایک انگریز کی طرح یقین کی دولت لے کر انگلینڈ سے واپس آیا تھا۔

اسٹیشن واپس آتے ہوئے ایک ہجوم سڑک پر اٹھ آیا تھا۔ وہ شو فر کو ایک سینما کے پاس رکنے پر مجبور کر رہا تھا جس پر ڈنزی کی ایک فلم لگی ہوئی تھی جیہ کو اپنے بیٹے کی توجہ اس ہجوم سے ہٹانے میں مشکل پیش آ رہی تھی وہ خود البتہ یہی سوچ رہی تھی کہ اگر یہ صورت حال تھی کہ سیر پور کے تاجر بھی دھڑا دھڑاپنا غلہ فروخت کر رہے تھے۔ جلد ہی یہ غلہ ختم ہونے والا تھا۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ پھر کیا ہو گا؟

وہ تو بھلا ہو بارشوں کا کہ اس نے سیر پور کو قحط کے خدشات سے کسی حد تک نجات دلا دی تھی جبکہ اس کے آس پاس ریاستیں بھوکوں مر رہی تھیں ارجن کو اس سے بھی کوئی دل چسپی نہ تھی کہ منہ زور دریا اپنے پانیوں میں کتنی کشتیاں بہا لے گئے ہیں اور اس کے نتیجے میں کتنا نقصان ہو گیا ہے۔ دوسری جانب نئے وائسرائے جنرل ویول نے ایک آرملی کمائڈر کی حیثیت سے بلیک مارکیٹنگ پر قابو پانے کے لئے سخت اقدامات کا اعلان کر دیا تھا۔

سترہ سالہ حاکم سیر پور کو جب سے یہ خبر ملی تھی کہ سیر پور لانسز، سیر پور کی سرحدوں

کے نہایت قریب برا کے جنگلات میں لڑ رہے ہیں وہ ان کے ساتھ شامل ہونے کے لئے قرار تھا۔ سونے پہ سہاگہ یہ کہ فورٹ ولیم نے ارجن کو مطلع کیا کہ میجر آسبن، بری ریا، اراکلن کی دلدلوں اور ترائی کے جنگلوں میں برسرِ پیکار سیرپور لانسز میں شامل ہونے کے روانہ ہو رہا ہے۔ جیہ کو اپنے بیٹے کی آنکھوں میں پاگل پن کی وہی جھلک دکھائی دی تھی۔ ایک عرصہ پہلے اس نے ٹکا کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔ اس کے والد کی شجاعت کی داستان اور الپو (ترکی) کے محاذ پر اس کے چچا کی موت نے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھادی تھی۔ جنگ میں حصہ لئے بغیر وہ مرد نہیں کہلا سکتا۔

ارجن جیپ لے کر شہر سے نکل گیا۔ جنگل، میدانوں، پہاڑی علاقوں اور دیہات اس نے لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور جنگ کے حق میں تند و تیز اور طویل تقریریں کیں۔ بعض اوقات وہ کسی کو بتائے بغیر سیرپور ایئر کاکوئی ہوائی جہاز لے کر پرواز کر جاتا۔ رات جب وہ شی پیل میں داخل ہوتا تو جیہ کو اس کا جوش جذبات سے چمکتا ہوا چہرہ دیکھ کر ہی چل جاتا کہ وہ جہاز میں ان پہاڑوں اور جنگلات پر چکر لگاتا ہے جہاں اس کے اندازے مطابق سیرپور لانسز لڑ رہے تھے وہ اس جگہ پر پروپیگنڈہ خطوط کے بندل گرانے جاتا تھا فوجیوں کے حوصلے بلند کرنے کے لئے کلکتہ سے چھپ کر آئے تھے۔

جیہ نے اب تک کچھ نہیں کہا تھا لیکن جب بھی وہ محل سے روانہ ہوتا اس کا دھڑکننا بھول جاتا۔ وہ پراگھنا کرنے لگتی کہ اپنے پروں پر طلوع ہوتے ہوئے سورج کی شبیہ لے کر پرواز کرنے والے چلبانی بمبار طیارے رائل انڈین ایئر فورس کے طیاروں سے اڑ رہیں اور ارجن کے سویلین اور غیر مسلح جہاز کی طرف متوجہ نہ ہوں۔

اسی اثناء میں جیہ نے راج گورو کو اجازت دے دی کہ وہ ارجن کی اٹھارویں سالگی عوامی پیمانے پر منانے کے انتظامات کریں یوں وہ ارجن کو عوامی تنقید سے بچانا چاہتی تھی۔ کی زندگی میں پہلی بار کامنی مندر میں ہونے والی تقریب کو حکمران کی ذات تک محدود کر گیا اور عام لوگوں کو آنے کی اجازت نہیں دی گئی اس کی وجہ جنگ بتائی گئی۔

جس وقت راج گورو نے بالغ مہاراجہ کے ماتھے پر حکمران کا ٹیکا لگایا اور اسے یادگار تلوار تھمائی تو ایک توپ فائر کر کے اس پر خوشی کا اظہار کیا گیا۔ لوگوں کا ہجوم، جسے کامنی مندر جانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی شہر کی سڑکوں پر جمع تھا تاکہ شی پیل جاتے وقت اپنے مہاراجہ کا دیدار کر سکے ارجن ایک ہاتھی پر سوار تھا اور مسکرا مسکرا کر لوگوں کے نفوس اور شور و غوغا کا جواب دے رہا تھا۔

ٹھیک اسی لمحے سر اکبر نے مہاراجہ کو ایک کلنڈ تھمایا تو اس کا موڈ بدل گیا۔ ہنسنے ہوئے ہونٹ بھیج گئے وہ چند ٹانے کلنڈ پر نظریں جمائے رہا۔ پھر وہ قدم بجا کر ہودے میں کھڑا ہو گیا اس نے سیرپور کی شاہی تلوار بے نیام کی اور ہاتھ اتنا بلند کر لیا کہ جھوم بہ خوبی تلوار کو دیکھ لے۔

”سیرپور کے باسیو!“ ارجن پوری قوت سے چلایا۔ ”وزیر اعظم نے ابھی ابھی مجھے مطلع کیا ہے کہ جاپانی افواج ہندوستان میں داخل ہو گئی ہیں۔ اس وقت دشمن کی فوجیں ہماری اپنی سرحدوں سے صرف دو سو میل کے فاصلے پر ہیں۔ شی پلس کا اسلحہ خانہ کھول دیا جائے گا۔ آج رات آپ لوگ سیرپور لائنز میں شمولیت کے لئے تیار رہیں تاکہ ہم سب مل کر اپنی ریاست کی حفاظت کر سکیں۔“ ارجن کے الفاظ نے جھوم میں گویا آگ بھردی۔

اور پھر جب رات ہوئی تو پورا سیرپور اسلحے کی تلاش میں سیرپور کے شاہی اسلحہ خانے کی طرف دوڑ پڑا۔ جیہ یا سر اکبر کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ وہ اس بھرے ہوئے جھوم کو روک سکتے یا اپنی کوئی بات اسے سمجھا سکتے..... وہ خاموشی کے ساتھ اپنی پرجوش رعایا کو دیکھتے رہے تھے۔

نصف شب کے وقت مہاراجہ ارجن نے شی پلس کو خبر باد کہہ دیا لیکن اس شان کے ساتھ کہ وہ ایک ہاتھی پر سوار تھا جس کے اوپر سرخ رنگ کا شاہی چھتر نصب تھا تیل کی کمی کے باعث سیرپور کی فوج اپنی گاڑیاں چھوڑنے پر مجبور ہو گئی تھی چنانچہ سفر کے لئے گھوڑوں کا انتخاب کیا گیا تھا۔ سیرپور کے نقاروں پر پڑنے والی چوٹ سے شی پلس کے در و دیوار لرز اٹھے تو جیہ کی آنکھوں میں بھی آنسو اٹھنے لگے لیکن وہ فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ یہ آنسو خوشی کے ہیں، دکھ کے ہیں یا فخر کے....

۱۹۴۴ء

اگلے دو ہفتوں کے دوران سیرپور کے پائلٹ گھنے جنگلوں میں مہاراجہ کی نقل و حرکت کا سراغ لگانے میں ناکام رہے تھے۔

جب ریڈیو نے اعلان کیا کہ ہیرویتھ کی افواج نے کوہ ہیمالے کے گرد و نواح میں رسد اور سپلائی کی لائن کٹ دی ہے اور سیونٹھ آرمی محصور ہو کر رہ گئی ہے تو جیہ نے سیرپور کے پائلٹس پر پابندی عائد کر دی کہ وہ میدان جنگ میں مہاراجہ کے اس سفر خود کشی کا تعاقب نہیں کریں گے۔

جیہ اپنے بیٹے کی زندگی کے بارے میں غیر یقینی صورت حال کا شکار تھی لیکن وہ پرامید

تھی کہ ارجن اپنی افواج کے ساتھ سیونٹھ آرمی کی پشت پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہو گا البتہ وہ اس امر پر حیران تھی کہ سیرپور لانسز بغیر کسی کمک کے کس طرح زندہ ہیں۔ کیا وہ دنیا کی ایک منظم ترین فوج کے مقابلے میں ایک بار پھر جام کی بوتلوں کے بم استعمال کر رہے ہیں لیکن اس بار جنگ میں ایک بنیادی فرق تھا۔ لانسز کی ہمت بندھانے والا نوجوان اس کا بھائی نہیں بلکہ بیٹا تھا اور وہ ایسے فوجی دستوں کی مدد کو گیا تھا جو چاروں طرف سے محصور ہو چکے تھے۔

”یہ جنگ ہندوستان کو تباہ و برباد کر دے گی، حکم!“ ایک روز سر اکبر نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ ”ہمیں سے تیس لاکھ کے درمیان لوگ قحط سے ہلاک ہو چکے ہیں۔ خود مختاری کے منصوبے غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی کر دیئے گئے تھے جس کی وجہ سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان خلیج اور زیادہ وسیع ہو گئی ہے جبکہ نوے ہزار سے زائد ہندوستانی فوجیوں کو اگلے محاذوں پر گرفتار کیا جا چکا ہے حکم! ان قیدیوں سے جانوروں کا ساسلوک کیا جا رہا ہے اور دن رات مشقت لی جا رہی ہے تاکہ برما تک ریلوے لائن تعمیر کی جاسکے اور ہیرو پٹو کی فوج بہ آسانی ہندوستان تک پہنچ سکے۔ یوں ہندوستان یعنی ہم اپنی غلامی برطانیہ کے بجائے جاپان سے بدل لیں۔“

مہاجرین دھڑا دھڑا سیرپور میں داخل ہو رہے تھے۔ جیہ کے پاس ایسا کوئی پیمانہ نہ تھا کہ وہ آنے والوں کے بارے میں یہ اندازہ کر سکتی کہ یہ لوگ قوم پرست ہیں جنہوں نے برطانوی راج کے لئے لڑنے سے انکار کر دیا ہے یا واقعی جنگ کے متاثرین ہیں اور طویل مسافیں طے کر کے پناہ کی تلاش میں آئے ہیں۔ آنے والوں میں سے بعض نے بتایا کہ انہوں نے مہاراج کی فوج کو سیونٹھ آرمی کے عقبی پوزیشنوں کی طرف بڑھتے دیکھا ہے۔ بعض مشکوک نگاہوں سے جیہ کو دیکھتے شاید ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ بھلا ایک سولیلین رضاکارانہ طور پر اس مملکت اور بھیانک جنگ میں کس طرح کود سکتا ہے۔

آخر کار سر اکبر یہ خبر لایا کہ سیونٹھ آرمی نے جاپانیوں کا گھیرا توڑ دیا ہے اور اب رنگون پر اپنے قبضے کی بحالی کے لئے لڑ رہی ہے۔ جب رنگون واپس لے لیا گیا تب جیہ کو پتا چلا کہ ارجن کی فوج مبینوں پہلے ہی سیونٹھ آرمی کے ساتھ شامل ہو گئی تھی۔

ایک ماہ بعد ایک ڈکونا طیارے نے دارالحکومت کی ہوائی پٹی پر لینڈنگ کی۔ جہاز کا دروازہ کھلا اور لوگوں کا ایک ہجوم جہاز کی طرف بھاگ کھڑا ہوا تاکہ اپنے حکمران کی بہ حفاظت واپسی پر اسے مبارک باد دے سکے۔ لیکن جب کبل میں لپٹی ہوئی کوئی شے جہاز کے

دروازے پر نمودار ہوئی تو ہجوم کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ دو قبائلیوں نے اسٹریچر جہاز سے نکال کر زمین پر رکھا تو آہوں اور سسکیوں کا ایک طوفان تھا جو ضبط کی دیواریں توڑ کر بہہ نکلا تھا۔ جیمس آبرن دروازے پر نمودار ہوا وہ سب سے پہلے جیہ کی طرف بڑھا۔ ”فکر کی کوئی بات نہیں، شہزادی۔“ اس نے مہارانی کو تسلی دی۔ ”ٹانگ ٹوٹ گئی ہے لیکن علاج کے بعد صحیح ہو جائے گی البتہ لیبریا کا شدید حملہ ہوا ہے۔“ اس کا اشارہ اسٹریچر پر لیٹے ہوئے مہاراجہ ارجن کی طرف تھا۔

جیہ کئی روز تک اپنے بیٹے کے بستر سے لگی بیٹھی رہی۔ زخم بھرنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے کیونکہ ہڈی صحیح نہیں بٹھائی گئی تھی ٹانگ کے زخم کا نئے سرے سے آغاز کر دیا گیا البتہ نوجوان مہاراجہ کا بخار قدرے قابو میں تھا کبھی کبھار بخار میں تیزی آ جاتی لیکن خود بخود اس میں کمی آ جاتی۔ جیمس آبرن اکثر و بیشتر پیس آتا تاکہ بیمار مہاراجہ کی مزاج پر سی کر سکے۔ وہ جیہ کو جنگ کی تازہ ترین صورت حال سے بھی آگاہ کرتا رہتا تھا۔ انگریز جب تک محل میں موجود رہتا وہاں ایک نئی روح اور نئے جذبے بیدار رہتے۔ اس نے سرگوشیوں میں ہی جیہ کو بتایا کہ جرمنی نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں تو مہارانی نے چونک کر ارجن کو دیکھا۔ خبر خوش آئند تھی لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ ارجن جاگ جائے۔

ٹانگ رفتہ رفتہ صحیح ہو گئی زخم بھر گیا تھا لیکن ارجن بے حد کمزور ہو گیا تھا۔ بخار کا زور بھی ٹوٹ گیا اور پھر ایک طویل عرصے کے بعد ارجن اپنے والد کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اپنے درباریوں سے صحت یابی کی مبارک باد وصول کر رہا تھا۔ کونسل کے ارکان نے جیمس آبرن پر زور دیا تھا کہ وہ مہاراجہ کا جشن صحت یابی منائے۔

”یورپ میں جنگ ختم ہو چکی ہے، حکم!“

”آپ اپنی حکمرانی کی ذمہ داریاں سنبھال سکتے ہیں، یور ہائی نیس۔“

ارجن نے اس نصیحت کو فوری طور پر مسترد کر دیا تھا۔ ”میں معذوری کے ساتھ جشن صحت یابی نہیں مناؤں گا۔“ اس نے فیصلہ سنایا۔ ”میں سب سے پہلے لندن جا رہا ہوں تاکہ اپنی ٹانگ کا آپریشن کروا سکوں۔ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ ہیروینٹون نے ابھی ہتھیار نہیں ڈالے۔ وائسرائے کے پاس سیرپور آنے کی فرصت نہیں ہو گی۔“

”لارڈ دیول ان دھل ان کوششوں میں مصروف ہیں کہ نیپٹن کا انگریز اور مسلم لیگ میں مفاہمت ہو جائے تاکہ ہندوستان کو خود مختاری مل سکے۔“ سر اکبر نے اسے آگاہ کیا۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وائسرائے اس وقت کسی ہندوستانی ریاست میں شکار میں مصروف نہیں ہے۔“

لیکن وائسرائے کی خاطر تواضع کا خیال ارجن کو بے حد بھلا لگا تھا یوں وہ اس سیاسی لڑائی میں بھی دلچسپی لینے لگا تھا جو مسلم لیگ اور نیشنل کانگریس کے درمیان برطانوی ہند کے کنٹرول کے لئے کی جا رہی تھی۔ اس نے سارا موسم برسات لارڈ ویول کے دورے کی منصوبہ بندی میں گزار دیا۔ راتوں کے وقت جب باہر بارش اپنے عروج پر ہوتی اور سیرپور کے دریا کنارے توڑ کر باہر نکلنے کو بے تاب ہوتے، وہ ریڈیو سن رہا ہوتا تاکہ چلپان کی شکست کی خبریں سن سکے۔

”ایٹم بم!“ مارے جوش کے ارجن کی آنکھوں کا رنگ بدل گیا۔ اس نے خبروں میں سنا تھا کہ ایک امریکی ہتھیار نے چلپان کے دو شہروں کو تباہ و برباد کر ڈالا ہے وہاں کوئی ذی روح زندہ اور کوئی مکان سلامت نہیں بچا تھا صفحہ ہستی سے دونوں شہروں کا نام و نشان تک مٹ گیا تھا۔

”ایٹم بم!“ ارجن نے یوں الفاظ دہرائے جیسے وہ بے حد خوش ہو لیکن جیہ اپنے آپ کو بوڑھا اور تھکا ہوا محسوس کرنے لگی تھی صرف چند ہفتے قبل ہی وہ انفرادی لڑائی کے ہتھیار تلاش کر رہا تھا اور اب وہ اجتماعی تباہی کے حق میں سراکبر کو دلائل دے رہا تھا۔

1945ء

وائسرائے کے دفتر سے مہاراجہ سیرپور کے نام ایک معذرتی خط موصول ہوا تھا کہ لارڈ ویول ان دنوں ہندوستانیوں کو اختیارات تفویض کرنے کا اہم اور کٹھن کلام انجام دے رہے ہیں اس لئے وہ مہاراجہ ارجن کو صحت یابی اور حکمرانی کی ذمہ داریاں دینے کے لئے سیرپور نہیں آسکتے۔

واقعات جس رفتار سے رونما ہو رہے تھے ان کے پیش نظر میجر جیمس آبرن، مہاراجہ کے ہمراہ لندن نہیں جاسکا تھا۔ جس روز مہاراجہ اپنے خاومین کے ہمراہ لندن روانہ ہوا اس کے اگلے ہی روز جیمس آبرن کو دہلی طلب کر لیا گیا۔ روائگی سے پہلے میجر آبرن، جیہ سے ملنے کے لئے سٹی پبلز آیا تھا۔

”یوں لگتا ہے کہ برطانوی سلطنت، ہندوستان چھوڑنے میں پاگل پن کی حد تک جلد بازی کا مظاہرہ کر رہی ہے اور اب وہ ہندوستانی ریاستوں کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کے قریب پہنچ چکی ہے۔“ آبرن نے جیہ سے روائگی کی اجازت طلب کی۔

”لیکن ہمارے روابط برطانوی سلطنت سے نہیں ہیں۔“ جیہ نے اعتراف کیا۔ ”ہم تو برطانوی تاج سے منسلک ہیں۔“

جیمس آبرن نے گھور کر جیہ کو دیکھا کہ وہ نیلی آنکھوں کے پھیلاؤ سے خوفزدہ ہو گئی۔ ”لیکن پارلیمنٹ ان شہروں سے رابطے میں ہو گی جو تباہی سے دوچار ہوئے ہیں یا وہاں مظاہرے ہوئے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہندوستان کی پانچ سو سے زائد ریاستوں کے ساتھ علیحدہ علیحدہ مذاکرات کرے گی۔“

”پوری جنگ کے دوران تم لوگ مصر رہے کہ ان حدود کا تحفظ کیا جائے جو ہندوستان کی نشانی ہیں۔ لیکن اب اتنی آسانی اور عام سے انداز میں تم لوگ ان حدود کو توڑنے کا فیصلہ کر رہے ہو۔ بھلا برطانوی تاج ہمیں کیسے نظر انداز کر سکتا ہے؟“

”میں نے آپ کو پہلے ہی متنبہ کیا تھا، شہزادی حکمرانوں نے خود تاخیر کی ہے۔“
آنے والے ہفتوں میں جیہ، آبرن کے تلخ اور کڑوے تبصروں کو بھول نہیں سکی۔ روزانہ اخبارات میں قوم پرست لیڈروں کی لمبی چوڑی تقریریں شائع ہوتیں لیکن ان کے مقابلے پر حکمرانوں کا ذکر تک بھی نہ ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میڈیا نے حکمرانوں کو قطعی فراموش کر دیا ہے۔

جیہ باقی تمام باتوں سے بے پروا ہو کر برطانوی بادشاہت کی اس بات چیت کا جائزہ لینے لگی جو وہ ہندوستان کی دو بڑی پارٹیوں سے جاری رکھے ہوئے تھی وہ اس بات پر البتہ بے حد حیران تھی کہ کیا اس کی اپنی ریاست اتنے دنوں تک قائم رہ سکے گی کہ ارجن صحت یاب ہو کر لندن سے واپس آ جائے؟

ہندوستان کے عوام کو اختیارات منتقل کرنے کا منصوبہ اس لئے التوا میں پڑ گیا کہ برطانوی سلطنت فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اختیارات کا محفوظ اور اصل حقدار کون ہے۔ قائد اعظم پاکستان کے لئے اپنے مطالبات پر اٹل تھے جبکہ نہرو کا اصرار تھا کہ نیشنل کانگریس، ہندوستان کی واحد ترجمان ہے۔

جب نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان ڈیڈ لائن ختم کرنے کے لئے برطانوی حکومت نے تجویز پیش کی کہ دونوں پارٹیوں پر مشتمل ایک مخلوط حکومت قائم کر دی جائے جو باری باری اختیارات استعمال کرے۔ لیکن نیشنل کانگریس نے جب مسلم لیگ کے ساتھ برابری کی بنیاد پر حکومت میں شرکت سے انکار کر دیا تو مجبور اور پریشان وائسرائے نے صرف کانگریس کی حکومت سے حلف لے لیا۔

”برطانوی ہم لوگوں پر اپنے ہاتھ صاف کر رہے ہیں، حکم!“ سر اکبر نے ریڈیو کی نائٹ گھماتے ہوئے جیہ کو مخاطب کیا۔ ”اگر برطانوی پارلیمنٹ ہندوستان سے جانے میں تاخیر کرے تو پھر مجھے یقین ہے کہ وہ شاہی ہندوستان کو بھی بھیڑیوں کی بھٹ میں پھینکنے - دریغ نہیں کرے گی۔“

جیہ نے ایک نظر دریا کی جانب دیکھا جہاں ماہی گیر مچھلیاں پکڑنے میں مصروف تھیں لیکن وہ زیادہ دیر ادھر متوجہ نہ رہ سکی تھی کیونکہ ریڈیو پر قائد اعظم کی آواز ابھرنا شروع ہو گئی تھی۔ ”وہ دو پارٹیاں جن سے ہم نے بات چیت کی ہے ہم پر پستول تانے ہوئے ہیں ایک کے پاس طاقت اور اس کے پیچھے مشین گنیں ہیں جبکہ دوسری کے پاس عدم اعتماد، عدم تعاون اور سول نافرمانی کی دھمکی ہے۔ صورتحال کا نتیجہ جلد نکلنا چاہئے ہمارے پاس بھی ایک پستول موجود ہے چنانچہ آج ہم نے ایک تاریخی فیصلہ کیا ہے..... ہم نے آئین اور آئینی طریقہ کار کو خیرباد کہہ دیا ہے۔“

”اس کا کیا مطلب ہوا“ سر اکبر؟“ جیہ نے فوراً پلٹ کر دریافت کیا۔

”میں نہیں جانتا، حکم!“ سر اکبر نے یوں اپنی نگاہیں ہاتھوں پر جمائیں جیسے بڑھتی ہوئی عمر کی جھریوں سے پریشان ہو رہا ہو۔ ”جب میں ایک نوجوان کی حیثیت سے سیرپور آیا تھا تو دنیا بے حد سادہ تھی۔ ہم سب لوگ..... ہندو، مسلمان، قوم پرست اور حکمران صرف ایک چیز چاہتے تھے..... برطانیہ کے عمل دخل کے بغیر باعزت زندگی لیکن اب میں اتنا بوڑھا ہو گیا ہوں کہ اس نئے ہندوستان کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔ مجھے ان رہنماؤں کے لالچ کی سمجھ نہیں آتی جو اس قوم کی لاش پر سیاست کرنا چاہتے ہیں جو ابھی پیدا نہیں ہوئی۔“

جیہ نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی اپنی بادشاہت متزلزل تھی لیکن ایک اچھی بات یہ تھی کہ لندن سے آنے والے خطوط میں ارجن کے آپریشن کی کامیابی کی اطلاع دی گئی تھی اس کے اطمینان کے لئے یہی بہت تھا۔

1946ء اگست کی چوتھی ہوئی دوپہر میں کلکتہ کی سڑکیں ویران ہو رہی تھیں۔

ارجن کامیاب آپریشن کے بعد واپس آ چکا تھا۔ اتر پورٹ پر اس کا استقبال کرنے کے لئے جیہ، سر اکبر اور جیمس آبرن موجود تھے۔ وہ جہاز سے نکل کر جب سیڑھیوں پر کھڑا ہوا تو جیہ ایک لمحے کے لئے اسے دیکھتی رہ گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے پر تپ سنگھ واپس آ گیا ہو۔ ارجن اس وقت بالکل اپنے باپ کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔

اڑپورٹ سے سیرپور ہاؤس کے راستے میں جگہ جگہ رکاوٹیں کھڑی ہوئی تھیں۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ ارجن نے ان لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

”کل کلکتہ میں مسلمانوں کا ایک بہت بڑا جلسہ ہونے والا ہے۔“ جیمس نے بتایا۔ ”جس

میں شریک ہونے کے لئے ہندوستان بھر کے مسلمان چلے آ رہے ہیں۔ اس جلسے میں

مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ ملک کے قیام کا مطالبہ کیا جائے گا۔ ہندوؤں نے اس لئے

رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں کہ شہر کے باہر والے مسلمان اس جلسہ میں شریک نہ ہو سکیں۔“

جیہ کو یہ سن کر شرم محسوس ہونے لگی۔ اس کی ریاست کا وزیر اعظم بھی تو مسلمان ہی

تھا جو اس وقت اسی گاڑی میں تھا اور جس کے ماتھے پر پریشانیوں نے لکیریں ڈال دی تھیں

سیرپور ہاؤس پہنچنے کے بعد ارجن کے لئے ایک چھوٹی سی مذہبی تقریب منعقد ہوئی جو ریاست

کے سربراہ کے لئے اس لئے ہوئی تھی کہ سربراہ صحت یاب ہو کر وطن واپس آ گیا تھا۔

”جیمس صاحب میں فوری طور پر مسزرائے کے پاس جانا چاہتی ہوں۔“ جیہ نے کہا۔

”تاکہ موجودہ صورت حال پر ان سے گفتگو کی جاسکے۔“

”بہت مشکل ہے حکم، سارے راستے فسادات کی لپیٹ میں ہیں۔ ایسی صورت میں

یہاں سے نکلنا خطرناک ہو گا۔ اس کے علاوہ ہم آپ کو فوری طور پر کوئی تحفظ بھی فراہم

نہیں کر سکتے۔“

”پلیز، کوئی بندوبست کر دیں میرا وہاں جانا بہت ضروری ہے۔“

جیمس صرف اتنا کر سکا تھا کہ اس نے فون کر کے مسزرائے کو جیہ کی آمد کی خبر پہنچا دی

تھی۔

”بیٹے!“ جیہ نے ارجن کی طرف دیکھا۔ ”میری یہ خواہش ہے کہ تم ان ہنگاموں سے

دور رہو۔ بھگوان تمہیں اپنی حفاظت میں رکھے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ ارجن ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس وقت پورا

ہندوستان جل رہا ہے تو میں اس آگ سے کیسے محفوظ رہ سکتا ہوں۔“

اس لمحے جیہ کو محسوس ہوا کہ اس کا بیٹا اچانک بہت بڑا ہو گیا ہے۔ اتنا بڑا کہ شاید اب

وہ اس کے اختیار میں نہیں رہا۔

اس شام جب جیہ مسزرائے کے گھر کی طرف روانہ ہوئی تو پورا راستہ خطروں سے بھرا

ہوا تھا۔ جگہ جگہ بلوے ہو رہے تھے۔ مکانات جل رہے تھے۔ ایسے میں ڈرائیور کے لئے

گاڑی کو صحیح سلامت نکل لے جانا بہت دشوار ہو رہا تھا۔ مسزرائے کے مکان کے پاس ایک

بھرے ہوئے مجمع نے گاڑی کا تعاقب بھی کیا تھا لیکن ڈرائیور بڑی ہوشیاری سے گاڑی دوڑاتا چلا گیا پھر جب گاڑی مسزرائے کے مکان کے احاطے میں داخل ہوئی تو مسزرائے بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں۔

”جھگوان کا شکر ہے کہ تم صبح سلامت یہاں تک آ گئیں۔“ اس نے کہا۔ ”پورا شہر جل رہا ہے۔ اس وقت تمہارے سیرپور جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ راستے میں گاڑیوں سے اتار اتار کر لوگوں کو مارا جا رہا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم اب واپس نہ جاؤ۔“

جیہ نے دیکھا کہ باہر لان پر مسزرائے کے ہندو اور مسلمان ملازمین سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ انہیں اپنے اپنے گھر کی فکر تھی۔ لمحہ لمحہ آنے والی خبریں انہیں اور پریشان کر رہی تھیں ایک طرف کچھ دانش ور قسم کے لوگ سر جوڑے ہندوستان کے مستقبل پر باتیں کر رہے تھے۔ اس سحرے مستقبل کی جس کا انہوں نے خواب دیکھا تھا لیکن اب وہ مستقبل شعلوں کے کفن میں لپٹا ہوا تھا۔

مسزرائے جیہ کو اپنے کمرے میں لے آئی جس کی کھڑکی سے ٹھنڈی، ٹھنڈی ہوائیں آ رہی تھیں۔ ”ان خبروں نے مجھے بہت تھکا دیا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”جھگوان کے لئے کچھ اور باتیں کرو۔“

لیکن ان کی باتیں اس وقت ادھوری رہ جاتیں جب جیس آبرن کا ٹیلی فون آتا وہ ہر آدھ گھنٹے بعد جیہ کو شہر کے حالات سے باخبر کر رہا تھا۔ اس کے فون کی ٹھنڈی سنتے ہی ہندو اور مسلمان ملازمین ارد گرد جمع ہو جاتے۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ان مخلوق کی کیا حالت تھی جہاں ان کی گھر تھے لیکن جیس کی آواز اور اس کی بتائی ہوئی خبروں میں مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق اس وقت پورا شہر ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔

رات ایک بجے کے قریب مسزرائے کے احاطے میں زخمیوں کو لایا جانے لگا۔ مسزرائے نے ان پناہ گزینوں کے لئے اپنے مکان کے گیٹ کھلوا دیئے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ مرد بھی اور چھوٹے چھوٹے بچے بھی، ہر طرف زخمیوں کی چیخ پکار مچی ہوئی تھی۔

”ہمارے گھروں کو جلا دیا گیا۔ گھر والوں کو قتل کر دیا گیا۔“ ایک آدمی رو رو کر فریاد کر

رہا تھا۔

”کون تھے وہ ہندو یا مسلمان۔“ مسزرائے نے دریافت کیا۔

”آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں۔“ وہ آدمی بھڑک اٹھا۔ ”ارے ببا وہ قاتل تھے اور

انگوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔“

رات اس طرح آنکھوں آنکھوں میں گزر گئی۔ دوسری شام جیمس آسبن کا فون آیا۔ پور ہائی نہیں۔“ اس نے جیہ سے کہا۔ ”تشدد کی آگ پھیلتی جا رہی ہے۔ ہم لوگوں نے اپنے فوجیوں کو براہ راست کارروائی کا حکم دے دیا ہے لیکن حالات قابو میں نہیں آ رہے اور ہاں آپ کا سیرپور ہاؤس شاید اس لئے ابھی تک بچا ہوا ہے کہ سیرپور کا مہاراجہ ہندو ہے اور وزیر اعظم مسلمان۔ میں اپنے فوجیوں کے ساتھ شہر کے حالات کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پورے شہر میں کرفیو ہے اس کے باوجود اب تک ساٹھ ہزار آدمی رے جا چکے ہیں۔ میں ایک فوجی جیپ لے کر آ رہا ہوں۔ آپ فوراً سیرپور آ جائیں۔ ہاں آپ کی ضرورت ہے۔ مہاراجہ آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔“

”ارجن اس وقت کہاں ہے۔“

”وہ اس وقت پورے شہر سے سیرپور والوں کو اکٹھا کرتے پھر رہے ہیں۔“ جیمس نے بتایا۔ ”آپ کا سیرپور ہاؤس اس وقت ایک فوجی کیمپ بنا ہوا ہے۔“ جیہ سوچنے لگی کہ پچھلے اگست میں اس کا بیٹا جاپانیوں سے جنگ کر رہا تھا اور اس اگست میں ایک دوسرے انداز کا خون کا دریا اس کی راہ میں آ گیا تھا۔ نہ جانے آنے والا اگست اپنے ساتھ کیا لے کر آنے والا تھا۔

مسز رائے نے آکر بتایا کہ جیمس جیپ لے کر آ گیا ہے۔

جیہ، جیمس کے ساتھ ہی اس کی جیپ پر بیٹھ گئی۔ اس نے دیکھا کہ جیمس بہت اداس ہو رہا تھا۔ نہ جانے کیوں جیہ کا دل دھڑک اٹھا۔ جیمس، جیہ کی طرف اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو، لیکن کہنے کی ہمت نہ ہو۔

”جیمس صاحب!“ جیہ نے ایک اضطرابی کیفیت میں جیمس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”آپ یہ

بتائیں میرا ارجن تو خیریت سے ہے نا؟“

”یور ہائی نس۔“ جیمس نے ایک گہری سانس لی۔ ”میں آپ کو سب کچھ بتاتا ہوں مہاراجہ اور سر اکبر سیرپور والوں کو محفوظ مقامات پر پہنچانے کے لئے جا رہے تھے کہ راستے میں ہندوؤں کے ایک مجمع نے ان کی گاڑی کو گھیر لیا وہ اس بات پر ہنگامے کر رہے تھے کہ ایک ہندو مہاراجہ ایک مسلمان کے ساتھ کیوں بیٹھا ہوا ہے۔ ارجن نے سر اکبر کے بارے میں بتایا کہ وہ ریاست کے وزیر اعظم ہیں لیکن مجمع نے سر اکبر کو گاڑی سے کھینچ لیا انہیں بچانے کے لئے مہاراجہ بھی گاڑی سے باہر آ گئے۔“

”پھر... پھر کیا ہوا؟“

”مجھے یہ کہنے دیں یور ہائی نس کہ مہاراجہ نے ایک بہادر کی شان سے اپنی جان دی وہ اپنے وزیر اعظم کو بچاتے ہوئے مارے گئے لوگوں نے سر اکبر کو بھی مار دیا۔“
جیہ کو اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ یہ سب سن کر زندہ کس طرح رہ گئی اس کا کلیجہ کیوں نہیں پھٹ گیا تھا۔

1947ء- سر اکبر کی لاش کے ٹکڑے قبرستان میں دفن کر دیئے گئے لیکن ارجن راکھ بتارس نہیں لے جاتی گئی۔ جیہ کی خواہش پر اس راکھ کو دریائے برہم پڑا ہی میں بر گیا تھا۔

سیرپور واپس آنے کے بعد جیہ اپنے کمرے میں بند ہو کر رہ گئی تھی سوگ کے آنے والوں سے کہہ دیا جاتا کہ مہارانی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کا دل اچاٹ ہو گیا زندگی نے اسے سوائے خوف اور پریشانیوں کے اور کیا دیا تھا اس نے ریاست کو بچانے کتنی کوشش کی تھی لیکن ہوا کیا؟ ریاست تو ابھی تک باقی تھی لیکن ریاست کا حکمران مر تھا سیرپور کی ریاست بغیر کسی وارث کے تھی۔

اس کے رات دن پوجا پاٹ میں گزرنے لگے۔ شاید اس طرح اسے سکون مل سکتا۔ سکون جو اب صرف خیال بن کر رہ گیا تھا۔ بہت دنوں کے بعد اسے یہ بتایا گیا کہ ہندوستان اور پاکستان نامی دو ملک بن چکے ہیں دونوں کے جھنڈے الگ ہیں۔ دونوں کے سربراہ اور کا جغرافیہ الگ ہے اس وقت جیہ کو احساس ہوا کہ وہ بھی اگست ہی کا مہینہ تھا۔ اس تقسیم نے فسادات کی ایسی آگ بھڑکائی کہ کلکتہ کے فسادات کو لوگ بھول گئے پورا ملک شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ ہندو، مسلمان، سکھ سب ایک دوسرے کو مار رہے تھے۔ لاکھوں لوگ مارے گئے لاکھوں گھر جل گئے۔ پناہ گزینوں کا ایک بہت بڑا قافلہ اودھ سے اودھ ہو گیا ایسا لگتا تھا جیسے پورا ملک پاگل ہو گیا ہو۔

جیمس آبرن دہلی سے واپس آیا تو جیہ اس سے الجھ پڑی۔ ”سمجھ میں نہیں آتا تمہاری فوج آخر کیا کر رہی ہے۔ وہ ان فسادات کو روکنے کی کوشش کیوں نہیں کرتی۔“
”آپ کس فوج کی بات کر رہی ہیں یور ہائی نس، فوج تو اب ہندوستان یا پاکستان کی۔ اور ان کے ذمے دار اس وقت کے اسلحوں اور ہتھیاروں کی تقسیم میں الجھے ہوئے ہیں کہ کمرے کے حصے میں کتنے ٹینک اور کتنی ہندو قہیں آئیں گی۔ اس موقع پر صرف ایک شخص ہے جس نے ان فسادات کو روکنے کے لئے بھوک ہڑتال کر رکھی ہے اور وہ ہے ماتما گاندھی۔“

”جیس صاحب‘ اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔“

”ہندوستان کی بربادی اور کیا ہو گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں دہلی میں کن کاموں میں مصروف تھا۔ ہم لوگوں کے پاس ہندوستانی ریاستوں کی خفیہ فائلیں تھیں۔ ہم نے وہ تمام اٹلیں وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی اطلاع کے بغیر نذر آتش کر دیں صرف اس لئے کہ ہندوستانی حکام بعد میں آپ لوگوں کو بلیک میل نہ کر سکیں لیکن اس سے کیا فائدہ ہوا آپ لوگوں پر دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔“

”آخر کیوں؟ ہندوستانی حکومت ہمیں بلیک میل کیوں کرے گی۔“

”دیکھیں یور ہائی نس۔ اس وقت پورے ہندوستان میں سینکڑوں ریاستیں ہیں۔ ہندوستان کو یہ ڈر ہے کہ کہیں یہ ریاستیں ان کے خلاف بغاوت نہ کر بیٹھیں۔ ایسی صورت میں یہ ماری ریاستیں مل کر ہندوستان کو بہت نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ اس لئے اب ہندوستان کی یہ خواہش ہے کہ ساری ریاستیں اس میں ضم ہو جائیں۔“

”یعنی ہم اپنا راج چھوڑ دیں۔“

”یہ تو کرنا ہی ہو گا۔ کیونکہ آپ بے بس ہیں یور ہائی نس۔ معاملے پر دستخط تو کرنے ل ہوں گے۔ ورنہ سیرپور ہی میں قتل و غارت گری شروع ہو جائے گی۔“

اسی وقت عورتوں کی چیخنے چلانے کی آواز نے انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ عورتیں ریڈیو پر گاندھی جی کے قتل کی خبر سن کر شور کر رہی تھیں۔ جیہ دوڑتی ہوئی ریڈیو کے پاس پہنچ گئی۔

ریڈیو پر بتایا جا رہا تھا کہ ہندوستان کے عظیم رہنما‘ مہاتما گاندھی کو اپنے ہی ایک آدمی نے قتل کر دیا ہے۔ یہ یقین کرنے والی خبر نہیں تھی لیکن یقین کرنا پڑا۔ جیہ کی آنکھوں کے اگے اندھیرے چھانے لگے۔ وہ سوچنے لگی کہ راج نبی کیا ہوتی ہے۔ شاید اس کے باپ دادا کی ریاست بالیر کا راج گورو اور وہاں کی ستی ماتا جو چیتے کی کھال پر بیٹھی رہتی ہے اور ایک مانپ اس کی حفاظت کرتا ہے اس سوال کا جواب دے سکے۔ اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اسے بالیر جا کر ان سے یہ معلوم کرنا چاہئے کہ جب حالات ایسے ہو جائیں تو ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے۔“

ایک گاڑی جیہ کو ان پہاڑیوں کی طرف لے گئی جہاں کسی زمانے میں ستی ماتا رہا کرتی تھیں جہاں وہ ایک دن اپنی ماں کے ساتھ آئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ستی ماتا اسی طرح چیتے کی کھال پر بیٹھی ہوئی ہو گی لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ پہاڑیاں خاموش تھیں۔

سوائے پر شور ہواؤں اور اڑتی ہوئی خاک کے وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ وقت نے سنی وجود ہی فنا کر دیا تھا۔

وہ واپس لوٹی تو قلعے کے گیٹ پر راج گورو اور میجر دیر سنگھ اس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ وقت نے ان کے نقوش بھی مدہم کر دیئے تھے۔ وہ سب خاموش طویل و عریض برآمدے میں آکر بیٹھ گئے۔ جہاں جیہ بچپن میں کھیلا کرتی تھی۔ جہاں کی ہر شے سے اس کی یادیں وابستہ تھیں۔

”ہاں یور ہائی نس۔“ راج گورو نے اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ یہاں کیوں آئی ہیں؟“ راج نیٹی کا بھید معلوم کرنے۔ ”جیہ نے دھیرے سے کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ پہلا اصول کیا ہے۔“

”پر جا، عوام۔“
”ٹھیک ہے۔“ راج گورو نے اطمینان بھرے انداز میں اپنی گردن ہلائی۔ ”راج والوں کو سب سے پہلے اپنی پر جا کا خیال رکھنا چاہئے۔“

”وہی تو میں معلوم کرنے آئی ہوں گورو جی۔ میرا باپ مرچکا ہے۔ شوہر مرچکا ہے۔ مرچکا ہے، آپ میرے استاد ہیں۔ آپ ہی یہ بتا سکتے ہیں کہ میں کیا کروں۔“
”اپنی پر جا کو قتل و غارت گری سے بچانے کے لئے وہ سب کچھ کرو جو تمہارے میں ہو۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب مجھے سیرپور کو ہندوستان میں ضم کر دینا چاہئے۔“ جیہ نے کہا۔ ”کیونکہ اس کے سوا ہمارے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے۔“

برآمدے کی ایک دیوار کے ساتھنگلی تلواریں آراستہ تھیں۔ یہ تلواریں اس کے دادا کی یادگار تھیں۔ راج گورو نے دیوار سے ایک تلوار اتار کر اس کی دھار پر اپنا آئینہ رکھا۔ انگوٹھے سے خون بننے لگا پھر اس نے آگے بڑھ کر جیہ کے ماتھے پر تلک لگا دیا۔
شام کا ڈھلتا ہوا سورج اس وقت بہت اداس دکھائی دے رہا تھا۔

1950ء جیمس دہلی کے اسٹیشن پر جیہ کے استقبال کے لئے کھڑا تھا۔
جیہ جب اپنے ڈبے سے برآمد ہوئی تو وہ لپکتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ ”آپ نے خبر سنی یور ہائی نس، مسٹر جناح کا انتقال ہو گیا ہے۔“

”اوہ!“ جیہ ایک گہری سانس لے کر رہ گئی صرف دو سال کے عرصے میں وہ سب لوگ ختم ہو چکے تھے جنہوں نے اس تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ اب صرف ماؤنٹ بٹور

اور جواہر لعل نہرو زندہ تھے۔

ایک شاندار گاڑی جب جیہ اور جیمس کو لے کر پارلیمنٹ ہاؤس پہنچی تو ہندوستان کا سیکرٹری وی پی مینن ان کے استقبال کے لئے سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ مختلف ہندوستانی رجواڑوں اور ریاستوں کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ ریاستیں ہندوستان میں ضم ہو چکی ہیں اور اب جیہ بھی سیرپور کی طرف سے کلفذات پر دستخط کرنے آئی تھی۔

”مہارانی صاحبہ۔“ مینن نے اسے مخاطب کیا۔ ”میں آپ کو اس بات کی مبارک باد دیتا چاہتا ہوں کہ آپ نے اپنی ریاست میں امن و امان کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہونے دیا جس وقت پورا ہندوستان جل رہا تھا۔ اس وقت بھی سیرپور میں سکون تھا۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر فخر کیا جاسکتا ہے۔“

”بہت بہت شکریہ۔“

”مہارانی صاحبہ آپ میرے ساتھ تشریف لائیں۔ سردار پٹیل نے کلفذات تیار کر دیئے ہیں۔“

وہ مختلف اندرونی کمرے میں بیٹھا تھا جسے ہندوستان کا مرد آہن کہا جاتا تھا۔ جیہ نے اب سے بہت پہلے اس شخص کو صرف ایک بار دیکھا تھا۔ وہ اب ہندوستان کا نائب وزیر اعظم تھا۔ سردار پٹیل نے مسکراتے ہوئے کلفذات جیہ کے حوالے کر دیئے۔ ”یہ ایک تاریخی موقع ہے مہارانی صاحبہ۔“

”ہاں بہت تاریخی۔“ جیہ دھیرے سے بولی۔ ”آج ہندوستان سیرپور میں ضم ہو رہا ہے۔“

سردار پٹیل ہنس دیا۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں سردار صاحب، ہماری ریاست کی تاریخ تین ہزار سال پرانی ہے۔ ریاست کے پرکھوں کے نام مہابھارت میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں جبکہ آپ لوگوں کی تاریخ کل پچاس ساٹھ سال پر محیط ہے۔“

پھر اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کلفذات پر دستخط کر دیئے۔

سیرپور واپس آنے کے بعد اسے وہاں کے عوام نے گھیر لیا۔ اس کے پاس آنے والوں میں ہر طبقے کے لوگ تھے۔ کسان، تاجر، استاد، طالب علم وہ سب یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ جیہ نے اپنی ریاست ہندوستان میں کیوں ضم کر دی۔

”وہ اس لئے کہ راج نیتی کا پہلا اصول ہے پر جا۔ یعنی عوام اور دوسرا اصول ہے حفاظت۔ تو میں نے تمہاری حفاظت کے لئے ایسا کیا ہے۔ تمہیں محفوظ رکھنے کے لئے اپنے راج کی قربانی دی ہے اگر میں ایسا نہ کرتی تو ہندوستانی فوجیں ریاست میں داخل ہو جاتیں۔ دوسری ریاستوں کا حشر تمہارے سامنے ہے۔“

لوگ اس کی باتیں سن کر خاموش ہو جاتے۔ انہیں جیہ پر بھروسہ تھا وہ جانتے تھے کہ اس نے جو کچھ بھی کیا ہو گا ان کی بھلائی کے لئے کیا ہو گا۔ وہ اگرچہ اب صرف نام کی مہارانی رہ گئی تھی لیکن اس کی عزت و احترام میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جدھر سے گزرتی لوگ اسے دیکھ کر اپنی گردنیں جھکا دیتے۔ کئی دنوں بعد اس نے ایک خبر سنی۔

ارون رائے سیرپور سے الیکشن میں حصہ لے رہا تھا۔ اس خبر نے جیہ کو بھڑکا کر رکھ دیا۔ اس شخص کو اس بات کا کیا حق حاصل تھا کہ وہ پارلیمنٹ میں جانے کے لئے اس کی ریاست کو سیڑھی کی طور پر استعمال کرے۔ اس نے جیمس کو اس وقت فون کر کے اپنے پاس بلا لیا۔

”جیمس صاحب، کیا آپ کو معلوم ہے کہ الیکشن کے کانڈنات کہاں جمع ہوتے ہیں۔“

”ہاں، ہاں کیوں نہیں۔“

”کیا آپ مجھے وہاں تک لے جاسکتے ہیں؟“

جیمس نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔

جیمس جس وقت جیہ کو لے کر الیکشن آفس پہنچا اس وقت ارون رائے اپنے کانڈنات جمع کرا کے باہر آ رہا تھا جیہ کو دیکھ کر وہ ٹھک گیا۔

”مہارانی تم، تم یہاں کیوں آئی ہو۔“

”اپنے کانڈنات جمع کرانے۔“ جیہ نے گردن اٹھا کر جواب دیا اور آگے بڑھتی چلی گئی کچھ دور چلنے کے بعد اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ارون رائے اس طرح کھڑا تھا جیسے کسی جاوو کرنے اسے پتھر کا بنا دیا ہو۔ جیہ کے حلق سے ایک قہقہہ بلند ہوا جو پھیلتا چلا گیا وہ قہقہہ الیکشن آفس سے باہر نکلا اور سیرپور کے بازاروں سے گزرتا ہوا دریائے برہم پتر کی لہروں میں شامل ہو گیا۔

